Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خوشبو ہے ہم سفر

عاصمہ شاہد

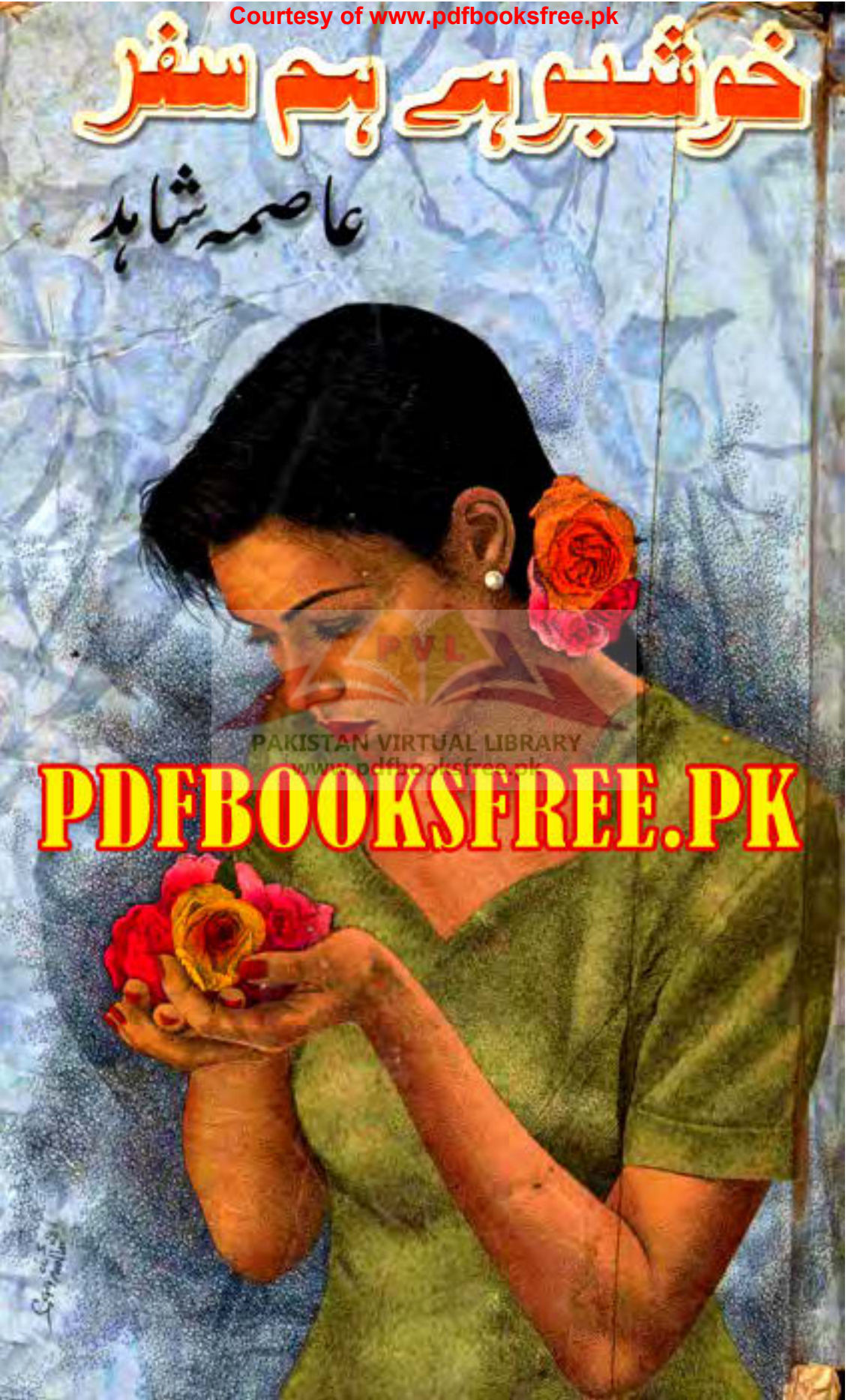

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
PDFBOOKSFREE.PK

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ذرا گاڑی روکنا۔"

"کیوں؟ کیا پریشانی ہے؟"

"روکو ناں۔"

"لو روک دی۔"

"ادھر دائیں طرف دیکھو۔ کیا عالیشان گھر ہے۔"

"گھر؟ محل کہو۔"

"خالی ہے یا کوئی رہتا ہے؟"

"سیّد وجاہت علی خان اپنے پوتے پوتیوں کے ہمراہ رہتے ہیں۔"

"وہ کون ہیں؟"

"تم کو نہیں معلوم؟ تعجب ہے۔ سیّد وجاہت علی خان کو کون نہیں جانتا۔ ممتاز صنعت کار ہیں۔ چیمبرز آف کامرس کے صدر رہ چکے ہیں۔ بزنس سرکل میں تو بے تاج بادشاہ کی سی حیثیت ہے۔ دولت کا حساب ہے نہ شمار۔ کئی ایک تو ملیں چل رہی ہیں۔ ہر بڑے شہر میں فائیو اسٹار ہوٹل ہیں۔ جائیدادیں بے شمار ہیں۔ اب اسی گھر سے اندازہ کر لو۔ تین ہزار گز پر تو یقیناً ہو گا۔ اطراف کی جگہ الگ ہے۔"

"گھر کا راستہ کس طرف سے ہے؟"

"یہ جو ذیلی سڑک جا رہی ہے۔ سمجھو، یہیں سے اس کی حدود شروع ہو جاتی ہیں۔ سڑک کے دونوں جانب باغات ہیں۔ کافی اندر جا کر گیٹ نظر آتا ہے۔"

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تم نے دیکھا ہو۔"

"ہاں، ایک بار اس گھر میں داخل ہونے کا موقع ملا تھا۔ میرے فرم کے ایم ڈی کاروباری لین دین کے سلسلے میں آئے تھے۔ اتفاق سے میں ساتھ تھا۔ سچ پوچھو تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ معمولی سے معمولی چیز سے بھی غیر معمولی شان ٹپکتی ہے۔ ہر چیز امارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ خواب گاہیں ایسی ہیں کہ سونے سے پہلے ہی سونے والوں کو خوابوں تک لے جائیں۔"

"مگر یہ گھر شہر کی آبادی سے بہت دور ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ گھر کے اندر کھڑی درجن بھر گاڑیاں یہاں سے شہر تک کا فاصلہ منٹوں میں سمیٹ دیتی ہیں۔ خدا بھی بے نیاز ہے۔ کسی کو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے کہ رکھنے کو جگہ نہیں ہوتی اور کوئی دو وقت کی روٹی کو بھی ترستا ہے۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ بہرحال اس سے زیادہ شاندار اور خوبصورت گھر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ نام بھی انوکھا سا ہے اس کا۔"

"کیا؟"

"پناہ گاہ۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"سید وجاہت علی خان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ والدین کے لاڈ پیار نے ضدی اور خودسر بنا دیا تھا۔ جس چیز کی طرف نظر سے اشارا کر دیتے، وہ اگلے لمحے قدموں میں ہوتی۔ ہر چیز ان کی ایک جنبش ابرو کی محتاج تھی۔ امارت کا احساس ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ زمین پر یوں چلتے گویا آسمان کو قدموں کے نیچے روند رہے ہوں۔

امارت ہی کیا اپنی وجاہت پر بھی بڑا مان تھا۔ رنگ روپ، نین نقش۔ ایک بار دیکھ کر نظر پلٹنا ہی بھول جاتی تھی۔ جانے قدرت نے کیا سوچ کر ان کو اتنا کچھ دے رکھا تھا۔

مگر۔

مکمل اور بے عیب تو بس خدا کی ذات ہی ہے ناں۔

سو سید صاحب کے خوبصورت سراپے میں جو دل تھا وہ محض ایک پمپنگ اسٹیشن تھا۔ احساس نام کی چڑیا کا دا کے آس پاس چھوڑ دور سے بھی گزر نہ تھا۔ دردمندی نام کی شے سے دل کی سوتیلی رشتہ داری بھی نہ تھی۔

اپنے والدین کو بھی انہوں نے زندگی میں بس ایک ہی خوشی دی تھی کہ شادی ان کی مرضی سے کی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ والدین کی پسند خود ان کی بھی پسند تھی۔ مگر دسترس میں آنے کے بعد پسند بھی کشش کھو بیٹھی۔ بس وقتاً فوقتاً ان کے نام پر دنیا کی آبادی میں اضافے کے لیے رہ گئی۔

دراصل اُفتادِ طبیعت اور نادان دوست قسم کی صحبتوں نے ان کو ایک کھونٹے سے بندھا نہ رہنے دیا۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھے۔ ان کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اپنی عقل پر پردہ ڈال دینے والی خوبصورتی اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی بے تحاشا دولت کی چمک کی بناء پر وہ جس چیز کو چاہیں فتح کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز بھی تو ان کی دسترس سے باہر نہیں تھی۔ وہ جھکانا تو جانتے تھے مگر جھکنا نہیں۔

مگر اب۔

اب ان کے ناقابلِ تسخیر اور مغرور وجود میں اتنی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی کہ ان کے اندر کی تمام رعونت اور خود پسندی ذات کے اندھیروں میں ہی کہیں گم ہو رہی تھی۔ بظاہر تو ان کا رعب و دبدبہ اسی طرح قائم و دائم تھا مگر رات کے سناٹوں اور خاموشیوں میں اپنی کمزوری کا احساس ان کو کروٹیں بدلنے پر مجبور کر دیتا۔

ان کی انا کے بت پر ہتھوڑا بن کر برسنے والا نہال آفریدی تھا۔

جس نے ان کی ذات کی نفی کی تھی۔ ان کو نظر انداز کیا تھا۔

اور جو کوئی غیر نہیں ان کا اپنا نواسا تھا۔

سید وجاہت کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ باپ اور بچوں میں ہمیشہ فاصلہ رہا جسے سید وجاہت صاحب نے ختم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اولاد بھی جب باشعور ہو گئی تو باپ کی فطرت کو دیکھتے ہوئے ان سے فاصلہ رکھنے پر مجبور ہو گئی۔ یوں سید وجاہت اور ان کے بچوں کے درمیان اجنبیت اور تکلف کی اَن دیکھی دیوار حائل تھی۔ بچے مختلف کالجوں، یونیورسٹیوں میں تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے، اپنے آپ میں مگن ایک بے فکر اور اطمینان بخش زندگی گزار رہے تھے۔ اس لیے کہ اپنے ڈکٹیٹر قسم کے باپ کو ان کا ذہن بہت پہلے ہی قبول کر چکا تھا۔

ان کی بظاہر پُرسکون زندگی کے سمندر میں بے چینی کا پہلا پتھر صمد آفریدی نے پھینکا جو ان کی اکلوتی بیٹی ناجیہ کا طلب گار بن کر "پناہ گاہ" میں داخل ہوا تھا۔

جانے کتنے برس پہلے کی بات تھی۔

○ ● ◆

"سنو!" رخشی نے ناجیہ کے اس زور سے کہنی ماری کہ اس کو یقین واثق ہو گیا کہ اس کی پسلی ٹوٹی نہیں تو کم از کم چٹخ ضرور گئی ہے۔

"بدتمیز!" دل کی گہرائیوں سے پہلے ایک درد بھری آہ نکلی، پھر وہ تکلیف سے بلبلائی۔ فراغت پاتے ہی اس نے رخشی کو گھور کر دیکھا۔

"مت گھورو مجھے۔ تمہارے گھورنے سے مجھے غیرت نہیں آ جائے گی۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"تمہیں تو ... تمہاری ... سروے گا تو آئے گی۔ دُور ہٹ کر بیٹھو مجھ سے۔" اس نے نظریں دوبارہ کتاب پر جما دیں۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ صمد آج پھر نہیں آیا۔"

جو جملہ وہ صبح سے ہر دس منٹ کے بعد دہرا رہی تھی، ایک بار پھر دہرایا۔ اس کی تو سرگوشی ایسی تھی جیسے کسی جلسۂ عام سے بغیر مائیک کے خطاب کر رہی ہو۔ چہ جائیکہ وہ اپنی نارمل آواز میں بات کرے، وہ بھی قدرے فاصلے پر بیٹھ کر۔

ناجیہ نے جز بز ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

کلاس میں چند ہی لڑکے لڑکیاں تھے وہ بھی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

"تو میں کیا کروں اگر صمد نہیں آ رہا ہے۔ صبح سے یہی بکواس سُنے جا رہی ہوں۔" وہ غصّے سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"حد ہو گئی تجاہلِ عارفانہ کی۔"

"رخشی! میرا دماغ نہ کھاؤ۔"

"ناجیہ! ہمیں کم از کم اس کی خیریت تو دریافت کرنی چاہیے کہ۔"

"کہ وہ ابھی تک اس دُنیا میں ہے یا اس کا قیام و طعام اللہ میاں کے ہاں پایا جاتا ہے۔" اس نے سُلگ کر رخشی کی بات مکمل کی۔

"اللہ نہ کرے جو اسے کچھ ہو جائے۔" رخشی نے گھبرا کر ایک ہاتھ سے دل اور دوسرے سے کلیجہ تھام لیا۔

"کیوں؟ اگر اسے کچھ ہو گیا تو تمہیں کچھ ہو جائے گا۔" اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

"بکومت۔ گستاخ، بے ادب لڑکی! اپنے الفاظ واپس لو۔ کیا تم کو علم نہیں کہ عزت مآب و عالی مرتبت و محترمی و مکرمی جناب اویس احمد سلمہٗ نے ظالم سماج کی بلا مبالغہ پچھتر دیواریں گرا کر ما بدولت سلمہا کے جملہ حقوق بشکل تمام اپنے نام محفوظ کرائے ہیں۔ لہٰذا اب ہم کسی دوسرے کی جانب نگاہ اُٹھا کر گناہ دارین حاصل کرنا نہیں چاہتے۔"

"پھر تم کو پریشانی کیا لاحق ہے؟ صبح سے صمد صمد کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اگر اتنی دفعہ اللہ کا نام لے لیا ہوتا تو اب تک جنّت الفردوس میں پہنچ چکی ہوتیں۔"

"تم میری جنّت دوزخ کی فکر نہ کرو۔ اپنی خبر لو۔ دل توڑنے جیسے عظیم گناہ کی مرتکب ہو رہی ہو۔" رخشی نے اسے شرم دلانے کی کوشش کی۔

"دیکھو رخشی!" اس نے اُنگلی اُٹھا کر وارن کرنے کے سے انداز میں کہا۔ "میں بہت برداشت کر چکی ہوں۔ اب مزید تمہاری بکواس نہیں سنوں گی۔"

"تمہاری ایسی کی تیسی۔ میں تو تم کو اپنی بکواس ضرور سُناؤں گی۔" وہ قریب آ کر بالکل ہی اس سے جُڑ کر بیٹھ گئی۔

"بات یہ ہے ناجیہ خان کہ یہ جو میرا نرم و نازک، معصوم سا دل ہے یہ برخوردار صمد آفریدی کی ہمدردی اور خلوص سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ اور برخوردار صمد آفریدی کا دل جس کی محبّت میں لت پت ہے اگر میں نے اس کا نام لے دیا تو یہ جو میری دو گز کی چوٹی آپ کو نظر آ رہی ہے یہ پانچ منٹ کے بعد دو انچ کی ہو چکی ہوگی۔ لہٰذا احتیاط کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے آپ سے صرف اتنی عرض ہے کہ

؎ چھوڑ دے اب یہ کھیل، تو کر لے میل میرے سنگ
مان لے اپنی ہار کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار"

اس نے پنڈولم کی طرح ڈولنا شروع کر دیا۔

"رخشندہ! یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ بُری طرح سیخ پا ہو گئی۔

رخشی ایک ڈھیٹوں کی چیمپئن واقع ہوئی تھی۔ مجال ہے جو اس پر کسی بات کا اثر ہو جائے۔ اس کے جذبات نے مزید ترقی کر لی۔ پنڈولم دائیں بائیں مزید شدّت سے لڑھکنے لگا۔

"میں کہہ رہی ہوں، تم ہوش میں آ رہی ہو یا نہیں؟" وہ سخت طیش میں بولی۔ اس کا خون بوائلنگ پوائنٹ پر پہنچ چکا تھا۔

دوسری جانب رخشی پر وجد طاری ہو چکا تھا۔ وہ ہوش و حواس سے بالکل ہی بیگانہ ہو چکی تھی۔ اس کو تو ناجیہ کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

"ایڈیٹ!" وہ اپنے تئیں اس کو جہنّم رسید کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی کتابیں اور بیگ اُٹھایا اور تیزی سے کلاس سے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

باہر نکل گئی۔

"سنو ناجیہ۔ رُکو تو پلیز۔" حواسوں میں آتے ہی رخشی اس کے پیچھے لپکی۔

○ ● ◆

ناجیہ اور رخشی دونوں میڈیکل کالج کی اسٹوڈنٹ تھیں۔ کالج ہی میں دونوں کی دوستی ہوئی تھی۔ مزاج میں خاصا تضاد ہونے کے باوجود دونوں کی دوستی وقت کے ساتھ پروان چڑھتی رہی۔ ناجیہ مغرور اور خودسر لڑکی تھی۔ بمشکل ہی کسی کو خاطر میں لاتی تھی، جبکہ رخشی خوش مزاج، بے تکلف اور پُرخلوص سی تھی۔

صمد آفریدی ان کا کلاس فیلو تھا اور شاید ناجیہ کا خاموش پرستار بھی۔ پتا نہیں کب، کون سے لمحے میں وہ اس کی نظر میں اُتری تھی۔ (پھر وہاں سے پھسل کر دل میں جا پڑی۔) مگر اس کا حصول صمد کو آسمان قدموں کے نیچے لانے کے برابر لگتا۔ اس کے پورے گروپ کی ناجیہ کے بارے میں رائے تھی کہ وہ دُور سے ہی اتنا زبردست کرنٹ مارتی ہے کہ پندرہ منٹ تک تو بندے کو پتا ہی نہیں چلتا ہے کہ وہ صحیح سلامت اسی دُنیا میں ہے یا عالمِ بالا کی جانب محوِ پرواز ہے۔

ناصر تو ہر وقت اسی پریشانی میں گُھلتا رہتا کہ آخر ناجیہ اپنے گلے میں ایک کھوپڑی اور دو ہڈیاں کیوں نہیں لٹکا لیتی۔ چلو یہ نہ کرے تو پُشت پر ڈینجر کا بورڈ ہی لگا لے۔ کم از کم اس طرح انسان بے خبری میں تو نہ مارا جائے۔

اگلے دن بھی صمد آفریدی غائب تھا اور رخشی حسبِ توفیق اپنی جگہ پر بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ حسبِ معمول اس کو فکر و پریشانی و تشویش جیسے امراض لاحق ہو چکے تھے۔

"سنو ناجیہ! صمد آج پھر نہیں آیا۔"

"اُف میرے اللہ!" ناجیہ نے سر پیٹ لیا۔

"پتا ہے، ناصر کہہ رہا تھا کہ وہ بہت بیمار ہے۔ جانے اس کو کیا ہو گیا۔" اپنے اچھے خاصے ہشاش بشاش چہرے سے اس نے یک لخت پریشانی ٹپکانی شروع کر دی۔

"تو میرا اس سے کیا تعلق۔ میں کیا کروں؟" ناجیہ بُری طرح چڑ گئی۔

"کچھ بھی کرو۔ مگر کرو ضرور۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"اب کیا جا کر اس کے سرہانے کھڑے ہو کر یٰسین شریف پڑھنا شروع کر دوں۔" وہ جل کر رہ گئی۔

"شٹ اَپ۔ میں پوچھتی ہوں آخر اس نے تمہارا بگاڑا کیا ہے۔ تم کیوں چاہتی ہو کہ وہ جوانی ہی میں دُنیا سے اُٹھ جائے؟" اس کا بس چلتا تو ناجیہ کو اس بات پر چبا ڈالتی۔ "بس میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آج ہم دونوں صمد کے گھر ضرور جائیں گے۔"

"وہ کس لیے؟" ناجیہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"اس کی عیادت کے لیے۔" رخشی قطعی لہجے میں بولی۔

"ہم اس کی عیادت کو کیوں جائیں؟"

"کیوں کا کیا سوال ہے؟ کسی کی عیادت کو جانا بُری بات ہے کیا اور پھر وہ ہمارا کلاس فیلو ہے، چار سال سے ہم اس کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔"

"محترمہ رخشی صاحبہ! جہانگیر بھی تو ہمارے ساتھ چار سال سے پڑھ رہا ہے۔ ابھی دو ماہ پہلے جب اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہ پلاسٹر چڑھائے پڑا رہا تو اس وقت تو آپ اسے دیکھنے نہیں گئی تھیں۔"

اور بس۔ اک ذرا سا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے کے مصداق رخشی ہتّے سے اُکھڑ گئی

"وہ خبیث، ذلیل انسان، میری جوتی بھی اس کو پوچھنے نہ جاتی۔ اس شخص کا بس چلے تو اپنی زہر میں بُجھی آنکھیں میرے چہرے پر ہی چپکا دے اور تم۔ تم اتنی اسٹوپڈ گرل کہ صمد جیسے باکردار و سلجھے ہوئے انسان کے ساتھ جہانگیر جیسے لُوز کریکٹر کے آدمی کو جوڑ رہی ہو۔ ہونہہ۔ کہاں زمین اور کہاں آسمان۔"

وہ طیش میں بولی تو بولے چلی گئی۔

پھر قدرے توقف کے بعد نرم لہجے میں بولی۔ "بہرحال یہ بات طے شدہ ہے کہ ہم صمد کی خیریت دریافت کرنے ضرور جائیں گے۔" اس کا ارادہ اٹل لگ رہا تھا۔

"چلی جانا خود ہی۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔" ناجیہ تنگ آ کر بولی۔

"تو تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گی۔" رخشی اسے گھورنے لگی۔

"ہرگز نہیں۔"

"دیکھتی ہوں کیسے نہیں جاؤ گی۔"

"کیا کر لو گی؟ کیا زبردستی گھسیٹتی ہوئی لے کر جاؤ گی؟" وہ تمسخر آمیز لہجے میں بولی۔

رخشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی کتاب کھول کر صفحے اُلٹ پلٹ کرنے لگی۔

ناجیہ بھی سر جھٹک کر دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔ چھٹی تک دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ ناجیہ کا مُنہ بنا رہا تو رخشی بھی مُنہ پُھلائے بیٹھی رہی۔

"میں گھر جا رہی ہوں۔ آج ڈرائیور کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ خود کار ڈرائیو کر کے لائی تھی۔ اگر تم نے چلنا ہو تو تم کو گھر ڈراپ کر دوں۔"

رخشی نے تو شاید گونگے کا گُڑ پھانک لیا تھا۔ ناچار ناجیہ نے ہی اسے مخاطب کیا۔

رخشی نے چند ثانیے اس کی سمت دیکھا۔

"چلو۔" وہ راضی ہو گئی۔ کتابیں اُٹھا کر اس کے ساتھ چلنے لگی۔

"تمہارا گھر تو کافی دُور ہے۔ شہر سے باہر نکل کر۔ اکیلی کیسے جاؤ گی۔"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ اس سے پہلے بھی جا چکی ہوں۔"

باتیں کرتے کرتے وہ پارکنگ ایریا تک پہنچیں۔ ناجیہ جُھک کر کار کا دروازہ کھولنے لگی۔ رخشی کی نظر برابر والی گاڑی میں بیٹھے ناصر پر پڑی جو اپنی کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی سر رضی کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

"السلام علیکم سر!" رخشی بیٹھتے بیٹھتے رُک گئی۔

"وعلیکم السلام۔" وہ خفیف سا مُسکرائے۔

"کیا بات ہے ناصر! کار اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے؟" وہ ناصر کی طرف متوجہ ہو گئی جس کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار واضح ہو رہے تھے۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ویسے آپ لوگ جا کہاں رہے ہیں؟" وہ یونہی پوچھ بیٹھی۔

"صمد کے گھر جا رہے ہیں۔ وہ بہت بیمار ہے۔ میں نے سوچا کہ ناصر کے ساتھ اس کے گھر ہو آؤں۔ اس کی خیریت دریافت کر لوں۔"

"سر! میں اور ناجیہ بھی صمد کے گھر جا رہے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ چلیے۔" اس نے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ پیشکش کر دی۔

ناجیہ ہکا بکا اس کا مُنہ دیکھتی رہ گئی۔ دوسری جانب ناصر نے جھٹکے سے گردن موڑ کر حیران نگاہوں سے ناجیہ کو دیکھا۔

"چلو۔ اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔" سر رضی نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے اس کی پیشکش قبول کر لی اور کار کی جانب لپکے۔

ناجیہ نے بمشکل اپنا غصّہ قابو میں کیا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔

ناصر اور سر رضی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گاڑی سبک رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

رخشی نے کن انکھیوں سے ناجیہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ آنکھوں میں سخت خفگی لیے، سنجیدگی و خاموشی کے ساتھ کار ڈرائیو کر رہی تھی۔ ناصر راستہ بتاتا جا رہا تھا۔

"ویسے سر آپ کو صمد سے کچھ خاص اُنسیت ہے۔" رخشی نے کار میں چھائی خاموشی ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

"بھئی، وہ بڑا نفیس لڑکا ہے۔ بہت بریلینٹ اسٹوڈنٹ ہے۔ میں واقعی اس کو بہت پسند کرتا ہوں۔"

"ناجیہ! بس یہیں روک لیجیے۔ یہ سفید گیٹ والا گھر ہے۔" ناصر نے کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ناجیہ نے گاڑی روک دی۔ سررضی ناصر کے ساتھ کھلے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ رخشی جان بوجھ کر پیچھے رہ گئی۔

"ناراض ہو مجھ سے؟" اس نے پہلے آیت الکرسی پڑھ کر ناجیہ پر زور سے دم کیا پھر ڈرتے ڈرتے قریب آ کر بولی۔

"بات مت کرو مجھ سے۔" ناجیہ تو اس کی چیر پھاڑ کو تیار تھی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" (اللہ رے معصومیت)

"ہونہہ!" وہ پاؤں پٹختی گیٹ میں گھس گئی۔

رخشی اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ اندر داخل ہوتے ہی صمد کے ابو مل گئے۔

"السلام علیکم انکل!" رخشی نے جھٹ سلام جھاڑ دیا۔ وہ ان سے پہلے بھی مل چکی تھی۔

"یہ ناجیہ ہیں!" اس نے تعارف کے مراحل طے کرائے۔

"آداب!" ناجیہ نے آہستگی سے کہا۔

"جیتی رہو۔"

"صمد کیسے ہیں؟" رخشی کو تو صمد کی پڑی ہوئی تھی۔ (ناجیہ نے دل ہی دل میں، فل اسپیڈ میں اُسے ڈھیروں صلواتوں سے نواز ڈالا۔)

"اب بہتر ہے۔ وہ سامنے والا کمرا اسی کا ہے۔" انہوں نے دائیں طرف اشارا کیا۔

"آؤ۔" رخشی اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"سُنو!" کمرے میں داخل ہونے سے قبل وہ رُک گئی۔

"اب کیا تکلیف ہے؟" ناجیہ نے تنک کر کہا۔

"ہمیں پھول لے کر آنے چاہیے تھے۔" رخشی کو نئی سوجھی۔

"اس کی قبر پر چڑھانے کے لیے۔" وہ بھنا کر بولی۔

"لعنت ہے تم پر۔ کبھی تو اس کے لیے اچھے الفاظ مُنہ سے نکال لیا کرو۔ تمہیں اتنا نہیں پتا کہ کسی مریض کی عیادت کو جاتے ہیں تو کوئی چھوٹا موٹا سا گلدستہ ساتھ لے کر جانا چاہیے۔ بڑا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ویسے اب ضرورت بھی نہیں ہے۔ گُل کا کیا کرنا ہے پورا گلشن چلا آ رہا ہے۔"

رخشی نے ناجیہ کو شوخی سے دیکھا اور غڑاپ سے اندر گھس گئی۔

ناجیہ اسے کوستی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی کمزور سا صمد بستر میں دھنسا ہوا تھا۔ ناجیہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے تحاشا حیرانی بھر گئی۔ جو فوراً ہی ناجیہ کے محسوسات تک پہنچ گئی۔ مگر اس نے اپنا چہرا بے تاثر ہی رکھا۔

رسمی طور پر مزاج پُرسی کے بعد وہ ایک کونے میں ٹک گئی۔

رخشی، سررضی کا خیال کر کے بمشکل اپنی زبان تالو سے چپٹائے بیٹھی رہی۔ ورنہ دل تو زبان سے پھلجھڑیاں چھوڑنے کے لیے مچلا جا رہا تھا۔

سررضی ہی اس سے اور اس کے والد سے گفتگو کر رہے تھے۔ ملازم نے سب کو کولڈ ڈرنک سرو کیا۔ جب وہ ناجیہ کے قریب پہنچا تو اس نے سر کے اشارے سے منع کر دیا۔

"لے لیجیے۔" ایک مدھم، سرسراتی ہوئی سی آواز اس کے کانوں میں اُتر گئی۔

بے ساختہ پلکیں اُٹھا کر اس نے صمد کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں اصرار سا تھا۔

"ارے لیتی کیوں نہیں؟" رخشی نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی اور ساتھ ہی اپنے پاؤں سے اس کا پاؤں کچل دیا۔

ناجیہ نے بڑی مشکل سے اپنے چہرے پر نمایاں ہونے والے تکلیف دہ تاثرات چھپائے۔ قہراً و جبراً ٹرے میں سے گلاس اُٹھا لیا اور ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئی۔

"خدا کی بندی! پی بھی لے۔ اس میں زہر نہیں ہے۔" رخشی ہنوز دانت پیسنے میں مصروف تھی۔

ناجیہ نے قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور نزاکت سے چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔

"اچھا صمد! بھئی اب ہم چلتے ہیں۔" سررضی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کی بات سنتے ہی ناجیہ اپنی جگہ سے یوں اُٹھی جیسے منتظر ہی ہو کہ کب سررضی کے مُنہ سے یہ جملہ نکلے اور وہ بندوق کی گولی بن کر جھٹ باہر نکل لے۔

"تھینک یو سر! آپ لوگوں نے بہت زحمت کی۔" صمد مشکور لہجے میں بولا۔

"ہم نے زحمت کی تبھی تو آپ پر رحمت نازل ہوئی۔" رخشی کو بھلا کہاں چین تھا، زبان پھسل ہی گئی۔

اس کے ذو معنی جملے کو اور سب تو سمجھ گئے پر سررضی حیرت سے بولے۔

"میں سمجھا نہیں رخشی، اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"وہ۔ سر! میرا مطلب ہے کہ۔" وہ بُری طرح بوکھلا گئی۔ "تچ۔ سر آخر آپ کو سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

"سر! ان کا مطلب ہے کہ مہمان رحمت ہوتے ہیں اور ہم رحمت بن کر آئے ہیں۔" ناصر نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

رخشی کا اٹکا سانس رواں ہو گیا۔ اس نے ناصر کو تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"اچھا ہاں۔ بالکل۔" سررضی ہنسنے لگے۔ "اچھا بیٹے! خدا آپ کو صحت دے۔"

"خدا حافظ سر۔ معذرت خواہ ہوں کہ آپ لوگوں کو چھوڑنے گیٹ تک نہیں جا سکتا۔"

"ارے نہیں بھئی، تم لیٹے رہو۔ آرام کرو۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور باہر نکل گئے۔

"تھینکس اے لاٹ۔" ناجیہ بیڈ کے قریب سے گزری تو کوئی ہولے سے بولا تھا۔ اس کا دل ٹھٹک گیا مگر قدم نہیں ٹھٹکے، نہ ہی اس نے مڑ کر دیکھا۔ سب کے ساتھ وہ بھی باہر نکل گئی۔

صمد اس صوفے کو دیکھتا رہ گیا جس پر کچھ دیر قبل ناجیہ بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ جا چکی تھی مگر اپنا احساس چھوڑ گئی تھی۔

○ ● ◆

دن مہینوں میں اور مہینے سال میں بدلتے گئے۔ اس پورے عرصے میں صمد، ناجیہ کے حصول کی خواہش کو پروان چڑھاتا رہا۔ امتحانوں کی تیاری کے سلسلے میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ وہ آخری دن تھا جب صمد نے سامنے سے آتی رخشی اور ناجیہ کو روک لیا۔

"مس خان!"

"جی!" وہ رُک گئی۔

رخشی کو بھی عین اسی وقت یاد آیا کہ وہ اپنا ادوراِل ثمرین کو دے آئی ہے اور اس سے لینا بھول گئی۔ وہ ناجیہ کو چھوڑ چھاڑ فوراً ہی رفوچکر ہو گئی۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ قریب آ گیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں آپ ہی کی طرف متوجہ ہوں۔ کہیے، میں سن رہی ہوں۔" اس کے انداز میں تمکنت تھی اور لہجے میں خود اعتمادی۔

"جو بات میں آپ سے کہنے والا ہوں، وہ میری لمحوں کی سوچ کا نتیجہ نہیں ہے۔ میں نے بہت عرصے اس پر غور و خوض کیا ہے اور خود کو ہر لحاظ سے بہت مخلص پایا ہے۔"

وہ رُک گیا پھر قدرے توقف کے بعد آہستہ سے بولا۔ "آپ کے لیے۔"

ناجیہ نے اپنی کشادہ آنکھیں پوری طرح کھول کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے نیلگوں آسمان پر اُڑتے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔

پھر ایک گہرا سانس لے کر گویا ہوا۔

"ناجیہ! میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"مسٹر آفریدی۔ آپ ہوش میں تو ہیں۔" وہ ایک دم ہی طیش میں آ گئی۔

"میرا خیال ہے کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ جس سے یہ تاثر ملے کہ میں بے ہوشی کے عالم میں ہوں۔" وہ سنجیدگی سے مسکرایا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"دیکھیے ناجیہ! آپ کے ساتھ پڑھتے ہوئے تین سال ہو گئے۔ میری طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جو میرے کردار کو آپ کی نظر میں مشکوک بناتی۔ میں خود بھی ٹھوس اور مضبوط آدمی ہوں۔ فضول قسم کی باتوں کا قائل نہیں ہوں۔"

ناجیہ کا دل ایک دم ہی اس کی صداقت کا گواہ بن کر دھڑکنے لگا۔

"میرے والد آپ کے والدین سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں روایتی مراحل سے گزرنے کے بعد ہی آپ کو اپنانا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے کی شائستگی اور نپے تلے لفظوں نے ناجیہ کی زبان بند کر دی۔

بہت سے لمحے خاموش گزر گئے۔

"میں آپ کو سوچ کر جواب دوں گی۔"

"کب تک جواب دیں گی؟"

"آپ کتنا انتظار کر سکتے ہیں؟"

"جتنا آپ کہیں۔"

"اور جو میں کہوں کہ دس سال تو پھر؟" اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آئی۔

"صرف دس سال۔" وہ ہنس پڑا۔ "او کے۔ میں دس سال کے بعد بھی آپ کو احساس کے اسی موڑ پر کھڑا ملوں گا، جہاں آج کھڑا ہوں۔ خدا حافظ۔" وہ نرم لہجے کی پھوار میں بھیگے جملے اس کے کانوں تک منتقل کر کے مخالف سمت چل پڑا۔

ناجیہ اس کی پشت دیکھتی رہی۔ سیاہ پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا۔

"صمد!" وہ بے ساختہ آواز دے کر زندگی کو ایک نیا رُخ دے بیٹھی۔

وہی ایک لمحہ ایک نئے راستے کا نشان بن گیا۔

اک نئی زندگی کا نقطۂ آغاز۔

صمد نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دم بخود سی اپنی جگہ کھڑی تھی۔ شاید خود اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اسے یوں پکارے گی۔

دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

ایک کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

تو دوسرا ساری جان کو کان بنائے کھڑا تھا۔

"میرے ڈیڈی چھ بجے کے بعد عموماً گھر پر ہی ہوتے ہیں۔" اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔

ایک طمانیت سی صمد کے سارے وجود میں اتر گئی۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر، سر کے خفیف اشارے سے خدا حافظ کہتا ہوا وہ اپنی راہ پر ہو لیا۔

ناجیہ اسے دُور جاتا دیکھتی رہی۔ جانے کیوں دل کہہ رہا تھا کہ وہ بہت مخلص، بہت چاہنے والا ثابت ہوگا۔

پیچھے سے رخشی نے آکر اس زور کا اس کی کمر پر ہاتھ رسید کیا کہ وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچی۔

"رخشی! تمہارے ہاتھ بہت چلتے ہیں۔" وہ تلملا کر رہ گئی۔

"کل سے تہ کر کے بیگ میں ڈال لیا کروں گی۔" بھلا ڈھٹائی میں رخشی کا کیا مقابلہ۔

"یہ تو بتاؤ تم دفع کہاں ہو گئی تھیں؟"

"بھئی میں تو کوریڈور کے دوسرے سرے پر کھڑی ہوئی تھی۔ یہیں قریب ہی۔ مگر صرف تصویر آ رہی تھی۔ آواز نہیں آ رہی تھی۔ کیا سرگوشیوں میں راز و نیاز کر رہے تھے؟" وہ سرگوشی میں بولی۔

"شٹ اپ!" اس نے بہت چاہا کہ اپنی مسکراہٹ چھپا لے مگر آنکھیں مسکرا پڑیں۔

بس جی پھر تو رخشی اس کے سر ہو گئی۔ "جلدی سے الف سے یے تک ساری بات مفصل، زیر زبر پیش کے ساتھ میرے گوش گزار کر دو۔"

اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح پیچھا چھڑا لے۔ مگر توبہ جی۔ رخشی تو جان کو چمٹ جانے والی بلا تھی۔

بالآخر تنگ آکر اس نے بتا دیا۔

"اوہ!" وہ شریر نظروں سے دیکھنے لگی۔ "ارے مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ تم اس پر پہلے ہی دن ریشہ خطمی ہو گئی تھیں۔ بس اِترانے ہی سے فرصت نہیں تھی محترمہ کو۔ نخروں میں رہتی تھیں۔ اندر ہی اندر مرتی تھیں۔"

"خیر تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اب بھی فیصلہ ڈیڈی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کہیں تو ہاں اور وہ کہیں تو ناں۔" وہ بے نیازی سے کندھے اُچکا کر بولی۔

"اوہ میرے خدا!" رخشی کا جی چاہا سر پھوڑ لے اپنا۔ یہ لڑکی وہیں کی وہیں ہے۔

"چلو، میری عقل پر ماتم کبھی فرصت سے کرنا۔" ناجیہ اس کا ہاتھ تھام کر گھسیٹتی ہوئی لے گئی۔

○ ● ◆

صمد وعدے کے مطابق اپنے والد کو لے کر جلد ہی "پناہ گاہ" پہنچ گیا۔

اس دن موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ناجیہ موسم کا لطف اٹھانے کے لیے باہر لان میں چلی آئی۔ اس کی گود میں سب سے بڑی بھابی کا شہیر تھا۔ ابھی کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ احمد آفریدی صاحب آئے ہیں۔ ساتھ ہی اسے وزیٹنگ کارڈ بھی تھما دیا۔

"اوہ!" اس کا دل زور سے دھڑکا۔

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور ڈیڈی کو اطلاع کر دو۔" ابھی وہ کہہ ہی رہی تھی کہ احمد آفریدی اور صمد چوکیدار کے ہمراہ وہیں آ گئے۔

ناجیہ کے ہاتھ بے ساختہ اُٹھے اور اس نے آسمانی آنچل سے سر ڈھانپ لیا۔

"آداب!"

"خوش رہو۔" ان کے چہرے پر شفقت بھری مسکراہٹ تھی۔

"السلام علیکم۔" وہ صمد کی طرف منہ کر کے منمنائی۔

"وعلیکم السلام۔" وہ بھی دیوار کی طرف منہ کر کے جواباً منمنایا۔

اس نے ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود باہر نکل گئی۔ ملازم نے سیّد صاحب کو اطلاع کر دی تھی۔ ناجیہ نے ان کو اور ان کے پیچھے بڑے بھیا اور آغا بھائی کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ سیدھی اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔

شاید وہ اس وقت تنہائی میں بیٹھ کر کچھ سوچنا چاہتی تھی۔

دوسری جانب سیّد صاحب اور احمد آفریدی میں باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد احمد آفریدی جب اپنا مدعا زبان پر لائے تو سیّد صاحب سُن کر ایک دم خاموش ہو گئے۔ بے حد گہری نظروں سے انہوں نے صمد کا جائزہ لیا پھر قدرے توقف کے بعد گویا ہوئے۔

"ہم اس سلسلے میں آپ کو سوچ کر جواب دیں گے۔"

"ضرور۔ ہمیں کوئی اعتراض ہے نہ جلدی۔" احمد صاحب خوش دلی سے بولے۔

کچھ ہی دیر میں ان لوگوں نے اجازت چاہی۔ آغا بھائی اور بڑے بھیا ان کو گیٹ تک چھوڑنے گئے۔ وہ تو رخصت ہو گئے مگر "پناہ گاہ" میں بھونچال آ گیا۔

بڑے بھیا کی بیگم تیزی سے اس کے کمرے میں آئیں۔

"ناجیہ!"

"جی بھابی جان!" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تمہیں ڈیڈی نے بلایا ہے۔" وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔ مگر تم جلدی سے آ جاؤ۔"

وہ جس رفتار سے آئی تھیں اس سے دوگنی رفتار سے باہر نکل گئیں۔ وہ اُلجھی اُلجھی سی سیّد صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ان کے کمرے میں اس کی والدہ اور دونوں بڑے بھائی بھی موجود تھے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ڈیڈی! آپ نے مجھے بلوایا ہے؟" اس نے اپنا لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

"ناجیہ! یہ صمد کون ہے؟" ان کی آواز اگرچہ نرم تھی مگر لہجے کی کاٹ کو اس نے صاف محسوس کیا۔

"میرے ساتھ پڑھتے تھے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"جانتی ہو وہ اور اس کے والد آئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"یہ بھی جانتی ہو گی کہ کیوں آئے تھے؟" وہ معنی خیزی سے بولے۔

"جی ہاں۔"

"ہوں۔ تو اس کا مطلب ہے کہ تم دونوں میں پہلے ہی عہد و پیمان ہو چکے تھے۔"

"ڈیڈی!" حیرت کے مارے ناجیہ کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

"میں نے تمہیں کالج میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے بھیجا تھا یا محبت کے سبق پڑھنے؟"

"ڈیڈی!" وہ چیخی۔ اس نے ایک نظر اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ بڑی بے بسی سے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"ڈیڈی آپ کو پتا نہیں چل رہا ہے کہ غصے میں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" آغا بھائی، بہن کے لیے ایسی بات برداشت نہ کر سکے۔ بے ساختہ بول اٹھے۔

سچی بات تو یہ تھی کہ سوبر اور سنجیدہ سا صمد اس کے بھائیوں کو بہت پسند آیا تھا۔ مگر ڈیڈی۔۔۔ اور آخری فیصلہ تو ڈیڈی ہی کو کرنا تھا۔

"تم سے دخل دینے کو کس نے کہا ہے۔ خاموش بیٹھو۔ ورنہ اس کمرے سے جا سکتے ہو۔" ان کا فطری جلال بول رہا تھا۔

"ناجیہ!" وہ غضبناک انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ "ابھی ہمارے ہاں بے راہ روی اس قدر بھی نہیں آئی کہ بیٹیوں کو اس حد تک کھلی چھوٹ دی جا سکے کہ وہ خود لڑکا پسند کر کے والدین کے روبرو لا کر کھڑا کر دیں۔ یہ کس راستے پر تمہارا قدم جا پڑا تھا۔"

"ڈیڈی! خدا کے لیے۔ آپ کی زبان سے یہ الفاظ زیب نہیں دے رہے۔" وہ رو دینے کے قریب تھی۔ "میں نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس کی وجہ سے آج میں آپ کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہ کر سکوں۔ صمد بے حد نفیس انسان ہیں۔ انہوں نے انتہائی شریفانہ انداز میں رشتہ مانگا ہے۔ دنیا کا دستور یہی ہے۔"

"بہرحال!" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہارے لیے بس اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ ہمیں اس رشتے سے انکار ہے۔"

"مگر کیوں؟" اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"ہم تمہارے اس کیوں کا جواب دینے کے پابند نہیں ہیں۔" وہ غرا کر بولے۔ "بیٹوں کی شادیاں اپنی مرضی سے کی ہیں تو بیٹی کو من مانی کرنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ کان کھول کر سن لو کہ ہمیں اپنی عزت، اپنے وقار اور اپنی شان کے منافی کوئی کام کرنے کی عادت نہیں ہے۔ تھرڈ کلاس لڑکوں کی طرح کالج میں رومانس لڑانے والا لڑکا سید وجاہت علی خان کا داماد نہیں بن سکتا۔ اور ویسے بھی ہم تمہارے لیے رشتہ تلاش کر چکے ہیں۔ تمہاری شادی وہیں ہو گی، جہاں ہم کہیں گے۔ یہ ہماری ضد ہے۔"

"ڈیڈی پلیز! مجھے غلط نہ سمجھیں، کیا آپ کو اپنے خون پر اعتماد نہیں ہے؟"

"ناجیہ! تم بے حد بدتمیز ہو گئی ہو۔" وہ دھاڑے۔

"ڈیڈی! آپ کی ضد بے وجہ ہے۔" اس کا لہجہ قدرے پست ہو گیا۔

"خاموش رہو۔ ہم تمہارے لیے جو کچھ کریں گے، وہ تمہارے بھلے کے لیے ہی کریں گے۔ بس ایک بار جو کہہ دیا کہ نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ کبھی نہیں۔ تمہیں غلط راستوں پر قدم رکھنے کی سزا ملنی چاہیے۔"

"ڈیڈی! خدا گواہ ہے کہ میں نے صمد کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر اب سوائے اس کے مجھے ہر رشتے سے انکار ہے۔" وہ ایک دم مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

اس کے اس رویے نے سید صاحب کے غصے کو آسمان پر پہنچا دیا۔ انہوں نے اگلے ہی دن صمد کے والد کو اس طرح

واضح اور دو ٹوک انکار کیا کہ مزید کسی پیش قدمی کی گنجائش نہ رہی۔

صمد کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ صورتِ حال یہ ہو جائے گی۔

ابھی تو اس نے ناجیہ کے خوش کن تصور کو ذہن میں بسایا بھی نہ تھا کہ اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوب گیا۔

"پناہ گاہ" کی فضا سخت کشیدہ ہو گئی۔ سید صاحب، ناجیہ کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔

ناجیہ نے خود کو بس کمرے تک محدود کر لیا تھا۔ کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تھا۔

اس کی امی اور بھائی اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے۔ باپ بیٹی دونوں اپنی ضد پر چٹان کی طرح قائم تھے۔ جسے ایک انچ بھی ہلانا دشوار بلکہ ناممکن نظر آ رہا تھا۔ سید صاحب سے تو بات کرنا سالم ہی شیر کے منہ میں گھس جانے کے برابر تھا۔ انہوں نے ناجیہ ہی کو قائل کرنا چاہا کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دے مگر وہ ٹس سے مس ہونے کو تیار نہ تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر اس کی امی نے سکندر رضا کو بلوا لیا۔ وہ سید صاحب کے دیرینہ دوست تھے۔ پناہ گاہ کی کوئی ایسی بات نہ تھی، جس سے وہ واقف نہ ہوں۔ اگر سید صاحب کے رویے میں لچک پیدا ہو سکتی تھی تو یہ کام سکندر رضا ہی کر سکتے تھے۔

مگر سید صاحب نے سرے سے ان کی بات ہی سننے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف صمد سخت ڈیپریشن کا شکار تھا۔ چپ چاپ۔ گم صم۔

جیسے کہیں کھو گیا ہو۔

اور اپنے آپ کو ڈھونڈنا بھی نہ چاہ رہا ہو۔

اس کی یہ کیفیت احمد آفریدی کے لیے سخت پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ انہیں اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ بے حد سعادت مند اور فرمانبردار۔ نہ کوئی ضد نہ فرمائش۔ انہیں یاد آیا جب وہ ناجیہ کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے ان کے کمرے میں آیا تھا۔

"ابو! آپ مصروف ہیں؟" وہ کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔

"بالکل نہیں، آ جاؤ۔" انہوں نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔

وہ ان کے قریب آ کر تو بیٹھ گیا پھر کچھ بولا نہیں۔ جانے کس سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا بات ہے، مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ٹھہریے ابو! ذرا مجھے مناسب الفاظ سوچ لینے دیجیے۔" وہ بے حد سادگی سے بولا۔

احمد آفریدی بے ساختہ ہنس پڑے۔ "میرے بیٹے! تم میرا فخر ہو۔ تم جیسی لحاظ والی اور فرمانبردار اولاد سب کی ہو۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے، مجھ سے بلا جھجک کہو۔ بیٹا بن کر نہیں دوست بن کر کہو۔"

"ابو! دراصل میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کے علم میں یہ لاؤں کہ کس سے کرنا چاہتا ہوں میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ کی رضا اور خوشی میرے لیے مقدم ہے۔ اگر آپ میرے لیے کوئی اور فیصلہ کر چکے ہیں تو مجھے اس سے انکار نہیں میں خوشدلی سے اسے قبول کر لوں گا۔"

"میرے بچے! تمہاری خوشی میں تو میرا سکون مضمر ہے۔ تمہاری خواہش میری خوشی ہے۔ میں تمہاری شادی وہیں کروں گا، جہاں تم چاہو گے۔" پھر وہ لہجہ بدل کر شوخی سے بولے۔ "اچھا تو پھر چلیں لڑکی والوں کے ہاں۔ میرے کپڑے ٹھیک ہیں؟"

"ابو!" صمد مسکرانے لگا۔

"کون ہے وہ؟"

وہ انہیں ناجیہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

○ ● ◆

زندگی جیسے کسی کانٹوں بھری جھاڑی میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

ناجیہ شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھی۔ ہر وقت وجود میں غم و غصے کے ابال اٹھتے رہتے۔

اسے دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ اس کے باپ نے صمد کے رشتے کو انکار کر دیا تھا۔ غم تو اس بات کا تھا کہ اس کی ذات

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کو ناقابلِ اعتبار جانا تھا۔ اس پر شک کیا تھا خود اُسے اس کی نگاہوں میں حقیر کر دیا تھا۔

"یہ کیا کیا ڈیڈی آپ نے؟ یہ سب کچھ کیوں کہا؟" اُس نے بڑے دُکھ سے سوچا۔ جب آپ کو میری ذات پر اعتبار ہی نہ رہا تو پھر میرے پاس بچا ہی کیا؟ کس بات کے زعم میں مبتلا رہتی ہیں؟

ڈیڈی! آپ نے مجھے کیسے زمین پر پٹخ دیا۔ میں تو آسمانوں پہ پائی جانے والی لڑکی تھی۔ آپ نے کس طرح میرے وجود کو دو کوڑی کا کر دیا۔ اب تو گھن آنے لگی اپنے وجود سے۔ نفرت سی ہو گئی ہے۔

اتنی ذلت — اتنی تحقیر؟

وہ بھی اپنی بیٹی کی — اکلوتی بیٹی کی؟

ڈیڈی! بڑا مان تھا مجھے آپ پر۔ آپ نے تو سارے بھرم محض چند لفظوں سے توڑ ڈالے۔ کاش آپ نے مجھ سے وہ سب کچھ نہ کہا ہوتا۔ میں آپ کی خواہش پر ایسے ہزاروں صمد قربان کر دیتی۔

مگر اب آپ کی ضد میری عزتِ نفس کا عوض بن جائے۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ جتنا آپ کی ضد زور پکڑتی جا رہی ہے۔ اتنی ہی میری ضد بھی پختہ ہوتی جا رہی ہے۔ آپ اپنی انا کی تسکین کے لیے مجھے داؤ پر لگانا چاہ رہے ہیں، مجھے یہ سودا منظور نہیں۔ میں شادی ہر قیمت پر صمد ہی سے کروں گی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔" اس کی سوچ کا رُخ یکایک جارحانہ ہو گیا۔

وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

دراصل غم و غصّے کی اس کیفیت نے اس کے اعصاب کو بالکل توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ اس ذہنی انتشار سے تھک گئی تھی اور کسی نتیجے پر پہنچنا چاہ رہی تھی۔

اپنے اور اپنے باپ کے درمیان شروع ہونے والی اس سرد جنگ کا خاتمہ چاہ رہی تھی۔

اپنی جیت کی صورت میں۔

دل و دماغ جس نتیجے پر پہنچنا چاہ رہے تھے، اس کے لیے اُسے پُل صراط کا سفر طے کرنا تھا۔

اور پھر اپنی انا اور ضد کے سائے تلے خود سری اور ہٹ دھرمی کا ہاتھ تھام کر وہ پُل صراط پر سے گزر گئی۔

اس کے ساتھ ہی زمین آسمان اس کے اور اس کے باپ کے درمیان حائل ہو گئے۔

"ڈیڈی آپ نے مجھے کھو دیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

○ ● ◆

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

صمد اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا منتظر تھا کہ کوئی اور فون ریسیو کر لے۔ کافی دیر گزر گئی اور گھنٹی بھی ثابت قدمی سے بجتی رہی تو مجبوراً اُسے اُٹھنا پڑا۔

"ہیلو۔"

"صمد! میں ناجیہ بول رہی ہوں۔"

"اوہ!" وہ اسی کے بارے میں تو سوچ رہا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ گہرا سانس لے کر گویا ہوا۔

"زندہ ہوں اور زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ بھرپور طریقے سے۔"

"کیسے یاد کر لیا آپ نے؟" اُس کی آواز بے حد آہستہ تھی۔

"میں صرف آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔"

"میں جو چاہتا تھا وہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔" وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"چاہتے تھے یا اب بھی چاہتے ہیں؟"

"فرض کر لیجیے کہ میں اب بھی چاہتا ہوں تو پھر —؟ بھلا اب ہو بھی کیا سکتا ہے؟" وہ بڑی آزردگی سے کہہ رہا تھا۔ "میں اور آپ الگ الگ راستوں کے مسافر ہیں۔ جب راستے ہی الگ الگ ہیں تو منزل کیسے ایک ہو سکتی ہے۔ سوچا تھا کہ آپ کی سنگت میں زندگی خوشگوار طریقے سے کٹ جائے گی۔ آپ کو اپنے گھر میں تو آباد کر نہیں سکتا۔ تصور میں ہی آباد کر کے خوش ہو لیتا ہوں۔"

"صمد! میں نے پناہ گاہ اور اس کے رہنے والوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"ناجیہ!" صمد ساکت رہ گیا۔

"اب مجھے آپ کا تحفظ اور مضبوط پناہ چاہیے، چھاؤں چاہیے۔ بولیے۔ چُپ کیوں ہیں آپ؟ صرف ایک لفظ ہاں یا ناں۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"میری طرف سے تو کل بھی ہاں تھی، آج بھی ہے۔ مگر ناجیہ میں نہیں چاہوں گا کہ آگے جا کر پچھتاوے کا کوئی لمحہ آپ کی زندگی میں آ کر ٹھہر جائے۔ اس کے بعد آپ پلٹنا چاہیں تو آپ کے پیچھے ہر راستہ بند ہو۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا۔

"مگر یہ دروازے تو میں خود بند کر رہی ہوں صمد! مجھے ابھی جواب چاہیے اگر آپ اس بات کو یہیں ختم کرنا چاہ رہے ہیں تو کوئی بات نہیں، میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔"

"ناجیہ! آپ میری وہ آرزو ہیں جسے میں حسرت بننے دینا نہیں چاہتا۔ میں اپنی زندگی کی بقا کے لیے آپ کی زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔"

اپنے مضبوط ارادے اس پر آشکار کر کے اُس نے ناجیہ کی تقدیر پر اپنے نام کی مہر لگا دی اور اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

○ ● ◆

وہ ایک سانولی سی اُداسی میں ڈوبی شام تھی۔ ناجیہ، صمد کے گھر کے ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔

صمد پریشانی کے عالم میں کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ گاہے بگاہے ایک نظر سسکیاں بھرتی ناجیہ پر بھی ڈال لیتا تھا۔

"اتنا مت روؤ ناجیہ! کہ تمہارے آنسو مجھے پچھتاوا لگنے لگیں۔" وہ بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو، میری بات سُنو، تمہیں کسی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہیے تم میری بیوی ہو، میری پناہ میں ہو۔ میں تم کو وہ سب کچھ دوں گا، جس کی عورت اپنے شوہر سے توقع کرتی ہے۔ عزت، اعتبار، مان، محبت۔ سب کچھ دوں گا۔ خدا کے واسطے اس طرح نہ روؤ کہ میں خود کو ظالم سمجھنے لگوں۔ پلیز چُپ ہو جاؤ۔" وہ اس سے التجا کر رہا تھا۔

"صمد!" وہ آنسوؤں کے درمیان بولی۔

"جی!" وہ اُس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"ڈیڈی مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"کر دیں گے۔" وہ اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ "کوئی بھی باپ اتنا سنگدل اور کٹھور نہیں ہو سکتا۔ ہم ان سے معافی مانگ لیں گے۔ میں خود تم کو پناہ گاہ لے جاؤں گا۔ کل ہی چلیں گے ہم۔" اُس نے ناجیہ کو تسلی دی۔

"پرامس!" وہ آنسو — بھری آنکھیں پوری طرح کھول کر بولی۔

صمد بے ساختہ مسکرا دیا۔ "پرامس!"

مگر پناہ گاہ جانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس سے پہلے ہی اسے اطلاع مل گئی کہ سید صاحب نے اسے عاق کر دیا ہے۔ پناہ گاہ میں داخلہ تو کجا اس کا نام لینا بھی ممنوع قرار پایا ہے۔

شادی کے اوّلین دن، جب اسے خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولنا تھا۔ وہ دُکھوں کے سمندر میں ڈوب گئی۔ اُسے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔

احمد آفریدی اور صمد دونوں ہی سید صاحب سے مصالحت کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔

مگر بے سود۔

ناجیہ نے سید صاحب کی عزت اور اُن کے وقار کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا تھا۔ وہ اُسے کسی قیمت پر بھی معاف کرنے کو تیار نہ تھے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وہ لرزتے ہاتھوں سے پناہ گاہ کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ جونہی دوسری جانب بیل ہوئی، اُس نے فون رخشی کے ہاتھ میں دے دیا۔

"ہیلو! کیا میں بیگم سید سے بات کر سکتی ہوں؟"

"جی — جی میرا نام رخشندہ ہے۔" پھر اُس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ناجیہ سے کہا۔ "آ رہی ہیں تمہاری امّی —"

اُس نے اس کے ہاتھ سے فون جھپٹ لیا۔

"ہیلو — ہیلو امّی جان!"

دوسری جانب ایک دم ہی خاموشی چھا گئی۔

"امّی پلیز! میری بات تو سُن لیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"کہو، مَیں سن رہی ہوں۔"

"امّی! مَیں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"یہ ناممکن ہے اب۔"

"خدا کے واسطے امّی! آپ تو مجھ پر اپنے دروازے بند نہ کریں۔ مجھے اپنے پاس آنے دیں۔ مَیں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے ڈیڈی نے تم پر اس گھر کے دروازے بند کر دیے ہیں۔"

"تو آپ مجھ سے ملنے آ جائیں، مَیں ترس رہی ہوں آپ کے لیے۔" وہ بلک بلک کر رو دی۔

بیگم سید کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہنے لگے۔ سینے میں ممتا بھرا دل رکھتی تھیں، کوئی پتھر کا ٹکڑا تو نہیں۔

"بیٹا! تیرے ڈیڈی کا کہنا ہے کہ اگر مَیں نے یا تیرے بھائیوں نے تجھ سے ملنے کی کوشش کی تو وہ مجھے طلاق دے دیں گے اور بیٹوں کو عاق کر دیں گے۔"

ناجیہ کی سسکیوں میں اضافہ ہو گیا۔

"یہ تُو نے کیا کر دیا ناجیہ، تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کس سے ٹکّر لے لی؟ کیا اپنے باپ کو جانتی نہیں تھی؟ اس پتھر سے ٹکرانے والا تو خود پاش پاش ہو جاتا ہے اور پھر تجھے اپنے باپ کی عزّت سے کھیل کر کیا مل گیا؟ کیا صمد تیرے باپ کی عزّت سے بڑھ کر تھا؟"

"امّی میری زندگی، میرے باپ کی ضد اور انا سے بڑھ کر تھی۔ امّی آپ مجھے معاف کر دیں۔"

"میرے معاف کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو کبھی بھی اس گھر میں داخل نہ ہو سکے گی۔"

"خدا کے لیے ایسا نہ کہیے۔ مَیں مر جاؤں گی۔ مجھے بتائیے مَیں کیا کروں؟"

"اب تو جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ تم اپنے گھر میں خوش رہو اور ہمیں بھول جاؤ۔ مَیں تمہاری ماں ہوں، ساری عمر تمہارے لیے دُعا کرتی رہوں گی۔ خدا تمہیں سُکھی رکھے۔" انہوں نے جلدی سے فون رکھ دیا۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے کو تھا۔

وہ امّی — امّی کرتی ہی رہ گئی۔

◆ ● ☾

زندگی رفتہ رفتہ اپنی ڈگر پر آ گئی۔ پانچ طویل برس گزر گئے۔ پناہ گاہ ناجیہ کو فراموش کر چکا تھا مگر کونے کھدروں میں وہ آج بھی زندہ تھی، جیسے بھائیوں کے دلوں میں۔ جو کبھی کبھار اس کی خیریت دریافت کر لیتے تھے۔ اپنی ماں کے مرنے کے بعد ناجیہ نے پاکستان چھوڑ دیا تھا اور صمد کے ساتھ لندن آ گئی تھی۔

شادی کے ڈیڑھ برس کے بعد اُس نے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ بیٹے کو پا کر اُس نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ خود کو اس کی ذات میں گم کر دیا تھا۔

احمد آفریدی کی ماربل کی مصنوعات بنانے کی فیکٹری تھی۔ اُن کی خواہش تھی کہ صمد ان کے بزنس میں ان کا ہاتھ بٹائے مگر صمد انٹرسٹڈ نہیں تھا۔ اس کی طبیعت کا میلان دیکھتے ہوئے انہوں نے صمد کو میڈیکل جوائن کرنے کی اجازت دے دی۔ اب وہ اسپیشلائزیشن کے بعد کینسر پر ریسرچ کر رہا تھا۔ اُس نے ثابت کر دیا تھا کہ اُس نے سچے دل سے ناجیہ کی خواہش کی تھی، مگر کبھی کبھی وہ بے حد افسردگی سے کہتا۔

"ناجیہ! ایک پھانس سی میرے دل میں چبھتی رہتی ہے کہ مَیں تمہیں تمہارے گھر والوں سے دُور کرنے کا ذمّے دار

ہوں۔"

"آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں سو لیے آپ نے مجھے اُن سے دور نہیں کیا مَیں نے خود ان لوگوں کو چھوڑ دیا۔"

"تمہیں وہ لوگ یاد تو آتے ہوں گے؟"

"ہاں بہت زیادہ، ماں باپ بھی کہیں بھلائے جا سکتے ہیں۔" وہ سر جُھکا کر اعتراف کرتی۔

"پھر؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھتا۔

"پھر کیا پھر —" اُس کی آنکھیں شوخ ہو جاتیں۔ پھر قدرے سنجیدگی سے کہتی "۔ آپ کی محبّت نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ فتح کر لیا ہے مجھے۔ آپ میرے ہیں، میرے پاس ہیں۔ یہ احساس میرا اثاثہ ہے۔ آپ نے مجھے کبھی بھی پچھتانے کا موقع نہیں دیا۔ مَیں آپ کی احسان مند ہوں۔ مَیں نے بہت کچھ کھویا، مگر اس کے بدلے جو کچھ پایا ہے وہ کھونے سے کہیں زیادہ ہے۔ مَیں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی آپ کے بل پر جیت لی۔ آئی ایم پراؤڈ آف یُو صمد! ناؤ یُو آر ایوری تھنگ ٹو می۔"

"اسٹوپڈ گرل۔ تم خوامخواہ جذباتی ہو جاتی ہو۔ مجھے تمہاری قربانیوں کا پورا پورا احساس ہے۔ مَیں کوشش کروں گا کہ تمہیں زندگی کی ہر خوشی دے سکوں۔ میرا جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے۔" وہ نرم گرم جذبوں کے ساتھ کہتا تو وہ فخر کے احساس سے چُور ہو جاتی۔

مگر وہ دونوں زیادہ دور ساتھ نہ چل سکے۔

شاید سیّد صاحب کی بد دُعا تھی یا پھر ناجیہ کو خدا نے ہی نافرمانی کی سزا دی۔

صمد نے تو اپنے خیال میں اپنی زندگی کی ڈور اُس کی زندگی کی ڈور سے بہت مضبوط باندھی تھی۔

بہت ساری گرہیں لگائی تھیں۔

مگر تقدیر نے بس ذرا سا جھٹکا دیا اور ساری گرہیں ٹوٹ گئیں۔

ناجیہ، صمد سے بہت دور چلی گئی۔

دوسرے بچّے کی پیدائش پر اُس کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ بچّہ، پیدا ہونے سے قبل ہی مر گیا اور وہ خود بھی زندگی کا ساحل چھوڑ کر موت کے بھنور میں پھنس گئی تھی۔

"سوری صمد! مَیں آپ کو دوسرا بچّہ نہ دے سکی۔" اُس کی سانسیں ٹوٹ رہی تھیں۔ صمد سخت پریشانی کے عالم میں اس کے پاس ٹھہرا تھا۔

"کوئی بات نہیں تم بالکل پریشان نہ ہو، بس جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔" اُس نے ناجیہ کا ہاتھ تھپتھپا کر تسلّی دی۔

"آپ کہتے تھے ناں کہ مجھے اتنے بچّے چاہئیں کہ جب مَیں گھر میں داخل ہوں تو مجھے اپنا گھر، گھر نہیں اسکول لگے۔"

"مت بولو اتنا۔ کیوں تردد کر رہی ہو، اللہ اور دے گا۔" جانے کیوں صمد کا دل بُری طرح گھبرا رہا تھا۔

"کیسے دے دے گا مجھے سامنے اپنی موت نظر آ رہی ہے۔ صمد میں مرنا نہیں چاہتی۔ عورت کے اندر جینے کی خواہش اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب اُس کے ہاں اولاد پیدا ہو جاتی ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں، نہال کے لیے، اپنے بچّے کے لیے۔ کاش مجھے تھوڑی سی زندگی اور مل جاتی۔ میرا نہال میرے قد کے برابر تو ہو ہی جاتا۔"

"مایوسی کی باتیں مت کرو، تم زندہ رہو گی، میرے لیے، نہال کے لیے۔ تم ہم دونوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔"

صمد کا دل قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ اور وہ قطرے ناجیہ کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"صمد! میرے بعد نہال کا کیا ہو گا۔ کاش میں اس کو ایک نظر دیکھ سکتی۔" اُس کے لہجے میں حسرتیں بھی دم توڑ رہی تھیں۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم، مَیں اسے شام کو لے آؤں گا۔"

"شام کس نے دیکھی ہے۔ میری زندگی کا سورج تو اس بھری دوپہر میں غروب ہو رہا ہے۔"

اُس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ لب پھڑپھڑا رہے تھے۔

صمد کا دل رُکنے لگا۔ "ناجیہ آنکھیں کھولو۔"

وہ پکارے چلا گیا اور ملک الموت نے ناجیہ کی زندگی کی کتاب بند کر دی۔ صمد کے جاندار ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ بے جان ہو گیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اُسے یوں لگا جیسے روح ناجیہ کے جسم سے نہیں بلکہ اس کے اپنے جسم سے نکل گئی ہو۔

○ ● ◆

سیّد صاحب لان میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے کہ ملازم نے ایک لفافہ لاکر میز پر رکھ دیا۔ انہوں نے اخبار سے نظر اُٹھا کر ایک اُچٹتی سی نگاہ اُس پر ڈالی۔ اُس پر تیز مہر دیکھ کر وہ چونک گئے۔ ان کی بھنویں سکڑ گئیں۔ انہوں نے تیزی سے لفافہ اُٹھا کر چاک کیا۔ سفید تہ کیا ہوا کاغذ اُن کے ہاتھ میں تھا۔

انہوں نے کھول کر پڑھا تو جیسے سارے جسم کی طاقت سلب ہو گئی۔ زمین اور آسمان اس قدر تیزی سے گھوم گئے کہ ان کو اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔

نہایت مختصر سی تحریر تھی۔

فقط ایک جملہ۔

"سیّد صاحب! میری بیوی ناجیہ مر گئی ہے۔"

نیچے صمد آفریدی کا نام لکھا ہوا تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اُن کے حواس بالکل مختل ہو چکے تھے۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔

اندر باہر، ہر طرف اس قدر گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ ناجیہ کی تیلیہہ بھی ذہن کے پردے پر واضح نہیں ہو رہی تھی۔

وہ بالکل بے حس و حرکت کرسی پر بیٹھے تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھیں کاغذ کے اس پرزے پر تھیں جس نے ان کے اندر کی دُنیا کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔

میری بیٹی مر گئی؟

میری ناجیہ مر گئی؟

یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

بھلا میری بچی کیسے مر سکتی ہے؟

میں نے تو کبھی اس کو بددعا نہیں دی تھی۔ میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔

وہ جھوٹ بولتا ہے۔ بکواس کرتا ہے۔ یہ اس کی کوئی چال ہے۔ وہ مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ میری بیٹی نہیں مر سکتی۔

ان کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

وجود جیسے بگولوں کی زد میں تھا۔ سہارے کے لیے زمین کی ضرورت تھی۔

"ڈیڈی! آپ میرے لیے چاکلیٹس نہیں لائے؟"

ڈیڈی! میں آپ کے ساتھ آفس جاؤں گی۔

"ڈیڈی! سالگرہ مبارک ہو۔ آپ کا برتھ ڈے گفٹ آپ کے تکیے کے نیچے رکھا ہے۔"

"ڈیڈی! کھانے کے معاملے میں میری اور آپ کی پسند ایک جیسی ہے۔ آپ کو بھی بریانی پسند ہے اور مجھے بھی۔"

"ڈیڈی! مجھے نئے ماڈل کی کار چاہیے۔"

"ڈیڈی! اس سال میں گرمیاں بیرس میں گزاروں گی۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

"ڈیڈی! مجھے میڈیکل میں داخلہ لینا ہے۔"

ہر سمت سے ناجیہ کی آواز آ رہی تھی۔

اس کا بچپن، اس کی جوانی، لفظوں میں ڈھل کر ان کی سماعتوں میں قیامت برپا کر رہے تھے۔

انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے دوبارہ خط کھولا۔

"میری بیوی ناجیہ۔"

ایک شعلہ سا سارے وجود میں بھڑک گیا۔ جس نے دل کی کسی اندھیری کوٹھڑی سے اچانک نکل آنے والی ناجیہ

علی خان کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

دل کے زخم انگارہ بن کر چٹخنے لگے۔

ہونہہ۔ میری بیوی۔ ہاں وہ اسی کی تھی۔ وہ میری نہیں تھی۔ کچھ نہیں تھی۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ وہ میرے لیے اسی دن مر گئی تھی جس دن اس نے اس گھر سے قدم باہر نکالا تھا۔

وہ میرے دل کا ٹکڑا نہیں، دل کا ناسور تھی۔

ذلت و رسوائی کی جو کالک اس نے میرے مُنہ پر ملی تھی، اس کے بعد مجھے آئینے سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ لوگوں نے کس کس طرح ہمدردی اور تاسّف کے پردے میں طنز کے نشتر چبھوئے تھے۔ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ میرے خاندان کے لیے بدنامی کا داغ تھی۔

میری ناموس پر بے غیرتی کا نشان۔

اچھا ہوا مر گئی۔

اسے مر ہی جانا چاہیے تھا۔

اب سے بہت پہلے۔ اُسی دن جب اپنی حیا اور میرے خاندان کی عزّت کی حفاظت اس کے بس سے باہر ہو گئی تھی۔

آہ۔

بھلا پتھر بھی کبھی پگھلتے ہیں؟

"افضل خان!" انہوں نے دھاڑ کر آواز دی۔

افضل خان ہانپتا ہوا حاضر ہو گیا۔

"کمال کو بُلواؤ۔" انہوں نے بے حد سخت لہجے میں کہا۔ چہرے کا تناؤ، وجود میں اُٹھنے والے غیض و غضب کے طوفان کی طرف اشارا کر رہا تھا۔ آنکھوں سے نکلنے والی چنگاریاں اس بات کی غمّاز تھیں کہ اندر الاؤ بھڑک رہا ہے۔

"ڈیڈی! آپ نے مجھے بُلوایا ہے؟" آکا بھائی اپنی چند ماہ کی بچی کو گود میں اُٹھائے ان کے قریب چلے آئے۔

"کمال کہاں ہے؟"

"بڑے بھیّا تو ابھی تک فیکٹری سے نہیں لوٹے۔"

"یہ لو۔ اسے پڑھ لو۔" انہوں نے کاغذ کی طرف بڑھایا۔

"کان کھول کر سُن لو۔ ماتم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب آنا سر جُھکا کر نہ چل سکو گے۔" ان کا لہجہ برف کی طرح سخت اور سرد تھا۔

"جی!" آکا بھائی کی خاک سمجھ میں نہ آیا۔ انہوں نے پرچے پر نظریں دوڑائیں۔

"ڈیڈی!" ان کے مُنہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ پاؤں کے نیچے زمین نہ رہی۔

"میں نے کہا ہے کہ سوگ منانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولے۔ "وہ ہمارے لیے اسی دن مر گئی تھی جس دن اس نے اس گھر سے قدم باہر نکالا تھا۔ اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔"

"اس کو یہ راستہ آپ کی ضد نے دکھایا تھا۔ شادی کی تھی اس نے، کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔"

آکا بھائی کا رواں رواں ان کی بے حسی پر چیخ اُٹھا۔

"ہاں اس نے قتل کیا تھا ہماری عزّت کا۔ ہماری غیرت کا۔ ہماری انا، ہمارے خاندانی وقار کا۔ جاؤ چلے جاؤ۔ اگر سوگ منانا ہے تو اس طرح مناؤ کہ خود تم کو بھی خبر نہ ہو۔"

ان کی سنگدلی پر آکا بھائی نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ سختی سے دانتوں تلے لب دبا لیے۔ آنسو بھری آنکھیں لیے کمرے سے نکل گئے۔

'پناہ گاہ' میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ در و دیوار سے غم ٹپکنے لگا۔ ناجیہ کو وہاں سے نکلے کئی برس گزر گئے تھے مگر وہ گھر سے نکلی تھی، بھائیوں کے دل سے تو نہ نکلی تھی۔

صمد کو ناجیہ کے چاروں بھائیوں کے خطوط ملے تھے جس میں انہوں نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نہال کے لیے بے پناہ چاہتوں کا اظہار کیا تھا۔ وہ صمد کے غم میں برابر کے شریک تھے۔
پر جس خط کا صمد کو انتظار تھا وہی نہ آیا۔
"ناجیہ! تمہاری تو موت بھی تمہارے ڈیڈی کو نہ پگھلا سکی" وہ ہاتھ میں پکڑی ناجیہ کی تصویر بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔

○ ● ◆

لوگ صحیح کہتے ہیں۔
وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ دل پر لگا زخم خواہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو، رفتہ رفتہ اس کی تکلیف کم ہوتی جاتی ہے، اور آخر میں بس یاد رہ جاتی ہے۔ ایسے ہی جیسے چوٹ لگ جائے تو زخم دھیرے دھیرے بھرنے لگتا ہے۔
اس کے اوپر کھرنڈ آجاتا ہے۔ کھرنڈ اترنے کے بعد ایک ہلکا سا نشان رہ جاتا ہے۔
اسی طرح زندگی کے دیے ہوئے غم بھی ہلکا سا نشان' یادداشت کے پردے پر چھوڑ جاتے ہیں اور جو کبھی ان زخموں کا خیال آجائے تو انسان ایک سرد آہ بھر کر رہ جاتا ہے اور بس۔
مرنے والوں کے ساتھ اگر ان کے چاہنے والے بھی مرجاتے تو یہ دنیا کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔
خدا کا بنایا ہوا نظام ایسا ہے کہ زندگی کو اپنی ڈگر پر لوٹتے بہت زیادہ دیر نہیں لگتی۔
معمولاتِ زندگی زیادہ دیر تک معطل نہیں رہ سکتے۔

○ ● ◆

سیّد صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے ثاقب کی منگنی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ منگنی کی رسم اگرچہ سادگی سے ادا کی جا رہی تھی مگر جس کلاس سے ان لوگوں کا تعلق تھا وہاں سادگی میں بھی خاصی دھوم دھام شامل ہوتی تھی۔
آغا بھائی کی بیگم میمونہ اپنی جیٹھانی کے کمرے میں داخل ہوئیں۔
سحیلہ بھابی! وہ پوچھ رہے ہیں کہ اگر آپ کے جانے کا پروگرام کنفرم ہو گیا ہو تو بتا دیں تاکہ سیٹیں بک کرائی جا سکیں۔"
سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں" انھوں نے اپنی ایک ماہ کی بچّی کو گود میں لے لیا۔ قدرے قبل از وقت پیدا ہونے والی بچّی کمزور سی تھی۔ سحیلہ اپنی بیٹی کی طرف سے پریشان رہنے لگی تھیں۔
رفیعہ کا کیا پروگرام ہے؟" انھوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"آپ... بچّی کی طرف سے فکر مند ہیں۔ ان کا بچّہ تو ابھی بیس دن کا ہے۔ اور کل سے اسے ہلکا سا بخار بھی ہے۔ خود ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے باوجود دیورانی صاحبہ جانے کو تیار بیٹھی ہیں۔ ان کے تو کپڑوں کا انتخاب بھی ہو چکا" وہ خوشدلی سے بولیں۔
"اور نہیں تو کیا" کھلے دروازے سے ہنستی مسکراتی، شوخ و شنگ سی رفیعہ اندر چلی آئیں "میں تو ذیشان کو اتّاں کے پاس چھوڑ کر جاؤں گی۔ بلکہ جاذب کو بھی یہیں چھوڑ کر جاؤں گی۔ کیا آپ کا بچّوں کو لے جانے کا ارادہ ہے؟" انھوں نے میمونہ سے پوچھا۔
"اوئی توبہ کرو۔ میں تو کسی ایک کو بھی لے کر نہیں جا رہی اپنے سر پر بخولنے کے لیے۔ اور پھر ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ شام کی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچیں گے اور اگلے دن واپس بھی آجائیں گے۔ گھر میں ڈیڈی ہیں، ملازم ہیں۔ بچّے آرام سے رہ جائیں گے"
"چلو اگر ایک ہی دن کا پروگرام ہے تو میں بھی چلتی ہوں" سحیلہ بھابی رضامند ہو گئیں۔

◆ ● ☾

"کیا حال ہیں بھئی؟" ثاقب کوئی میگزین دیکھ رہے تھے کہ رفیعہ بھابی ان کے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گئیں۔
"بے حال ہیں" انھوں نے نظر تو نہ اٹھائی مگر ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔
"ہائے ہائے۔ بچّے کا اتنا سا منہ نکل آیا" انھوں نے مصنوعی تأسّف سے کہا "ویسے اگر تم کہو تو میں ڈیڈی سے بات کروں کہ ثاقب بھی ہمارے ساتھ جانا چاہ رہے ہیں" وہ احسانِ عظیم فرمانے پر راضی تھیں۔
"محترمہ بھابی صاحبہ! میرے لیے سفارش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی اسلام آباد

جا رہا ہوں"
"ہاہ۔ چل جھوٹے" رفیعہ نے سر کو جھٹکا دیا۔
"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ آپ کو میری بات کا اعتبار نہیں ہے تو میں آپ کو ٹکٹ دکھا دیتا ہوں۔ ابھی ابھی آپ کے شوہر نامدار نے یہیں لا کر رکھے ہیں۔ کہاں گئے۔ ہاں یہ رہے۔ لیجیے دیکھیے یہ رہا میرا ٹکٹ"
اسی لمحے چھوٹے بھیّا اندر آ گئے۔
"سنیے، کیا ثاقب بھی منگنی کی رسم میں شریک ہوں گے؟" وہ حیرانی کے ساتھ اپنے شوہر سے مخاطب ہوئیں۔
"ان لوگوں کے گھرانے میں یہ دستور نہیں ہے۔ وہ لوگ اس کو نامناسب خیال کریں گے"
"اجی ان کی ایسی کی تیسی۔ نامناسب خیال کرتے ہیں تو کریں۔ وہ ہماری منگیتر ہیں اور ہم ان کے منتظر۔ اور باقی فالتو افراد جائیں بھاڑ میں۔ جب تک ہم بذاتِ خود ان کی انگلی میں اپنے دستِ مبارک سے انگوٹھی نہیں پہنا دیں گے ہمیں تو چین ملے گا نہ سکون۔ مزید یہ کہ دل بے قرار کی بے قراری بھی ہم وہیں بیٹھے بیٹھے گلا پھاڑ کر سنائیں گے۔ ہماری بلا سے چلے سارا زمانہ سنے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ کوئی خاص قابلِ اعتبار خاتون نہیں ہیں۔ کیا پتا کس کی انگلی میں انگوٹھی پھنسا کر آجائیں اور ہم ساری عمر کے لیے پھنس جائیں۔ اس لیے ہم بہ نفسِ نفیس خود جائیں گے"
ثاقب کے لہجے میں بے اعتباری تھی اور نظر زیرِ لب مسکراتے چھوٹے بھیّا پر تھی۔
"سنیے! کیا آپ نے ڈیڈی سے اس سلسلے میں بات کی؟" رفیعہ پر تو گھبراہٹ طاری ہو چکی تھی۔ جھٹ میاں کے سر پر جا کھڑی ہوئیں۔
"اور میں اس وقت تک وہاں سے نہیں ٹلوں گا جب تک وہ محبت کی نشانی تنہائی میں شرماتے لجاتے مجھے جو... نہیں دیں گی" ثاقب نے آگے سے اضافہ کیا۔
رفیعہ کی تو آنکھیں پھٹ گئیں "اوئی اللہ ثاقب کیا بالکل ہی حواس جاتے رہے؟"
ان کے اپنے حواس طویل رخصت پر روانہ ہو چکے تھے۔ "وہ لوگ روایتی قسم کے ہیں"
"کیا سولہویں صدی کی پیداوار ہیں؟" انھوں نے معصومیت سے سوال داغا۔
"حد ہو گئی۔ آپ سمجھاتے کیوں نہیں ثاقب کو" وہ شوہر کی طرف پلٹیں۔
"تو بھلا میں کیا سمجھاؤں" چھوٹے بھیّا کندھے اچکا کر بولے "خود میرے حواس ہی کب ٹھکانے پر ہوتے تھے جب تم مجھے تحفے بھجوایا کرتی تھیں"
رفیعہ کا بس چلتا تو بے ہوش ہو جاتیں اس بات پر۔ بہرحال غشی تو طاری ہو ہی گئی۔
دوسری طرف ثاقب کا بے ساختہ قہقہہ در و دیوار ہلا گیا۔
"خدا کی پناہ! میں کب آپ کو تحفے بھجواتی تھی" رفیعہ شرمندگی کے "کے ٹو" کے نیچے دب چلی تھیں۔ روہانسی ہو کر بولیں ساتھ ہی خجالت بھری نگاہ ثاقب پر ڈالی۔
"ارے بھئی، وہی تو لے کر آتی تھی۔ کیا نام تھا تمہاری کزن کا۔ ہاں یاد آیا۔ روح افزا"
"افزا" رفیعہ اپنی کزن کے نام کی توہین پر کچھ تلملا اور کچھ بلبلا کر بولیں۔
"ہاں ہاں وہی۔ وہی تو لے کر آتی تھی۔ تمہیں یاد نہیں۔ حد ہو گئی۔ یہ کوئی اتنی بہت پرانی بات تو نہیں ہو گئی" وہ ان کی یادداشت واپس لانے کی کوششوں میں مصروف ہو چکے تھے۔
"میں نے کبھی بھی آپ کو کوئی تحفہ نہیں بھجوایا تھا" ثاقب کے سامنے خفت اور خجالت سے ان کی بُری حالت تھی۔ آنکھیں الگ شرمندگی بھرے آنسوؤں کا چھڑکاؤ کرنے کو تیار ہو گئیں۔
مگر چھوٹے بھیّا تو ان کو ستانے پر تُل گئے تھے۔
"تمہیں یاد ہے رفیعہ۔ جب منگنی کے بعد پہلی بار تم مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ تم نے میری کلائی تھام لی تھی۔ میں اوئی اللہ کہہ کر بھاگ گیا تھا"
رفیعہ تو لگیں انا للہ ہونے۔ دھم سے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ آنسو ضبط نہ ہو سکے۔ ایک دم ہی رو پڑیں۔
چھوٹے بھیّا بُری طرح بوکھلا گئے "حد کر دی رفیعہ۔ بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا" وہ سرعت سے ان کے قریب آتے ہوئے بولے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں آپ سے کبھی ملنے نہیں آئی تھی۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بولیں۔ اپنے شوہر سے زیادہ انہوں نے ثاقب کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ "آپ جھوٹوں کے بادشاہ ہیں۔"

"بجا ارشاد۔" چھوٹے بھیّا نے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔

"اور یہ ثاقب تو اسلام آباد کاروباری سلسلے میں جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی جائیں گے۔ ہم اگلے ہی دن لوٹ آئیں گے۔ ان کا قیام تین چار روز کا ہے۔"

"جی!" رفیعہ نے جھٹ رونے کو بریک لگایا۔ ساتھ ہی ثاقب کو گھور کر دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ یہ آنسو بھی موقع بے موقع بلاوجہ ہی ٹپک جاتے ہیں۔ شرمندگی میں اضافے کو۔ بھلا ثاقب کیا سوچتے ہوں گے، انہوں نے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا۔

"بھابی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔" ثاقب سر کو جھٹکا دے کر بولے۔

رفیعہ نادم سی ہو گئیں۔

"اچھا چلو اب جا کر کھانا لگواؤ۔ آغا بھائی اور بڑے بھیّا بھی آفس سے آ گئے ہیں۔ مجھے بھی بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

رفیعہ اُٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئیں۔

دونوں بھائیوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں تو دونوں ہی بے ساختہ ہنس پڑے۔

کھانے کی میز پر بھی ثاقب کی منگنی موضوعِ گفتگو تھی۔ بھابیاں ثاقب کو چھیڑ رہی تھیں۔ وہ کچھ حاضر جوابی اور کچھ ڈھٹائی سے اپنا دفاع کر رہے تھے۔

"بڑے بھیّا آپ نے شادی سے پہلے بھابی کو دیکھا تھا؟" ثاقب نے شریر نظروں سے پہلے انہیں اور پھر سجیلہ بھابی کو دیکھا۔

"نہیں بھئی۔ توبہ کرو۔" وہ جیسے بدک کر بولے تھے۔

"تصویر بھی نہیں دیکھی تھی؟" انہوں نے حیرت سے فوت ہو جانے کی ایکٹنگ کی۔

"اونہوں۔ اُن دنوں میری قسمت کا ستارا شاید انتہائی تاریک راہوں سے گزر رہا تھا۔" انہوں نے دزدیدہ نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ اُن کی جانب سے جوابی خشمگیں نگاہیں وصول کر کے پھر اپنی پلیٹ پر جھک گئے۔

"تو پھر آپ نے شادی کیسے کر لی؟"

"بس ڈیڈی نے کہا اور میں نے کر لی۔" وہ بے حد سادگی سے بولے۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اگر بھابی آپ کو پسند نہ آتیں تو...؟"

"تو اب بھی کون سا..." باقی جملہ انہوں نے دل میں پورا کیا۔ "ویسے اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ گنجائش ابھی بہت ہے۔"

"سن رہی ہیں بھابی!" ثاقب جھٹ بی جمالو بن گئے۔

سجیلہ آنکھوں کا سائز بڑا کر کے شوہر کو گھورنے لگیں۔

"بھابی جان صرف گھورنے سے کام نہیں چلے گا۔ خوب گوشمالی کیجیے گا۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے ثاقب تم تو اس طرح لڑائی کروا دو گے۔" چھوٹے بھیّا ہنسے۔

"بڑے بھیّا ویسے ایک بات ہے۔ بھابی کھانا بہت اچھا بناتی ہیں۔" آغا بھائی نے سچے دل سے تعریف کی۔

"تم کو نہیں معلوم یہ بے وقوف بھی بہت اچھا بناتی ہیں۔" وہ بے ساختہ بولے۔

"آپ کو دیکھ کر ہمیں بخوبی اندازہ ہے۔" ثاقب کی زبان بھلا کہاں رکتی تھی۔

"نہیں، یہ تو شادی کے پہلے ہی سے ایسے ہیں۔" بڑی بھابی جلدی سے بولیں۔

ان کے انداز پر سب ہنس پڑے۔

○ ● ◆

وہ سب لوگ ایئرپورٹ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

"بھئی جلدی کرو ناں کیا فلائٹ کا ٹائم نکلواؤ گی۔" بڑے بھیّا اپنے بالوں میں برش کر رہے تھے۔ آئینے میں سے

انہوں نے سجیلہ کو دیکھا۔

"چل تو رہی ہوں۔" وہ جیسے بادل نخواستہ اُٹھی تھیں۔ عجب پژمردہ سی لگ رہی تھیں۔ ننھی سی بچّی کو انہوں نے دوبارہ کاٹ میں لٹا دیا۔

"کیا بات ہے؟ اس قدر سست کیوں ہو رہی ہو؟" وہ ان کی طرف مڑے۔

"جانے کیوں دل گھبرا رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے مجھے اپنی بچّی نہیں ملے گی۔ یہ کہیں کھو جائے گی یا میں ہی واپس نہ آؤں گی۔" ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"کیا احمقانہ باتیں کر رہی ہو۔ ہم ثاقب کی منگنی کی رسم ادا کرنے جا رہے ہیں یا اللہ میاں کے پاس، جو جا کر واپس ہی نہ آئیں گے۔" وہ برہمی سے بولے اور کڑی نظروں سے گھورنے لگے۔

"اور یہ اپنے چہرے سے اُداسی کے بادل ہٹاؤ۔ خوشی کا موقع ہے نہ کہ مُنہ لٹکانے کا۔ خوامخواہ بدشگونی کی باتیں مت کرو۔ میں تمہاری اس وہم کی عادت سے سخت عاجز ہوں۔ ایسی ہی بات ہے تو زیبا کو ساتھ لے چلو۔"

"نہیں، کل تک تو ہم واپس آ ہی جائیں گے۔ اب ایک دن کے لیے اس کو کیا لے کر جاؤں۔ آنا سے کہہ دوں گی، اس کا خیال رکھے گی۔" وہ اپنے کپڑے اُٹھا کر باتھ روم میں چلی گئیں۔

ساری رات دل بے چین رہا۔ بُرے بُرے خیالات آتے رہے۔ "خدا جانے کیا ہوتا جا رہا ہے سجیلہ کو۔ ہونہہ۔ وہمی عورت۔ لاحول ولاقوۃ۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے کوٹ پہن رہے تھے۔ کاٹ کے قریب آ کر سوتی ہوئی گلابی سی بچّی کو جھک کر پیار کیا اور باہر نکل گئے۔

سامان وغیرہ گاڑی میں رکھوا کر وہ اندر آئے تو لاؤنج میں ہی ان کو سجیلہ نظر آ گئیں۔ ہلکی گلابی پلین ساڑی میں ملبوس وہ ثاقب کی کسی بات پر قہقہہ لگا رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر تازگی اور بشاشت تھی۔

انہوں نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔ سجیلہ کی اُلجھی ہوئی گفتگو نے خوامخواہ ان کے ذہن میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔

سیّد صاحب خود ان کو ایئرپورٹ سی آف کرنے جا رہے تھے۔ کار میں باوردی ڈرائیور موجود تھے۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔

"ثاقب! کیا تم بھی کل ہی واپس آؤ گے؟" سیّد صاحب نے دریافت کیا۔

"نہیں ڈیڈی۔ میں اتوار کو شام کی فلائٹ سے آؤں گا۔" ثاقب پچھلی نشست سے بولے۔

سیّد صاحب بیٹے کو کاروباری میٹنگز کے سلسلے میں ہدایات دینے لگے۔

ایئرپورٹ پر ان کو خدا حافظ کہہ کر وہ واپس پناہ گاہ پہنچ گئے۔

○ ● ◆

انہوں نے دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہ دوڑائی۔ رات کے نو بجنے والے تھے۔

"حیرت ہے ان لوگوں نے اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع نہیں کی۔" وہ بڑبڑائے۔

"افضل خان!" انہوں نے ملازم کو آواز دی۔

وہ پل بھر میں حاضر ہو گیا۔

"بچّے کیا کر رہے ہیں؟" انہوں نے پوتے پوتیوں کے متعلق دریافت کیا۔

"سب بچّے اپنی آنا کے پاس ہیں۔" وہ بڑا باادب واقع ہوا تھا۔

"تنگ تو نہیں کر رہے ہیں۔ رو تو نہیں رہے ہیں؟"

"جواہرے بی رو رہی تھیں۔ گل محمد ان کو اور جاذب میاں کو سیر کرانے لے گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آنا سے کہہ دو رات کو سب بچّوں کو سوتے وقت دودھ ضرور دے۔ اور تم ذرا ٹی۔ وی آن کر دو۔"

افضل خان نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

سیّد وجاہت بیڈ پر نیم دراز ہو گئے اور کتاب پڑھنے میں محو ہو گئے۔ گھڑی نے اعلان کیا کہ نو بج چکے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ٹی۔ وی پر خبرنامہ شروع ہو گیا۔ سیّد صاحب کتاب چھوڑ کر ٹی۔ وی کی جانب متوجہ ہو گئے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
السلام علیکم۔ پہلے اہم خبروں کا خلاصہ۔
پی آئی اے کا بوئنگ طیارہ جو کراچی سے اسلام آباد کی پرواز پر تھا، آج شام اسلام آباد کے ہوائی اڈے پہ رن وے کے قریب گر کر تباہ ہو گیا۔ حادثے کی وجوہات ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی ہیں۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ طیارے میں سوار عملے کے نو ارکان سمیت ایک سو تئیس مسافر جاں بحق ہو گئے۔"

جیسے مشرق سے مغرب تک بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں جو ساری کی ساری ایک ساتھ پھٹ گئیں۔
ہر طرف دھماکے ہی دھماکے ہو رہے تھے۔
ایک ہی آواز کی صورت۔
طیارے میں سوار عملے کے نو ارکان سمیت ایک سو تئیس مسافر جاں بحق ہو گئے۔
پھر جیسے ایک دم ہی زمین سے آسمان تک ہر چیز زندگی کے احساس سے عاری ہو گئی۔ ہر سُو قیامت خیز سکوت چھا گیا۔
جانے نیوز ریڈر اور کیا کہہ رہی تھی۔
سیّد صاحب کا دایاں ہاتھ دل پر تھا۔ وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑے تھے۔

○ ● ◆

آئی سی یو کی شیشے کی دیوار کے اس پار کھڑے سکندر رضا کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وجود ہولے ہولے سسک رہا تھا۔

اڑتالیس گھنٹے کے دوران سیّد صاحب کو یہ تیسرا دل کا دورہ پڑا تھا۔ اندر موجود ڈاکٹرز ان کی جان بچانے کی سر توڑ کوششیں کر رہے تھے۔ موت سید صاحب کے بیڈ کے ارد گرد گھوم رہی تھی۔
سکندر رضا ساکن آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک دم ہی سجدے میں گر پڑے۔
"اے پروردگار! تُو بڑا غفور و رحیم ہے۔ اسے بخش دے۔ اس کے گناہ دھو دے۔ اسے زندگی سے قریب کر دے۔ اے اللہ! میں تیرے غضب، تیرے جلال، تیرے انتقام سے تیری ہی پناہ چاہتا ہوں۔ مالک تُو ہمیں مصیبتوں سے بچا لے اور مصیبتوں سے دُور کر دے۔ پروردگار تُو وجاہت کو معاف کر دے۔" ان کا دل بلک بلک کر رو رہا تھا۔
ڈاکٹر کے جوتوں کی آواز پر وہ تیزی سے اُٹھے۔ ڈاکٹر سُتے چہرے کے ساتھ ان کے قریب آ گیا۔
سکندر رضا کی آنسو بھری آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا۔
ڈاکٹر نے نظریں جھکا لیں۔
"کچھ تو کہیے ڈاکٹر صاحب!" ان کی آنکھیں، ان کا چہرا، ان کی آواز سب کچھ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔
"سکندر صاحب! سیّد صاحب پر یہ تیسرا دل کا دورہ پڑا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی ان کی جان بچ گئی تو وہ یقیناً خدا کا معجزہ ہو گا۔ آپ دعا کیجیے!" ڈاکٹر تسلیوں سے انہیں بہلا رہا تھا۔ جبکہ اس کا چہرا مایوسی کی واضح تحریر تھا۔ سکندر رضا دل تھام کر رہ گئے۔

سیّد صاحب سے ان کا بچپن کا ناتا تھا۔ عمر کا بڑا طویل وقت ساتھ گزرا تھا۔ اگرچہ کہ وقت اور حالات کے تحت شدید نوعیت کے اختلافات بھی رہے مگر ایک دوسرے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پایا تھا۔
خدا قادرِ مطلق ہے۔ اس کے بس میں سب کچھ ہے۔ وہ تنکے میں جان ڈالنے والا ہے۔
وقت گزرتا رہا اور زندگی ذرا ذرا کر کے سید صاحب کے جسم میں داخل ہوتی رہی۔ بالآخر خدا نے ان کو موت پر فتح دے دی۔

وہ غالباً بائیسواں دن تھا جب انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔
ڈاکٹر تمتماتے چہرے کے ساتھ سکندر رضا کے پاس آئے۔
"سکندر صاحب! خدا اپنی قدرت کے نمونے دکھاتا رہتا ہے۔ جلدی سے میرے ساتھ آئیے۔ سیّد صاحب ہوش میں آ گئے ہیں۔"

سکندر رضا سُن کر اپنی جگہ پتھر کے بُت میں تبدیل ہو گئے۔
"ہوش میں آ گئے ہیں؟" وہ یوں بولے جیسے خود ہوش میں نہ رہے ہوں۔
"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ مجھے اس کے پاس لے کر مت جاؤ۔ وہ مجھ سے ایک ہی سوال پوچھے گا۔ میں اس کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکوں گا۔ میں اسے کیسے بتا پاؤں گا کہ اس کے جگر گوشوں کو میں نے اپنے ہاتھوں سے زمین کے حوالے کیا ہے۔ میں اس سے کیسے کہوں گا کہ اب اس کے لیے اس دُنیا میں کچھ نہیں بچا ہے۔ زندگی نے بے موت ہی مار دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ تم اس کی زندگی کی نوید سُناتے ہو۔ اگر میں اس کے سامنے گیا تو کہیں میری صورت اس کے لیے موت کے فرشتے میں نہ ڈھل جائے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔
"سکندر صاحب! حوصلے سے کام لیجیے۔" ڈاکٹر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اس وقت آپ کا مثبت تعاون سیّد صاحب کو زندگی سے قریب لانے کے سلسلے میں ہمارے لیے مددگار ثابت ہو گا۔ ہمت کریں۔" وہ اُٹھا کر ان کو اپنے ساتھ لے گیا۔
وہ مُردہ قدموں کے ساتھ آئی سی یو میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی سفید براق بستر پر سیّد صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ وہ جیسے گھسٹتے ہوئے ان تک پہنچے۔ ضبط کے دامن کو جتنا مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے وہ اتنا ہی ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا تھا۔
"وجاہت!" انہوں نے بالکل قریب جا کر بھرّائی ہوئی آواز میں پکارا۔
سیّد صاحب کی بے نور سی آنکھیں ان کے چہرے پر آن ٹکیں۔
"وجاہت مجھے پہچانتے ہو؟" ان کے بے جان سے ہاتھ پر انہوں نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "میں سکندر ہوں!"
سیّد صاحب کی آنکھوں میں پہچان کے سائے لہرانے لگے۔
قریب کھڑے ڈاکٹر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔
"تم آرام کرو وجاہت، میں تمہارے بہت پاس ہوں اور خُدا سے تمہارے لیے دُعا گو ہوں۔" وہ ان کے پاس سے ہٹنے لگے کہ سیّد صاحب نے ان کی کلائی کو اپنی کمزور گرفت میں لے لیا۔
وہ رُک گئے۔
"سکندر!" ان کے لب پھڑپھڑائے۔
"ہاں کہو، میں سُن رہا ہوں۔" وہ اپنا چہرا ان کے قریب لے آئے۔
"سکندر! میرے بچوں کو دفنا دیا، سب کی لاشیں مل گئی تھیں ناں، اُن کی قبریں قریب قریب بنوائی ہیں ـــــ یا الگ الگ ـــــ؟"
سکندر رضا کو یوں لگا جیسے ان کی ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو۔ ان کا اپنے قدموں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹر نے انہیں کندھوں سے تھام لیا۔
"سکندر صاحب! ہمت جمع کیجیے ـــ نرس!" وہ نرس کی طرف متوجہ ہوا "فوراً سیّد صاحب کو نیند کا انجکشن لگا دو۔"
"سکندر! میری بات کا جواب تو دو۔" سیّد صاحب کے منہ سے اٹک اٹک کر الفاظ نکل رہے تھے۔
"وجاہت! کمال، ثاقب، آفتاب سب ہیں تو سہی۔ شہیر، شیراز اور جاذب کی صورت میں۔ رفیعہ اور سمیلہ سب موجود ہیں۔ جواہر، خمار، زیبا کی صورت میں۔ تم نے ان کے لیے زندہ رہنا ہے۔ تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔ وہ سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں، تمہیں پوچھتے ہیں۔" وہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔
پر سیّد صاحب نیند کے انجکشن کے زیرِ اثر غافل ہو چکے تھے۔

○ ● ◆

اور جس دن وہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر پناہ گاہ میں آئے تو سکندر رضا ساتھ ہی تھے۔ ان کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ گُم صُم سے سیّد صاحب ان کے ہمراہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہے تھے۔ لاؤنج میں آ کر وہ رُک گئے۔ چاروں جانب نظر دوڑائی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے گھر کی ہر چیز پر موت کے نشان ہوں۔

اور پل بھر میں ہی ان کے دیکھتے دیکھتے منظر بدل گیا۔

سیڑھیوں پر سے رفیعہ کے اترنے کی آواز آنے لگی۔

کچن میں کھڑی سجیلہ خانساماں کو ہدایت دے رہی تھیں۔

میمونہ اپنے کمرے میں شاید جواہر کو بہلا رہی تھی۔

بلیرڈ روم میں کمال کی آواز گونج رہی تھی۔

باہر لان میں بنے سنگِ مرمر کے چبوترے پر بیٹھے ثاقب اور اس کے دوستوں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

ڈرائیو وے میں شاید آفتاب کی گاڑی آ کر رکی تھی۔ ہارن زور زور سے بج رہا تھا۔

اور ضیاء کی آوازیں کہیں سے نہیں آ رہی تھیں۔

ہاں، وہ اپنے کمرے میں سو رہا ہوگا۔ وہ عموماً اس وقت سوتا ہے۔

ہر طرف شور ہو رہا تھا۔

شوخیاں، شرارتیں، نسوانی ہنسی، مردانہ قہقہے، چوڑیوں کی کھنک، قدموں کی چاپ۔

اور پھر ایک دم ہی ہر آواز کا گلا گھٹ گیا۔ پُرہول سناٹا چھا گیا۔

بس مدھم مدھم سی، دبی دبی سی سرگوشی ابھر رہی تھی۔

جیسے ہر شے "موت موت" پکار رہی ہو۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ دل سے صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

وجاہت یہ سب تیرے گناہوں کی سزا ہے۔

کس کا دل دکھایا تھا، کون سا گناہ کیا تھا جو خدا نے اتنی کڑی سزا دی۔

اور جس کا کفارا ساری زندگی بھی دیتا رہے تو بھی نہ بخشا جائے۔

کس کے دل کی بددعا تھی، جو سیدھی عرش تک گئی۔

دراصل سید وجاہت علی خان نے اپنی امارت اور غرور کی چٹکیوں میں اتنے دلوں کو مسلا تھا کہ یہی یاد نہ آتا تھا کہ کون سا بندہ خدا کے اتنے نزدیک تھا کہ خدا نے اس کی فوراً ہی سن لی۔

کسی دکھے ہوئے دل کی بددعا ہی تو تھی جو آج گھر کی ویرانی کی صورت میں سامنے تھی۔

"وجاہت!" سکندر رضا نے ان کا بازو تھام لیا۔ "بیٹھ جاؤ، ماں، کس سوچ میں پڑ گئے ہو، آؤ یہاں بیٹھو۔" انہوں نے سید صاحب کو صوفے پر بٹھا دیا۔ "میں بچوں کو بلواؤں۔"

"آہ!" دل جیسے بہت زور سے کراہا تھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

بچے جونہی اندر داخل ہوئے، ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔

وہ ان سب کو بازوؤں میں بھر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ ننھے ننھے معصوم ذہن اس بات سے ناواقف تھے کہ ماں، باپ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ چکا ہے۔

"دادا جان! آپ کیوں رو رہے ہیں، آپ کو چوٹ لگ گئی؟" ننھی خمار اپنے ننھے منے ہاتھوں کے پیالے میں ان کا چہرا تھامے پوچھ رہی تھی۔

"دادا جان! کیا آپ کو کس نے مارا ہے؟" چھوٹی سی جواہر معصومیت سے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، مجھے گناہوں نے مارا ہے، سزاؤں نے مارا ہے۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

"بس کرو وجاہت۔" سکندر رضا نے ان کو کندھوں سے تھام لیا۔ "انا! تم بچوں کو باہر لے جاؤ۔ آؤ وجاہت، میں تمہیں تمہارے کمرے میں لے چلوں، تم کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

وہ زبردستی اٹھا کر ان کو ان کے بیڈ روم میں لے گئے۔

○ ● ◆

"وقار! میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟" صمد بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔" اس کا انداز بات منوانے کا سا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو تم! کیا تم جانتے نہیں ہو؟" صمد نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"صمد! تم ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آفٹر آل، وہ نہال کے نانا ہیں۔" وقار اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہاہ۔۔۔! نانا۔" صمد کا لہجہ زہر آلود تھا۔

"دیکھو اس وقت جو بھی حالات ہیں وہ واقعی تکلیف دہ ہیں مگر! بہرحال ان کا سامنا کرنا ہے، اگر تم نہال کو بے سہارا بچوں کے کسی ادارے میں داخل کراؤ گے تو پتا نہیں وہ بڑا ہو کر کس قماش کا آدمی نکلے۔ نانا کے زیرِ تربیت رہے گا تو کم از کم معاشرے کا صحت مند اور باکردار فرد تو بن سکے گا۔ صمد میرے بھائی! یہ نہال کے مستقبل کا سوال ہے اور اس کا انحصار تمہارے صحیح یا غلط فیصلے پر ہے۔" وہ اس کے ساتھ گھنٹہ بھر سے مغز ماری کر رہا تھا۔

"وقار! میں سوچتا ہوں کہ مجھے اس طرح ناجیہ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بعض اوقات رشتے ناتے کتنی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں کتنے ضروری بن جاتے ہیں۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں بچا۔ میرا ایک ہی بچہ اور وہ بھی اتنا چھوٹا کہ اسے کسی اچھی یا بری بات کا شعور نہیں ہے۔ وقار! یہ میں کس دوراہے پر آ گیا ہوں، میں کیا کروں؟ آگے کنواں ہے اور پیچھے کھائی، میں کس طرف چھلانگ لگاؤں۔"

"ڈاکٹرز کی رپورٹ کیا کہتی ہیں؟" وقار نے پوچھا۔

"انتہائی مایوس کن ہیں۔"

"بہتری کی کوئی امید نہیں ہے۔"

"قطعی کوئی امید نہیں ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں میرا معصوم بچہ گم ہو جائے گا۔" صمد کی آواز بھرا گئی۔

"صمد! ان حالات میں صحیح فیصلہ یہ ہے کہ تم نہال کو اس کے نانا کی تحویل میں دے دو۔"

"وہ اسے قبول نہیں کریں گے۔" صمد نے انکار میں سر ہلایا۔

"گھر بیٹھے بیٹھے بکواس کیے جاؤ۔" وقار جل بھن کر رہ گیا۔

"میں سوچوں گا۔"

"یعنی گاڑی وہیں کی وہیں ہے۔ ارے خدا کے بندے سوچنے کا وقت گزر گیا۔ اب فوری کوئی فیصلہ کرو۔ لمحہ لمحہ قیمتی ہے۔"

"ہاں لمحہ قیمتی ہے۔" صمد نے تھکے تھکے سے انداز میں صوفے سے ٹیک لگائی۔

○ ● ◆

محترم جناب سید صاحب!

آداب!

زندگی بڑی عجیب چیز ہے ہمیں علم نہیں ہوتا کہ کب، کون سے لمحے میں کیا ہو جائے۔ بعض فیصلے چاہے وہ صحیح ہوں یا غلط، ان کے تحت انسان بڑی سے بڑی خوشی حاصل کر لیتا ہے، مگر کبھی کبھی کوئی ایسا لمحہ بھی زندگی میں آ جاتا ہے کہ جو انسان کو بے بس اور مجبور کر دیتا ہے۔

سید صاحب! میں نے کبھی بھی آپ کو اپنا حریف نہیں سمجھا۔ سچ پوچھیے تو ان غیر معمولی واقعات کے باوجود میں آپ کے بارے میں منفی رائے نہ رکھ سکا۔ اس کی وجہ یقیناً آپ کی بیٹی تھی۔ مجھے فخر ہے کہ ناجیہ جیسی سلجھی ہوئی لڑکی میری شریکِ حیات تھی۔

بہرحال جو کچھ ہوا اسے میں نے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کیا۔ آپ مجھے کس قدر ناپسند کرتے ہیں۔ اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ میں آپ کی نظر میں اپنی اہمیت اور حیثیت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میں یقیناً اس طرح آپ سے دوبارہ مخاطب نہ ہوتا اور ناجیہ کی موت کے بعد اس کی گنجائش رہ بھی نہیں جاتی تھی، مگر میں آپ کو اپنے موجودہ حالات کے پیشِ نظر خط لکھ رہا ہوں اور اس جسارت پر معذرت بھی چاہتا ہوں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آپ شاید یہ بات نہ جانتے ہوں کہ میں یہاں کینسر کے مرض پر ریسرچ کر رہا تھا، اس بات سے بے خبر کہ کینسر کے جراثیم خود میرے اندر بھی پرورش پا رہے ہیں، اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب تدبیر کا لمحہ میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ڈاکٹروں کے بقول میری زندگی بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ مجھے مرنے کا غم نہیں، غم تو اس بات کا ہے کہ میرا بچہ اس دنیا میں اکیلا رہ جائے گا۔

سیّد صاحب! میں بھی آپ ہی کی طرح مرد ہوں اور انا پرست بھی ہوں، مگر میں کٹھور نہیں۔ میری اولاد میری کمزوری ہے، میرا بچہ میری انا اور خودداری سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ اس وقت میرے بعد نہال کا کوئی نہیں ہے، مگر میں ابھی آپ کو بھولا نہیں۔ نہال صرف میرا ہی نہیں، آپ کی بیٹی کا بیٹا بھی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ میرا مقصد اچھی طرح سمجھ گئے ہوں۔ دوسری صورت میں میرا بچہ یتیم خانے میں بھی پل سکتا ہے، اگرچہ کہ مجھے آپ کی طرف سے کسی مثبت جواب کی اُمید نہیں ہے، مگر اس کے باوجود میں آپ کے خط کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔

صمد آفریدی

شاید یہ آپ کا اور میرا ایک اور امتحان ہے۔

صمد کا طویل خط سیّد صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ ماتھے پر بل اور آنکھوں میں سوچ تھی۔

انہوں نے افضل خان کو بلوایا۔

وہ حاضر ہو گیا۔

"گل محمد سے کہو کہ اسی وقت سکندر رضا کے ہاں جائے اور اُن کو ہمارا پیغام پہنچائے کہ ہمیں اُن سے بہت ضروری کام ہے، وہ فوراً آئیں، گل محمد اُن کو اپنے ساتھ ہی لے کر آئے۔"

"جی بہتر۔" وہ باہر نکل گیا۔

سیّد صاحب اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے۔ ناجیہ کی تصویر ذہن کے پردے پر بن بن کر مٹ رہی تھی۔ صمد کو حالانکہ ایک ہی بار دیکھا تھا، مگر نجانے کیوں اس کے نقوش ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔ منفی اور مثبت خیالات آجا رہے تھے۔ ٹہل ٹہل کر تھک گئے تو صوفے پر بیٹھ کر سکندر رضا کا انتظار کرنے لگے۔

"السلام علیکم!" سکندر رضا اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"وعلیکم السلام، آؤ سکندر۔"

"کیا بات ہے، تم نے اچانک بُلوا لیا۔ صبح ہی تو آفس میں ہماری ملاقات ہوئی ہے، خیریت تو ہے؟"

"یہ دیکھو۔" انہوں نے سکندر رضا کے ہاتھ میں خط تھما دیا۔

"کیا ہے یہ؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا اور خط پڑھنے لگے۔

"اوہ! چچ چچ! بہت سخت صدمہ ہوا۔" وہ تاسف سے بولے۔

سیّد صاحب نے ان پر ایک تیکھی نگاہ دوڑائی، مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔

"تم نے مجھے کیوں بُلوایا ہے؟" وہ خط واپس کرتے ہوئے بولے۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کس بارے میں؟" سکندر رضا حیرانی سے بولے۔

"اسی بارے میں۔"

"ارے بھئی فوراً سے پیشتر نواسے کو بُلواؤ اور اگر ہو سکے تو داماد کو بھی بُلواؤ۔" سکندر رضا قطعیت سے بولے۔

"ہوں۔" سیّد صاحب نے معنی خیزی سے آنکھیں گھمائیں۔ "تم جانتے ہو نا جیہ کی شادی سے ہماری کتنی بدنامی ہوئی تھی۔ کون کون سی ذلتیں اور رسوائیاں ہمارا مقدر بن گئی تھیں۔"

"اس قدر فضول بات کہنے کا یہ کون سا موقع ہے؟" وہ تنک کر بولے۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"تم اس کو خط لکھو۔"

"میں؟" وہ بھونچکا رہ گئے۔

"ہاں تم! اسے لکھ دو کہ پناہ گاہ اس کے بچے کو اپنی پناہ میں لینے کے لیے تیار ہے۔" اُن کے لہجے کی بے نیازی

نے سکندر رضا کو کھولا کر رکھ دیا۔

"تم خود کیوں خط نہیں لکھتے؟"

"نہیں، میں ہرگز نہیں لکھوں گا۔"

"وجاہت تم ——!"

"سکندر! مجھے کنوینس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم اُس شخص کو لکھ دو کہ ہم اُس کے بچے کی پرورش کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"وجاہت! تم انا کے ناگ کے ڈسے ہوئے ہو، اس کا زہر تمہارے سارے وجود میں سرائیت کر چکا ہے تم پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ تم پتھر کے بنے ہوئے ہو۔" وہ سخت غصّے میں کمرے سے باہر نکل گئے۔

"تم نہیں جانتے سکندر! اس شخص نے ہماری عزّت اور ہماری شان کا جنازہ بہت دھوم دھام سے نکالا تھا۔ لوگوں نے ہمارے مُنہ پر کہا کہ ہماری بیٹی نے اس کی خاطر اپنے باپ کی شان و شوکت، اس کی غیرت و حمیّت کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ تم کیا جانو سکندر —— صمد تو ہمارے دل پر لگے اُس زخم کا نام ہے، جس سے لمحہ لمحہ ٹیس اُٹھتی ہے مگر پھر بھی ہم اپنی بیٹی کے بیٹے کو دُنیا کی ٹھوکروں میں نہیں دیکھ سکتے۔ تم کہتے ہو کہ ہم پتھر کے بنے ہوئے ہیں کیسے؟"

سیّد صاحب اس وقت خود کلامی کی کیفیت میں مُبتلا تھے

○ ● ◆

برخوردار صمد!

السّلام علیکم!

تمہارا خط سیّد وجاہت علی خان کو مل گیا تھا میری بدقسمتی ہی سمجھو کہ میں سکندر رضا، سیّد وجاہت کا دوست ہوں اور انہی کے کہنے پر تم سے مخاطب ہوں۔ تمہارا خط میری نظر سے بھی گزرا تھا۔ تمہارے حالات جان کر بے حد دُکھ ہوا۔ خدا تمہاری مشکلات آسان کرے۔

میرے عزیز! تم اپنے بچے کو فوراً سے پیشتر پاکستان روانہ کر دو۔ میں جانتا ہوں کہ تم کو وجاہت کے خط کا انتظار ہو گا اور میری تحریر دیکھ کر تمہیں یقیناً غصّہ آجائے گا، مگر میرے بیٹے تم جذبات کو عقل پر غالب نہ آنے دینا، اگر تمہاری نظر میں کوئی ایسا شخص ہے جو تمہارے بچے کی پرورش کر سکے تو تم خود مختار ہو، مگر یتیم خانے سے ایک ظالم و جابر نانا کا سایہ بہر حال بہتر ہے۔ کم از کم وہ ایک باکردار انسان تو بن جائے گا۔ یتیم خانے میں نہ صرف یہ کہ اس کی صلاحیتیں دب جائیں گی بلکہ وہ ذہنی پسماندگی کا شکار ہو جائے گا۔ ایسے بچوں میں بہت کم بچے زمانے کی رفتار کا ساتھ دے پاتے ہیں، ورنہ زیادہ تر پیچھے ہی رہ جاتے ہیں۔

صمد بیٹے! تم سمجھنا کہ یہاں تمہارا بچہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ ناجیہ میرے لیے بھی بیٹی ہی کی طرح تھی۔ تم یوں سمجھو کہ نہال میرا ہی نواسا ہے اور اسے تم نے میرے سپرد کیا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں گا، نہال کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔

بیٹے! وجاہت کی طرف سے تم کو جتنی تکلیف پہنچی ہے، اس کا مجھے اندازہ ہے اور میں اس کی طرف سے معذرت خواہ ہوں۔

اُمید ہے کہ میرے خط کو تم نہ صرف ٹھنڈے دل سے پڑھو گے بلکہ اس پر غور بھی کرو گے۔

تمہارے لیے دُعا گو!

سکندر رضا!

صمد شدید طیش کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی بھنویں تنی ہوئی تھیں اور دانت سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کی حالت اس کے اندر اُٹھنے والے طوفان کی غمّازی کر رہی تھی۔

"دیکھا تم نے؟" صمد نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

وقار نے خیریت اسی میں سمجھی کہ خاموش رہے۔ صمد اس وقت چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی طرح بل کھا رہا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"وقار! دیکھی تم نے اس شخص کی فرعونیت، اوہ میرے خدا!" وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔
"کاش! نہال پیدا ہوتے ہی مر جاتا تو میں اس عذاب میں گرفتار نہ ہوتا۔"
"پاگل ہو رہے ہو صمد! کیوں تم اس طرح نہال کو کوس رہے ہو؟"
"تم تو میرے سامنے نہ بولنا، یہ تمہاری ہی تجویز تھی۔" صمد بپھر کر بولا۔
"غلط نہیں کہا تھا میں نے۔" وقار اُلٹا اس پر چڑھ گیا۔ "دیکھو میں سمجھتا ہوں کہ نہال کے نانا کا رویہ انتہائی نامنا ہے، مگر میرے بھائی تم اس مغربی ماحول میں اپنے بچے کو کس کے سہارے چھوڑو گے۔ وہاں اس جیسے اور بھی بچے ہیں وہ سب اس کے اپنے ہیں، یہ اُن میں گھل مل جائے گا اور پھر یہ صاحب جنہوں نے خط لکھا ہے، مجھے تو کوئی برے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی وہاں موجود ہوں گے اور میں بھی تو پاکستان میں رہتا ہوں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے بچے سے بالکل ہی غافل ہو جاؤں گا۔ میرے دوست وہاں اس کی دیکھ بھال کے لیے بہت سے لوگ ہیں، یہاں کون ہے اس کا، اُف خدایا! تمہاری سمجھ میں آخر یہ بات کیسے آئے گی؟" وقار بے چارا بول بول کر تھک گیا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ فیصلہ صمد کے لیے دو دھاری تلوار بن گیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم ایک دو دن تک اس بارے میں کچھ نہ سوچو۔ جب تمہارا مزاج اور تمہاری عقل ٹھکانے پر آ جائیں، تب تم کوئی فیصلہ کرنا۔ میں اب بھی وہی کہتا ہوں جو پہلے کہہ رہا تھا۔" وقار نے چند ثانیے رُک کر اُسے دیکھا اور پھر بولا۔ "میں اب چلتا ہوں کل صبح پھر آؤں گا۔"

"اچھا!" صمد نے آہستگی سے سر ہلایا۔

وقار باہر نکل گیا۔

○ ● ◆

"ابو! میں کہاں جا رہا ہوں؟" نہال، صمد کے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔
"بیٹے! آپ اپنے نانا جان کے پاس جا رہے ہیں۔"
"نانا جان کیا ہوتا ہے؟" وہ معصومیت سے بولا۔
"جیسے ہم آپ کے ابو ہیں، ایسے ہی وہ آپ کی امی کے ابو ہیں، آپ اُن کے پاس جا رہے ہیں۔"
"ابو! وہ آپ کے بھی نانا جان ہیں۔"
صمد ہنس پڑا۔ "نہیں بیٹے! میرے تو وہ دشمن ہیں۔" اس کے انداز میں تلخی نمایاں تھی۔
"دشمن کیا ہوتا ہے؟"
"جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو خود ہی پتا چل جائے گا۔" صمد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔
"ابو! کیا میں آپ کے ساتھ جاؤں گا؟"
"نہیں میری جان! وقار انکل آپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔"
"نہیں ابو! میں آپ کے ساتھ جاؤں۔" وہ مچل کر بولا۔ "وہاں آپ نہیں ہوں گے تو مجھے اسکول کون چھوڑ کر آئے گا، کپڑے کون بدلے گا اور مجھے کھانا کون کھلائے گا۔"
"یہ سب کام آپ خود کریں گے۔ اب آپ بڑے ہو گئے ہیں، آپ کو خود کرنا چاہیے۔" صمد کی آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔
"مجھے رات کو نیند نہیں آئے گی تو کیا میں اپنے آپ کو کہانی بھی خود سناؤں گا؟"
صمد لاجواب ہو کر رہ گیا۔
"میرے بچے! آپ رات کو سوتے وقت کھڑکی سے باہر چاند کو دیکھا کیجیے گا، آپ کو خود بخود نیند آ جائے گی۔"
صمد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نہال کو کیسے سمجھائے اور کیا سمجھائے۔
"مگر مجھے آپ کو دیکھے بغیر نیند نہیں آئے گی۔" نہال کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔
"مت کرو تم ایسی باتیں، کیوں میری جان لینے پر تلے ہوئے ہو!" اس نے سختی کے ساتھ بیٹے کو سینے سے بھینچ لیا۔

شدید کرب کے عالم میں آنکھیں میچ لیں۔

○ ● ◆

"وقار! یہ سارے میرے کاغذات ہیں اور یہ میری وصیت ہے۔"
"صمد!" وقار کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔
"پلیز وقار! تم میری بات غور سے سنو۔ میری وصیت کے مطابق میری ساری جائداد کا وارث نہال ہے۔ فیکٹری کا تو تم کو پتا ہے کہ سارا حساب کتاب قریشی صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ نہال کے باشعور ہونے تک وہ اسی طرح فیکٹری کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔ اس کے بعد نہال با اختیار ہو گا۔ ہر چیز اس کے کنٹرول میں دے دی جائے۔ وہ گھر جس میں، میں اور لالہ ابو رہا کرتے تھے، وہ میں قریشی صاحب کے نام کر رہا ہوں۔ اُن کے مجھ پر بہت احسانات ہیں یہ وفاداری اور ایمانداری کی مجسم مثال ہیں۔
یہ میری ڈائریاں ہیں، اس میں میری زندگی کی ہر حقیقت بند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بیٹے کو میری زندگی میں رونما ہونے والے ایسے ہر واقعے کا علم ہو۔ وہ میری زندگی کے ہر پہلو سے واقف ہو۔ میں نے تفصیل سے اس کی ماں اور خاص طور پر اس کے نانا کا ذکر کیا ہے۔ شادی سے لے کر نہال کے پاکستان بھجوانے تک کے طرزِ عمل کا۔
یہ لو۔" اس نے ایک بڑا سا لفافہ وقار کو دیا۔ "یہ میری اور میرے بیوی بچے کی تصویریں ہیں۔"
"میرے دوست!" صمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تمہاری دوستی میری زندگی کی خوشگوار حقیقت ہے۔ میرے بچے کا خیال رکھنا اور اسے ہمیشہ احساس دلانا کہ اس کا باپ کم ہمت اور بزدل نہیں تھا، مگر حالات نے اس کو جھکا دیا۔"
"صمد! تم حوصلے سے کام لو۔"
"اب کہاں حوصلہ رہ گیا ہے۔ بس کچھ دن رہ گئے ہیں۔ دعا کرو، وہ بھی کم ہو جائیں۔ میں نہال کے جانے کے بعد جینا نہیں چاہتا۔"
وقار نے بھرپور نگاہ ڈال کر صمد کے زرد چہرے کو دیکھا۔ وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ آنکھیں بالکل ہی اندر دھنس چکی تھیں۔ کیسا خوبصورت اور وجیہہ تھا صمد۔ سب دوست اس کو پرنس کہتے تھے۔ کیسا کملا گیا تھا۔ بالکل سی خزاں رسیدہ پھول کی مانند لگ رہا تھا۔
"کیا دیکھ رہے ہو؟"
"بے فکری کے دن تلاش کر رہا ہوں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔
"بے فکری کے دن ― ہاہ!" صمد کی ہنسی بڑی کھوکھلی سی تھی۔ "زندگی بذاتِ خود جہنم بن جائے تو بے فکری کے دن خواب بن جاتے ہیں۔"
"صمد! دکھ سکھ ملا کر ہی زندگی بنتی ہے۔ نصیب کی بات ہے یہ تو، کسی کی قسمت میں پھول زیادہ، کسی کے مقدر میں کانٹے زیادہ۔ کیا تم نے ناجیہ بھابی کے ساتھ بھرپور زندگی نہیں گزاری؟" وقار نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"ہاں، بھرپور زندگی مگر ادھوری ―" وہ یاس سے بولا۔
"اوکے یار! میں چلتا ہوں، پیکنگ بھی کرنی ہے، کل صبح کی فلائٹ ہے۔"
"ہاں، میں جانتا ہوں کہ میرے اور تمہارے بچے کے درمیان بیس گھنٹے کا فاصلہ رہ گیا ہے، اس کے بعد لمبی جدائی ہمیشہ کی، کبھی نہ ختم ہونے والی، ایک لامتناہی سلسلہ۔"
"صمد!" وقار نے اُسے گلے سے لگا لیا۔
اور ضبط کی انتہا پر کھڑا صمد بُری طرح ٹوٹ گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔
"اللہ کے واسطے صمد! میرے صبر کا امتحان نہ لو۔" وقار خود بھی بے حد دُکھی ہو رہا تھا۔
"اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تم آج کا دن اپنے بچے کے ساتھ گزارو۔" اس نے صمد کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"آل رائیٹ، تم آؤ گے یا میں آ جاؤں؟" صمد نے پوچھا۔
"نہیں، میں ہی آ جاؤں گا۔" وقار اس کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔
صمد، نہال کو آؤٹنگ پر لے گیا۔ اُسے خوب گھمایا پھرایا، اس کی آواز ٹیپ کی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ابو! آپ کب آئیں گے؟" نہال اُس کی گود میں چڑھ کر بیٹھا تھا۔

"بہت جلد آؤں گا۔" اُس نے پیار سے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"وہاں اور کون ہوگا؟"

"وہاں آپ جیسے بہت سے بچے ہوں گے، وہ سب آپ کے بھائی بہن ہیں۔ وہ آپ سے پیار کریں گے آپ اُن سے محبت کرنا، آپ وہیں پڑھیں گے، میرے بچے تم دل لگا کر پڑھنا۔ تم اپنے زورِ بازو پر یقین رکھنا کسی پر انحصار نہ کرنا۔ خدا تمہیں کسی کا زیرِ احسان نہ کرے۔"

(اوہ! میرے بچے! میں تم کو کیسے سمجھاؤں، کاش تم اتنے چھوٹے نہ ہوتے)

اگلے دن بہت خاموشی سے اس نے نہال کو وقار کے حوالے کر دیا۔ وقار نے اُسے گود میں لے لیا۔ اچانک ہی صمد نے اُسے وقار کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا اور دیوانوں کی طرح پیار کرنے لگا۔

"صمد! ہوش میں آؤ۔" وقار کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔

"وقار پلیز، میرے بچے کا خیال رکھنا۔" اُس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔ آنکھوں میں سیکڑوں حسرتیں تھیں۔

"بے فکر رہو اور اپنا خیال رکھو۔ میں تم سے فون پر رابطہ کرتا رہوں گا۔"

صمد چپ ہو گیا۔

وقار اُس کی زندگی کی واحد خواہش اپنے ساتھ لے گیا۔

صمد نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے نیچے ان دونوں کو دیکھا۔ وقار، نہال کو کار میں بٹھا رہا تھا۔

"میرے خدا، میرے بیٹے کو اپنی امان میں رکھنا۔

میرے خدا اسے مضبوط کردار کا آدمی بنانا۔ اسے ہر اچھی بُری بات کا شعور دینا۔

میرے خدا اسے بے حساب خوشیاں دینا۔ اتنی کہ اس سے سنبھالی نہ جائیں۔

میرے خدا غم، دُکھ، تکلیف کے الفاظ میرے بیٹے کی زندگی سے مٹا دے

میرے خدا، میرے بیٹے کو اس راستے پر چلانا جو تیرا راستہ ہو۔

میرے خدا میں نے اپنے بیٹے کو تیرے حوالے کیا۔"

صمد کا دل، اس کے جسم کا رواں رواں، زبان بن کر نہال کے لیے دُعائیں کر رہا تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

وقار نے سید صاحب سے ٹیلی فون پر بات کر لی تھی کہ وہ جمعہ کی شام نہال کو لے کر ان کے پاس آ رہا ہے۔ وہ نہا کر اپنے کمرے سے نکلا تو نہال کو اپنے صوفے پر بیٹھا پایا۔ معصوم، بھولا بھالا سا بچہ بالکل خاموش سمٹ کر صوفے پر بیٹھا تھا۔

وقار کو اس پر پیار آ گیا

"نہال یہاں آؤ میرے پاس۔" اس نے بازو پھیلایا۔

وہ صوفے سے اُتر کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ تیار ہیں نانا جان کے ہاں جانے کے لیے؟" اس نے نہال کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"جی۔"

"ڈر لگ رہا ہے؟"

"نہیں۔"

"رونا آ رہا ہے؟"

"نہیں۔"

"گھبراؤ گے تو نہیں؟"

"نہیں۔"

وقار بے ساختہ ہنس پڑا۔ اسے گود میں لے کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"جہاں میں تم کو لے کر جا رہا ہوں، وہ تمہارے نانا جان کا گھر ہے۔ وہاں تم جیسے اور بھی بچے ہوں گے۔ وہ سب تمہارے اپنے ہیں۔ تم ان سے دوستی کرو گے کھیلو گے۔ ان کے ساتھ ہی اسکول جایا کرو گے۔ ٹھیک؟" نہال نے فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلایا۔

"تنگ نہیں کرنا ہے، کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرنا ہے۔ بہت اچھے بچوں کی طرح رہنا ہے۔"

"جیسے آپ کہیں گے، میں ویسا ہی کروں گا۔" وہ آہستہ سے بولا۔ وقار نے اس کو سینے سے لگا لیا۔

اتنے چھوٹے سے بچے کے لیے زندگی کو وقت نے آزمائش بنا دیا ہے۔ اس نے بے حد دکھ سے سوچا۔ "آؤ چلیں۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر باہر آ گیا۔

پناہ گاہ پہنچ کر اس نے اپنے آنے کی اطلاع کرائی۔ سید صاحب نے اسے فوراً ہی اندر بلا لیا۔ اتفاقاً سکندر رضا بھی اس وقت سید صاحب کے ہمراہ موجود تھے۔

"السلام علیکم۔" وقار قریب آ گیا۔

"وعلیکم السلام۔" دونوں بیک وقت بولے۔

"آؤ بیٹھو۔" سید صاحب نے کرسی کی طرف اشارا کیا۔

"یہ نہال ہے صمد کا بیٹا۔"

"ہوں۔" سید صاحب نے بغور نواسے کا جائزہ لیا۔

ناجیہ نے صمد کا ایک ایک نقش چُرا کر بیٹے کو دے دیا تھا۔

"آداب۔" نہال نے معصومیت سے کہا۔

"یہاں آؤ۔" سید صاحب نے رعب دار آواز میں کہا

نہال نے وقار کی طرف دیکھا۔ اس نے خفیف سا مسکرا کر نظروں سے اشارا کیا

"جی۔" نہال ڈرتے ڈرتے ان کے قریب چلا گیا۔

"یہاں ہمارے پاس بیٹھو۔" انہوں نے ایک خالی کرسی گھسیٹ کر قریب کر لی۔ نہال بیٹھ گیا۔

وہ وقار سے مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے رہے۔ پر صمد کا ذکر کہیں موجود نہ تھا۔ وقار اندر ہی اندر کھولتا رہا۔

"صمد میاں کیسے ہیں؟" سکندر رضا ہی نے پوچھا

"انتظار کر رہا ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"میں سمجھا نہیں برخوردار۔"

"اصل کے پیغام کا۔"

"کیا کوئی امید نہیں ہے بہتری کی؟" سکندر رضا افسوس زدہ لہجے میں بولے۔

"نہیں، اب تو بس گنے چنے ہی لمحے رہ گئے ہیں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

"نہال کے لیے جوس لے کر آؤ۔" ملازم چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا لایا تو سید صاحب نے نواسے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

ملازم جوس کا گلاس لے آیا تو سید صاحب نے پلیٹ میں سے گلاس اٹھا کر نہال کی جانب بڑھایا۔ "یہ لو۔"

"تھینک یو۔" اس نے بڑھ کر تھام لیا۔

چائے پی کر وقار نے رخصت کی اجازت چاہی۔

"تم اس کی طرف سے فکر نہ کرنا۔" سید صاحب نے نہال کی جانب اشارا کیا۔

"مجھے آپ سے اچھی ہی امید ہے۔ او کے مائی سن۔ خدا حافظ۔" اس نے جھک کر نہال کو پیار کیا۔ "میں تم سے ملنے آتا رہوں گا۔"

"انکل، ابو کب آئیں گے؟" وہ ایک دم اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"بہت جلدی آئیں گے۔" وقار نے ایک نظر سید صاحب پر ڈالی اور تیز تیز قدموں سے واپس لوٹ گیا۔

نہال کے معصوم چہرے پر آنسو بڑی خاموشی سے بہنے لگے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

یہاں اس کو ایک نئی زندگی شروع کرنی تھی۔ ایک نئے راستے پر اکیلے ہی سفر کرنا تھا۔

○ ● ◆

انابی جونہی داخل ہوئیں ان کی آنکھوں کے سامنے جاند تارے ناچ گئے۔ کمرہ تھا کہ میدانِ حشر کا نمونہ۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ جائزہ لینا شروع بھی کریں تو کہاں سے۔

قالین پر نہال بیٹھا تھا۔ اس کے ایک گھٹنے پر ذیشان کا سر تھا۔ دوسری ٹانگ کے نیچے بقیہ ماندہ ذیشان تھا گویا اس کی ٹانگ کے پل کے نیچے دبا ہوا تھا۔ کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ آیا ذیشان نہال کی گود میں ہے یا نہال ذیشان کی گود میں۔ نہال نے اس کے منہ میں فیڈر دے رکھا تھا۔

ننھی زیبا بھی منہ میں فیڈر ٹھونسے بیٹھی تھی۔ اس کے پاس انگریزی کے رسالے بکھرے ہوئے تھے جن کی وہ آخری رسومات ادا کر رہی تھی۔ جابجا پھٹے ہوئے کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ شہیر دیوار پر چاک سے لکھنے اور نادیدہ بچوں کو پڑھانے میں مصروف تھا۔ ساتھ ہی لکڑی کے اسکیل سے پردوں اور صوفوں کی ٹھکائی بھی جاری تھی

"اللہ کی پناہ۔" انابی نے سر تھام لیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے گھر میں؟" وہ سخت برہمی سے بولیں۔

"انابی، ذیشان کو دودھ پلا رہا ہوں۔" نہال نے بڑے مزے سے جواب دیا۔

"کس نے کہا تھا تم سے؟ اور یہ جاذب اور خمار کہاں ہیں؟" بچوں کی کل تعداد میں انہیں خاصی کمی ہوئی تو بقیہ کو پوچھا۔

"دونوں نہا رہے ہیں۔" نہال بے حد خشوع و خضوع سے دودھ پلانے میں مصروف تھا۔

"اُف۔" وہ تیزی سے باتھ روم کے کھلے دروازے میں داخل ہوئیں جہاں کپڑوں سمیت نہانے کی مشق جاری تھی۔ جاذب میاں ٹب میں پائے جاتے تھے۔ خمار بی بی شاور کے نیچے کھڑی تھیں۔

"ادھر آؤ دونوں۔" انہوں نے دونوں کو پکڑ کر باہر نکالا۔ "رحیمہ۔ او رحیمہ۔" انہوں نے ملازمہ کو آواز دی۔

"شہیر۔" وہ شہیر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "تم نے ان دونوں کو منع نہیں کیا۔ خدا جانے کب سے نہا رہے ہیں۔"

"یہ خود ابھی نہا کر نکلے ہیں۔" نہال نے شہیر کا وہائٹ پیپر جاری کر دیا۔

انابی دھم سے صوفے پر بیٹھ رہیں۔ اتنی دیر میں ساڑھے تین من کی رحیمہ لشتم پشتم آن پہنچی۔

"میں دو گھنٹے کے لیے بازار چلی گئی تو بچوں نے یہ حشر کر دیا۔ تم ان کو سنبھال نہیں سکتی تھیں۔ جلدی جاؤ اور ان سب کے کپڑے نکال کر لاؤ۔" ان کا نزلہ رحیمہ پر ہی گرنا تھا۔

"نہال، میرے پاس آؤ۔"

"جی آ رہا ہوں۔" وہ حکم بجا لانے کو تیار تھا

اب سوال یہ تھا کہ وہ ذیشان کو اپنی گود سے اتارے یا خود اس کی گود سے اترے۔ "نا یا با مشکل۔" دونوں ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے تھے۔

"انابی، میں نہیں آ رہا ہوں۔" اس نے حکم کی تعمیل سے مجبوراً انکار کیا۔

انابی نے انہیں ایک دوسرے میں سے باہر نکالا۔

"تم سے کس نے کہا تھا کہ ذی شان کو دودھ پلاؤ۔ میں پلا کر گئی تھی۔" انہوں نے نہال کو گھورا۔

"انابی، یہ رو رہا تھا۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"اور یہ دودھ میں کیا ملایا ہے؟" انہوں نے دودھ کی شیشی کو غور سے دیکھا۔

"روح افزا۔"

"اوئی میرے اللہ۔ یہ بچہ ہے یا بلا۔" انہوں نے سر پیٹ لیا۔ "کس نے کہا تھا؟"

"انابی اس طرح بچے بہت شوق سے دودھ پیتے ہیں۔" اس نے خدا بہتر جانے کتنے بچوں اور کتنے سالوں کے تجربے کا نچوڑ پیش کیا۔

انابی نے دانتوں تلے لب دبا کر بے ساختہ آنے والی مسکراہٹ روکی۔

"شیراز سو رہا ہے کیا؟" انہیں بہت دیر میں شیراز یاد آیا

"نہیں انابی۔ جس ٹیبل کے پاس آپ کھڑی ہیں شیراز اور جواہر اس کے نیچے ہیں۔"

انابی نے نیچے سے دونوں کو گھسیٹا۔ رحیمہ ان کے کپڑے لے آئی تو سب کے کپڑے تبدیل کرائے۔

تھوڑی دیر میں سب بچے اپنی انابی کے ساتھ میز پر بیٹھے تھے۔ رحیمہ نے ان سب کے آگے گرم دودھ کا گلاس رکھا اور انابی ان کو بتانے لگیں کہ انہوں نے بچوں کے لیے کیا کچھ خریدا ہے۔

"میرے لیے بھی لائی ہیں آپ؟" نہال بے یقینی سی کیفیت میں کرسی سے اتر کر ان کے قریب آ گیا۔

"ہاں میرے لعل کیوں نہیں؟" انہوں نے اسے پیار کر لیا۔

"تھینک یو۔" خوشی اس کے چہرے پر چھا گئی۔ وہ دوبارہ اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

جانے اس کو محبتوں کا یقین کیوں نہیں آتا۔ وہ اس صورت دیکھے گئیں۔ انہیں یاد آیا جب پناہ گاہ میں نہال کا پہلا دن تھا۔

وہ کچن سے باہر نکلیں تو نہال کو سیڑھیوں پہ بیٹھا پایا۔ جانے کس دنیا میں مگن تھا۔ من موہنی سی صورت، ادا میں معصومیت۔ انہیں بہت ٹوٹ کر اس پہ پیار آیا۔

"نہال!" انہوں نے پیار سے پکارا۔

"جی۔" وہ قدرے سہما سہما سا لگا۔

"بیٹا اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟" انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"میں اکیلا ہوں ناں اس لیے اکیلا ہی بیٹھا ہوں۔" وہ نظریں جھکا کر بولا۔

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ وہ تڑپ سی گئیں۔ جھٹ اسے گود میں چھپا لیا

"خدا نہ کرے اکیلے کیوں ہوتے۔" انہوں نے چٹا چٹ اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"تم جیسے تو یہاں اور بھی بچے ہیں۔ تمہاری طرح پیارے پیارے۔ تم ان سے ملے؟ نانا جان نے ملوایا؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"آؤ میں ملواتی ہوں۔" وہ اسے لے کر بچوں کے کمرے میں آ گئیں۔ بچے اسے دیکھ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے انداز میں اشتیاق سا جھلک رہا تھا۔

"ان سے ملو بچو، یہ ہیں تمہارے بھائی نہال۔ آج سے یہ بھی اسی گھر میں رہیں گے تمہارے ساتھ۔ بھائی کو تنگ نہیں کرنا ہے۔ بہت خیال رکھنا ہے۔ سب وعدہ کریں۔" بچوں نے جھٹ وعدہ کر لیا۔

"چلو بھئی نہال، میں تم کو ان سب کے نام بتاؤں۔

یہ شہیر ہے۔ خمار اور وہ جھولے میں سوئی زیبا، یہ دونوں شہیر کی بہنیں ہیں۔ یہ شیراز ہے، جواہر اس کی چھوٹی بہن ہے۔ اب بچے جاذب اور ذیشان یہ دونوں آپس میں بھائی ہیں۔"

"مگر میرا تو کوئی بہن بھائی نہیں ہے۔" وہ جیسے پریشان سا ہو کر بولا تھا۔

"یہ سب تمہارے بہن بھائی تو ہیں۔ جاؤ ان کے ساتھ کھیلو۔"

نہال جلد ہی ان سب میں گھل مل گیا۔ نہ اس کے انداز میں اتنی جھجک رہی تھی اور نہ چہرے پر خوف کی پرچھائیں۔ انابی اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھیں۔

وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا، کیوں آیا تھا۔ وہ سب جانتی تھیں۔ وہ اتنا پیارا، اتنا بھولا بھالا سا تھا کہ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے اور بچوں کو اپنے سائے میں چھپا لیا ہے ایسے ہی اسے بھی سمیٹ لیں گی۔

○ ● ◆

دراصل سید صاحب کے سرد رویے نے نہال کو محبتوں کے معاملے میں بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے سید صاحب کے وجود میں محبت اور شفقت تلاش کرنا چاہی۔ مگر ان کی نگاہیں اس قدر سرد ہوتیں کہ ان کی ٹھنڈک اس کے وجود میں پھیل جاتی۔ جانے کیسی نظریں تھیں ان کی۔ نہال ڈرنے لگتا۔ ان کا لہجہ اور پکارنے کا انداز ایسا تھا کہ اس کا سانس بند ہونے لگتا۔ سید صاحب اپنے پوتے اور پوتیوں پہ تو کبھی کبھار دستِ شفقت رکھ بھی دیا کرتے تھے مگر نہال سے انہوں نے کچھ لاتعلقی سی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے لیے نو لفٹ کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ ان کے اس طرزِ عمل نے نہال کو ان سے دور کر دیا۔ رفتہ رفتہ وہ ان سے کترانے لگا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سیّد صاحب کا دوسرے بچوّں سے التفات پہلے وہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ حسرت کی جگہ غصّے نے لے لی۔ اس کی جھجک، اس کا خوف، خودسری اور ضد میں بدل گئے۔ وہ دن بدن بدتمیز ہو گیا۔ ہر اس بات کی نفی کرتا جو سیّد صاحب کہتے۔

وہ کہتے ہاں، یہ کہتا نا۔
وہ کہتے زمین، یہ کہتا آسمان
وہ کہتے مشرق، یہ کہتا مغرب
وہ کہتے اِدھر، یہ کہتا اُدھر۔
وہ کہتے یہاں، وہ کہتا وہاں

○ ● ◆

جاذب کی تجویز پر سب لوگ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ جواہر کی آنکھوں پر پٹّی بندھی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہی تھی۔ نہال ایک جھاڑی کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اس کی پشت جواہر کی طرف تھی۔ جواہر نے جو ہاتھ مارا تو وہ زور سے نہال کی کمر پر لگا۔ وہ اوندھے منہ گر گیا۔ اس نے پلٹ کر جواہر کے منہ پر زوردار چانٹا جڑ دیا۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی
عین اوپر گیلری میں کھڑے سیّد صاحب یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔
"نہال" انہوں نے دھاڑ کر کہا
نہال نے سہم کر اوپر دیکھا۔
"اوپر آؤ"
نہال خاموشی سے اندر کی جانب بڑھ گیا۔
"تم نے جواہر کو کیوں مارا؟" انہوں نے اس کا کان پکڑ لیا۔
"پہلے اس نے مجھے مارا تھا" وہ بے خوفی سے بولا۔
"اس نے تم کو جان بوجھ کر نہیں مارا تھا۔"
"مارا تو تھا ناں" وہ بحث کرنے کے سے انداز میں بولا۔
"آئندہ اگر تم نے اس پر ہاتھ اٹھایا تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ ناؤ گیٹ آؤٹ"
نہال زور زور سے پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔
نیچے لاؤنج میں سب لوگ ایک لائن میں کھڑے تھے۔
"زیادہ تو نہیں ڈانٹا؟" جاذب نے پوچھا۔ نہال نے کوئی جواب نہ دیا۔ جواہر کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اچانک ایک زنّاٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مار دیا۔
"نانا جان نے کہا تھا کہ اب جواہر کو نہ مارنا۔ اسی لیے میں نے تم کو مارا ہے سوری" یہ کہہ کر دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔
اور پھر ان کے منہ سے نکلی بات تو کیا، اس نے تو ان کی سوچ، ان کی خواہش، ہر بات، ہر چیز رد کر دی۔ کالج میں خواہش کے مطابق پری انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔ اس کو معلوم ہوا کہ سیّد صاحب کی آرزو ہے کہ وہ اور جاذب کیمیکل سائنس میں انجینئرنگ کریں۔ اس نے جھٹ اپنے مضامین تبدیل کر کے کامرس لے لی۔ اس کو علم ہوا کہ سیّد صاحب کیلیفورنیا کی کسی یونیورسٹی میں اس کا داخلہ کرانے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ اَڑ گیا کہ اس نے ایم بی اے انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈ منسٹریشن سے کرنا ہے اور اس نے وہیں سے کر کے دم لیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے اپنے باپ کی فیکٹری سنبھال لی۔

○ ● ◆

"پتا نہیں، وہ آئے گا یا نہیں؟"
"روز فون کر کے کہہ دیتا ہے کہ شام کو ضرور آجاؤں گا اور آتا نہیں ہے" جاذب نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
"مجھے بھوک لگ رہی ہے" ذیشان کے پیٹ میں چوہوں کے علاوہ اور بھی کئی اقسام کے جانور دوڑنے لگے۔
"بھئی، انہوں نے کہا تھا کہ چھ بجے تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ اب چھ بجنے میں دیر ہی کتنی رہ گئی ہے" جواہر

پھولوں کا گلدستہ بنانے میں مصروف تھی۔
وہ سب لوگ "تاج محل" میں بیٹھے تھے۔ وسیع و عریض لان کے بیچوں بیچ بنے سنگِ مرمر کے اس بڑے سے چبوترے کو جس کے چاروں اطراف سیڑھیاں تھیں۔ ذیشان نے تاج محل کا نام دے رکھا تھا۔
ان سب کو نہال کا انتظار تھا۔ نہال نے اپنے لیے ایک بڑا سا خوبصورت فلیٹ خرید لیا تھا۔ فیکٹری سے لوٹتے ہوئے اگر دیر ہو جاتی تو وہ اپنے فلیٹ پر چلا جاتا تھا ورنہ پناہ گاہ آجاتا۔ آج کل اس پر کام کا زیادہ لوڈ تھا۔ وہ ہفتے بھر سے اپنے فلیٹ میں ہی رہ رہا تھا۔ اور فون کر کے ان سے کہتا کہ آج ضرور آجاؤں گا۔ اور روزانہ کو چکمہ دے جاتا۔
انہیں گیٹ پر نہال کی کار کے ہارن کی آواز آئی۔ گیٹ کھلنے کے ساتھ ہی ڈرائیو وے پر نہال کی کار آتی نظر آئی۔
وہ جونہی کار سے اترا، ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کا شور بلند ہوا۔ اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ سب "تاج محل" میں کھڑے تھے۔
نہال کا دل جیسے ان کی محبتّوں کے عوض بک گیا۔
"یہ کیا قیامت مچا رکھی ہے تم لوگوں نے" گرے شلوار قمیص میں ملبوس تھکا تھکا سا نہال ان کی جانب بڑھا۔
"حضور! آج کے دن آپ جناب نہال آفریدی صاحب بہ نفسِ نفیس خود اس دنیائے فانی میں تشریف لائے تھے۔ اور ہم پر بطور بلائے ناگہانی نازل ہوئے تھے۔ یہ سارا انتظام اسی بھیانک واقعے کی یاد تازہ کرنے کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ بس آپ کی سواری بادبہاری کا انتظار تھا" زیبا شوخی سے بولی۔
"اوہ" نہال ہنس پڑا۔ آج اس کی سالگرہ تھی مگر اسے قطعی یاد نہ رہا تھا۔
"تحفوں کا بھی انتظام کیا ہے یا صرف ٹھونسنے کے لیے بیٹھے ہو؟" اس نے ایک نگاہ سب پر دوڑائی۔
"نیّت میں اس قدر وافر مقدار میں خرابی تو ہمارے ہاں صرف ذیشان میں پائی جاتی ہے۔ آپ تو ایسے نہ تھے" خمار نے حیرت کا اظہار کیا۔
"میرا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میری نیّت کی شان میں گستاخی کی ضرورت ہے" ذیشان نے تیز لہجے میں کہا۔
اس کے اور خمار کے سفارتی تعلقات زیادہ تر خراب ہی رہتے تھے۔ دونوں کا آپس میں سلوک ایسا ہی تھا جیسے کسی دو سوکنوں کا ہو سکتا ہے۔
"بھائی جان" ذیشان، نہال کی طرف متوجہ ہوا۔ "اس سے پہلے کہ میں معصوم، نیک شریف بچّہ بذاتِ خود مارے بھوک کے اس جہانِ فانی سے پردہ فرما جاؤں اور یہ سب نعمتیں جو میز پر میری عنایت کی منتظر ہیں، میرے لواحقین میرے سوم میں آ کر کھائیں۔ آپ مجھ ناتواں حقیر، فقیر، بندۂ پُرتقصیر پر رحم کھایئے اور جلدی سے آیئے" ذیشان نے چھری نہال کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے مختصراً اپنا مدعا بیان کیا۔
"تمہاری زبان کو کاٹ کر عجائب گھر میں رکھوا دینا چاہیے" خمار جل کر بولی۔
"اور آپ کو پورے کا پورا عجائب گھر میں رکھ دینا چاہیے" وہ ترکی بہ ترکی بولا۔
"اچھا بس اب میں کیک ذبح کرنے والا ہوں" نہال کیک پر جھکا۔ پھر ایک دم سیدھا ہو گیا۔ اسے کچھ خیال آ گیا تھا۔
"میں ابھی آتا ہوں" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا
"نشریاتی رابطے میں خرابی ہونے پر ادارہ دلی معذرت اور احتجاج کرتے ہیں" ذیشان نے میز پر مکاّ مارا۔
"اور احتجاجی مظاہرے کے طور پر الٹا لٹک رہے ہیں" خمار نے آگے سے جملہ پورا کیا۔ ذیشان بھنا کر رہ گیا۔
"زیبا، تم اوون میں سے مرغی نکال کر لاؤ" جواہر نے کہا۔
"اچھا" وہ اندر چلی گئی۔ نہال نے سیّد صاحب کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔
"کون ہے؟"
"نانا جان۔ میں ہوں۔ السّلام علیکم"
"وعلیکم السّلام۔ کیا بات ہے؟"
نہال ایک لمحے کو چپ ہو گیا پھر گویا ہوا۔
"نانا جان! یہ لوگ میری برتھ ڈے منا رہے ہیں۔ آپ بھی ہم لوگوں کو کمپنی دیجیے"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔" اندر سے روکھا جواب آیا۔
نہال کی بھنویں سکڑ گئیں۔
"ویسے صاحبزادے، میرا خیال ہے کہ اب آپ بچے نہیں رہے۔"
نہال کے وجود میں جیسے چنگاریاں سی سلگ گئیں۔
"زیبا۔!" اس نے سیڑھیاں چڑھتی زیبا کو سخت لہجے میں پکارا۔ "وہ کیک اٹھا کر باہر پھینک دو۔"
وہ دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اترا اور دوسری منزل پہ واقع اپنے بیڈروم میں گھس گیا اور زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔
زیبا بونقوں کی طرح ہاتھ میں ٹرے لیے کھڑی رہ گئی۔ وہ پلٹی تو انابی سامنے سے آ رہی تھیں۔
"انابی۔ وہ۔!" اس نے نہال کے بیڈروم کی طرف اشارا کیا۔
"تم چلو۔ میں آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ نہال کے کمرے کی طرف بڑھیں اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں۔ نہال جوتوں سمیت بستر پہ آڑا ترچھا پڑا تکیے میں منہ گھسائے ہوئے تھا۔ انابی آگے بڑھیں اور اس کے جوتے اتارنے لگیں۔ اپنے ٹخنوں پہ ہاتھ کا لمس محسوس کر کے وہ چونک کر مڑا اور پھر تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔
"انابی! یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ کیوں مجھے گنہگار کر رہی ہیں؟" اس نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔
"ارے تو میرا بچہ ہی تو ہے۔" ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔
"مونہہ۔ میں محبت کے قابل نہیں ہوں انابی۔" وہ طنزیہ ہنسا اور موزے اتارنے لگا۔
"بکواس نہ کر۔ تجھے اپنے بہن بھائیوں کا خیال نہیں ہے۔ کب سے وہ تیرے انتظار میں بیٹھے ہیں اور تو ہے کہ نخرے دکھا رہا ہے۔ کیا تجھے ان کی محبتوں کا احساس نہیں ہے؟" وہ قدرے خفگی سے بولیں۔
نہال خاموش رہا۔
"تو ایک آدمی کی سزا سب کو کیوں دے رہا ہے میرے چاند؟" انابی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اب اٹھ بھی جا نا۔ کیا اینٹھا پڑا ہے۔"
نہال نے ذرا مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور چپلوں میں پاؤں پھنسا کر باہر آ گیا۔
"کہاں رہ گئے تھے۔؟" شیراز نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
زیبا ساری رپورٹ نشر کر چکی تھی۔
"اذیت کی سولی پہ لٹک گیا تھا جا کر۔" وہ دھم سے کرسی پہ بیٹھ گیا۔
"کیوں گئے تھے تم وہاں؟" شہیر نے اسے گھورا۔
"بے وقوف ہوں نا شاید۔ ہر بار نئی چوٹ کھانے میں لطف آتا ہے۔ عادت سی ہو گئی ہے۔"
"چلو چھوڑو۔ جو لمحہ خوشی بن کر آئے اسے فوراً سے پیشتر دائیں بائیں دیکھے بغیر قابو میں کر لینا چاہیے۔"
"ختم کرو بات کو اور کیک کاٹو۔" جاذب نے بات آئی گئی کر دی۔
نہال نے کیک کاٹا۔ سب نے اس کو مبارکباد دی۔
"اب سب لوگ نہایت خشوع خضوع سے دعا کریں کہ اللہ نہال بھائی کی عمر دراز کرے اور یہ عاقبت کے بوریے سمیٹیں۔" ذیشان نے سب پر ایک نظر ڈالی۔
"آمین۔" باجماعت آواز آئی۔
"میں بھی ساتھ میں مدد کروں؟" ذیشان اسی لہجے میں بولا۔
"کس سلسلے میں؟" خمار نے تیکھے چتونوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"عاقبت کے بوریے سمیٹنے میں۔ کہو آمین۔"
خاموشی۔
"سانپ سونگھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جلدی سے آمین کہا جائے۔"
"آمین۔" مری مری آوازیں نکلیں۔
"اب اتنی اونچی آواز میں تو انسان کہے کہ کم از کم فرشتے تو سن ہی لیں۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

"اب تحفے وغیرہ بھی تو میری خدمت میں پیش کرو۔" نہال نے گلاس میز پہ رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ لو مرو۔" شہیر نے اپنی کرسی کے نیچے رکھا ڈبہ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔
"یہ ہم سب کی طرف سے ہے۔" جواہر جلدی سے بولی۔
"یہ تو بڑا ہلکا سا ہے۔" نہال نے اس کا ریپر اتارتے ہوئے کہا۔
"تو کیا ساہیوال کی بھینس اس میں رکھ کر دیتے؟" ذیشان جل کر بولا۔
نہال نے ڈبہ کھولا تو اس میں اوپر تک گھاس بھری ہوئی تھی۔ اس نے کڑی نگاہوں سے جاذب کو دیکھا۔ "یہ تحفہ ہے؟"
"تمہارے لیے مناسب ہے۔" جاذب ہنس کر بولا۔
"جو خود کھاتے ہو۔ وہی مجھے بھی دے رہے ہو۔" اس نے ڈبہ جاذب کی گود میں پٹخ دیا۔
"ہم نے تمہارے لیے نیا ڈیک خریدا ہے۔ تمہارے کمرے میں رکھا ہے۔" شیراز نے بالآخر بتا دیا۔
"شکریہ۔" وہ ممنونیت سے بولا تھا۔

○ ● ◆

وہ شام کو ہی پناہ گاہ پہنچ گیا تھا۔ اتنا تھکا ہوا تھا کہ جاتے ہی اپنے کمرے میں بستر میں گھس کر سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو رات اتر آئی تھی۔ کمرے میں لائٹ بھی نہیں جلی تھی۔ وہ سستی سے بستر میں پڑا رہا۔ اچانک دروازہ کھلا اور شیراز اندر داخل ہوا۔
"آئیے شیراز بھائی۔" وہ اٹھ بیٹھا۔
جانے شیراز میں کیا بات تھی۔ ایسا تھا جیسے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ۔ جیسے کڑی دھوپ میں چھاؤں۔ اتنی نرمی اور اتنی ملائمت تھی اس میں۔ ٹھنڈے مزاج کا، اپنے آپ میں مگن رہنے والا، کم گو سا تھا۔ اس کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہی احترام کرنے کو جی چاہتا تھا۔
ذیشان کا خیال تھا کہ ضرور شیراز بھائی نے پچھلے جنم میں اپنی محبوبہ کی بے وفائی کا منوں کے حساب سے صدمہ اٹھایا تھا۔ اسی لیے وہ اس جنم میں یوں صمٌ بکمٌ پیدا ہوئے ہیں۔ شکل پہ صبح و شام مظلومیت سی برستی ہے۔ اور ذیشان کی یہ واحد بات تھی جس سے خمار کو بھی اتفاق تھا۔
"لائٹ کیوں نہیں جلائی تم نے؟" شیراز نے سوئچ آن کر دیا۔
"ابھی تو سو کر اٹھا ہوں۔"
"نہال میرے پرانے ریکارڈز تمہارے پاس تو نہیں ہیں۔ مجھے مل نہیں رہے ہیں۔"
"رحم کھائیں شیراز بھائی اپنے حال پہ۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "اتنے پرانے گانے سنتے رہیں گے تو کسی دن آپ کے کان آپ کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ ایمان سے مجھے لگتا ہے کہ آپ شادی بھی کسی ایسی لڑکی سے کریں گے جو کسی آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے دوران ملی ہو اور اس کی پیشانی پہ قبل مسیح کی کوئی تاریخ لکھی ہو۔ ذیشان کو تو ڈر ہے کہ آپ کہیں مصر میں رکھی کسی ممی سے نہ نکاح پڑھوا لیں۔ آپ جب بھی فلائٹ پر مصر جاتے ہیں ذیشان گھر میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیتا ہے کہ اب آپ ضرور اپنے ساتھ ایک آدھ ممی لٹکائے ہوئے لا رہے ہوں گے۔"
شیراز اپنے مخصوص دھیمے انداز میں ہنس دیا۔ "بکواس نہ کرو۔ یہ بتاؤ کہ رکھے کہاں ہیں؟"
"وہ سامنے بک شیلف پر پڑے ہیں۔"
"تم نے سنے؟"
"اللہ نہ کرے جو اتنا برا وقت مجھ پہ آئے۔" وہ اٹھ کر باتھ روم میں جا کے منہ ہاتھ دھونے لگا۔
شیراز سامنے دیوار کو تکتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔
"نہال۔!"
"جی!" اس نے تولیے سے منہ رگڑتے ہوئے کہا۔
"تم دیواریں کیوں بناتے ہو۔ پل کیوں نہیں بناتے؟"
"میں آپ کی بات سمجھا نہیں بھائی جان!"
"یہ سرد جنگ آخر کب تک چلے گی؟"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کون سی جنگ ؟"

"انجان مت بنو نہال ۔ میں تمہاری اور دادا جان کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ ۔ آئی سی۔" اس نے معنی خیز نظروں سے شیراز کو دیکھا

"نہال کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم سب بے وقوف ہیں ۔ انجان ہیں ۔ نہال ہم سب تم سے پیار کرتے ہیں ۔ تم ہمارے بھائی ہو ہمیں بہت عزیز ہو ۔ دادا جان ہمارے دادا ہیں ۔ انہوں نے ہم کو پالا ہے ۔ وہ ہمارا سب کچھ ہیں ۔ ان کے سوا ہمارا ہے کون ؟ ماں باپ نے تو اتنی چھوٹی عمر میں ساتھ چھوڑا کہ ان کی پرچھائیاں تک ہمارے ذہنوں میں نہیں ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم کو دکھ نہیں ہوتا ۔ جب تمہارے اور دادا جان کے درمیان ـــــ" وہ دانستہ چپ ہو گیا ۔

"مگر میں نے تو کبھی ان سے اونچی آواز میں بات نہیں کی ۔ ہمیشہ ان کی عزت کی ہے ۔ ان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا ۔ آپ اس پر شکر نہیں کرتے ؟" اس نے ایسی نظروں سے شیراز کی طرف دیکھا کہ وہ اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گیا ۔

"میرے بھائی ! نانا جان کے تو مجھ پر بھی بہت احسانات ہیں اور میں احسان فراموش نہیں ہوں ۔" وہ طنزاً گویا ہوا ۔

"نہال ! تمہارے اور دادا جان کے درمیان شیشے کی دیوار حائل ہے ۔ تم اس کے پیچھے سے صرف ان کو دیکھ سکتے ہو ۔ نہال تم اس دیوار کو گرا دو ۔ دادا جان کو محسوس کر کے دیکھو ۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا ۔

"شیراز بھائی ! آپ میرے احساسات کبھی نہیں سمجھ سکتے ۔ اگر آپ میرے ماضی کو پڑھیں تو آپ کو نانا جان کی سنگدلی کا احساس ہو گا ۔ میرے غم کو آپ محسوس نہیں کر سکتے ۔ آپ کو ان کی سنگدلی کا احساس اس لیے نہیں ہے کہ آپ میری جگہ پر نہیں ہیں ۔ انسان روز کیسے جیتا اور کیسے مرتا ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے ۔ کبھی کبھی سرد مہری کی اس فضا میں مجھے سانس نہیں آتا ۔" اس کی آواز میں دکھ بول رہا تھا ۔

شیراز نے اسے دیکھا ۔ غلط تو وہ بھی نہیں کہہ رہا تھا ۔ شیراز اس پر سے نظر ہٹا کر کمرے میں لگی پینٹنگ کو دیکھنے لگا جس میں ایک پرندہ آسمان کی جانب محوِ پرواز تھا ۔ سورج کے غروب ہونے کا منظر اور بڑھتے ہوئے اندھیرے کو نمایاں کیا گیا تھا ۔

نہال نے بھی اسی پینٹنگ پر نگاہ جما دی ۔

"میری زندگی بھی اس پرندے کی مانند ہے ۔" وہ ٹھنڈا سانس لے کر بولا ۔ "اکیلا اور بالکل اکیلا ۔ جس کا کوئی نہیں اور جس کے ارد گرد اندھیرا ہے ۔ جسے منزل کا کوئی پتا نہیں ۔ بس اس کو اڑنا سکھا دیا گیا ہے اور وہ ایک نامعلوم منزل کی جانب سفر کر رہا ہے ۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم ہم کو اپنا نہیں سمجھتے ۔" شیراز نے سخت خفا ہو کر کہا ۔

"ارے نہیں بھائی جان !" اس نے جلدی سے شیراز کا ہاتھ تھام لیا ۔ "میری زندگی میں جو تھوڑی بہت کشش ہے ۔ وہ آپ لوگوں کی بدولت ہی تو ہے ۔ ورنہ میری لو د زندگی میں بھلا کیا رکھا ہے ۔" پھر رک کر قدرے شوخی سے بولا ۔

"آپ لوگوں کے بغیر میری زندگی بلیک اینڈ وائٹ ہے ۔"

"گویا ہماری وجہ سے آپ کی ٹرانسمیشن کلرڈ ہو گئی ہیں ۔" شیراز خوشگواری سے بولا

"سو فیصد ۔" وہ بڑے خوبصورت انداز میں ہنسا

"اچھا یار ۔ اب باہر ـــ جاؤ ۔ کیا اندر ہی پڑے رہو گے ۔"

"باقی سب لوگ کہاں ہیں ؟" نہال نے پوچھا ۔

"تاج محل میں دفن ہیں ۔" شیراز نے برجستہ کہا ۔

نہال نے اس کی بات پر جاندار سا قہقہہ لگایا ۔ دونوں باہر نکل گئے ۔

○ ● ◆

"جویریہ ۔ او جویریہ ۔" نہال دروازے ہی میں سے آوازیں دیتا چلا آ رہا تھا ۔

"زندہ بھی ہے یا مر گئی ۔" اس نے پاس کھڑی زوباریہ سے پوچھا ۔

"پتا نہیں ، دس منٹ پہلے تو بقیدِ حیات تھیں ۔ اب اگر مر گئی ہوں تو معلوم نہیں ۔" اس نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا ۔

نہال جویریہ کے کمرے میں داخل ہوا ۔ جو اس کی آواز سنتے ہی بستر میں گھس کر سر تک چادر تان چکی تھی ۔ "اٹھ کر بیٹھو ۔" نہال نے اس کے اوپر سے چادر کھینچ لی ۔ ۔ اسی لمحے اس کی نگاہ کارنر ٹیبل پر رکھے ڈیکوریشن پیس پر پڑی ۔

"اوہ ۔ یہ یہاں رکھا ہے ۔ میں بھی کہوں کہ آخر میرے ڈرائنگ روم میں رکھا شو پیس چلا کہاں گیا ۔ اب سمجھا تم چرا کر لائی تھیں ۔"

"ہونہہ ۔ ہمیں چوری کی کیا ضرورت ۔ بس ہمیں جو چیز پسند آ جاتی ہے ، وہ خود بخود ہماری ہو جاتی ہے ۔" اس نے بڑی شان سے کہا ۔

"کبھی یہ بھی تو کہو کہ میں تمہارا ہوں اور میرا دل بھی تمہارا ہے ۔" وہ اس پر جھک آیا ۔

اس کی توقع کے خلاف جویریہ کو اس کی بات سن کر ذرا مرچیں نہ لگیں ۔ بلکہ وہ الٹا بولی ۔

"کہہ دیں گے ۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے ۔" اس کا انداز لاپروا سا تھا ۔

"کب کہو گی ۔ میری زندگی میں ہی کہہ دو تو اچھا ہے ۔" خدا جانے وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا کہ اس کی محبت سے ۔

"فکر نہ کرو تم انتقال کر گئے تو تمہاری قبر پر کھڑے ہو کر کہہ دوں گی ۔" اس کی ڈھٹائی اور اطمینان قابلِ دید و تعریف تھے ۔

"دیکھو برخوردار ۔" وہ بزرگانہ شفقت کے ساتھ بولی ۔ "صحیح بات اگر غلط وقت پہ کہہ دی جائے تو اپنا تاثر کھو دیتی ہے ۔"

"صحیح وقت کے انتظار میں کہیں تم مجھے نہ کھو دینا ۔"

"اے کسی طرح کھو بھی جاؤ ۔ میری جان تو چھوٹے تم سے ۔" وہ بالآخر چیخ ہی گئی ۔ دانت کچکچا کر بولی ۔

نہال نے اس کے انداز پر برجستہ قہقہہ لگایا ۔ ڈھٹائی سے گانا گا کر اس کو جلانے لگا ۔

"چاند سی محبوبہ ہو میری کب ایسا میں نے سوچا تھا

نہیں ہو گی تمہاری چاند سی محبوبہ ۔ بہت بھیانک قسم کی محبوبہ ملے گی تمہیں !" گانا سن کر تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ اُف کاش نہال کو کچا کھا جانا اس کے بس میں ہوتا تو اب تک وہ اس کا صفایا کر چکی ہوتی ـــــــ

"اب اپنے آپ کو بھیانک تو نہ کہو ۔ اتنی پیاری تو ہو تم ۔ جنت کی حوریں تم پر فدا ہیں ۔ بچپن ہی سے عاشق تھا میں تم پر ۔ عنفوانِ شباب میں میں نے اپنے دل کا پلاٹ تمہارے نام الاٹ کر دیا تھا ۔"

"بھاڑ میں گیا تمہارا دل ۔" وہ بھڑک کر بولی ۔

"ناں ناں ۔ اس طرح تم بھی بھاڑ میں چلی جاؤ گی ۔ کیونکہ تم اسی دل میں مقیم ہو ۔"

"نہال بھائی !" اس نے تنبیہ کرنے کے انداز میں کہا ۔ "باز آ جاؤ تم اپنی حرکتوں سے ۔ مت تنگ کرو مجھے ۔"

"وہ مجھے تنگ کرتا ہے اور میں تمہیں ۔" وہ آنکھوں سے مسکرا رہا تھا ۔

"وہ کون ؟" اس نے حیرانی سے پوچھا ۔

"میرا دل ۔" وہ اس کے کان میں بولا ۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی ۔" وہ اس پر جھپٹی ۔

"تم لڑاکا بلی ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا ان بہتر سوکنوں کے ساتھ گزارا کیسے ہو گا جو جنت میں مجھے ملیں گی ۔"

وہ لمحوں میں پریشان و ہلکان نظر آنے لگا ۔

"تم لکھ کر رکھ لو کہ میں تم سے شادی ہرگز نہیں کروں گی ۔"

"اور تم بھی لکھ کر رکھ لو کہ میں تم سے شادی کر کے رہوں گا ۔" وہ اسی کے انداز میں بولا ۔

"باجی کیا کر رہی ہو ؟ زوباریہ عجیب بیزار سی صورت بنائے اندر داخل ہوئی ۔

"میرے دل سے کھیل رہی ہیں ۔" نہال شرارت سے باز نہیں آ رہا تھا ۔

"ہونہہ ۔" وہ پیر پٹختی کمرے سے باہر جانے لگی کہ نہال نے اس کی کلائی تھام لی ۔

"اچھا چلو فی الحال اس بات کو یہیں ختم کر دیتے ہیں ۔ میں تم دونوں کو لینے آیا تھا ۔ آئسکریم کھانے چلتے ہیں ۔" وہ صلح جو انداز میں بولا ۔

"چلو ۔" جویریہ بیگم جھٹ راضی ۔

بھلا جویریہ کو کوئی آئسکریم کی آفر کرے اور وہ راضی نہ ہو ۔ اس کو تو رات دو بجے سونے سے اٹھا کر آئسکریم کھانے کے لیے چلنے کو کہو تو وہ آنکھیں کھولنے میں بھی وقت ضائع نہ کرے ۔ ننگے پاؤں ہی ساتھ ہو لے ۔

تینوں کمرے سے نکلے تو سامنے قریشی صاحب آتے نظر آ گئے ۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تم فیکٹری سے سیدھے یہیں آ گئے تھے۔؟" انہوں نے نہال سے پوچھا۔
"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"کہیں باہر جا رہے ہو۔؟" انہوں نے بیٹیوں کی طرف دیکھا۔
"ابا جان! ہم آئسکریم کھانے جا رہے ہیں۔" زوباریہ بولی۔
دونوں بہنیں باپ کو خدا حافظ کہتی ہوئی نہال کے ساتھ باہر آ گئیں۔

○ ● ◆

"کیا تمہارا اندرونی جغرافیہ تبدیل ہو گیا ہے؟"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ ہے کہ دل بائیں سے دائیں ہو گیا۔ جگر پیروں میں آ گیا۔ یا گردے دماغ کو چڑھ گئے۔"
"اس فضول بیہودہ بکواس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" شہیر نے اسے گھور کر دیکھا۔
"مطلب یہ ہے کہ آخر ایسا کون سا مرض لاحق ہو گیا کہ جس کا علاج حکیم نے یہ بتایا ہے کہ کمرے کے دیوانہ وار چکر لگا
شہیر اپنے بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا۔
"آخر تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم کو ہوا کیا ہے۔ میں جب سے آیا ہوں اپنے آپ میں ہی نہیں ملتے۔" نہال
پچھلے آدھا گھنٹے سے شہیر سے یہ اگلوانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس قدر چپ چپ کھویا کھویا کیوں ہے۔
"تم مجھے تنگ کیوں کر رہے ہو؟" شہیر بیڈ پر سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھا۔
"جب تک مجھے اصل بات نہیں بتاؤ گے اسی طرح تنگ کرتا رہوں گا۔"
"یا اللہ! یہ کیا بلا میرے چمٹ گئی۔" شہیر نے اپنا سر پیٹ لیا۔
"کیا ہوا ہے تمہیں؟"
"کچھ نہیں۔"
"جب تک نہیں بتاؤ گے، تمہارے سینے پر مونگ دلتا رہوں گا۔"
"تم باز نہیں آؤ گے؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔
"نو۔"
"اچھا کسی اور کو تو نہیں بتاؤ گے۔؟" شہیر نے ہار مانتے ہوئے کہا۔
"کیا بات ہے۔؟"
"پہلے وعدہ کرو۔"
"اچھا بابا وعدہ کیا۔"
"یار نہال۔ میں کسی کو پسند کرنے لگا ہوں۔" خیر شرم تو اسے آ نہیں رہی تھی۔ بہر حال جتنی بھی آ رہی تھی اسی کو استعمال
میں لا کر بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔
"مجھے۔؟" نہال مارے اشتیاق کے اس کے قریب پہنچ گیا۔
"خوش فہمی کی انتہا ہے۔" شہیر جل ہی تو گیا۔
"اچھا یہ بتاؤ، زندہ ہے یا مردہ۔"
"شٹ اپ۔" شہیر نے جھنجھلا کر کہا۔
"میں سمجھ گیا یار۔ یہ اپنے بابا افضل خان کی اماں چھیانوے برس کی عمر میں سولہ سال کی لڑکیوں کو مات دے رہی ہیں۔"
"نہال۔" شہیر نے مارے غصے کے مٹھیاں بھینچ لیں۔
"اچھا۔ وہ نہیں ہیں۔ حد ہو گئی۔" اس نے اپنا قیاس غلط ہونے پر جھٹ ماتم کر ڈالا "اوہ۔ اوہ میں سمجھ گیا وہ
جو ہمیں سبزی دینے کے لیے آتا ہے ضرور اس کی چوتھی بیوی پسند آ گئی ہو گی۔ کمبخت ہے بھی تو اتنی حسین۔
میرا دل بھی اکثر پھسل جاتا ہے اس پر۔ اپنا جاذب بھی سات آٹھ دفعہ لڑھک چکا ہے۔"
"نہال۔ میں سر پھاڑ دوں گا تمہارا۔" شہیر کو اس کے سر پر دے مارنے کے لیے کوئی چیز نہیں ملی۔

"تو تیسری بیوی پسند ہے؟" نہال نے رازداری سے پوچھا۔
"تم دفع ہو جاؤ میرے کمرے سے۔"
"یار اس کی دوسری بیوی مر گئی ہے۔ اور تم اتنے بدذوق تو نہیں ہو کہ اس کی خاتونِ اول پر فریفتہ ہو جاؤ۔"
نہال اسی شش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ اللہ جانے شہیر کو سبزی والے کی کون سی بیوی پسند آ گئی۔
"میں خود ہی چلا جاتا ہوں۔" شہیر اٹھ کر جانے لگا۔
"اچھا ناراض کیوں ہوتے ہو۔ تم خود ہی محترمہ کا اسٹرکچر سمجھا دو۔ نیز یہ کہ وہ دنیا کے کون سے خطے میں پائی جاتی ہیں
زمین پر ہیں یا پانی میں۔"
"میں جواہر کی بات کر رہا ہوں۔"
"جواہر؟ کون جواہر؟"
"ارے گدھے تیرے نانا اور میرے دادا کی سرچڑھی پوتی۔"
"یار۔ وہ بھی کوئی لڑکی ہے مرنے کے لیے۔ خیر اب تو تم اس پر مر ہی چکے۔ یہ بتاؤ کب یہ واردات رونما ہوئی۔"
"بس۔ وہ مجھے اچانک ہی اچھی لگنے لگی ہے۔"
"ہوں۔ تو گویا محترمہ آپ کے دل کی خوفناک و خطرناک راہیں، کھائیاں اور انتہائی پُرپیچ گھاٹیاں طے کرتی
ہوئی بالآخر دل کے پاتال میں اتر گئی ہیں؟"
"ہاں، بالکل یہی بات ہے۔" اس نے بڑی بے چارگی سے سر ہلایا۔
"میں بھی کہوں کہ آج کل آپ کے دل سے دھک دھک کے بجائے کھٹ کھٹ کی آوازیں کیوں آتی ہیں
اب سمجھ میں آیا محترمہ چہل قدمی فرماتی ہوں گی۔" نہال نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پُرخیال انداز میں کہا۔
"بکواس مت کرو۔ نہال اب کیا کیا جائے۔" شہیر کی تو شامت ہی آئی تھی۔ وہ نہال سے مشورہ مانگ بیٹھا۔
"کرنا کیا ہے ذرا سی شیو بڑھا لو۔ یہ بال ماتھے پر ڈال لو۔" اس نے شہیر کے بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر
لٹکا دی۔ "ذرا سی غمگین و مسکین صورت بنا لو اور انتہائی پُرسوز آواز میں صبح و شام پانچ پانچ دفعہ گایا کرو کہ۔

ع ہم چلے اس جہاں سے

"یار۔ میں سیریس ہوں اور تم ہو کہ بکواس کرنے سے باز نہیں آ رہے ہو۔" شہیر نے اپنے بال پیچھے کیے۔
"اچھا اگر تم کو یہ ترکیب پسند نہیں تو ایک اور مجرب نسخہ ہے۔ ذرا شاعرانہ قسم کا۔ انشاء اللہ تم دونوں کو خاطر خواہ
افاقہ ہو گا۔ کسی دن جواہر کو اکیلا دیکھ کر شروع ہو جانا کہ
اے نازنینہ! ہوں تو میں ذرا سا کمینہ۔ مگر مجھے گولی مارو تو ہے حسینہ۔ تیری ایک نظر نے کیا کام کر دکھایا، کہ کل تک دل
تھا میرا آج ہو گیا تیرا یا۔ تو نے اس طرح کیا صفایا کہ میں نے اب تک خود کو نہیں پایا۔ اے میری دشمنِ ہوش و حواس
کھٹاس مٹھاس! میں خود کو تیری آنکھوں میں اس طرح تیرتا محسوس کرتا ہوں جیسے جھیل میں کوئی بطخا تیرتا ہے۔"
شہیر نے طیش میں تکیہ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا "خبیث انسان۔ اگر اس سے میں نے یہ سب کچھ کہہ دیا تو
لتنے ڈنڈے پڑیں گے کہ سارے ارمان ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"
"تو بھائی جب آپ اتنے ہی بزدل تھے تو کس نے کہا تھا دل لگانے کو۔ بہل جاتا دل بہلتے بہلتے۔"
"محبت کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ اب اس میں میرا کیا قصور تھا۔" شہیر نے ایسی دل خراش قسم کی صورت
بنائی کہ نہال میاں پگھل کر بہہ گئے۔ بھرائی رقیق القلبی پر قابو پا کر بولے۔
"تم بھی اپنے دل کا ڈھکن کھلا رکھتے ہو کہ جو آئے دھڑ سے اس میں گر پڑے۔ مالکانہ حقوق بھی فوراً دینے
پر تیار ہو جاتے ہو۔" نہال اس کی جانب مڑا تو وہ اس کی بکواس سے تنگ آ کر جا چکا تھا۔
"لاحول ولاقوۃ۔ آج تک ایک مکھی کو التفات کی نگاہ سے دیکھا نہیں تھا۔ سالم لڑکی سے محبت ہو گئی۔ ہونہہ۔" وہ سر
منہ لپیٹ کر بستر پر پڑ گیا۔
سنجیدہ اور سوبر سی جواہر اور باوقار سا شہیر دونوں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ نہال کے بھنچے ہوئے
ہوئے ہونٹ خود بخود ڈھیل گئے۔ اس نے دل سے ان دونوں کے ایک ہو جانے کی دعا کی۔
بستر پر لیٹے لیٹے بھی اسے سکون نہ آیا۔ پھر دوبارہ شہیر کا دماغ چاٹنے اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی پشت

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کی طرف تھی۔ وہ کھڑکی سے لان میں جھانک رہا تھا۔

"حاضر ہو سکتا ہوں؟" نہال کی کھنکتی ہوئی آواز شہیر کے کانوں میں پڑی تو وہ چونک کر پلٹا۔

"کیا جواہر نیچے لان میں کھڑی ہے؟" اس نے بہت بھولے انداز میں پوچھا۔

"تم دفع ہو جاؤ۔ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔" شہیر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"تو جن کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں ان کو بلا لیں۔" نہال کی بات پر اس نے گھور کر دیکھا۔

"جواہر" نہال نے آواز دی۔

"جی" شہیر کی بدقسمتی ہی تھی جو اس کی آواز قریب ہی سے آئی

"ذرا یہاں تو آؤ۔" نہال اطمینان سے بولا۔ مگر شہیر کا اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔

"جی بھائی جان" جواہر ایک دم سامنے آ گئی۔

شہیر نے نہال کے آہستہ سے چٹکی بھری۔ اس نے ایسی لرزا دینے والی "ہائے" نکالی کہ توبہ ہی بھلی۔

"کیا ہوا؟" جواہر گھبرا کر اس کی طرف بڑھی۔

"کوئی اپنی جان سے جا رہا ہے اور تم کو اس کا احساس نہیں۔" نہال نے ذومعنی بات کہی۔

"کیا مطلب؟" وہ بیوقوفوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگی۔

"مطلب یہ کہ مجھے پانی پلاؤ۔" خدا نے نہال کے دل میں رحم ڈال ہی دیا

اس کے جاتے ہی شہیر نے سکھ کا سانس لیا۔

"شہیر! میں بالکل سیریس ہوں۔ اب بتاؤ کیا چاہتے ہو۔؟" نہال واقعی سنجیدگی سے بولا۔

"ٹھہر جاؤ۔ پہلے جواہر تم کو پانی دے کر چلی جائے۔"

"بہت ہی بزدل ہو۔" نہال ہنسا۔ "ایسا کرو کہ ایک ٹیکہ بنوا کر اس پر بڑا بڑا "بزدل عاشق" لکھوا کر ماتھے پر لٹکا لو۔"

"تم اپنے بیہودہ مشورے اپنے پاس رکھو۔ مجھے اپنا منہ تڑوانے کا کوئی خاص شوق نہیں ہے۔" وہ جل کر بولا۔

"یہ لیں۔" جواہر نے پانی کا گلاس نہال کو پکڑایا۔

"ٹھہرو جواہر۔ تھوڑی دیر بیٹھو۔ شہیر کو گپ شپ کرنی ہے۔" نہال بیڈ پر سے اتر گیا۔

"نہیں، میں مووی دیکھ رہی ہوں۔" وہ باہر نکل گئی۔

"تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"تو کیا فلرٹ کر رہا ہوں؟"

"تو پریشانی کیا ہے۔ نانا جان تک بات پہنچ جائے تو معاملہ پکا سمجھو۔" نہال سنجیدگی سے بولا۔

"پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ دادا جان سے کون بات کرے؟"

"اسے تم خود کہہ دینا کہ دادا جان میں اپنے عشق کے ہتھوڑے سے سماج کی دیوار گرا دوں گا، بشرطیکہ ہتھوڑا جواہر کے ہاتھ میں ہو۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ دینا کہ میں اپنی زندگی کی اندھیری شاہراہوں پہ جواہر کے نام کی یہ لائٹیں لگانا چاہتا ہوں۔"

"نہال! میں چاہتا ہوں کہ مجھے جواہر کی مرضی پہلے معلوم ہو جائے۔" شہیر اس کی بات پر توجہ دیے بغیر بولا۔ "یہ تو ممکن ہے کہ وہ مجھے پسند نہ کرتی ہو۔ دادا جان اس کی شادی مجھ سے کر دیں اور وہ چپ چاپ کر لے۔ زندگی یونہی بسر ہو جائے۔ یار نہال! تم کوئی ایسی ترکیب کرو کہ مجھے اس کے دل کی خبر ہو جائے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ تم سے کہہ دے گی کہ میں آپ کی چاہت و الفت میں تقریباً فوت ہو چکی ہوں۔ آئیے میں آپ کو چاند نگر کی سیر کراؤں۔ ستاروں کی وادی میں لے جاؤں۔ پھولوں کے دیس میں لے کر اتروں۔ آئیے میں آپ کو بتاؤں کہ محبت کون سے بازار میں ملتی ہے۔ دلوں کے سودے کیسے طے کیے جاتے ہیں۔ تھوک کے حساب سے کتنے میں ملتے ہیں اور ریٹیل میں کتنے کے؟"

"کاش وہ یہ سب کچھ مجھ سے کہہ دے۔" شہیر نے مصنوعی آہ بھر کہا۔

"سنبھل جاؤ۔ اونچے ہیل کی سینڈل پہنتی ہے وہ۔ ہونٹ پچکا دے گی تمہارا۔ اپنی شکل خود بھی نہ پہچان سکو گے۔"

"نہال پلیز کچھ کرو۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" شہیر کے لہجے کی گہرائی اور سچائی نہال کو متاثر کر گئی۔

"تم فکر نہ کرو۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "فیکٹری کے کاموں کے سلسلے میں مجھے کچھ دن اپنے فلیٹ میں ہی رہنا پڑے گا قریشی صاحب کا بھی فون آیا تھا۔ ورکرز نے ہڑتال کر دی ہے۔ کچھ دن تو میرے مصروف گزریں گے۔ پھر آ کر جواہر کو بھی ٹٹول لیں گے۔"

"یار کہیں انکار نہ کر دے۔" شہیر نے خدشہ ظاہر کیا

"تم نے وہ شعر نہیں سنا۔

انکار کی سی لذت اقرار میں کہاں
بڑھتا ہے شوق غالب ان کی نہیں نہیں سے

"اگر اس نے انکار کر دیا تو پھر میں کیا کروں گا؟" اس خیال سے ہی شہیر کی روح فنا ہو رہی تھی۔

"ایک بڑی سی تسبیح گلے میں ڈال کر جواہر جواہر کرتے جنگل کی طرف نکل جانا۔" نہال ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہیر کو خواہ مخواہ ہی اس پر پیار آ گیا۔ کمبخت دل کا اتنا اچھا ہے کہ اس پہ غصہ تو میں کر ہی نہیں سکتا۔

○ ● ◆

وہ جلدی جلدی ہاتھ اور منہ چلا رہی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹے، کیا قحط پڑنے کا اعلان ہو گیا ہے جو آپ دونوں ہاتھوں سے کھانے میں مصروف ہیں۔" قریشی صاحب صبح کی سیر سے ابھی لوٹے تھے۔

"میں مشن پر۔" اس نے نوالہ نگلا "جا رہی ہوں۔"

"کیا سوسائیڈل مشن پر جا رہی ہیں آپ؟"

"نہ۔ اپنے مطالبات منوانے کے لیے بھوک ہڑتال کرنے جا رہی ہوں۔"

"وہ کس لیے؟"

"ابا جان، خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ تو میں کوئی دو مہینے سے آپ سے کہہ رہی ہوں کہ ہمیں پکنک پر لے چلیں، مگر آپ کے کان پر جوں نہیں رینگی۔"

"بیٹا جان! میرے کان پر جوں اس لیے نہیں رینگتی کہ میرے سر میں جوئیں نہیں ہیں۔" وہ مسکرائے۔

"آپ ایسا کریں کہ زوباریہ سے دو چار جوئیں لے کر اپنے سر میں ڈال لیں۔" وہ روانی میں بے ساختہ کہہ گئی۔

قریشی صاحب نے اس کی بات پر قہقہہ لگایا۔ جویریہ جھینپ سی گئی۔

"اچھا تو میری بیٹی کو مجھ سے یہ شکوہ ہے۔" انہوں نے قریب آ کر پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ "چلو آج ہی چلتے ہیں۔"

"ہرے۔" اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

"آہستہ بیٹا۔ محلے والے سمجھیں گے کہ شاید صور اسرافیل بجنا شروع ہو گیا ہے۔"

"اوہ" اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔ "ہرے" اس نے باپ کے کان میں سرگوشی کی۔

"اب ٹھیک ہے نا؟" اس نے نظروں سے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" انہوں نے نظروں ہی سے جواب دیا اور بے ساختہ بیٹی کا ماتھا چوم لیا۔

ایک گھنٹے بعد ہی دونوں بہنیں اپنے والدین کے ہمراہ کار میں بیٹھی اڑی جا رہی تھیں۔ ساحل پہ پہنچ کر دونوں نے جلدی جلدی سامان نکال کر ہٹ میں رکھا اور سمندر کی جانب دوڑ لگا دی۔

"سمندر دیکھ کر دونوں دیوانی ہو جاتی ہیں۔" بیگم قریشی نے برا سا منہ بنایا۔

"کچھ یاد ہے ہم کیسے دیکھ کر دیوانے ہوئے تھے؟" قریشی صاحب شوخی سے بولے۔

"لاحول ولا قوۃ۔" بیگم قریشی نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے میگزین کے اندر منہ کر لیا۔

"باجی! کہیں تم اپنی زندگی سے مایوس تو نہیں ہو؟" زوباریہ نے پوچھا۔

"کیوں؟" اس نے بھنویں اچکا کر کہا۔

"احتیاطاً پوچھ رہی ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کے مظالم سے تنگ آ کر خودکشی کا سوچے بیٹھی ہو۔ کیا خبر لپک کر سمندر میں چھلانگ لگا ہی دو۔ میں حفاظتی اقدامات پہلے ہی کر لینا چاہتی ہوں۔" زوباریہ کے لیے جویریہ اس دنیا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کی سب سے ناقابلِ اعتبار ہستی تھی۔ اس کا کچھ پتا نہیں تھا کہ اگلے لمحے وہ کیا کر بیٹھے۔

"اونہوں۔ فی الحال ایسا ارادہ نہیں ہے۔ اگر کبھی خودکشی کا ارادہ کیا تو اس سے پہلے پریس کانفرنس ضرور بلواؤ

جویریہ کی تو ہر بات اوٹ پٹانگ ہوتی تھی۔

اسی لمحے بیگم قریشی نے زوباریہ کو آواز دی۔ "وہ ابھی آئی" کہتی ہوئی ہٹ کی طرف دوڑ گئی۔

جویریہ ننگے پاؤں سمندر کے کنارے کنارے چلتی رہی۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی جب اس کے پیروں سے چھو

تو اس کے دل میں گدگدی ہونے لگتی۔ بے اختیار اس کا دل چاہتا کہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس نے مڑ کر

دیکھا کہ دور ہٹ کی سیڑھیوں پر اس کے والدین بیٹھے تھے۔ قریب ہی زوباریہ کھڑی تھی

قریب ہی ایک بہت بڑی سی چٹان ابھری ہوئی تھی۔ جویریہ احتیاط سے پاؤں جما جما کر رکھتی ہوئی اس پر چڑھ

کر بیٹھ گئی اور اپنا چہرا گھٹنوں پر رکھ لیا۔ صبح کا سمے تھا۔ سمندر کی موجیں پُرشباب تھیں۔

دور کہیں بہت دور نیلا آسمان سمندر سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

"کتنا خوبصورت منظر ہے!" جویریہ نے سوچا۔ "اللہ تعالیٰ نے بھی انسان کے لطیف احساسات کی تسکین کے لیے

کیسی کیسی نعمتیں پیدا کی ہیں۔"

وہ دھیرے دھیرے گنگنانے لگی۔

"ہائے میرا دوپٹہ۔" جویریہ کے دوپٹے کو شریر ہوا اپنے سنگ لے جانے لگی۔ وہ چٹان کے دوسرے سرے

جا پڑا۔ وہ اپنے دوپٹے کی طرف لپکی۔ اس نے جھک کر جیسے ہی اپنا دوپٹہ اٹھانا چاہا اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں

وہ جو کوئی بھی تھا اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

"ہائے اللہ!" جویریہ کا جو سانس جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بہت دور اس کے والدین بڑے سے دھبے کی مانند نظر آ رہے تھے۔ زوباریہ اپنی

دُھن میں مگن اطمینان سے چلتی ہوئی اس کے نزدیک آ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر لاش کو دیکھا۔

"زوباریہ! ذرا ادھر آ کر نیچے جھانکنا۔" زوباریہ قریب آئی تو اس نے کہا۔

"کیا ہے؟" اس نے نیچے جھانکا۔

"امی!" اس نے یہ بڑی سی چیخ ماری اور اُلٹے قدموں روانہ ہو گئی۔

"زوباریہ! رُکو تو۔"

توبہ جی زوباریہ کو تو پر لگ چکے تھے۔

"بے وقوف! ابا جان کو بھیجو۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ زوباریہ بدستور امی، امی کی صدائیں بلند کرتی ہوئی

دوڑی جا رہی تھی۔ پیروں کو اُٹھا کر سر پر رکھ لیا تھا۔

"پاگل نہ ہو تو۔" اس نے سر کو جھٹکا دیا اور خود چھلانگ لگا کر نیچے اُتر آئی۔

دل مضبوط کر کے لاش کے قریب آئی۔ دور دور سے اس کے اردگرد گھوم کر جائزہ لیا۔ ڈرتے ڈرتے پاس

آئی۔

"اے بھائی!" اس کی اپنی سٹی گم تھی۔

(بھائی پر اثر بھی نہ ہوا)

"یہ تو گھوڑے بیچ کر مرا ہے۔" اس نے سوچا۔ اب بھلا اس سے کیا ڈرنا۔

"سنو بھئی۔ زندہ ہو یا مر گئے ہو۔" اب وہ اس کے بالکل ہی قریب چلی آئی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ

کر آہستہ سے ہلایا۔ جویریہ کو اس میں زندگی کی رمق محسوس ہوئی۔ اب تو اس نے بازو تھام کر ایسے خوفناک

جھٹکے دیے کہ مر بھی گیا ہوتا تو اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔

ایک کراہ سی اس کے منہ سے نکل گئی۔ اور وہ سیدھا ہو گیا۔

جویریہ ڈر کے مارے گز بھر دور جا کھڑی ہوئی۔ غور سے اس کی صورت دیکھی۔ وہ کوئی نوعمر لڑکا تھا۔

"میں کہاں ہوں؟" وہ نقاہت سے بولا۔

"ریت پر۔" اس نے لفظوں کے ساتھ کنجوسی برتتے ہوئے جواب دیا۔

"یہاں کیسے آ گیا؟" اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

"پانی کے ذریعے۔" اس نے اب بھی اختصار سے کام لیا۔

تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ جویریہ دیدے پھاڑے اسے گھورتی رہی۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

"اب میں چلتی ہوں۔" اس نے یوں کہا جیسے آگے سے یہ بھی کہنا چاہ رہی ہو کہ چاہو تو یہیں پڑے رہو

یا واپس سمندر میں چھلانگ لگا دو میری بلا سے۔

"سنیے۔!"

"سنائیے۔" وہ پلٹی۔

"کیا آپ میری مدد کریں گی؟" اس کی کمزوری آواز سے بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ "مجھ سے بالکل اُٹھا نہیں جا رہا

ہے۔"

"دیکھیے جی! آپ کو تو اللہ ہی اُٹھائے گا۔" جویریہ ان لوگوں میں سے تھی جو کہنے کے بعد سوچتے ہیں اور پھر

دانتوں میں زبان دبا لیتے ہیں۔ (ابھی بھی زبان دانتوں کے نیچے ہی تھی)

نحیف سی مسکراہٹ لڑکے کے چہرے پر آ کر معدوم ہو گئی۔ "میں ابھی ابھی دنیا سے اُٹھتے اُٹھتے بچا ہوں۔"

وہ اُٹھ کر چٹان کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے کے ساتھ ہی اس کا سر اس زور سے چکرایا اور فوراً

ہی اس کو بڑی سی قے ہو گئی۔

جویریہ پرے ہٹ گئی اور تشویش سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

اس کا سارا جسم جیسے کھنچ کھنچ کر اوپر آ رہا تھا، وہ اُلٹیاں کر رہا تھا۔ جویریہ کو اس پر بڑا ترس آیا۔ وہ قریب آ کر

اس کی پشت سہلانے لگی۔

لڑکا بے دم سا ہو کر پھر ریت پر گر گیا۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"اچھا ہوا۔ تم کو اُلٹی ہو گئی۔ سمندر کے پانی کے ساتھ جو کچھ الا بلا تمہارے معدے میں گیا تھا سب باہر آ گیا۔"

بڑی دیر میں جا کر لڑکے کی جان میں جان آئی۔

"ضرورت کیا تھی خودکشی کرنے کی؟" جویریہ نے اسے اُٹھنے میں مدد دی۔

"خودکشی کون باؤلا کر رہا تھا۔"

"ابھی کیا صرف کوشش کر کے دیکھ رہے تھے؟"

"میں ذرا گہرے پانی میں کھڑا تھا۔ میری گھڑی کی چین کھل گئی۔ اور پانی میں گر گئی۔ میں اسے تلاش کرنے جھکا

اتنے میں لہر اس زور سے آئی کہ میں اس میں بہہ گیا۔ اس کے بعد سنبھل ہی نہیں سکا۔ بہت دیر تک ہاتھ پاؤں

مارے مگر بے سود۔ اُف توبہ!" اس نے خوف سے جھرجھری لی۔ "موجیں اُٹھا اُٹھا کر پٹخ رہی تھیں۔"

"پھر؟" جویریہ اس کو سہارا دیے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔

"پھر کیا؟ میں نے کہا دنیا والو! میں جا رہا ہوں اور اے اللہ میاں! میں آ رہا ہوں۔"

جویریہ مسکرانے لگی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" اس نے سیاہ اور سرخ پرنٹ کے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس اس بے حد پیاری سی

لڑکی کو غور سے دیکھا۔

"ابھی رکھا نہیں ہے۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔ پھر کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جویریہ۔ اور تمہارا؟"

"رکھ کر بتاؤں گا۔" وہ اس سے دو ہاتھ آگے تھا۔ پھر اسی کے انداز میں اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "کامران۔"

دونوں ہنس دیے۔

"آؤ میں تم کو اپنے والدین سے ملواؤں۔" وہ اس کو لے کر ہٹ میں داخل ہوئی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

عجیب منظر تھا۔ زوباریہ ایک طرف کو لڑھکی پڑی تھی۔ شاید رو رہی تھی (بھیانک قسم کی چیخوں کے ساتھ) بیگم قریشی بدحواسی سے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ قریشی صاحب اس کو چمکار رہے تھے۔

"کہاں تھیں تم؟" بیگم قریشی جویریہ کو دیکھتے ہی غصّے سے بولیں۔ پھر کامران پر نگاہ پڑتے ہی ایک دم چپ ہو گئیں۔

"زوباریہ کو کیا ہوا؟" وہ بہن کی طرف بڑھی۔

"بیٹا میری طرف دیکھو۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔" قریشی صاحب زوباریہ ہی کی طرف متوجّہ تھے۔

"ابّا جان ادھر چٹان کے پاس یہ لمبی سی لاش پڑی ہے۔ اور اب تک تو باجی بھی یقیناً ڈر کے مارے لاش تبدیل ہو چکی ہوں گی۔ ہائے میری باجی!"

اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کی پہلی نگاہ سیدھی کامران پر پڑی۔ اس کی آواز پھنس گئی۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ دھپ سے باپ کی گود میں گر گئی۔

جویریہ نے جلدی جلدی سارا قصّہ والدین کو سنایا اور زوباریہ کو ہوش و حواس میں لانے کے لیے ہلا ہلا کر چلانے لگی۔

"احمق لڑکی! اُٹھ کر بیٹھو۔" اس نے زوباریہ کو سیدھا کیا۔ "زندہ انسان ہے یہ۔ ابھی مرا نہیں ہے۔ ڈر کیوں رہی ہو؟"

زوباریہ نے پہلے ایک آنکھ کھول کر کامران کو دیکھا۔ وہ دیوار کے سہارے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔

"دوسری آنکھ بھی کھول کر اطمینان سے میرا جائزہ لے لیں۔" وہ زوباریہ ہی کو دیکھ رہا تھا۔

"اُف خدایا میری توبہ!" زوباریہ نے اپنی پوری قوت سے سانس باہر نکالا کہ یقیناً پھیپھڑے تلملا کر رہ گئے ہوں گے۔

"امّی جی!" وہ روتی شکل و آواز بنا کر ماں کی طرف متوجّہ ہوئی۔ "آپ یقین کریں، میرا دل بالکل ہی رُک گیا تھا۔"

"اب چل پڑا کہ نہیں؟" جویریہ نے اسے دو چھانپڑ رسید کرنے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔

"بیٹے! تم رہتے کہاں ہو؟ میں تم کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔" قریشی صاحب کامران سے مخاطب ہوئے۔

"میرا گھر یہاں سے دُور نہیں ہے۔ میری بائیک بھی یہیں پیچھے کی جانب کھڑی ہے۔ آپ زحمت نہ کیجیے میں چلا جاؤں گا۔" وہ بے حد شائستگی سے بولا۔

"تم ایسی حالت میں کس طرح اکیلے جا سکو گے۔ آؤ چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" انہوں نے اس انداز سے کہا کہ کامران کو انکار کے لیے مناسب الفاظ نہ سوجھے۔

"آپ لوگ بھی ساتھ چلیں۔ میرے والدین آپ لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" اس نے جویریہ وغیرہ کی سمت دیکھا۔

پہلے تو انہوں نے کچھ پس و پیش سے کام لیا پھر اس کے اصرار پر آمادہ ہو گئے۔ سامان سمیٹ کر گاڑی میں رکھا۔ قریشی صاحب، کامران کی بائیک پر اور جویریہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی میں آگے پیچھے چل پڑے۔ کامران کے گھر پہنچ کر انہوں نے بیل بجائی۔ اندر سے جو صاحب باہر نکلے تو ان کی صورت دیکھ کر قریشی صاحب بُری طرح چونک گئے۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔

"معاف کیجیے گا اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ غالباً زبیر صاحب ہیں؟"

"بڑے افسوس کی بات ہے قریشی صاحب! صرف سولہ برس ہی تو گزرے ہیں اور ہمیں آپ بھول گئے۔" وہ یوں بولے جیسے صرف سولہ دن ہی گزرے ہوں۔ بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے ان کے گلے لگ گئے۔ پھر ان سب کو لاکر ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ان کی بیگم جب اندر آئیں تو وہ بھی بیگم قریشی کو پہلی نگاہ میں پہچان گئیں۔ پُر مسرت طریقے سے ان کی جانب بڑھیں۔

"بھابی! آپ پر تو سولہ سال جیسے گزرے ہی نہیں۔ آپ تو پہلے کی طرح اسمارٹ ہیں۔" ان کے لہجے میں رشک تھا۔ بیگم قریشی مسکرانے لگیں۔

"یہ دونوں آپ کی بچیاں ہیں؟"

"ہاں۔ یہ جویریہ ہے اور یہ زوباریہ۔"

"ماشاءاللہ۔ بہت پیاری ہیں۔" انہوں نے دونوں کو پیار کیا۔

"سوال یہ ہے قریشی صاحب کہ آپ نے ہمیں کیسے ڈھونڈ نکالا؟"

"یہ تو آپ کامران سے پوچھیے۔"

کامران نے انہیں ساری بات بتائی۔ سن کر دونوں میاں بیوی کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ بیگم زبیر نے تڑپ کر بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور ایک دم ہی رو پڑیں۔

"بہن! روئیے نہیں۔ اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے بچّے کو نئی زندگی دی۔" بیگم قریشی اپنی جگہ سے اُٹھ کر ان کے قریب چلی آئیں۔ ان کو دلاسا دینے لگیں۔

ماحول قدرے سوگوار سا ہو چلا تھا۔ زوباریہ بڑی رقیق القلب واقع ہوئی تھی۔ اور ایسے موقعوں پر تو اس کا جی چاہتا کہ سامنے والے سے مقابلے پر اُتر آئے۔ خوب دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اس وقت بھی اس پر منوں کے حساب سے رقّت طاری ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ درد بھری چیخوں سے رونے کے طویل پروگرام کا آغاز کرتی۔ جویریہ نے سختی سے اپنے پیر سے اس کا پیر کچل دیا۔ ساتھ ہی سرگوشی کی۔

"خبردار جو روئیں ــــ خون پی جاؤں گی!"

اس کی دھمکی سے ڈر کر زوباریہ نے رونا تو چھوڑ دیا، روتی صورت بنانے کا پروگرام بھی ہفتے بھر کے لیے ملتوی کر دیا۔ اس میں تو پہلے ہی خون کی کمی تھی۔ اگر وہ بھی باجی پی جاتیں تو اس میں بچتا کیا؟ (خون کے علاوہ عقل کی بھی کمی تھی)

جویریہ بہن کو گھورنے سے فارغ ہوئی تو باپ کی جانب متوجہ ہو گئی جو کامران سے محوِ گفتگو تھے۔

"بیٹا! سولہ سال پہلے ہم اور تمہارے ابّو ایک ہی محلّے میں رہائش پذیر تھے۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی۔ پھر غالباً زبیر صاحب امریکہ جا کر سیٹل ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ہم نے بھی وہ مکان چھوڑ دیا۔"

"ہاں، میں پانچ سال امریکہ میں رہا پھر واپس پاکستان آ گیا۔"

بیگم زبیر ملازمہ کو چائے کا کہہ کر دوبارہ ان میں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"بھابی! میں تو جویریہ کو دیکھ کر حیران ہوئی جا رہی ہوں۔ کتنی چھوٹی سی ہوا کرتی تھی۔ یاد ہے آپ جب بھی کہیں جاتی تھیں اسے ہمیشہ میرے پاس چھوڑ کر جاتی تھیں۔"

"ہاں اس نے میرا اتنا ناک میں دم نہیں کیا تھا جتنا آپ کا کر رکھا تھا۔" بیگم قریشی نے اپنی قابو سے باہر افلاطون قسم کی بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جو ان کی بات پر خراب سی شکل بنا کر پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔

"آپ کے اور بچّے کہاں ہیں؟" بیگم قریشی نے پوچھا۔

"میرا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ کامران۔" وہ کچھ اُداسی سے مسکرائیں۔

"اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز کرے۔ میری بھی دو ہی بیٹیاں ہیں۔ ہم ــــ تو انہی کو اپنا بیٹا سمجھتے ہیں مگر یہ دونوں بھائی کی کمی بہت محسوس کرتی ہیں۔ مگر اللہ کی مرضی۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"کامران کو بھائی بنا لو۔" بیگم زبیر بڑے خلوص سے بولیں۔

"لو بھئی، تم دونوں کو تو بیٹھے بٹھائے بھائی مل گیا۔" بیگم قریشی، کامران کی والدہ کے خلوص سے بہت متاثر ہوئیں۔ اس موقع پر جویریہ کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا کرے کیا کہے۔ اس نے شرمانا ہی شروع کر دیا۔

"بھائی بنا رہی ہیں تمہارا، دولہا نہیں بنا رہیں۔" کامران صوفے کی پشت کی جانب سے جھک کر اس کے کان میں بولا۔

"اُفوہ۔" جویریہ کے سن کر پتنگے ہی تو لگ گئے۔ تلوار نہ ملی جو سونت کر کھڑی ہو جاتی۔ (اپنے جوہر دکھانے کے لیے) پھر بھی نگاہوں سے تو تیر برسانا شروع کر ہی دیے۔

کامران ایک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "ممّی! صغراں نے میز پر چائے لگا دی ہے۔"

"آئیے!" بیگم زبیر ان سب کو لے کر ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"آخر مسئلہ کیا ہوگیا ہے؟" شہیر ابھی ابھی آکر ان میں بیٹھا تھا۔ اس لیے اسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ سب لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔

"یہ اپنی جواہر صاحبہ ڈیمینسز ویلفیئر ایسوسی ایشن کی چیئر پرسن منتخب ہوگئی ہیں غالباً۔" نہال نے اپنا خیـ ظاہر کیا۔

"خواتین کے حقوق کے لیے اور ان کی حمایت میں اپنی جان دینے کو تیار بیٹھی ہیں۔" ذیشان نے نہال کے کو مزید واضح کیا۔

"جاذب بھائی کہہ رہے ہیں کہ اللہ نے عورت کو مرد کے لیے بنایا ہے۔ جواہر آپا کہتی ہیں کہ مرد عورت بغیر ادھورا ہے۔ بات تقریباً ایک سی ہے مگر دونوں کا انداز جدا ہے۔ اب دونوں اپنے اپنے خیالات دا کے ساتھ ایک دوسرے پر ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" خمار نے ساری بات سمجھائی۔

"یہ جاذب بھائی آخر مان کیوں نہیں لیتے کہ مرد احساس برتری کا شکار ہے۔ وہ عورت پر حاکمیت جتلا کوشش کرتا ہے۔ خاص طور پر شوہر بن جانے کے بعد وہ سمجھتا ہے کہ عورت اب اس کی جنبش ابرو کی م ہے۔ اس کی مرضی ہوگی تو عورت سانس لے گی ورنہ ہرگز نہ لے گی۔" جواہر نظروں ہی نظروں میں جاذب کو تـ ہوئے بولی۔

"دیکھو جواہر۔۔۔!" جواہر نے اپنی توپوں کا رُخ اس کی جانب کیا ہی تھا کہ شہیر نے اس کی بات کاٹ دی۔
"کیا مطلب ہے تمہارا؟ تمہارے خیال میں بیوی کو شوہر پر حکمرانی کرنی چاہیے اور اسے اپنی اُنگلی کے اشـ پر نچانا چاہیے۔" شہیر کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا۔
"توبہ کریں۔ زہر لگتے ہیں مجھے ایسے مرد جو اپنی بیوی کے اشاروں پر چلتے ہیں یا پکن ہیلپر قسم کے ہوتے اور ایسے مرد بھی جن کی بیویاں خود تو آگے چلتی ہیں اور ان کے شوہر بچوں کو گود میں اُٹھائے اور دوسرے ہا میں سامان کی ٹوکری اُٹھائے ان کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔" جواہر کے انداز پر سب نے قہقہہ لگایا۔ ساتھ شہیر کے مستقبل پر چھائے خطرے کے بادل چھٹ گئے اس نے سکھ کا سانس لیا۔
"جواہر تمہیں تو نہ یوں چین ہے اور نہ یوں۔" جاذب بولا۔
"جاذب بھائی میں معاشرے میں مرد کی حاکمیت تسلیم کرتی ہوں مگر اس طرح نہیں کہ وہ عورت کی شخصیت کچل کر دے۔" جواہر نے کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔
"ہونہہ! عورت کی شخصیت کو کچل کر رکھ دے۔" جاذب نے سلگ کر اس کی نقل اُتاری۔ "یہ جو تمہاری شخصـ کو کچل رہا ہے ناں تو اس کے بغیر تم معاشرے میں سر اُٹھا کر نہیں چل سکتیں۔ مرد محافظ ہوتا ہے عورت کا۔ اکیلی عورت پر ہزاروں نگاہیں اُٹھتی ہیں، اگر اس کے ساتھ مرد ہو تو کسی کی مجال نہیں کہ آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکـ"
"ہاں تو جو وہ نگاہیں اُٹھیں گی، وہ بھی تم مردوں ہی کی ہوں گی۔" خمار نے جوابی توپ داغ دی۔
"مرد کی خوبی ہے کہ وہ طاقتور ہے، تحفظ دے سکتا ہے۔" جاذب جتانے والے انداز میں بولا۔
"اور اس کی خامی ہے کہ اس کو اپنی اس طاقت کا احساس ہے اور وہ اس کا کبھی کبھی ناجائز استعمال کرتا ہے۔" خمار تو کاٹ کھانے کو تیار تھی۔

جاذب خمار کو گھورنے کے بعد جواہر کی طرف متوجہ ہوگیا۔
"اور یہ جو تم مجھے کہہ رہی ہو کہ مرد حاکمیت جتاتا ہے تو یہ کیوں نہیں کہتیں کہ عورت اسے باندھ کر رکھنا چاہتی ہے۔ مرد کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے وہ آزاد رہنا چاہتا ہے۔ من مانی اس کی فطرت ہے۔ اب تم دیکھو، خدا نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی ہے مگر جہاں شوہر نے دوسری شادی کا نام لیا بیوی خودکشی کرنے چلـ پڑتی ہے۔ عورت درحقیقت مرد کو اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔"
"اللہ میاں نے ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ برابری کرو۔ آج کا مرد دو بیویوں کے درمیان برابری نہیں کرسکتا اس لیے اس کو دوسری شادی بالکل نہیں کرنی چاہیے۔" جواہر کی سمجھ میں نہ آیا کہ جاذب کا سر توڑے کہ پھوڑے۔
"دوسری؟ میں تو تیسری اور چوتھی بھی کروں گا۔" ذیشان نے ایسے موقع پر اپنے ارادوں کا اظہار ضروری سمجھا۔

"چپ رہ کمبخت۔ تیری تو پہلی بھی بڑی مشکل سے ہوگی۔ کسی لڑکی کو ہاتھ پیر جوڑ کر راضی کرنا پڑے گا کہ اللہ کے نام پر ہمارے بھائی سے شادی کر لو۔" خمار ذیشان سے زیادہ ہی مایوس تھی۔
"بھئی کم ٹو دی پوائنٹ۔ تم لوگ بات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔" شیراز نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ زبان کھولی ورنہ وہ زیادہ تر مسکرانے پر ہی اکتفا کرتا تھا۔
"اچھا جواہر تم یہ بتاؤ کہ یہ جو آج کی عورت آزادی کا نعرہ لگا رہی ہے کیا یہ صحیح ہے۔" جاذب نے کچھ سوچ کر پینترا بدلا۔
[illegible] کیا جو چار دیواری کا تصور ہمارے مذہب نے دیا ہے' وہ اس

جویریہ اپنے بستر میں دھنسی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی زور زور سے چیخنے لگی۔ وہ کان لپیٹ کر پڑ گئی مگر گھنٹی مستقل مزاجی سے بجتی ہی رہی۔ وہ کوفت زدہ سی ہوکر جھنجھلاتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا کوئی بھی نظر نہ آیا۔
خدا جانے سب اپنے سینگوں سمیت کہاں سما گئے۔ اس نے جھلا کر سوچا اور ریسیور اُٹھا لیا۔
"ہیلو"
"وہ عورت اگر مکمل [illegible] گھنٹے سے گھنٹی بج رہی [illegible] ہے۔ اس پر دقیانوسی کا لیبل لگا دیتے ہو۔ تو نے نیشنل [illegible] چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی بولڈ ہو، ایکٹو ہو، سوسائٹی موو کرنا جانتی ہو۔" جواہر کو غصہ آگیا۔

"حد میں رہ کر۔ حد سے باہر نہیں۔" جاذب بھی آپے سے کبھی باہر کبھی اندر ہو رہا تھا۔
"تم عورتیں اپنی حدود سے باہر نکل رہی ہو۔ یہ جو عورتیں وومن لبریشن گاتی پھرتی ہیں۔ کبھی ان کی گھریلو زندگی دیکھو جاکر۔ ایسی عورتیں شوہر کو شوہر نہیں سمجھتیں۔ صرف نوٹ چھاپنے کی مشین سمجھتی ہیں۔ ایسے گھروں کے سربراہ محض ایک پے انگ گیسٹ کی طرح ہوتے ہیں بچے گورنس کی گود میں پلتے ہیں۔ ایسے گھرانوں میں ملازموں کو اسٹیٹس سمبل سمجھا جاتا ہے۔ جس کے گھر جتنے ملازم اس کا اسٹیٹس اتنا ہی اونچا ہوگا۔ اس قسم کے گھروں میں بیوی کا آدھا رول تو ملازم ہی ادا کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے بیگم صاحبہ کو اپنی مصروفیات سے فراغت ملے تو شوہر سے پوچھیں بھی کہ بھئی تم ہے کس حال میں ہو؟ جس وقت شوہر کے آفس سے آنے کا ٹائم ہوتا ہے تو بیگم یا تو اشنان باتھ لے رہی ہوتی ہیں یا پھر آلو، کھیرے، ٹماٹر کا ماسک منہ پر تھوپ رکھا ہوتا ہے ایسی عورتوں کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ یہ جو کھیرے ٹماٹر منہ پر چپکا رکھے ہیں انہیں سلیقے سے کاٹ کر سلاد کس طرح بنتا ہے۔ بچوں کو رات کو سوتے وقت پیار کر لیا بس ممتا کا حق ادا ہوگیا۔ بھلا انہیں گود میں کیسے اُٹھایا جاسکتا ہے۔ ساڑھی کی خال راب نہ ہو جائے گی۔"

جاذب نے بولنے کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔
"بھائی جان سانس تو لے لیں۔ کہیں بھول ہی نہ جائیے گا۔" ذیشان بڑی بے چارگی سے بولا۔
"عورت نے درحقیقت خود کو ڈیکوریشن پیس بنا رکھا ہے۔ کیوں وہ اپنے نسوانی وقار کو ختم کر رہی ہے۔ عورت نسوانیت کے دائرے میں رہ کر ہی دلکش نظر آتی ہے۔"
"ہاں تو یہ تم مرد ہی ہو جو عورت کی دلکشی کو اشتہار بناتے ہو۔ کیوں مرد اپنے گھر کی عورت کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ چادر اوڑھ کر باہر نکلے۔ نہیں صاحب بیگم پچاس سال پہلے کا ماڈل لگیں گی۔ دوست کیا کہیں گے بھائی تو نے کس ملانی سے شادی کر لی۔" خمار بھی بھاپ اُڑاتی پھر رہی تھی۔
"تمام مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔" جاذب نے اسے ڈانٹ دیا۔
"تمام عورتیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔" خمار اس پر چڑھ دوڑی۔
"ہونہہ جس مرد کو عورت کا محافظ کہہ رہے ہو ویسا ہی دوسرا مرد اسی عورت کے لیے بھیڑیا بن جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اکیلی عورت گھر سے باہر بھیڑ کی طرح ہوتی ہے اور تمام مرد بھیڑیے۔"
"جب مرد بھیڑیے ہیں تو کیوں باہر نکلتی ہے عورت۔" شہیر نے سلگ کر کہا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"آخر مسئلہ کیا ہو گیا ہے؟" شہیر ابھی ابھی آکر ان میں بیٹھا تھا۔ اس لیے اسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ سب لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔

"یہ اپنی جواہر صاحبہ ویمنز ویلفیئر ایسوسی ایشن کی چیئرپرسن منتخب ہو گئی ہیں غالباً" نہال نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"خواتین کے حقوق کے لیے اور ان کی حمایت میں اپنی جان دینے کو تیار بیٹھی ہیں" ذیشان نے نہال کے کو مزید واضح کیا۔

"جاذب بھائی کہہ رہے ہیں کہ اللہ نے عورت کو مرد کے لیے بنایا ہے۔ جواہر آپا کہتی ہیں کہ مرد عورت بغیر ادھورا ہے۔ بات تقریباً ایک سی ہے مگر دونوں کا انداز جدا ہے۔ اب دونوں اپنے اپنے خیالات دلا کے ساتھ ایک دوسرے پر ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں" خمار نے ساری بات سمجھائی۔

"یہ جاذب بھائی آخر مان کیوں نہیں لیتے کہ مرد احساس برتری کا شکار ہے۔ وہ عورت پر حاکمیت جتلانے کوشش کرتا ہے۔ خاص طور پر شوہر بن جانے کے بعد وہ سمجھتا ہے کہ عورت اب اس کی جنبش ابرو کی محتاج ہے۔ اس کی مرضی ہو گی تو عورت سانس لے گی ورنہ ہرگز نہ لے گی" جواہر نظروں ہی نظروں [illegible]

اس کی بات پر [illegible] ایک طرف [illegible]

"دیکھو" جاذب نرم لہجے میں جواہر سے مخاطب ہوا۔

"ان سب باتوں سے میرا مقصد یہ ہے کہ عورت اپنے نسوانی وقار کو ختم نہ کرے۔ ہر وہ چیز اپنائے جو زیب دیتی ہو۔ اسے بے شک خود اعتماد اور بولڈ ہونا چاہیے مگر مردمار قسم کی نہ ہو۔ جیتی جاگتی عورت کانچ کی گڑیا نہ بنے۔ میں ایسی عورتوں کو پسند کرتا ہوں جو گھریلو بھی ہوں اور سوشل بھی مجھے زہر لگتی ہیں ایسی عورتیں جو اپنے ناخنوں کی دیکھ بھال اپنے بچوں سے زیادہ کرتی ہیں۔ میرے خیال میں بڑھے ہوئے ناخنوں والے ہاتھ اتنی دلکشی نہیں رکھتے جتنا گھریلو کاموں میں مشغول ہاتھوں کی بجتی ہوئی چوڑیاں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں"

"تو گویا آپ بہرحال عورت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں ناں"

اس نے جاذب کی باتوں سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔ جاذب نے جیسے نہ چاہتے ہوئے اثبات میں سر [illegible]

"میں بھی تو یہی کہتی ہوں کہ مرد عورت سے بے شک برتر ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد اگر سیڑھی پر سب سے اوپر کھڑا ہے تو عورت سب سے نیچے کھڑی ہے۔ عورت اس سے محض ایک اسٹیپ کھڑی ہے" جواہر متاثر کن لہجے میں بولی۔

"بس اب ختم کرو جھگڑا۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے لڑتا ہے اور پھر فتح کرتا ہے۔ عورت بغیر لڑے فتح کر لیتی ہے" خمار کی بات خوبصورت تھی' وہ سب یک خاموش ہو گئے اور اسے تعریفی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"واہ واہ خمار۔ تم نے بڑا شاندار ڈائیلاگ جھاڑا ہے" نہال نے اس کی تعریف کی۔ اور بس خمار صاحبہ بیٹھ گئیں۔

"تو گویا یہ بات مان لی گئی کہ مرد فاتح ہو کر بھی مفتوح ہے اور عورت مفتوح ہو کر بھی فاتح ہے" جواہر لہجے میں احساس تفاخر تھا۔

"اچھا میں آپ کو ایک واقعہ سناتی ہوں" زیبا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"سکندر اعظم نے جب دارا کو شکست دے کر اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا تو اس کے مصاحبوں نے اس کہا کہ وہ دارا کے محل میں چلے اس کے گھر کی عورتیں بے حد حسین ہیں۔ تو پتا ہے سکندر اعظم نے کیا جواب اس نے سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آنکھیں بھی خوب پھیلا لیں۔ (ڈرامائی عنصر پیدا کرنے کے لیے)

"کیا جواب دیا؟" سب نے سرگوشی میں پوچھا۔

"اس نے کہا کہ ہم نے اس خاندان کے شہ زور مردوں کو شکست دی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس خاندان کی

"چپ رہ کمبخت۔ تیری تو پہلی بھی بڑی مشکل سے ہو گی۔ کسی لڑکی کو ہاتھ پیر جوڑ کر راضی کرنا پڑے گا کہ اللہ کے نام پر ہمارے بھائی سے شادی کر لو" خمار ذیشان سے زیادہ ہی مایوس تھی۔

"بھئی کم تو دی پوائنٹ۔ تم لوگ بات کو کہاں سے کہاں لے گئے" شیراز نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ زبان کھولی ورنہ وہ زیادہ تر مسکرانے پر ہی اکتفا کرتا تھا۔

"اچھا جواہر تم یہ بتاؤ کہ یہ جو آج کی عورت آزادی کا نعرہ لگا رہی ہے کیا یہ صحیح ہے" جاذب نے کچھ سوچ کر پینترا بدلا۔

[illegible] کیا جو چار دیواری کا تصور ہمارے مذہب نے دیا ہے' وہ اس

جویریہ اپنے بستر میں دھنسی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی زور زور سے چیخنے لگی۔ وہ کان لپیٹ کر پڑ گئی مگر گھنٹی مستقل مزاجی سے بجتی ہی رہی۔ وہ کوفت زدہ سی ہو کر جھنجلاتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔ ادھر ادھر دیکھا کوئی بھی نظر نہ آیا۔

خدا جانے سب اپنے سینگوں سمیت کہاں سما گئے۔ اس نے جھلا کر سوچا اور ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو"

"بہری ہو گئی تھیں؟ ایک گھنٹے سے گھنٹی بج رہی ہے فون کی" کامران کی آواز آئی۔

"کتاب پڑھ رہی تھی" اس کی آواز سن کر جویریہ کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔

"کیسے فون کیا تم نے؟"

"ممی کہہ رہی ہیں کہ آج رات کا کھانا سب ہمارے ہاں کھائیں"

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آج ممی نے ڈنر پر ہماری پوری فیملی کو دعوت دے رکھی ہے۔ میں تمہیں آج سب سے متعارف کراؤں گا"

کامران کے لہجے میں اس کے لیے بہت خلوص تھا۔

"کہ یہ ہیں ملک کی مایہ ناز شخصیت۔ جویریہ قریشی۔ جن کی دید اور ملاقات سے فیض یاب ہو کر آپ سب خوش قسمت لوگوں کی فہرست میں آ گئے ہیں" وہ بڑی اکڑ سے بولی۔

"ہونہہ" کامران جل گیا "تمہاری خوش فہمی کا مرض تو دن بدن لاعلاج ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ آ رہے ہو ناں سب لوگ؟"

"ہاں ہم شام کو پہنچ جائیں گے۔ مغرب تک" اس نے پروگرام بتایا۔

"نہیں تم اور زوباریہ تو ابھی آؤ۔ دعوت کا انتظام کیا محلے والے آ کر کریں گے؟" وہ بولا۔

"اچھا بابا۔ تم اپنی چونچ بند کرو۔ زوباریہ کالج سے اب تک نہیں آئی۔ آج وہ غالباً دیر سے لوٹے گی"

"تو تم ہی آ جاؤ۔ تم تو گھر پر پائی جاتی ہو"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں کچھ دیر میں آتی ہوں" اس نے فون بند کر دیا اور اپنی ماں کے کمرے میں آئی۔

"امی' کامران کا فون آیا تھا۔ ممی نے ہم سب کو آج رات ڈنر پر بلایا ہے۔ میں ابھی جا رہی ہوں۔ آپ' ابا جان اور زوباریہ شام تک آ جائیے گا"

"جاؤ۔ گاڑی دھیان سے چلانا" بیگم قریشی نے پہلے اجازت اور پھر ہدایت دی۔

وہ خدا حافظ کہتی ہوئی باہر آ گئی۔ پورچ سے گاڑی نکالی اور زبیر صاحب کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دی۔ وہ ان کے گھر کی طرف رواں تھی مگر اس کا ذہن پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔

زبیر صاحب کی فیملی بے حد مخلص تھی۔ چند ہی ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ شروع شروع میں جویریہ اور زوباریہ ان لوگوں کے گھر زیادہ آتے جاتے جھجکتی تھیں۔ مگر اب تو جویریہ جتنا ہنگامہ اپنے گھر میں کھڑا رکھتی تھی اس سے چار گنا شور و غل ان کے گھر میں مچاتی تھی۔

بیگم زبیر بڑی پیاری شخصیت کی مالک تھیں۔ جویریہ سے ان کو خاص طور پر انس ہو گیا تھا۔ ہر بار وہ اس سے اس انداز میں ملتیں کہ جویریہ ان کی محبت کے آگے ہار سی جاتی تھی۔ وہ چاہت کا یوں اظہار کرتیں کہ وہ شرمسار سی ہو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جاتی۔ کبھی کبھی وہ ان سے بڑی حیرت سے پوچھتی۔

"ممی آپ مجھے اتنا چاہنے لگیں۔"

"اس سے بھی زیادہ۔" ان کے لہجے کا یقین اس کی آنکھوں میں اشک بھر دیتا۔

"ممی میں بھی آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔" وہ ان کے گلے میں بازو ڈال دیتی۔

"میں تم سے کیسے نہ پیار کروں۔ بیٹیاں ہوتی ہی پیار کے قابل ہیں۔" وہ اس کی پیشانی چوم لیتیں۔

"ہائے اللہ میاں آپ کو ایک بیٹی دے ہی دیتا۔" وہ افسوس سے کہتی۔

"دی تو ہے۔" وہ اسے محبت سے دیکھتیں۔

"ویسے تھی میری بھی ایک بچی۔ مر گئی۔"

"اچھا۔" وہ حیران رہ گئی۔

"کیسی تھی؟" اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"بہت پیاری سی۔ بالکل تمہاری طرح۔"

"کیسے ڈیتھ ہوئی اس کی؟"

"گیلری سے گر گئی تھی۔ چار برس کی عمر تھی اس کی۔"

"چچ چچ۔" اس کا حساس دل دکھ گیا۔

"کیا نام تھا اس کا؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"جویریہ۔"

"اوہ۔" وہ ایک دم ان کی صورت تکتی رہ گئی۔

زبیر صاحب کے گھر کا براؤن گیٹ نظر آیا تو خیالات کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ گاڑی سائیڈ میں کھڑی کر کے اندر چلی آئی۔

بیگم زبیر اس کو دیکھتے ہی کھل گئیں۔ بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"تم آ جاتی ہو تو گھر میں روشنی سی ہو جاتی ہے۔"

"ممی آپ مجھ سے اتنی محبت نہ کریں۔" اس کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی۔

"کیوں؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے کہیں یہ ڈھیر ساری محبتیں مجھ سے چھن نہ جائیں۔" وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

"ہشت۔ پاگل نہ ہو تو۔" ممی نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"اچھا ممی، جلدی سے بتائیے کہ آج رات دعوت کا انتظام کس طرح کرنا ہے۔" وہ ان کے زانو پر ہاتھ کا بوجھ ڈال کر اٹھتے ہوئے بولی۔

"کچن کا سارا انتظام تو صغراں کے ہاتھ میں ہے۔ تم اور کامران مل کر لان میں سٹنگ اریجمنٹ کر دینا۔ اتنی جلدی نہیں ہے۔ شام تک کر دینا۔"

"او کے پھر میں کامران کے کمرے میں ہوں۔ اس سے گپ شپ ہی کر لوں۔"

"میں صغراں کو دیکھتی ہوں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔"

"پکار ہی ہے۔" اس نے ان کی بات اچک لی۔

وہ ہنستے ہوئے کچن کی جانب بڑھ گئیں۔ جویریہ کامران کے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

چھوٹی سی تقریب بڑی پُر رونق تھی۔ کامران کی فیملی کے تقریباً سبھی افراد موجود تھے۔ کامران نے فرداً فرداً سب کا تعارف جویریہ اور زوباریہ سے کرایا تھا۔ وہ لوگ سلجھے ہوئے ذہنوں کے خاصے خوش اخلاق سے تھے۔ خاص طور پر نوجوان پارٹی تو بے حد فرینک اور گھل مل جانے والی تھی۔ دونوں بہنیں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں کر رہی تھیں۔ بڑا بے تکلف سا ماحول تھا۔ چھری کانٹوں کی آوازوں کے ساتھ دبی دبی ہنسی اور اونچے اونچے بے فکر قہقہوں کا شور بھی بلند ہو رہا تھا۔

جویریہ ہر ایک سے یوں اپنائیت اور بے تکلفی سے بات کر رہی تھی جیسے ان سب کی جان پہچان پیدا ہونے سے بھی قبل کی ہو۔ وہ بڑے مزے سے سارے لان میں گھومتی پھر رہی تھی۔

اس بات سے قطعی بے خبر کہ وہ نہ جانے کتنی پسندیدگی بھری نگاہوں کی زد میں ہے۔ کتنے دلوں کی دھڑکنیں منتشر ہو رہی تھیں۔

کتنے ہونٹ یہ کہنے کے لیے بے چین ہیں کہ بلا شبہ وہ بے حد حسین ہے۔

○ ● ◆

"شہیر تمہارا فون ہے۔" شہیر صوفے پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ نہال نے اسے اطلاع دی۔

وہ اخبار رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کیا کر رہی ہو؟" نہال جواہر کے پاس بیٹھ گیا جو سویٹر بن رہی تھی۔

"سویٹر بن رہی ہوں ذیشان کا۔"

"اس گھر میں ذیشان کے بڑے ناز اٹھائے جاتے ہیں۔" نہال مسکرایا۔

"چھوٹا ہے ناں۔" جواہر کے لہجے میں ذیشان کے لیے محبت تھی۔

"ہاہ۔" اس نے بڑی بریلی آہ بھری۔

"کاش کوئی ہمارے بھی نخرے سہنے والا ہوتا۔"

"آپ شادی کر لیجیے پھر خوب جی بھر کر ناز اٹھوائیے گا۔" اس نے مشورے سے نواز ڈالا۔

"اور اگر کوئی ایسی مل گئی کہ معلوم ہوا ہم اس کے نخرے برداشت کر رہے ہیں؟"

"تو کیا ہوا کر لیجیے گا۔ یہ بھی تو عورت کا حق ہے۔" وہ تیزی سے سلائیاں چلاتے ہوئے بولی۔

"ہونہہ ایسی کی تیسی کر دیجیے گا۔" اس نے سر کو جھٹکا دیا۔

"جواہر پلیز ذرا مجھے پانی تو پلاؤ۔ بہت پیاس لگ رہی ہے۔ آج صبح سے پانی ہی نہیں پیا۔"

"ابھی لاتی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی وہ باہر چلی گئی۔

"پلیز تم انکار کر دو۔ میں جیتے جی مر جاؤں گا۔" شہیر کا جملہ جواہر کے کانوں میں پڑا۔ اس نے ایک نظر شہیر کو دیکھا۔ وہ سیل فون پر کسی سے مخاطب تھا۔

جواہر نے جلدی سے فرج میں سے پانی نکالا اور واپس پلٹی۔

"مگر میں ابھی فی الحال اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ دادا جان کو لا سکوں۔" شہیر کا دوسرا جملہ کانوں سے ٹکرایا۔ وہ رکی نہیں جلدی سے ٹی۔ وی لاؤنج میں گھس گئی۔

"یہ لیجیے۔" اس نے گلاس نہال کے ہاتھ میں تھمایا۔

"تھینک یو۔" نہال نے بغور اس کی صورت دیکھی۔ وہ کچھ الجھی الجھی نظر آ رہی تھی۔

اسی وقت شہیر اندر داخل ہوا۔

"کس کا فون تھا؟" نہال نے اس سے پوچھا۔

"میرے دوست کا تھا۔" وہ خالی الذہنی سے بولا۔

"مگر وہ تو کوئی لڑکی تھی؟"

"میرے دوست کی بہن تھی۔ اس کا میسج دے رہی تھی۔" شہیر قدرے چڑ کر بولا۔

"میسج دے رہی تھی کہ قومی اسمبلی کے اجلاس کی تازہ ترین رپورٹ پیش کر رہی تھی۔"

"نہال بکواس مت کرو۔" وہ برہم سا ہو گیا۔

اس کے لہجے پر نہال اور جواہر نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ نہال نے حیرت سے کندھے اچکائے۔

"کافی پہنچ گئے آپ۔" جواہر نے نہال سے پوچھا۔

"نیکی کر رہی ہو وہ بھی پوچھ کر۔"

"شہیر بھائی آپ؟" وہ شہیر کی طرف مڑی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تو تھینکس مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ قدرے رکھائی سے بولا۔
جواہر اور نہال نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ جواہر باہر نکل گئی۔

☾ ● ◆

"ٹھنڈے پانی سے نہاتا۔" وہ کمبل لپیٹے، بستر میں دھنسا ہدایتیں جاری کر رہا تھا۔
"میں ابھی باہر نکل کر تمہیں جہنم رسید کرتا ہوں۔" شہیر غصے میں دانت پیستا ہوا بولا۔
رات کا ایک بجا تھا۔ سخت کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ نہال، شہیر کے کمرے میں موجود تھا۔ اور وہ باتھ روم میں نہا رہا تھا۔ باتھ روم میں پانی گرنے سے زیادہ شور ان صلواتوں اور کوسنوں کا تھا جو شہیر کے منہ سے پانچ سو الفاظ فی منٹ کے حساب سے نہال کے لیے نکل رہی تھیں۔
نہال، شہیر کے مغلظات سن کر یوں جھوم رہا تھا جیسے نصرت فتح علی خان کی "دم مست قلندر مست مست" سن رہا ہو۔
"ہائے میں مر گیا۔ اللہ مجھے بچا لے۔" شہیر نہا کر باہر نکلا تو اس کے دانت باقاعدہ موسیقی کا پروگرام راگ رنگ پیش کر رہے تھے۔
"ٹھہرو میں پنکھا کھول دوں۔" نہال یوں بولا جیسے شہیر پانی سے نہیں پسینے سے نہا کر نکلا ہو۔
"خبیث انسان! کیا تیرے سینے میں چنگیز خان کا دل فٹ ہو گیا ہے۔" اس کی بات سن کر شہیر کا جی چاہا کہ اس کی گردن ہی مروڑ دے۔
"میں اگر مر گیا ناں تو میرا خون ناحق تمہاری گردن پر ہو گا۔"
"کچھ نہیں ہوتا تمہیں۔ تم اتنی آسانی سے مرنے والے نہیں ہو۔" وہ لاپروائی سے بولا۔
شہیر جلدی سے سویٹر پہن کر لحاف میں گھس گیا اور سر تک اوڑھ لیا۔ لحاف میں چھوٹے سے دو سوراخ بنا کر ان میں اپنی آنکھیں چپکا کر نہال کو گھورتے ہوئے بولا۔
"تم نے میرے اوپر اتنا سارا تیل کیوں ڈالا؟"
"اس لیے کہ تم شرافت سے نہانے نہیں جا رہے تھے۔" نہال کے لہجے کے اطمینان سے وہ مزید تپ گیا۔
سلگ کر اس کی نقل اتاری۔ "نہانے نہیں جا رہے تھے۔ اب تک میرے بالوں سے تیل کی چکناہٹ نہیں گئی۔"
تیل سے تو شہیر کو ازلی بیر تھا۔ خمار اور زیبا بھی اگر کبھی کبھار بالوں میں تیل ڈال لیا کرتیں۔ تو جب تک سر دھو لیا کرتیں وہ ناک پر رومال رکھے رکھے گھومتا۔
"اوہ ہاں۔" نہال کو جیسے یاد آیا۔
"میں تمہارے لیے آئس کریم بھی لایا تھا۔" اس نے تو شہیر کی فوتگی کے پورے پورے انتظامات کر رکھے تھے۔
"نہال تیرا ستیاناس میں عالم شباب میں ہی دنیا سے اٹھ جاؤں گا۔" اس نے لحاف کے اندر ہی دونوں ہاتھ اٹھا کر نہال کو کوسا۔
"میرے پروردگار وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جو میں نے نہال کو بتایا تھا۔ پاگل ہو گیا تھا میں۔ عقل میری گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ نہال۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔
"بھائی تو چاہتا کیا ہے آخر؟ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"
"چاہتے تو تم ہو۔ جواہر کو۔"
"جہنم میں گئی جواہر۔" اس وقت تو اسے جواہر بھی زہر لگ رہی تھی۔ (بھلا بتاؤ ایسے عشق کا کیا کرنا ہے جو سردی میں نہانے پر مجبور کر دے۔)
"تو تم بارات لے کر وہیں جاؤ گے؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔
"کہاں؟" شہیر کے لہجے میں حیرانی تھی۔
"جہنم میں؟" وہ بھولپن سے بولا۔

"دفع ہو جاؤ اپنی صورت لے کر۔ اور نقصان ہونے سے پہلے مجھے کا غذ اور پین دے جاؤ۔"
"کیا جواہر کو محبت نامہ لکھو گے؟"
"ارے گدھے وصیت نامہ لکھوں گا۔ آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔ ہائے تم دیکھ لینا ایک گھنٹے میں میری دھڑکن ٹھنڈی ہو جائے گی۔ چچ چچ۔ لوگ کیا کہیں گے کہ شہیر بے چارا کنوارا ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔"
اسے قبل از وقت مرنے کا غم کھائے جا رہا تھا۔
"اب یہ را۔ را۔ را بند کرو۔ اور سو جاؤ۔" نہال نے اٹھ کر ٹیوب لائٹ آف کر دی اور نائٹ بلب جلا دیا۔
"یا اللہ تو میرے گناہ بخش دے۔ میں تیرا بہت ہی معصوم، نیک، شریف بندہ ہوں۔" وہ خدا سے اپنے گناہ بخشوانے میں مصروف ہو گیا۔ "ارے او نہال کے بچے۔" اس نے لحاف سے باہر منہ نکالا۔
"آخری بار دیکھ لے مجھے جی بھر کے۔ پھر میں دوبارہ نہ آ سکوں گا مر کے۔ کل تک تو میری "شہریت" بدل چکی ہو گی۔ میں کسی اور دنیا کا باسی ہو چکا ہوں گا۔ آہ۔" اس نے دل کی عمیق گہرائیوں سے "آہ" نکالی۔
"جواہر میری بیوی بننے سے پہلے ہی بیوہ ہو جائے گی۔"
"فکر نہ کرو۔ اس کے بدلے عدت میں، میں بیٹھ جاؤں گا۔" نہال نے دلاسا دیا۔
"شٹ اپ۔" وہ اس کو ڈانٹ کر پھر اپنے بعد از وفات حالات کی فکر میں لگ گیا۔
"کل کے اخبار میں خبر چھپے گی کہ شہیر علی خان اپنی مرضی سے وفات پا گئے۔"
"میں نے آج تک کوئی ایسا مردہ نہیں دیکھا جو مرنے سے پہلے اتنا شور مچاتا ہو۔" نہال دانت کچکچا کر بولا۔
"اچھا تو میں چلا اس جہان فانی سے۔" وہ ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر پڑ گیا۔
"کہاں دفن ہونا پسند کریں گے آپ؟" نہال اس پر جھک گیا۔
"آپ کی قبر کے برابر میں۔" وہ بھنا کر بولا۔ نہال نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔
"اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کہ کیسا محسوس کر رہے ہو؟" اس نے شہیر کے گیلے بالوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔
"ملک الموت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے رہی ہے۔"
"ابھی تک تم نے کسی ریشمی آنچل کی سرسراہٹ تو سنی نہیں۔ ملک الموت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سننے بیٹھ گئے۔"
"ہاں تو یہ سردی میں نہانے والی ترکیب تمہاری تھی۔" وہ لحاف کے اندر سے دھاڑا۔
"اچھا اب تم سو جاؤ میں بھی یہیں تمہارے کمرے میں سو جاتا ہوں۔" نہال نے تکیہ اور کمبل اٹھا کر قالین پر پٹخا اور لیٹ گیا۔
"اوپر صوفے پر سو جاؤ ناں۔ اچھا نہیں لگ رہا ہے بڑا بھائی تو بستر پر سو رہا ہے اور چھوٹا زمین پر۔" شہیر اس کی محبت سے مجبور ہو کر بولا۔
اس کی بات نے جیسے نہال کے اندر توانائیاں بھر دیں۔
"یہ تمہاری محبتیں ہی ہیں جنہوں نے مجھے مار ڈالا ہے۔ اب آواز بند کرو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ شب بخیر۔"
"شب بخیر۔ بھائی بات سن۔" شہیر نے پھر لحاف سے منہ باہر نکالا۔
"یار ہر آدھے گھنٹے کے بعد مجھے چیک کرتے رہنا۔ کہیں میری روح قفس عنصری سے پرواز تو نہیں کر گئی۔"
"یا اللہ تو مجھے چھت پھاڑ کر اٹھا لے۔" نہال نے سر پیٹ لیا۔
"اچھا بس یوں سمجھو کہ میں سو گیا۔" شہیر نے کروٹ بدل لی، نہال نے بھی سر تک کمبل تان لیا۔
صبح پہلے نہال ہی کی آنکھ کھلی۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ قالین پر کیوں پڑا ہے۔ وہ یہی سمجھا شاید سوتے میں بستر سے گر گیا۔ اسی لمحے اس کی نگاہ شہیر پر پڑی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔
اس نے کلاک پر نگاہ ڈالی۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ وہ اٹھا اور شہیر کے منہ پر سے لحاف اٹھا کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
"اوہ مائی گاڈ۔" شہیر سخت بخار میں جل رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نہال وہیں اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔

"شہیر!" اس نے ہولے سے آواز دی۔

"ہوں!" اس نے بمشکل اپنی سرخ آنکھیں کھولیں "کیا ہوا؟"

"بھائی تجھے بہت تیز بخار ہے۔"

"ہونے دے مگر مجھے سونے دے۔"

"مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ یہ بے وقوفوں والی ترکیب میرے ہی ذہن کی پیداوار تھی۔ سوری بھائی!" وہ واقعی ملول دکھائی دے رہا تھا۔

"گدھے ہو تم۔ اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ ایک آدھ دن میں ٹھیک ہو جاؤں گا!" شہیر لحاف کے اندر سے بولا۔

"لاؤ میں تمہارا ٹمپریچر نوٹ کرتا ہوں!" اس نے دراز میں سے تھرما میٹر نکالا اور شہیر کے لگا کر دیکھا۔ اسے ایک سو دو بخار تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ یہ بتاؤ کہ کوئی آیا تو نہیں بلانے کے لیے؟"

"نہیں اب تک تو کوئی اوپر نہیں آیا حالانکہ ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں!"

"اب تم دعا کرو کہ جواہر ہی بلانے آئے!" شہیر نے کہا اور دونوں ہل ہل کر خشوع و خضوع سے جواہر کے آنے کی دعائیں مانگنے لگے۔

دروازے پر دستک کی آواز سے دونوں کے دل دھڑک گئے۔

"کون ہے؟" نہال ہی نے پوچھا۔

"بھائی جان دروازہ کھولیں!" اللہ مہربان تھا اسی لیے باہر سے جواہر کی آواز آئی۔

نہال نے معنی خیز نظروں سے شہیر کو دیکھا۔ وہ مسکرایا۔

"ابے احمق مسکرا کیوں رہا ہے؟ شکل ایسی بناؤ کہ بس صدمے کے مارے قریب المرگ ہو!"

اور شہیر میاں جھٹ صدمے کے مارے قریب المرگ ہو گئے۔ گردن ایک طرف ڈال دی۔

اسی وقت دوبارہ دستک ہوئی۔

"آ رہا ہوں جواہر!" نہال اٹھنے لگا کہ شہیر نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"یار! میرا دل بری طرح دھڑک رہا ہے!" اس نے سرگوشی کی۔

"تم اپنے دل سے کہو کہ ذرا تمیز سے دھڑکے!" اس نے جا کر دروازہ کھول دیا۔

"نہال بھائی آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ سب لوگ ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ شہیر بھائی کہاں ہیں؟ سو رہے ہیں اب تک؟ حد ہو گئی!" وہ بولتے بولتے اندر آ گئی۔

"شہیر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے!"

"کیا ہوا؟" اس نے شہیر کو دیکھا جو بے سدھ ہو کر پڑا تھا (صدمے کے مارے قریب المرگ)

"بخار ہو گیا!"

"مگر کل تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے؟" اس نے ذرا پریشانی سے کہا۔

"دیکھو کتنا تیز بخار ہے!" اس نے زبردستی جواہر کا ہاتھ پکڑا اور شہیر کے بازو پر رکھ دیا۔

"اوہ!" اس نے ہاتھ ہٹا لیا "یہ آخر یکایک انہیں کیا ہو گیا؟"

"میرا خیال ہے شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے ایسا ہو گیا!" نہال نے یوں کہا جیسے اپنے آپ سے بولا ہو۔

"کس بات کا آخر اتنا شدید اثر لے لیا؟" وہ کبھی نہال کو دیکھ رہی تھی اور کبھی شہیر کو۔

نہال تذبذب کے عالم میں اسے دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ کچھ کہے یا نہ کہے۔

"دراصل جواہر تم کسی سے ذکر نہ کرنا۔ شہیر اپنے دوست کی بہن سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اب اس لڑکی کی شادی کہیں اور طے ہو گئی ہے!"

جواہر نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔ نہال نے اپنی عقابی نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

جواہر کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر رہے تھے۔ اس نے سختی سے لب بھینچ لیے تھے۔ وہ بے چینی سے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں صرف اور صرف شہیر کی تعاقب کرتی ہوئی نگاہیں تھیں۔ اس کی وہ مسکراتی ہوئی خاموش نگاہیں۔ جنہیں وہ بہت دنوں سے اپنے اردگرد بھٹکتا محسوس کر رہی تھی۔

"تم چلو میں آتا ہوں!" نہال کے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

جواہر تیزی سے پلٹ گئی۔

"کیا تاثرات تھے اس کے؟" شہیر نے ایک آنکھ کھول کر پوچھا۔

"مبارک ہو!" نہال تقریباً اس کے اوپر چڑھ گیا۔

"ہوا کیا؟"

"آنسو نکل آئے تھے محترمہ کے۔ تیزی سے پلکیں جھپک رہی تھیں!"

"واقعی آنسو ٹپک پڑے تھے؟" شہیر کو یقین نہ آیا۔

"نہیں جلیبیوں کا شیرا ٹپک رہا تھا!" وہ جل کر بولا۔

"دراصل میں نے اچانک ہی غیر متوقع سی بات کہہ دی۔ اسے اتنی مہلت نہ مل سکی کہ اپنے تاثرات یا جذبات پر فوراً قابو پا لیتی۔ اب تو تم کو اطمینان ہو گیا کہ اس کے دل میں تمہارے لیے سافٹ کارنر ہے!"

شہیر کے چہرے پر رنگ بکھر گئے۔

"مگر یار نہال، وہ تو اب مجھ سے بدگمان ہو گئی ہو گی!"

"بے فکر رہو۔ میں ساری بات کلیئر کر دوں گا۔ تمہیں اتنی اچھی لڑکی کا ساتھ مبارک ہو۔ ایسا ساتھی مل جائے جس سے ذہنی مطابقت ہو تو زندگی بڑی آسان ہو جاتی ہے!" نہال نے شہیر کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ شرما سا گیا۔

"شرمانے کا تکلف نہ کرو۔ چوتھی کی دلہن لگ رہے ہو۔ اب تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ تمہارے اس بخار کی وجہ سے میرے ذہن پر بوجھ ہو گیا ہے۔ میں جا کر ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں اور تمہاری قلوپطرہ کو بھی دلاسے کی دو خوراکیں دے آؤں!" وہ باہر نکل گیا شہیر نے پرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

○ ● ◆

"جب سے تم میرے خاندان والوں سے ملی ہو میرے خاندان میں جنگ کا طبل بج چکا ہے!" کامران حد درجے بدتمیزی سے کون کھا رہا تھا۔

"کیوں؟" جویریہ اس سے دوگنا زیادہ بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مزے سے کمبل میں گھسی سخت سردی میں آئس کریم کھا رہی تھی۔

"میں تو سوچ رہا ہوں کہ اگر تم جیسے چار چھ فتنے اور اللہ میاں نے پیدا کر دیے تو دنیا میں ہر طرف دنگا فساد برپا ہو جائے گا!"

"ہوا کیا؟" وہ پوری دلجمعی سے اپنے کام میں مصروف تھی۔

"میرے شادی شدہ کزنز پچھاڑیں کھا رہے ہیں، جن کی منگنی ہو گئی ہے وہ دھاڑیں مار رہے ہیں اور جو ابھی فارغ ہیں ان میں رسہ کشی شروع ہو گئی ہے!" وہ اِدھر اُدھر کی تو ہانک رہا تھا مگر اصل بات نہیں بتا رہا تھا۔

"کچھ ہو بھی گیا!" وہ چڑ گئی۔

"دراصل سب ہار گئے!" وہ بڑے مزے سے بولا۔

"کیا ہار گئے؟" اس کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔

"اپنا اپنا دل۔ تم چیز ہی ایسی ہو!"

"بدتمیز۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟" اس کی بات جویریہ کی سمجھ میں آئی تو وہ پہلے تو جھینپ گئی۔ پھر اسے غصے سے گھورنے لگی۔

"شرم کی کیا بات ہے۔ بس چھپّر پھٹنے والا ہے۔ صبح ہوتے ہی میری بڑی خالہ آ جائیں گی، دوپہر میں چھوٹی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

چچی کا آنے کا ارادہ ہے۔ پھوپھو شام کے وقت آنے کو تیار بیٹھی ہیں اور بڑی والی تائی اماں تو غالباً فجر کی نماز ہی نکل کھڑی ہوں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فجر کی نماز یہیں آکر پڑھیں۔"

"کیوں آئیں گے سب؟" سمجھ تو وہ خوب رہی تھی مگر انجان بن رہی تھی۔

"ابا جان کے سامنے درخواست پیش کرنے کہ وہ ان کے نالائق سپوتوں کو اپنی فرزندی میں لے لیں۔"

"بکواس مت کرو کامران۔" جویریہ نے بُرا سا منہ بنایا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"دو چار اس قسم کی آوازیں ممی ڈیڈی کے کان میں پڑی ہیں۔ میری بڑی تائی اماں تو بے حد سنجیدہ ہیں اس سلسلے میں۔ وہ ممی سے صاف اور واضح الفاظ میں کہہ چکی ہیں کہ وہ تمہارے رشتے کے لیے ابا جان سے آنا چاہتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک آدھ روز میں ہی ممی کو ساتھ لے کر آن وارد ہوں گی۔"

"مجھے کوئی شادی وادی نہیں کرنی ابھی۔" وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اطمینان سے بولی۔

"کیوں؟" کامران نے پوچھا۔

"ابھی میں ایم کام کروں گی۔"

"بس اب تم ایم کام کو گولی مارو اور گھر کے کام میں دلچسپی لو۔ سنا ہے معاذ بھائی تین چار مہینے میں پاکستان آنے والے ہیں۔"

"یہ معاذ بھائی کون ہیں؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"میرے دولہا بھائی۔" اس نے بیل کو آواز دی کہ آ مجھے مار۔

اس کے بعد وہ آگے آگے اور بیل پیچھے پیچھے۔ ذرا سی دیر میں گھر پانی پت کا میدان بن چکا تھا۔

◯ ● ◆

وہ چھٹی کا دن تھا۔ نہال کو قریشی صاحب سے کچھ کام تھا۔ وہ ان کے گھر آیا تو وہ اسے ملے نہیں۔ کہیں باہر گئے تھے۔ وہ باہر لان میں جا رہا تھا کہ تیزی سے اندر آتی جویریہ اس سے ٹکرا گئی۔

"منہ پر آنکھیں نہیں ہیں کیا؟ دیکھ کر نہیں چلتے۔" وہ جھلا کر بولی۔

"اور تم کیا آنکھیں بند کر کے چلنے کی پریکٹس کر رہی تھیں۔" نہال نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

جویریہ دُور ہٹی تو ایک دم اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کے کھلے بالوں کی ایک لٹ نہال کی قمیص کے بٹن میں اُلجھ گئی تھی۔ اس نے نہال کی جانب دیکھا۔

اُف توبہ نہال کی نگاہیں۔ اس کا سارا وجود پانی پانی ہو گیا۔ جویریہ نے اپنے بال چھڑانا چاہے تو وہ اور اُلجھ گئے۔

"ہائے اللہ۔" شرمندگی، گھبراہٹ اور بے چارگی کی لہریں سر سے پیر تک جا رہی تھیں۔

نہال پُشت پر ہاتھ باندھے اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس کی جان پر بن آئی تھی اور وہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

جویریہ نے جھجکتے ہوئے نہال کے سینے پر ہاتھ رکھا اور دوسرے ہاتھ سے جھٹکا دے کر اپنے بال چھڑا لیے اسی کشمکش میں کچھ بال بٹن میں ہی اُلجھے رہ گئے۔

جویریہ دھک دھک کرتے دل پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ "سوری نہال بھائی۔"

"سوری تو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ میری قمیص کے بٹن اتنے گستاخ ہو گئے ہیں۔" وہ اسے گہری گہری نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

جویریہ اپنے بال لپیٹ کر تیزی سے جوڑا بنانے لگی تھی کہ اس کا ریشمی دوپٹا پھسل کر نہال کے پیروں پر جا گرا۔ نہال نے فوراً اس کی طرف سے نظریں چرا لیں۔ گردن موڑ کر دائیں جانب کیاری میں لگے گلاب کے پودوں کو دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں جویریہ جھک کر اپنا دوپٹا اُٹھا چکی تھی۔ وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ایک تو جویریہ کا حسن ہی قیامت تھا۔ دھوپ، غصّے اور جھلاہٹ کے امتزاج نے اس کے حسن کی چنگاری

کو شعلہ بنا دیا۔

نہال کو وہ اس لمحے اتنی اچھی لگی کہ اس کا جی چاہا کہ اسے چھیڑے چلا جائے۔ اس نے لے کر اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیے۔ اپنی لافانی محبت کا یقین دلانے کے لیے زمین آسمان ایک کرنے لگا۔

"ہائے۔" اس نے عاشقوں والی ہائے نکالی۔

"اللہ کرے وہ دن آئے جب اپنا بنائیں آپ مجھے۔"

"میں سر کو جھکاؤں قدموں میں اور جوتے لگائیں آپ مجھے۔ یہی کہنا چاہتے ہو ناں۔" وہ خون آشام نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"جوتے کیوں لگائیں، دل سے لگائیں۔" وہ ایک بے غیرت تھا۔

"نہال بھائی یہ گملا اُٹھا کر آپ کے سر پر دے ماروں گی۔"

"ان نازک کلائیوں سے گملا کہاں اُٹھے گا۔ میں صرف پھول سے ہی گزارا کر لوں گا۔" اس نے قناعت پسندی کا ثبوت دیا۔

جویریہ پاؤں پٹختی ہوئی لان چیئر پر جا کر بیٹھ گئی۔ نہال نے بھی اس کی تقلید کی اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

دیکھوں انہیں تو تابِ نظارہ نہیں مگر
ان کو نہ دیکھنا بھی قیامت ہے کیا کروں
گو بہت دل شکن ہیں ان کی تغافل شعاریاں
اس پر بھی مجھ کو ان سے محبت ہے کیا کروں

"کیا کروں؟" وہ لب چباتے ہوئے بولی۔

"میرے کمرے میں جاؤ، کونے میں شو ریک رکھا ہے۔ جا کر اپنے سر پر تڑاتڑ جوتے برساؤ تاکہ یہ جو محبت کا بھوت تمہارے سر پر سوار ہے یہ اترے۔"

"خدا جانے تم میرے جذبات کی قدر کب کرو گی؟ میں ہوں کہ تمہارے پیچھے عاشق حسین دیوانہ ہوا جا رہا ہوں۔ تم پر اثر نہیں ہوتا۔ یا تو تمہارا دل پتھر کا ہے یا میری آہ اور چاہ دونوں بے اثر ہیں۔ خیر میں سوچ رہا ہوں کہ روزانہ صبح چھ بجے اُٹھ کر ریاض کیا کروں۔ آہ میں سوز و گداز پیدا کرنے کے لیے۔"

اس کی آنکھوں میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ گھنی مونچھوں تلے لب مسکرا رہے تھے۔

جویریہ تنگ آ کر کرسی کا رُخ دوسری سمت کر کے نہال کی جانب پُشت کر کے بیٹھ گئی۔

"جویریہ۔" وہ مجنوں کے خاندان کا آخری چشم و چراغ بنا اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

"نہال بھائی آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" وہ زچ ہو کر بولی۔

"تمہیں۔" اس نے جھٹ کہا۔

"میں کوئی پچھتر ہزار دفعہ کہہ چکی ہوں کہ میں آپ سے شادی نہیں کروں گی، نہیں کروں گی۔"

"اور میں چھہتر ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میں تمہی سے شادی کروں گا۔"

"مرو۔ میرا کیا ہے۔ تھک ہار کے خود ہی میرا پیچھا چھوڑ دو گے۔"

"ہاہ۔"

اے عاشق تیری ہمراہی میں تھک جائیں تو دم لینے کو ہمیں
وہ سایہ زلف یار بہت اس کوچے کی دیوار بہت

وہ بھی عاشقی میں لت پت شعر حفظ کر کے آیا تھا۔

اسی لمحے گیٹ کے باہر قریشی صاحب کی گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔" جویریہ نے جھٹ گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی۔

"بے وقوف۔" نہال زیرِ لب بولا اور دھیرے سے ہنس دیا۔

◯ ● ◆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"بیٹا! باہر تو تم کو جانا ہی پڑے گا۔ کئی کنٹریکٹس سائن کرنے ہیں۔ نئے آرڈر لینے ہیں۔" قریشی صاحب نہال سے مخاطب تھے۔ "جاپان میں ٹریڈ فیئر بھی ہونے والا ہے۔"

"چچا جان میرا موڈ نہیں ہے۔" وہ کرسی پر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ کر سر نیہوڑائے پڑا تھا۔

"نہال تم پریکٹیکل لائف میں آ گئے ہو مگر مزاج ٹین ایجر والا ہی ہے۔" انہوں نے سرزنش کی۔

نہال ہنس دیا۔ "دراصل میں کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ انسان چینج بھی تو چاہتا ہے۔ یکسانیت سے اکتا جاتا ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ملک سے باہر چلے جاؤ۔ تفریح بھی ہو جائے گی اور کام بھی ہو جائے گا۔"

"دیکھوں گا۔" وہ قدرے بیزاری سے بولا۔

"بس اب چھوڑو یہ لاابالی پن۔ اپنا پاسپورٹ وغیرہ مجھے دے دینا۔ میں صدیقی صاحب سے کہہ دوں گا۔ تمہارے ویزے کے لیے اپلائی کر دیں گے۔" وہ اٹل لہجے میں بولے۔

"جی اچھا۔" وہ جیسے بادلِ نخواستہ بولا تھا۔

اس کے انداز پر قریشی صاحب مسکرا دیے۔

نہال انہیں بغور دیکھنے لگا۔ "چچا جان اگر آپ نہ ہوتے تو یہ فیکٹری کب کی بک چکی ہوتی۔ اسے آپ نے ری اسٹیبلش کیا ہے۔ میں آپ کا احسان مر کر بھی نہیں اتار سکتا۔ میرے والد تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن گئے تھے۔ جس ایمانداری سے آپ نے سب کچھ میرے حوالے کر دیا اس کی تو مثال ملنی مشکل ہے۔" اس لہجے میں تشکر تھا۔

"نہال۔" باہر سے بیگم قریشی کی آواز آئی اور قریشی صاحب کا جواب ان کے منہ میں ہی رہ گیا۔

"جی۔" اس نے دروازے کی سمت دیکھا۔

"کافی پیئو گے بیٹا؟" وہ اندر چلی آئیں۔

"نہیں۔ آپ نے کھانا ہی اتنا کھلا دیا ہے کہ اب اگر مزید کچھ حلق سے نیچے گیا تو سب کچھ ریورس ہو جائے گا۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

"بس اب تو چلنے کی کر رہا ہوں۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ جویریہ، زوباریہ اب تک نہیں آئیں۔"

"نہیں وہ دونوں دیر سے ہی آئیں گی۔ جویریہ کی سہیلی کی منگنی ہے تاں وہیں گئی ہیں دونوں۔" انہوں نے بتایا۔

"اچھا چچا جان اجازت دیجیے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" انہوں نے اس سے ہاتھ ملایا۔

بیگم قریشی اسے دروازے تک چھوڑ آئیں۔

وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ وہ ڈیفنس سوسائٹی کی بھول بھلیوں سے نکل کر شاہراہ فیصل پر آ گیا۔ اس کا فلیٹ حسن اسکوائر کے پاس تھا۔ یونیورسٹی روڈ سے وہ دائیں ہاتھ مڑ گیا۔ گلی میں کافی اندھیرا تھا۔ اس نے ہیڈ لائٹس تیز کر دیں۔ مگر جونہی اس نے اپنے فلیٹ والی گلی کا موڑ کاٹا اسے زوردار بریک لگانے پڑے کوئی گاڑی کے سامنے آ گیا تھا۔ بچاتے بچاتے بھی گاڑی کا کونا اسے لگ گیا اور وہ دھکے سے گر گیا۔ نہال تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا اور اس زمین بوس نسوانی وجود کو اٹھایا۔

"خاتون! میں معذرت چاہتا ہوں۔ غلطی میری بھی نہیں تھی۔ آپ اچانک گاڑی کے سامنے آ گئی تھیں۔ آپ کے چوٹ تو نہیں آئی؟" وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

"بیٹے! غلطی میری ہی تھی۔" وہ خاتون زمین سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ "دراصل بیچ سڑک پر میرا بٹوا ہاتھ سے

نکل گیا تھا۔ میں اٹھانے کو جھکی تو تمہاری گاڑی سے ٹکرا گئی۔ مجھے چوٹ نہیں آئی، ٹھیک ہوں۔"

انہوں نے کہنے کو تو کہہ دیا، مگر درحقیقت ان کے گھٹنے پر کافی چوٹ آئی تھی اور اس کا اظہار ان کی آواز سے بھی ہو رہا تھا۔ نہال نے صاف محسوس کیا۔

"نہیں، چوٹ تو یقیناً آپ کو لگی ہے، آپ مجھے بتانا نہیں چاہ رہی ہیں۔ آئیے میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ آؤں۔"

نہال سمجھا کہ شاید وہ یہیں قریب ہی کسی فلیٹ میں رہتی ہوں گی۔

"میں یہاں نہیں رہتی۔ میرا گھر تو نیپا چورنگی کے پاس ہے۔ میں تو بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔"

"کوئی بات نہیں، میں آپ کو گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں۔"

"میرے بیٹے! تمہیں تکلیف ہو گی خوامخواہ۔" وہ پس و پیش سے کام لے رہی تھیں۔

"آپ مجھے شرمندہ نہ کریں، یہ میرا اخلاقی فرض ہے۔ میری وجہ سے آپ کو چوٹ آئی ہے، تکلیف زیادہ ہو تو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"

"ارے نہیں، ذرا سا درد ہے ٹھیک ہو جائے گا۔"

ان خاتون کا فلیٹ سیکنڈ فلور پر تھا۔ نہال نے ان کو سہارا دے کر سیڑھیاں چڑھایا۔

گھنٹی بجتے ہی دروازہ کھل گیا۔ شاید کوئی دروازے سے ہی چپکا کھڑا تھا۔

"اماں بی! آپ کہاں رہ گئی تھیں۔ میرا دم تو بس نکلنے ہی والا تھا۔ آپ اگر اور تھوڑی دیر نہ آتیں تو میں مر چکی ہوتی۔"

وہ جو کوئی بھی تھی، اپنی ماں کے سینے سے لگ گئی اور ہچکیوں ہچکیوں رونا شروع کر دیا۔

"مجھے پتا تھا کہ بہت دیر ہو گئی ہے اور تم نے رو رو کر برا حال کر لیا ہو گا۔" خاتون تردد سے بولیں۔

"آخر آپ چلی کہاں ـــــ" اسی لمحے اس کی نگاہ نہال پر پڑی۔

آنسوؤں میں ڈوبی دو چمکتی سیاہ آنکھیں نہال کی آنکھوں سے الجھ گئیں۔

ان آنکھوں میں اتنی بے تحاشا چمک تھی کہ پانی کی دیوار اس چمک کو ماند نہ کر سکی تھی۔

اور اگلے ہی لمحے وہ دروازے کی اوٹ میں تھی۔

ایسے جیسے بجلی چمک کر غائب ہوئی ہو۔

جس سرعت سے وہ غائب ہوئی تھی، اسی سے نہال کو اندازہ ہوا کہ وہ ایک ٹک اسی کو دیکھتا رہا ہے۔

"لاحول ولا قوۃ۔" وہ اپنی غیر اخلاقی حرکت پر خود سے شرمندہ ہوا۔

"آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ۔" خاتون نے پورا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"نہیں شکریہ، بس اب میں چلتا ہوں۔" اس نے اندر جانے سے احتراز کیا۔

"تم نے میرے لیے اتنی تکلیف کی، میں تمہیں چائے پیے بغیر جانے نہیں دوں گی۔" ان کے لہجے میں بے حد اصرار تھا۔

"چائے کا تکلف نہ کریں، بس اجازت دیجیے۔" اسے یوں اجنبی گھر میں بے دھڑک گھس جانا کچھ اچھا نہ لگا تھا۔

"تکلف کی کیا بات ہے بیٹے۔ پریشانی تو تم کو ہوئی کہ مجھے یہاں تک چھوڑنے آئے، آؤ اندر آ جاؤ۔" انہوں نے اتنے خلوص سے کہا کہ وہ مجبور سا ہو گیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اندر چلا آیا۔ وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم میں چلی آئیں۔

"بیٹھو!" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود باہر نکل گئیں۔

نہال نے طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی۔ ڈرائنگ روم گو کہ سادہ تھا، مگر ہر چیز سے سلیقہ مندی ٹپک رہی تھی۔ وہ کونے میں رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تم جلدی سے چائے بنا لو۔" باہر سے اسے ان خاتون کی آواز آئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"اچھا!" جواباً چاندی کے گھنگھرو بجے۔ جھنکار میں ذرا سی آنسوؤں کی آمیزش بھی تھی۔

خاتون نہال کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی گفتگو بے حد سادہ تھی۔ تصنع اور بناوٹ سے پاک۔ نہ ذرا دیر میں اُن سے بے تکلف ہو گیا۔ اُسے ان کا اپنائیت بھرا انداز بھلا لگا تھا۔

"دراصل میں اپنی خالہ زاد بہن کی عیادت کو گئی تھی۔ اُن کے گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ ان کو اسپتال میں دا کر دیا ہے۔ میں وہاں سے سیدھی اسپتال چلی گئی۔ یہاں اپنی بیٹی کو کہہ گئی تھی کہ سات بجے تک آ جاؤں اسپتال دور تھا، آنے جانے میں وقت تو لگتا ہے، پھر بس کا ملنا بھی تو اس وقت دشوار ہوتا ہے۔ اتنی دیر ہو گئی۔ میری بچی رو رو کر ہلکان ہو گئی۔" اُن کے لہجے میں بیٹی کی محبت بول رہی تھی۔

"آپ کے شوہر ـــ؟" نہال نے پوچھنا چاہا۔

"انتقال ہو گیا ان کا، کئی برس گزر گئے۔" وہ افسردگی سے بولیں۔

"میری ایک ہی بچی ہے، بس ہم دونوں ماں بیٹی ہی رہتے ہیں۔"

اُسی وقت پردہ ہلا اور وہ دو چمکتی سیاہ آنکھوں سے آراستہ چہرے والی اندر داخل ہوئی۔

پتا نہیں کیوں بے ساختہ نہال کا جی چاہا کہ اپنی نگاہیں اُٹھا لے، ایک نظر اُسے دیکھ لے۔

ابھی دل اور نگاہوں میں رابطہ بھی نہ ہوا تھا کہ دماغ نے آنکھوں پر شرافت اور تکریم کا پردہ ڈال د نہال دل و دماغ کی اس جھڑپ میں اُلجھ سا گیا۔ اتنے میں وہ چائے کی ٹرالی اُس کے قریب کر کے باہر نکل دماغ پُرسکون ہو گیا، دل مسوس کر رہ گیا۔

نہال اپنے دل کی کیفیت پر پہلے حیران ہوا پھر جھنجلا سا گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹا، چائے لو نا۔"

"جی شکریہ۔" وہ چونک گیا اور چائے کا کپ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اتنی دیر ہو گئی تم سے باتیں کرتے ہوئے، مگر میں نے اب تک تمہارا نام ہی نہیں پوچھا۔"

"نہال نام ہے میرا، نہال آفریدی۔" وہ شائستگی سے گویا ہوا۔

چائے کا کپ اُس نے جلدی جلدی حلق میں اُنڈیلا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کا بے حد شکریہ امّاں بی!" وہ ایک دم چُپ ہو گیا۔ اُس کے منہ سے بلا ارادہ پھسل گیا تھا۔

"معذرت خواہ ہوں، میرے منہ سے بے ساختہ ہی نکل گیا تھا۔" وہ جھینپ کر بولا۔

خاتون کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"میرے بھانجے اور بھتیجے بھی مجھے امّاں بی ہی کہتے ہیں، مگر تمہارے منہ سے کہنا مجھے اچھا لگا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ کسی اچھے گھرانے کے چشم و چراغ معلوم ہوتے ہو۔"

"اب میں چلتا ہوں۔" اُن سے اجازت طلب کر کے وہ باہر آ گیا۔

باہر نکلتے ہی وہ اپنی نگاہوں کو چوری سے نہ بچا سکا۔ وہ تیزی سے اِدھر اُدھر کی خبر لے چکی تھیں او اُس کو نہ پا کر ناکام لوٹ آئی تھیں۔

بیرونی دروازے سے باہر نکل کر وہ فلیٹ کی سیڑھیاں ایک ایک کر کے اُترنے لگا۔

اور اپنی سوچ کی سیڑھیاں ایک ایک کر کے چڑھنے لگا۔

"سوال یہ ہے کہ نظر بے قابو کس طرح ہوئی؟"

"دل نے بہکایا۔"

"دل کو بغاوت پر کس نے اُکسایا؟"

"دو آنکھوں نے۔"

"کیا دل محض ایک اُچٹتی نگاہ سے زیر ہو جاتے ہیں؟"

"لاحول ولا قوۃ، کیا میں لٹو ہو گیا ہوں۔" وہ اپنے آپ پر جھنجلایا۔

اپنے خیالات کو بے وقوفانہ اور خود کو احمق قرار دے کر اور گھر جا کر اپنے آپ کو محاورۃً سو جوتے رسید کر کا پروگرام ترتیب دے کر وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا نیچے آ گیا۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اُس نے ونڈ شیلڈ کی طرف دیکھا۔

دو سیاہ آنکھیں جھلملا گئیں۔

"حد ہو گئی نہال آفریدی ـــ تف ہے تم پر۔"

اُس نے جھٹکے سے گاڑی گیئر میں ڈالی، پہیوں نے احتجاج کیا اور گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔

"جب یہ دو آنکھیں آنسوؤں میں بھیگی اس قدر فسوں خیز ہیں تو مسکراتی ہوئی کیسی لگتی ہوں گی۔" دل سوچ بچار میں مُبتلا ہو چکا تھا۔ (توبہ! ہو گا کسی کا دل ایسا پُر تجسس قسم کا؟)

"تمہیں کیا؟ جیسی بھی لگیں، تم پر کیا آفت آ گئی؟" نہال نے دل کو جھاڑ دیا اور گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔

"تم کیوں چاہتے ہو کہ میں خاموش رہوں، میں تو بولوں گا۔" دل سدا کا ضدی اور ہٹیلا۔ بھلا اس نے کب کسی کی سُنی ہے؟

بڑا مان تھا اسے خود پر۔

اپنے جذبات کی پختگی پر۔

دل و دماغ کے ناقابلِ تسخیر ہونے پر مگر ـــ؟

لو ایٹ فرسٹ سائٹ کو پرلے درجے کی حماقت قرار دینے والا اپنے دل کی آواز دبانے کی کوشش میں تھا۔ اس وقت اس پر سخت جھنجلاہٹ طاری تھی۔ ایکسیلیٹر پر اُس کے پاؤں کا دباؤ اور بڑھ گیا۔ اُس نے اپنے فلیٹ پر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور گاڑی کا رُخ پناہ گاہ کی جانب موڑ دیا۔

وہ ہر صورت میں ایسے بیوقوفانہ اور جذباتی خیالات سے اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا۔ دل کو اس کی نادانی کی سزا دینا چاہتا تھا۔

اتنا تو بے قیمت نہ تھا اس کا دل کہ کسی کی بے ارادہ نگاہ اس کا عوض بن جاتی۔

○ ● ◆

اتنے دنوں سے گھر میں ایک ہی نام کی بازگشت سُنائی دے رہی تھی۔

"معاذ!"

خیر یہ تو اسے معلوم تھا کہ کامران کی بڑی تائی امّاں اپنے چھوٹے نورِ نظر کا پروپوزل لے کر آئی تھیں اور یہ کہ قریشی صاحب نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ اس سے آگے اس کی معلومات صفر تھیں اور نہ ہی اس نے معلومات میں اضافے کی کوشش کی۔ پر اب تو در و دیوار بھی معاذ ـــ معاذ کرنے لگے تھے۔ سو اس کے اندر تجسس پیدا ہونا فطری تھا۔

کس سے پوچھے جا کر؟

زوبار یہ احمق سے۔

اُف توبہ! اس کو تو آج کل اپنی خبر نہیں تھی۔ وہ بُری طرح اپنے امتحانوں میں مصروف تھی اور جب اس کے امتحان شروع ہو جاتے تو وہ کھانا پینا، سُکھ چین، آرام، غرض ہر چیز کو طلاق دے دیا کرتی۔ اپنا سکون تو اس کا غارت ہو ہی جاتا تھا۔ ساتھ میں وہ باقی گھر والوں کا سکون بھی حرام کر دیتی کیونکہ جب اس کو یاد نہ ہوتا تو وہ پھپک پھپک کر رونا شروع کر دیتی اور چاہتی کہ ساتھ میں گھر والے بھی اس کے ساتھ چیخیں مار مار کر روئیں۔

کامران بھی تو کتنے دِنوں سے نہیں آیا تھا اور نہ ہی وہ گئی تھی۔

اور بھلا کامران سے وہ پوچھتی بھی کیا؟ اسے جھجک محسوس ہوتی۔

"لے ہے، امّی کو اتنی توفیق نہیں کہ خود ہی مجھ سے بات کر لیں۔" اُسے امّی پر ہی تاؤ آنے لگا۔

اُس دن وہ لان میں مارچ پاسٹ کر رہی تھی، اس بات سے بے خبر کہ بیگم قریشی گیلری میں کھڑی اُسے دیکھ رہی ہیں۔

"جویریہ!" انہوں نے اُسے آواز دی۔ "اُوپر میرے کمرے میں آؤ۔"

"آ رہی ہوں۔" وہ اُن کے کمرے میں جا دھمکی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"آؤ بیٹھو! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"
"کیا بات ہے امّی؟"
اُن کے چہرے کے تاثرات غیر واضح تھے۔ وہ ان کا ذہن پڑھنے سے قاصر رہی۔
"بیٹا! تمہیں پتا ہے کہ کامران کی تائی امّاں نے اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔"
"جی!" وہ دھیرے سے بولی۔
"معاذ لندن میں رہتا ہے، تعلیم یافتہ ہے، اپنا کاروبار ہے، خاندان بھی اچھا ہے، یعنی بظاہر اس رشتے میں کوئی بُرائی نہیں، لیکن ہم لوگ اتنی جلدی اقرار بھی نہیں کریں گے۔"
انہوں نے ایک نگاہ بیٹی پر ڈالی پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"تمہارے ابّا جان نے تمہارے احسان ماموں کو لندن خط لکھا تھا کہ وہ معاذ کے بارے میں معلوم کریں کہ وہ کیسا ہے، کیا کرتا ہے، اس کی سوسائٹی کیسی ہے؟ کل ہی احسان بھائی کا خط آیا ہے۔ محض اتفاق ہے کہ وہ معاذ کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ انہوں نے اس کی بے حد تعریف لکھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمیں یہ رشتہ منظور کر لینا چاہیے اور یہ کہ تم اس کے ساتھ خوش رہو گی۔ سُنا ہے کہ معاذ کچھ دنوں میں پاکستان آنے والا ہے۔ تمہارے ابّا جان اس سے ملنے کے بعد ہی حتمی طور پر فیصلہ کر سکیں گے۔"
جویریہ خاموشی سے سر جھکائے ان کی بات بھی سن رہی تھی اور اپنے دل کی دھڑکن بھی۔
"تمہارا کیا خیال ہے بیٹا؟" انہوں نے بیٹی کا عندیہ جاننا چاہا۔
"جی میرا؟" وہ جیسے سوتے سے جاگی۔
"زندگی تم نے گزارنی ہے جویریہ! تمہاری رضامندی کے بغیر ہم اتنا بڑا قدم کیسے اُٹھا سکیں گے؟"
وہ نظروں سے اُسے تول رہی تھیں۔
(امّی جی! میری تو اُس سے جان نہ پہچان اور بننے چلا ہے وہ میرے دل کا مہمان، مجھے کیا پتا کہ وہ کیسا ہے؟ کیا کھاتا ہے؟ کیا پیتا ہے؟ دو ٹانگوں والا ہے یا چار ٹانگوں والا؟ میں کیا رائے دوں) اس کا دل شریر ہوا۔
"چپ کیوں ہو جویریہ؟"
"امّی جان! جو راستہ آپ اور ابّا جان میرے لیے منتخب کریں گے، اس پر چلنا میرے لیے سعادت کا باعث ہوگا، جسے آپ میرے حق میں بہتر کہہ دیں، وہ میرے لیے بہترین ہے۔"
"خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"
انہوں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جانے کیوں دل بھر بھر آ رہا تھا، مگر انہوں نے خود پر قابو رکھا۔ کچھ دیر اُسے دیکھتی رہیں پھر گہرا سانس لے کر گویا ہوئیں۔
"میں زوباریہ کو دیکھتی ہوں، صبح سے کمرا بند کیے پڑھ رہی ہے۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا۔"
"ہاں صبح اس کو یاد نہیں ہو رہا تھا۔ روتے ہوئے میرے پاس آئی تھی کہ اسے کچھ بھی یاد نہیں ہو رہا ہے، جو یاد ہے وہ بھی بھول رہا ہے اور یہ کہ میں اس کے ساتھ مل کر روؤں، اس پر غم و اندوہ کا جو پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اس کے نیچے میں بھی دب جاؤں۔ میں نے تو صاف کہہ دیا، مجھے نہیں آ رہا رونا۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے ابّا جان کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میرا خیال ہے ابّا جان نے ہی دھاڑیں ماری ہوں گی اس کے ساتھ بیٹھ کر۔" جویریہ نے پُرخیال انداز میں کہا۔
"شیطان!" بیگم قریشی نے خفگی بھری مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور باہر نکل گئیں۔
جویریہ کا ذہن امّی کی کہی ہوئی باتیں دُہرانے لگا۔
"معاذ!" اس نے زیرِ لب کہا۔
اپنی نارمل سوچوں، پُرسکون دل کی دھڑکنوں پر غور کیا۔ ذرا سا مسکرائی اور کمرے سے باہر آ گئی۔

○ ● ◆

"بھئی آج کل مجھے بہت بوریت ہو رہی ہے۔" ذیشان نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم تو ہو ہی نکمّے۔ کام کے نہ کاج کے، دُشمن اناج کے، بوریت تو ہو گی۔" زیبا بولی۔
"نہال بھائی سے میں نے کہا تھا شکار پر چلیں۔" اُس نے مُنہ بسورا۔
"تو شکار کرنے کیا جائے گا، کہیں خود ہی شکار نہ ہو جائے، بیٹھ جاؤ یہیں پر ہی۔" خمار نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا۔
"ذیشان! تم بوریت دور کرنے کے لیے ایک آدھ عشق ہی کر ڈالو۔" شہیر ہنس کر بولا۔
"تم تو سب کو ایسے ہی مشورے دو گے۔" نہال نے ذومعنی لہجے میں کہا۔
شہیر نے کن اکھیوں سے جواہر کو دیکھا۔
"کوئی فائدہ نہیں ہے، میں پہلے ہی کئی دفعہ لڑائی کر چکا ہوں۔" ذیشان مظلومیت سے بولا۔
"کیوں کیا ہوا؟"
"ہونا کیا تھا

رہا یونہی نامکمل غمِ عشق کا فسانہ
کبھی مجھ کو نیند آئی کبھی سو گیا زمانہ

"تمہیں آتا ہی کیا ہے سونے اور کھانے کے علاوہ؟" جاذب نے کتاب میں سے مُنہ نکال کر کہا۔
"آتا کیوں نہیں۔" وہ چڑ کر بولا۔ "مبلغ چار عشق لڑائے ہیں میں نے۔"
پھر دبی آواز میں کہا۔ "ناکام و نامراد۔"
"ہائے — ہائے۔" افسوس زدہ آوازیں اُبھریں۔
"کل ہی اپنی چوتھی محبت کو اس کی سسرال پہنچانے کے بعد گھر آ کر میں نے صدمے کے عالم میں چند اشعار کہے ہیں، اجازت ہو تو پیش کروں؟"
"ضرور — ضرور —!" سب دلچسپی سے اُسے دیکھنے لگے۔
"عرض کیا ہے۔" اُس نے شاعروں والی ادا سے کہا۔

اُف یہ حسین رُت، یہ موسم سُہانا
اس پر یہ حجاب ہے بادا ظالمانہ

"واہ — واہ!" اِک شور سا مچ گیا۔
"کیسی ادا تھی ذرا ہمیں بھی تو بتانا۔" نہال نے اسی کے انداز میں کہا۔
سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔
"اگر میرا یا میرے اشعار کا مذاق اُڑایا تو میں اُٹھ کر چلا جاؤں گا۔" اُس نے بُرا مان کر دھمکی دی۔
"ہاں یہ کہتے ہوئے۔"

میں چلا میں چلا، سر پہ باندھے کفن
موت کی راہ میں، لٹاتا لے جان من

نہال کی بات پر سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ذیشان سخت خفا ہو گیا۔
"میں جا رہا ہوں۔"
"کیا بات ہے نہال، کیوں تم ذیشان کو چھیڑ رہے ہو؟"
شیراز نے ذیشان کا بازو تھام لیا۔ ساتھ ہی نہال کو سرزنش کی۔
"اچھا چلو آگے بھی تو۔ حجاب کے بعد اگلا ظلم کون سا تھا؟" نہال مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولا۔
روٹھا روٹھا ذیشان پھر گویا ہوا۔

شوق میں اِک جھلک کی جانے لب سے نکلے ہیں
اللہ کے واسطے ذرا نقاب تو اُٹھانا

"ہائے اللہ ذیشان! کیا ہاتھ جوڑ دیے تھے تم نے؟" خمار نے حد درجہ معصومیت سے پوچھا۔
"میں واقعی جا رہا ہوں یہاں سے۔" وہ ناراض ہو کر چل دیا۔
"اچھا اب نہیں بولیں گے، معاف کر دو۔" خمار نے اُس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وہ لڑھکتا ہوا اپنی جگہ پر آ گیا۔

"اب کوئی نہ بولے۔" شیراز نے سب کو تنبیہہ کی۔

"ذیشان تم سناؤ۔"

دیکھتا ہے گر کوئی، تو دیکھنے دو خبیث کو
بھاڑ میں جائے یہ سارا زمانہ

"واہ۔۔۔ واہ۔۔۔!" داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔

اور ذیشان میاں اتنی تعریف پر اپنی اوقات سے باہر آ گئے۔

لیجیے یہ ہم نے اٹھا دی نقاب
بلا تکلف دیدار کیجیے جناب
دور کیوں کھڑے ہیں ذرا آئیے تو پاس
کمبخت تیرا ہو جائے ستیاناس

"ہائے ہائے اس نے ہمارے بھائی کو یہ کہہ دیا۔" زیبا فوراً برا مان گئی۔

"مجھے نہیں کہا تھا۔" ذیشان بلبلا کر بولا۔ "اور یہ میں کوئی آپ بیتی نہیں سنا رہا ہوں، سمجھیں؟"

اس نے زیبا پر آنکھیں نکالیں۔ وہ چرمرا کر جواہر کے پہلو میں دبک گئی۔

"آخری شعر ہے۔" اس نے سب پر ایک نگاہ ڈالی۔

آ تجھے مزے چکھاؤں زندگانی کے
عمر میں برابر ہوں میں تیری نانی کے

محفل کشتِ زعفران ہو گئی۔

"خوب!" شیراز نے ہنستے ہوئے اسے داد دی۔ سب ہی نے اس کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"بھئی کل چھٹی کا دن ہے، کوئی تفریحی پروگرام ہونا چاہیے۔" خمار نے کہا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ ہم سب ون ڈش پارٹی کر لیتے ہیں آپس میں مل کے، ذرا لطف ہی رہے گا۔" ذیبا نے تجویز پیش کی۔

"یار ذیشان! تو کھانے پینے کے علاوہ کوئی اور بات بھی کر لیا کر۔" نہال جو دور بیٹھا سونف پھانک رہا تھا سے بولا

"یہ تو جب مرے گا ناں تو وصیت کر کے مرے گا کہ میری قبر میں چھولے، دہی بڑے، فروٹ کیک، ڈرنکس وافر مقدار میں رکھوا دینا۔ وقتاً فوقتاً ٹھونستا رہے گا اٹھ اٹھ کے۔" خمار دانت کچکچا کر بولی۔

"پلیز آئس کریم ضرور رکھوا دینا۔" ذیشان نے ایسے ملتجی لہجے میں کہا کہ سب ہنس پڑے۔

"منکر نکیر کیا کہیں گے یہ قبر ہے یا ڈائننگ کار۔" زیبا کی بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔

"ویسے یہ ون ڈش پارٹی والی بات قابلِ غور ہے۔"

"تو ڈشیں ہوں گی ہی کتنی، ایک میں بنا لوں گی ایک زیبا بنا لے گی اور ایک تم۔" جواہر بولی۔

"جی نہیں، سب بھائی بنائیں گے۔" خمار نے شہیر وغیرہ کی طرف اشارا کیا۔

"بھئی، مجھے تو کچھ آتا نہیں ہے۔" شہیر نے دامن چھڑایا۔

"میں شہیر کو ہی بطور ڈش لے آؤں گا۔" نہال بولا۔

"ہاں ہم نمک، مرچ چھڑک کر کھائیں گے۔" زیبا نے شریر انداز میں بھائی کو دیکھا۔

"نمک مرچ کیوں، بادام پستہ نہ چھڑکیں۔" جواہر مسکرائی۔

"کیوں شہیر تمہیں بہت میٹھا لگتا ہے کیا؟" نہال اس کی جانب جھک کر بولا۔

"بھئی، شیراز بھائی کو معاف کر دیتے ہیں، یہ بے تُک کچھ نہ لائیں۔" نہال جلدی سے شیراز کی طرف متوجہ

"نہیں بھئی، میں پانی بوائل کر کے برف ڈال کر لے آؤں گا۔" وہ سب شیراز کی بات پر مسکرانے لگے۔

○ ● ◆

"یار نہال! یہ کتنا مشکل کام ہے۔" شہیر نے بیسن گھولتے ہوئے کہا۔

"اب اتنا بھی نہیں ہے۔" نہال سینڈوچز کے لیے مایونیز بنا رہا تھا۔

"تم عادی ہو ناں، فلیٹ پر ہوتے ہو تو سارے کام خود ہی کرتے ہو۔ تم کوئی ملازم رکھ لو ناں، ایک چھوڑ دس ملازم افورڈ کر سکتے ہو۔"

"میں وہاں کام نہیں کرتا، اپنا خالی وقت گزارتا ہوں۔ فارغ بیٹھا رہوں تو سوچیں مجھے پاگل کر دیں۔" اس نے طنزیہ کہا۔

شہیر چپ سا ہو گیا۔

"ہٹیں بھائی جان! مجھے یہ اوون میں رکھنا ہے۔" جواہر اندر آئی۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"دیکھ نہیں رہی ہو، کتنا برا وقت آیا ہے مجھ پر، قسمت میں یہ دن دیکھنا بھی لکھا تھا۔" شہیر نے بے خیالی میں ماتھے پر سے بال ہٹائے تو سارا بیسن ماتھے پر لگ گیا۔

جواہر کی ہنسی چھوٹ گئی۔ "لائیے چھوڑیے، میں بنا دیتی ہوں، آپ بیسن گھولتے کچھ اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔"

"بغیر بیسن گھولتے اچھے لگتے ہیں؟" نہال نے منہ موڑے بغیر کہا۔ شہیر نے ترچھی نگاہ سے جواہر کو دیکھا۔

"آپ کیا بنا رہے ہیں نہال بھائی؟" جواہر اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"کسی کی تقدیر بنا رہے ہیں۔" وہ برجستہ بولا۔

"شہیر بھائی! یہ لیجیے، اب پکوڑے آپ خود ہی بنا لیں۔" اس نے پیالہ شہیر کے ہاتھ میں تھمایا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

تن کے اجلے من کے اجلے، صورت چاند ستاروں کی
من کے نگر میں آن بسے ہیں کیسے کیسے پیارے لوگ

نہال نے مسکرا کر شہیر کو دیکھا۔

"خبیثِ اعظم! تو چاہتا کیا ہے؟ کیا مجھے پٹوائے گا؟" شہیر نے تلنے والا چمچہ اس کی کمر پر دے مارا۔

"یار شہیر! یہ لڑکیاں چاہے کتنی ہی طرم خان کیوں نہ ہوں، اس مرحلے پر آ کر ساری خود اعتمادی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ ایسے لرزتی ہیں جیسے وجود میں زلزلہ آ گیا ہو۔ واقعی حیا عورت کی فطرت ہے۔ اب جواہر ہی کو دیکھو، کس قدر خود اعتماد ہے مگر کتنی کنفیوز ہو جاتی ہے۔"

"ہاں، ظاہر نہیں کرتی، بات کا موضوع بدل دیتی ہے۔"

"مطلب کیا ہے آپ کا؟" نہال نے تیوری چڑھائی۔

میری زندگی ہے کشمکش مجھے سوچنا بھی محال ہے
تجھے اک ہاں سے گریز ہے میری زندگی کا سوال ہے

شہیر نے درد بھری آواز میں کہا۔

"اب ہاں تو وہ بوقتِ نکاح کرے گی اور یہ تمہارے پکوڑے آج کی تاریخ میں بن جائیں گے یا نہیں۔ زیادہ مزے کے نہ بنانا، جواہر کو پسند آ گئے تو ساری عمر تم ہی سے بنوائے گی۔"

شہیر اس کی بات سن کر ہنس دیا۔

○ ● ◆

تاج محل میں چھوٹی سی ٹیبل رکھی جا چکی تھی، سب اپنی اپنی ڈش لے کر حاضر ہو گئے۔

"یہ کیا ہے؟" جاذب نے ایک ڈش کی رونمائی کی۔

"دہی بڑے ہیں اور کیا ہیں؟" وہ درحقیقت ذیشان کا کارنامہ تھے۔

"چلو پہلے اسی کو چکھتے ہیں۔" جاذب نے ایک چمچہ منہ میں ڈالا پھر فوراً ہی اگل دیا۔

"یہ دہی بڑے ہیں یا دہی پتھر، کس نے بنائے ہیں؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

"آپ کے اکلوتے بھائی نے۔" ذیشان سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"بس تو اب یہ تم ہی کھاؤ گے پکڑو اپنے وہی بڑے۔" اس نے اپنی پلیٹ اس کے آگے پٹخ دی۔
"شہیر بھائی گانا سنائیے۔" زیبا، جواہر کا بنایا ہوا پائن ایپل کیک کھاتے ہوئے بولی۔
"کیوں رونے کا بہت دل چاہ رہا ہے تمہارا؟" ذیشان اس کی طرف مڑا۔
"تم چپ رہو، بھائی جان سنائیے ناں۔" وہ اصرار کرنے لگی۔
"ہاں بھئی موسم بھی خوبصورت ہو، نظارہ بھی حسین ہو تو کوئی اچھا سا گانا ہونا ہی چاہیے۔" نہال چھیڑنے باز نہ آیا۔
"کون سا سناؤں؟" شہیر راضی ہو گیا۔

دل میں طوفان چھپائے بیٹھا ہوں
یہ نہ سمجھو کہ مجھ کو پیار نہیں

نہال شریر انداز میں گویا ہوا اور شہیر اس کو دل ہی دل میں کوس کر رہ گیا۔
"مجھے یہ گانا نہیں آتا۔" اس نے انکار کیا۔
"تو کوئی دوسرا سنا دو، اپنی پسند کا۔"
شہیر اپنی پرسوز آواز میں گانے لگا۔

یہ جھکی جھکی نگاہیں انہیں میں سلام کر لوں
یہیں اپنی صبح کر لوں یہیں اپنی شام کر لوں

وہ بے ساختہ جواہر کی طرف اٹھنے والی اپنی نگاہ نہ روک سکا۔

تیرا غم، تیری جستجو، تیرا درد، تیری حسرت
تیری ہوا اگر اجازت تو میں اپنے نام کر لوں

وہ جذب کے عالم میں گا رہا تھا، اس بات سے قطعی بے خبر کہ اس کا عشق مشک بن رہا ہے۔

تو ہی میری ابتدا ہے تو ہی میری انتہا ہے
جہاں تو اشارا کر دے میں وہیں قیام کر لوں
تیری زلف کے یہ سائے بس اب آگے کون جائے
تو کہے تو زندگی کو میں یہیں تمام کر لوں

اس نے تو چھپانا چاہا تھا مگر افسانہ تو بہر حال بن ہی گیا تھا۔ ہر دل کو یہ خبر ہو گئی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ نگاہوں میں شوخی اور ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ لیے سب شہیر کو دیکھ رہے تھے۔ دوسری جانب جواہر شرم سے کٹے جا رہی تھی۔ اس کی ہتھیلیوں پر پسینہ آ رہا تھا۔ اس نے چور نگاہوں سے اپنے بھائی شیراز کو دیکھا جو بڑے لاپروا سے انداز میں بیٹھا تھا۔ ایک غصے اور خفگی بھری نگاہ اس نے شہیر پر ڈالی۔
شہیر نے گانا ختم کیا تو زیبا بولی۔
"بھائی جان! آپ کی آواز بہت اچھی ہے۔"
شہیر دھیرے سے ہنس دیا۔
"بھئی یہ چکن روسٹ کس نے بنایا ہے؟" شیراز نے پوچھا۔
"میں نے۔" خمار بولی۔
"میں نے سوچا تھا کہ جس کی ڈش مجھے سب سے زیادہ اچھی لگے گی میں اس کو یہ شولڈر بیگ دوں گا۔" اس نے بڑا خوبصورت سا بیگ خمار کی طرف بڑھایا۔
"ہائے اللہ! کتنا خوبصورت ہے۔" خمار تو پھولے نہ سمائی۔
"کہاں سے خریدا ہے آپ نے؟"
"کل ہی تو لیا تھا دبئی کی ڈیوٹی فری شاپ سے۔"
"بھائی جان! یہ تو بے ایمانی ہے۔" زیبا بسور کر بولی۔
"بھئی میں تو فلائٹس پر جاتا رہتا ہوں تم کو بھی لا دوں گا۔" اس نے زیبا کو چمکارا

"واہ بھائی جان! اگر سبھی بھائیوں میں سے کسی کی ڈش آپ کو پسند آ جاتی تو آپ یہ لیڈیز بیگ کس طرح دیتے؟" ذیشان کو تو خمار کا تحفہ کانٹے کی طرح دل میں چبھ رہا تھا۔
"یہ ناممکن تھا کہ مرد حضرات اس معاملے میں خواتین سے سبقت لے جاتے۔" شیراز مخصوص دھیمے سے انداز میں مسکرایا۔
"اور تمہارے وہی بڑے تو اس قابل تھے کہ تمہارے سر پر جوتے مارے جائیں۔" جاذب نے منہ بنا کر کہا۔
اسی لمحے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ سید صاحب باہر کی جانب آتے دکھائی دیے۔
"جاؤ زیبا! دادا جان کو بلا لاؤ۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کھائیں۔" شہیر نے کہا۔
"دادا جان! یہیں آ جائیے، ہم سب نے ون ڈش پارٹی کی تھی آپ بھی کچھ لیجیے۔" وہ کاہل وہیں بیٹھے بیٹھے چلائی۔
"نہیں، تم لوگ کھاؤ۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔ ان کی نظریں اتفاقاً یا قصداً نہال کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔
"آ جائیے نانا جان! میں یہاں سے اٹھ جاتا ہوں۔" نہال نے ہنس کر کہا۔ اس کی ہنسی میں دکھ کی شدید چبھن تھی۔
اس نے اپنی پلیٹ اٹھائی اور تیزی سے تاج محل کی سیڑھیاں اتر کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔
سید صاحب نے اسے اندر جاتے دیکھا، پھر نہ معلوم کیا سوچ کر وہ تاج محل کی طرف بڑھنے لگے اور اس کے قریب آ گئے۔
ذیشان کو یہ دیکھ کر غصہ آ گیا۔ اس نے پلیٹ میز پر رکھی اور نہال کے پیچھے اندر چلا گیا۔
سید صاحب میز پر رکھی چیزوں کا جائزہ لینے لگے۔ وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔
دوسری جانب نہال اپنے بیڈ روم کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔
احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
کب تک؟ آخر کب تک میرے احساس کو زخمی کیا جاتا رہے گا۔
کب تک میری ذات کی نفی کی جاتی رہے گی؟
کب تک مجھے ٹھکرایا جاتا رہے گا؟
کب تک ۔۔۔؟
اس کے وجود میں جیسے دوزخ دہک رہی تھی۔

○ ● ◆

وہ سیٹی بجاتے ہوئے اندر آ رہا تھا کہ ایک دم ٹھٹک گیا۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا حیرت بھر گئی۔
ڈرائنگ روم میں بیگم قریشی کے پاس اماں بی بیٹھی ہوئی تھیں۔
ان پر نگاہ پڑتے ہی دو سیاہ آنکھیں تصور میں آئیں، جھلملائیں اور غائب ہو گئیں۔
"نہال وہاں کیوں رک گئے بیٹا اندر آ جاؤ۔" بیگم قریشی بولیں۔
اس نے اندر آ کر دونوں کو سلام کیا۔
"خیریت سے ہیں آپ؟" وہ اماں بی سے مخاطب ہوا۔
"ہاں، نادرہ آپا! آپ نہال کو جانتی ہیں؟" بیگم قریشی تعجب سے بولیں۔
"ہاں، کافی دنوں کی بات ہے ان کی گاڑی سے میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، معمولی چوٹ آئی تھی، یہ مجھے لڑنے میرے گھر تک گئے تھے۔" انہوں نے تفصیل بتائی۔
"تم سے کیا رشتے داری ہے؟"
"بس سمجھیں کہ میرا بیٹا ہی ہے۔" وہ نہال کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔
"نہال! یہ میری پرانی ملنے والی ہیں۔ ان کی بیٹی زوباریہ کو ٹیوشن پڑھاتی ہے۔"
وہی دو سیاہ آنکھیں۔
"آہ! زوباریہ کتنے نصیب والی ہے۔" دل نے آہ بھری۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اُف خدایا! کتنی مشکلوں سے اس نے سب کچھ ذہن سے محو کیا تھا اور اب تو دل جیسے اماں بی کی صورت دیکھ کر انگڑائیاں اور جمائیاں لیتے ہوئے جاگ گیا تھا۔

"چچا جان کہاں ہیں؟" اُس نے قریشی صاحب سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔"

وہ اُن کے بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔

قریشی صاحب سے اپنے کاروباری امور ڈسکس کر کے جب وہ باہر نکلا تو خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اُس نے گھڑی دیکھی اور حساب لگایا کہ آیا وہ رات کے کھانے تک پناہ گاہ پہنچ سکے گا یا نہیں۔

وہ پورچ تک آیا تو اماں بی وہیں چکن کی سفید چادر اوڑھے جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

"نہال جا رہے ہو؟ رات کا کھانا کھا کر چلے جانا۔" بیگم قریشی نے کہا۔

"نہیں چچی جان! میں پناہ گاہ جاؤں گا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے تو کافی رات ہو جائے گی۔ پھر کبھی سہی۔ آپ گھر جا رہی ہیں؟"

وہ پہلے بیگم قریشی سے اور پھر اماں بی سے مخاطب ہوا۔

"ہاں بیٹا! مجھے بھی باتوں میں کافی دیر ہو گئی۔ بچی گھر میں اکیلی ہے۔"

"آئیے، میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

"تم خوامخواہ زحمت نہ کرو۔ مجھے رکشا مل جائے گا۔"

"لے آپا! اب اس وقت تو رکشا مشکل ہی سے ملے گا، تم نہال کے ساتھ ہی چلی جاؤ، یہ تمہیں چھوڑتے ہوئے نکل جائے گا۔"

ان دونوں کے اصرار کرنے پر اماں بی راضی ہو گئیں۔

نہال نے آگے والا دروازہ کھول دیا۔ وہ چادر سمیٹتے ہوئے بیٹھ گئیں۔ نہال مناسب رفتار سے ڈرائیو کرنے لگا اور اماں بی سے باتیں بھی۔

"جیسے اماں بی آپ کا گھر آگیا۔" اُس نے عین ان کے فلیٹ کے نیچے گاڑی روکی۔

"آؤ تم اوپر آجاؤ۔" انہوں نے اُترتے ہوئے کہا۔

"چلو — چلو — اوپر چلو۔" دل نے تو ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"نہیں پھر کبھی سہی، مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اُس نے ان سے معذرت کرتے ہوئے دل کی آواز سختی سے دبا

اُن کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی موڑ لی۔

جانے کیوں اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ آتے ہوئے انجانی خواہش کے جو ننھے ننھے چراغ وجود میں ہلکی ہلکی روشنی کر رہے تھے، اب واپس جاتے ہوئے وہ مایوس ہو کر بجھ چکے ہیں۔

آخر وہ اپنے آپ سے کیوں لڑ رہا ہے؟

جس راستے پر قدم آپ ہی آپ اُٹھ رہے ہیں، انہیں واپس پلٹ آنے پر کیوں مجبور کر رہا ہے۔

بھلا فطرت سے کوئی جیت سکا ہے؟

بے وقوف دیکھ تو لے، ذرا سا اس راستے پر آگے جا کر۔

آگے اندھیرا ہے کہ روشنی؟

پناہ گاہ پہنچنے تک اس کا ذہن بوجھل ہو چکا تھا اور وہ کمبخت دو آنکھیں تو حواسوں کو چٹ کر گئی تھیں

○ ● ◆

وہ مارے غصے کے گیٹ کے قریب ٹہل رہی تھی۔

"ارے کامران کے بچے اب مرتی جا آ کے۔ خدا جانے کہاں دفعان ہو گیا۔ ہائے وہ بے چاری کس حالت میں ہے۔ جانے اس پر کیا بیت رہی ہو گی۔ ہائے کامران خدا کا واسطہ آ بھی جا۔"

وہ بار بار گیٹ سے باہر جھانک رہی تھی۔ کبھی وہ مارے غصے کے اُبلنے لگتی اور اگلے ہی لمحے ہمدردی

اور تاسف کی تصویر بن جاتی۔

"اُس کو دیکھوں جا کر، وہ نہ جانے کس حال میں ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر کی طرف دوڑ گئی۔

اُسی لمحے ڈور بیل کی آواز پورے گھر میں گونج گئی۔

وہ آدھے راستے سے پلٹی۔

"کہاں مر گئے تھے؟" اُس نے غصے میں کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ "اوہ!" جونہی اجنبی پر نگاہ پڑی اُس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"سس — سوری!" وہ بُری طرح شرمندہ ہو گئی۔

"زبیر صاحب ہیں؟" اجنبی نے بے حد شائستگی سے کہا۔

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"اچھا تو پھر میں چلتا ہوں، آپ اُن سے کہیے گا — !"

"سنیے!" وہ جلدی سے بولی۔

"کیا آپ میرا ایک کام کر دیں گے؟" وہ ملتجی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ضرور — فرمائیے۔" وہ بے حد نرمی سے بولا۔

"پلیز میری مدد کریں، وہ بہت سخت تکلیف میں ہے، بے چاری مر جائے گی۔"

"کون؟" وہ چونک گیا۔

"اُفوہ! کیا ساری باتیں یہیں کھڑے کھڑے پوچھ لیں گے، جلدی سے آئیے۔" اُس نے راستہ چھوڑ دیا۔

اجنبی اندر داخل ہو گیا۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی بلکہ تقریباً دوڑتے ہوئے لان کے پچھلے حصے میں آئی۔

"ہائے اللہ کہیں وہ چل ہی نہ بسی ہو۔" وہ فکر مندی سے بڑبڑائی۔

اجنبی نے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے اُس کی سمت دیکھا۔

"آپ مجھے بتائیے تو سہی کون ہے وہ؟"

"یہ۔" جویریہ نے انگلی سے اشارا کیا۔

"جی!" اُس نے حد درجہ حیرت سے پہلے زمین پر بے سُدھ پڑی زخمی بلی کو دیکھا اور پھر جویریہ کو دیکھے گیا۔

"ہائے اللہ آپ مجھے کیا دیکھ رہے ہیں۔ بلی کو دیکھیے ناں۔ اس کی نبض چیک کریں۔ دل کی دھڑکنیں دیکھیں۔ انتقال تو نہیں ہو گیا اس کا؟" وہ بلی کے پیچھے ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

اجنبی شش و پنج کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کا تو سر چکرا رہا تھا۔

"اُف خدایا! کیا سانپ سونگھ گیا آپ کو؟ میں کہہ رہی ہوں بلی کو سونگھیے۔ اوف — فوہ!" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

"میرا مطلب ہے بلی کو دیکھیے۔"

اجنبی پنجوں کے بل گھاس پر بیٹھ گیا۔ بلی کو بغور دیکھا۔ وہ زخمی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ اور ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔

"آپ مجھے نیم گرم پانی اور روئی لا دیجیے۔ میں اس کے زخم صاف کر دوں گا۔ زخموں پر لگانے والی دوائی بھی لے آئیے۔"

"جی ابھی لائی۔" وہ حکم کی غلام جھٹ اندر کو دوڑ گئی۔

اس کی نظروں نے بے ساختہ جویریہ کا تعاقب کیا۔

چشم زدن میں وہ دوائی اور پانی لے کر حاضر ہو گئی۔ "یہ لیجیے۔"

اجنبی بلی کے زخم صاف کرنے لگا۔

"سی — سی — ہائے — آہستہ۔" جویریہ تکلیف سے یوں بلبلائی جیسے وہ بلی کے نہیں اس کے زخم صاف کر رہا ہے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اجنبی نے ذرا کی ذرا اُس کی طرف دیکھا۔

"یہ زخمی کیسے ہوئی؟"

"پتا نہیں! میں اس طرف آئی تو یہ اسی حالت میں تھی۔ میرا بھائی کامران اپنے دوست کے گھر گیا تھا۔ آنے والا تھا اسی کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ آئے تو اس کی مرہم پٹی کرے۔"

"آپ خود اس کی مرہم پٹی کر لیتیں۔"

"مجھے بلیوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔" وہ منمنا کر بولی۔ ساتھ ہی دو قدم دور ہٹ گئی۔ "اور مجھے چھپکلی اور لال بیگ سے بھی ڈر لگتا ہے۔" اُس نے اپنے بارے میں مزید گل افشانیاں کیں۔ پھر ایک دم لہجہ بدل کر بولی۔

"ویسے میں بہت بہادر ہوں۔"

اُس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"آپ زبیر صاحب کی کون ہیں؟" اُس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"میں اُن کی بیٹی ہوں جویریہ۔" وہ پوری طرح بلی کی طرف متوجہ تھی۔

اُس نے ایک دم سر اُٹھایا۔ اُس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اگلے لمحے وہ پھر اپنے کام میں مشغول تھا۔ بلی کی مرہم پٹی کر کے وہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک منٹ! میں ابھی آئی۔" وہ پھر پرواز کر گئی۔

اور وہ نہ جانے کس سوچ میں پڑ گیا۔

دو منٹ میں ہی جویریہ پھر سر پر کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ تھا۔

"میں دودھ میں دو پین کلر ڈال کر لائی ہوں، بلی کو دے دوں؟" اُس نے اس درجہ معصومیت سے پوچھا کہ وہ اس کی صورت کو دیکھتا رہ گیا۔

"آپ نے اس میں پین کلر کیوں ڈالیں۔ اب یہ والا دودھ بلی نہیں پیئے گی۔"

"میں نے اس لیے ڈال دیں کہ بے چاری بلی کو درد ہو رہا ہو گا، تھوڑا سا آرام ہی آ جائے گا۔ اچھا میں دوسرے پیالے میں لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر چلتی بنی۔ پلک جھپک ایک اور پیالہ لے آئی۔

"ذرا یہ دودھ بلی کے قریب رکھ دیں۔" وہ دو گز دور کھڑے ہو کر بولی۔

وہ ایک دم ہنس پڑا۔ "لائیے۔" اُس نے پیالہ لے کر بلی کے قریب رکھ دیا۔

"اللہ آپ کو زندگی دے۔ آپ کی عمر دراز کرے۔ آپ کا جذبۂ ہمدردی دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آپ نے میری معصوم بلی کی اتنی مدد کی۔" اُس نے فراٹے سے اُسے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے بلی کی تکلیف دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے رونا آ رہا تھا۔"

"اچھا میں اب چلتا ہوں۔" وہ گیٹ کی جانب بڑھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ تحریری طور پر بھی اس کو لکھ دیتی۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ خوش اخلاقی سے بولا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ ایک دم پلٹا۔

بے حد گہری نگاہوں سے اس نے جویریہ کو دیکھا۔

کیسا وجود کو جلا کر خاک کر دینے والا حسن تھا اس کا۔

ایک طویل سانس لے کر اس نے اپنی دلکش آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زبیر صاحب آئیں تو ان سے کہیے گا معاذ احمد آیا تھا۔"

"جی!" جویریہ ٹھٹھر کی ہو گئی۔

○ ● ◆

دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس کے لیے گاڑی چلانا دشوار ہو گیا تھا۔ وائپر تیزی سے ونڈ اسکرین پر حرکت کر رہے تھے مگر اگلے ہی لمحے پانی کی بوچھاڑ شیشے کو پھر دھندلا دیتی۔ وہ اماں بی کے گھر جا رہا تھا۔ آج چوتھی بار اُس کے قدم اس راستے پر پڑے تھے۔ دراصل بیگم قریشی کا سخت پریشانی کے عالم میں فون آیا تھا۔

"نہال! زوباریہ، نادرہ آپا کے ہاں ٹیوشن پڑھنے گئی ہے۔ اب اتنی تیز بارش میں، میں جویریہ کو اسے لینے کیسے بھیجوں؟ تمہارے چچا جان تو تمہیں پتا ہے کہ اسلام آباد گئے ہیں میرے بچے ذرا جا کر زوباریہ کو لے آؤ۔ میں سخت پریشان ہو رہی ہوں، اگر اتنی بارش میں یہاں تک نہ پہنچ سکو تو اپنے گھر لے جانا۔ مجھے فون کر دینا کم از کم میرے دل کو سکون تو ہو جائے گا۔"

"آپ فکر مند نہ ہوں، میں اسے جا کے لے آتا ہوں۔" اُس نے فون بند کر دیا۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل چپکے چپکے مسکرا رہا ہو۔ وہ خود بھی ہنس پڑا۔ شاید دل کی فتح ہو گئی تھی۔ آئینے میں نگاہ ڈال کر اُس نے اپنے کپڑوں کا تنقیدی جائزہ لیا۔ بالوں میں برش پھیرا۔ کار کی چابی اُٹھائی اور باہر آ گیا۔ پہلی بار وہ ان کے گھر اتفاقاً گیا تھا۔ دوسری بار اماں بی کو ڈراپ کرنے گیا تھا۔ تیسری بار زوباریہ اس کے ساتھ تھی کہ اس نے اپنی ٹیوٹر سے چند ضروری نوٹس لینے تھے اور اگلے دن اس کا پیپر تھا۔

"چلو زوباریہ! تم فٹافٹ اپنی ٹیوٹر سے نوٹس لے آؤ، میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ فیصلہ کر کے چلا تھا کہ اوپر نہیں جائے گا۔

"بھائی جان!" اُس کا لہجہ بڑا خوشامدی سا تھا۔ وہ سرک کر نہال کے قریب ہو گئی۔

"جی فرمائیے۔"

"بھائی جان ان کی سیڑھیوں میں بڑا اندھیرا ہوتا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے، آپ بھی میرے ساتھ اوپر چلیں۔"

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ ڈر لگتا ہے۔" اس نے زوباریہ کی نقل اُتاری۔ "بس تم جلدی سے جاؤ اور جلدی سے آؤ۔"

"پلیز۔!" وہ منت سماجت کرنے لگی۔

"تم اپنی ٹیوٹر سے کہو، وہ ایک باسکٹ نیچے لٹکا دے، تم اس میں بیٹھ جانا، وہ اوپر کھینچ لے گی۔" وہ مسکرانے لگا۔

"چلیے ناں۔" وہ ضد کرنے لگی۔

مجبوراً نہال اُس کے ساتھ اُوپر آیا۔ دروازے پر گی بیل پر انگلی رکھ دی۔

اُس نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ اپنی جادو بھری آنکھوں سے اُس نے نہال کو دیکھا

کیسی آنکھیں تھیں اس کی۔

سوتے سے جگا دینے والی۔

اور جاگتے کو سلا دینے والی۔

اس سے پہلے کہ نہال حواسوں میں آتا، وہ دروازے کے پیچھے ہو گئی۔ اک طلسم سا ٹوٹ گیا۔

اُس رات نہال نے اپنا آپ اپنے دل کے حوالے کر دیا۔ شعوری طور پر اس کے بارے میں سوچا۔ وہ عجیب تشنگی سی محسوس کر رہا تھا۔

پیاس تو جبھی بجھتی ہے جب ڈھیر سارا پانی پیا جائے۔ ایک گھونٹ پانی تو پیاس کو اور بڑھا دیتا ہے۔

آج اتنی تیز بارش میں وہ ایک بار پھر اس کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ بظاہر تو وہ زوباریہ کو لینے آیا تھا۔ مگر درحقیقت وہ اس کے در پر ایک جھلک کا سوالی بن کر کھڑا تھا۔

نادرہ آپا نے دروازہ کھولا، وہ اندر چلا آیا۔

"رانیہ!" انہوں نے آواز دی۔

کون کہتا ہے، جب پھولوں پر شبنم گرتی ہے تو آواز نہیں آتی۔ ہوتی تو ہے رانیہ۔

"جی!" اندر سے جھنکار آئی۔

"زوباریہ کو بھیج دو۔ نہال اسے لینے آئے ہیں۔"

"بس تھوڑے سے سوال رہتے ہیں، اسے سمجھا دوں۔"

نہال وہیں بیٹھ گیا۔ نادرہ آپا اس سے باتیں کرنے لگیں، مگر اس کے حواس خمسہ اندر کی جانب ہی فٹ تھے جہاں سے اس کے پڑھانے کی آواز آ رہی تھی۔ نہال اُس کی آواز اپنی سماعتوں میں محفوظ کر رہا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کچھ ہی دیر میں پردہ ہلا اور وہ زوباریہ کے ہمراہ ... نہال نے اُچٹتی سی نگاہ ڈالی۔

خوابیدہ سے حسن والا چہرا بڑا مقناطیسی تھا

اور نہال کا دل محض ایک لوہے کا ٹکڑا بن گیا۔

"السلام علیکم۔" دانیہ نے بڑے سرسری انداز میں کہا۔

"چلیں نہال بھائی۔" زوباریہ کتابیں سنبھالے کھڑی تھی۔

"چلو۔" وہ زوباریہ کو لیے باہر آ گیا۔

"کیا یوں بھی ہوتا ہے کہ دیکھا اور پھسل گئے۔" وہ سوچتے ہوئے سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔

"اب تو پھسل گئے، اعتراف کیوں نہیں کر لیتے۔" دل جھٹ بولا۔

وہ مسکرانے لگا۔ اُس نے اگر اقرار نہ کیا تو وہ انکار بھی نہ کر پایا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو شہیر نے ریسیور اُٹھا لیا۔

"کیا کر رہے ہو؟" نہال نے سلام دُعا کے بعد پوچھا۔

"اسی کافر کو دیکھ کر جی رہا ہوں، جس پر دم نکل رہا ہے۔"

نہال ہنسنے لگا۔ "کہیں فنا ہی نہ ہو جانا۔"

"کوئی بات نہیں۔ اڑا کے کہے گی خاک صنم یہ درد محبت سہنے دو۔"

نہال نے قہقہہ لگایا۔ "شہیر میاں۔"

ے عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی بہل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

"تم نے فون کیسے کیا؟"

"یار! قریشی صاحب نے کل صبح کی فلائٹ سے میری سیٹ بُک کرا دی ہے۔ مجھے کنٹریکٹس بھی سائن کرنے تھے ورنئے آرڈر بھی لینے تھے۔ اسی سلسلے میں اٹلی جا رہا ہوں۔ لندن، جرمنی اور اِدھر اُدھر کا بھی پروگرام ہے۔"

"تم تو کہہ رہے تھے کہ اس مہینے کے آخر میں جاؤ گے۔"

"ہاں، مگر قریشی صاحب کے بھانجے کی کل کی سیٹ لندن کے لیے بُک تھی۔ کسی وجہ سے کینسل کرائی ہو گی تو انہوں نے میری بُک کرا دی۔"

"کب تک آؤ گے؟"

"میرا خیال ہے ایک ماہ سے زیادہ لگ جائے گا۔"

"ہم لوگ آ رہے ہیں تمہیں سی آف کرنے۔"

"نہیں یار خوامخواہ ابھی چلو گے تو رات کو یہاں میرے گھر پہنچو گے۔ صبح چار بجے میری فلائٹ ہے۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا اور سب کہاں ہیں۔"

"شیراز تو صبح ہی فلائٹ لے کر گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ چین گیا ہے۔ زیبا اپنے کمرے میں ہے باقی سب واک کرنے گئے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے، تم اپنی محبت کے گھوڑے جواہر کے دل کے میدان میں چرنے چھوڑو، میں تو چلا۔"

"نہال!"

"کیا ہے؟"

"تم دادا جان سے تو بات کر لو کہ تم جا رہے ہو۔" شہیر نے قدرے رُک کر کہا۔

"ہاہ!" نہال کی زہر آلود ہنسی شہیر کے کان میں اُتری۔

"تم سے پہلے میں انہی سے بات کر رہا تھا۔ جانتے ہو انہوں نے کیا کہا؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"کیا کہا؟" اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

"میرا تم سے اور تمہارے بزنس سے کوئی واسطہ نہیں، جو جی میں آئے کرو۔"

شہیر خاموش ہو گیا۔

"شہیر! تم لوگوں کی محبت نے مجھے پناہ گاہ سے باندھ رکھا ہے، ورنہ میں کب کا پناہ گاہ چھوڑ چکا ہوتا۔"

"اچھا زیبا سے بات کرو، میرے سر پر کھڑی ہے۔"

"بھائی جان! آپ کب تک آئیں گے؟" اُس نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"جلدی ہی آ جاؤں گا۔"

"ہم آپ کے بغیر بور ہو جائیں گے۔" وہ اس کے جلتے ہوئے دل پر اپنی معصوم محبت کے چھینٹے مار رہی تھی۔

"مت کرو تم لوگ مجھ سے اتنی محبت۔ میں اس گھر میں محبت اور نفرت کی چکی کے درمیان بُری طرح سے پس رہا ہوں۔" اُس نے کرب سے سوچا۔

"تمہارے لیے کیا لاؤں؟" اُس نے سارے خیالات ایک طرف جھٹکے۔

"بس آپ خیریت سے لوٹ آئیں، ہمارے لیے وہی بہت ہے۔"

"بھابی لے آؤں تمہارے لیے؟" وہ شرارت سے بولا۔

"اوئی خدا نہ کرے، خبردار! ایسا نہ کرنا۔" زیبا کی بے ساختگی پر نہال ہنس پڑا۔

"اچھا جاذب وغیرہ آئیں تو مجھے فون کروا دینا۔"

"ہم سب لوگ آ رہے ہیں آپ کو سی آف کرنے، خدا حافظ۔" زیبا نے فون بند کر دیا۔

"تو یہ کتنا طویل سفر ہے۔" نہال نے بوریت سے سوچا۔

وہ فرینکفرٹ سے سوار ہوا تھا۔ لندن میں تھوڑی دیر رُکنے کے بعد جہاز نے ابھی ابھی ہیتھرو ایرپورٹ سے ٹیک آف کیا تھا۔ جہاز آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر رہا تھا۔ نہال ایزی ہو کر بیٹھ گیا۔ آس پاس بیٹھے ہوئے اللہ کے بنائے نمونوں کو دیکھنے لگا۔ مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے رنگ رنگ کے لوگ اپنے آپ میں مگن تھے۔ کچھ باتیں کر رہے تھے۔ کچھ رسالے پڑھ رہے تھے۔ نہال بور ہو کر شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔

"لے بی! بڑی جلدی شادی ہو گئی تمہاری۔"

نہال کے کانوں میں اُردو میں کہا گیا یہ جملہ پڑا تو وہ چونک کر پلٹا۔

اُس کے برابر میں ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی شلوار قمیص اور اسکارف میں ملبوس بیٹھی تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ کمال اطمینان سے چیونگم چبا رہی تھی۔ اُس کے دوسری طرف تقریباً پچاس پچپن سالہ ایک خاتون بیٹھی حیرت سے منہ کھولے اُسے تکے جا رہی تھیں۔ وہ بھی لڑکی کی طرح پاکستانی ہی معلوم دے رہی تھیں۔ ہلکے رنگوں کی شلوار قمیص اور بڑی سی چادر میں خاصے رعب اور دبدبے والی چیز لگ رہی تھیں۔

نہال نے کن اکھیوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔

اسے میں نے پہلے کہاں دیکھا ہے؟ وہ اُلجھن میں پڑ گیا۔

"لو بھلا بتاؤ اتنی ننھی سی عمر اور ماں باپ نے شادی کے جھنجٹ میں پھنسا دیا۔" بڑی بی ناک پر انگلی رکھ کر بولیں۔

"دراصل میں بڑی جنگلی، جانور، جاہل، جنونی و جذباتی قسم کی چیز تھی۔" لڑکی نے "ج" کے سارے الفاظ استعمال کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہوئے کہا۔ "لڑاکا میں اس قدر تھی کہ محلے والے مجھے تارپیڈو کہتے تھے۔ کام کو ہاتھ لگانا میرے مذہب میں گویا حرام تھا۔ کاہل تو اس قدر تھی کہ فریج کے پاس کھڑے ہو کر اپنی بہن کو آواز دیتی تھی کہ وہ مجھے پانی پلائے۔ نہانے کی بھی چور تھی۔ تین تین مہینے نہیں نہاتی تھی۔ بس ایک دن اماں سڑک پر کھڑی ہو گئیں اور فجر کی نماز کے بعد جو پہلا شخص اس سڑک سے گزرا اُسی سے میری شادی کر دی۔"

لڑکی زبان کا بھرپور استعمال کر کے گویا اللہ میاں کی عطا کردہ اس بیش بہا نعمت کا شکر ادا کر رہی تھی۔

نہال خوامخواہ ہی ان کی باتوں میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ نہ صرف لڑکی کا چہرا بلکہ اس کی آواز اور اس کا انداز بھی جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ لاکھ ذہن پر زور ڈالنے پر بھی یاد نہ آ رہا تھا کہ پہلے اسے کہاں دیکھا ہے۔ وہ بظاہر تو رسالہ پڑھنے میں محو تھا مگر اس کی پوری توجہ ان دونوں کی طرف تھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کتنے سال ہوگئے شادی کو؟" بڑی بی کی آنکھیں مارے تجسس کے اپنے سائز سے ڈبل ہو رہی تھیں۔

"تین۔" رسان سے جواب ملا۔

"بچے کتنے ہیں؟"

"چار۔" کھٹ سے کہا گیا۔

"چار بچے تین سال میں ہو بھی گئے؟" بڑی بی کے لہجے میں شک تھا۔

لڑکی ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی پھر جلدی سے بولی۔

"ہاں ناں! دو جڑواں بچے شادی کے پہلے سال ہوئے اور دو تیسرے سال پیدا ہوئے۔"

"اوئی! شاباش ہے بیٹی، تو اتنی سی عمر میں چار بچے پال رہی ہے۔"

بڑی بی کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اس بات پر اس لڑکی کے گلے میں گولڈ میڈل لٹکا دیتیں، تمغۂ شجاعت اور بہادری الگ عطا کر دیتیں۔

نہال نے ذرا سا منہ موڑ کر لڑکی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، مگر چہرے سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔

اسی وقت غالباً کسی پرندے کے قریب سے گزرنے کی وجہ سے جہاز کا توازن ذرا سا بگڑ گیا۔ تمام مسافر دائیں سے بائیں ڈول گئے۔

"ہائے میں مری۔" بڑی بی نے اپنا کمزور سا دل تھام لیا۔ "ارے میرا دم نکلا۔"

"فکر نہ کیجیے، آپ اتنی جلدی نہیں مریں گی۔ آپ کی تو شکل بتا رہی ہے کہ آپ دس بارہ گھنٹے اور جئیں گی، ویسے بھی گناہ گاروں کا دم اتنی آسانی سے نہیں نکلتا۔"

لڑکی شاید شیطان کے خاندان میں تولد ہوئی تھی یا پھر شیطان ہی اس کے خاندانی بزرگوں میں تھا۔

"ارے موئی میرے دشمن، لے لو ابھی میری عمر ہی کیا ہے اور تجھے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ شرم نہیں آتی بڑوں کے منہ لگتے ہوئے۔"

بڑی بی نے لڑکی کے خوب لتے لے ڈالے۔ ان کی آواز بھی قدرے اونچی ہوگئی تھی، جب ہی قریبی پڑوسی انہیں ہونقوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔

"لے میں پوچھ رہی ہوں کہ وہ تجھے برداشت کیسے کر رہا ہے؟" وہ ایک لمحہ رک کر دوبارہ اسٹارٹ ہوگئیں۔

"کون وہ؟ آپ کا "وہ" یا میرا "وہ"؟"

لڑکی نے شرارت سے کھنکتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے موتیوں جیسے سفید دانتوں کے درمیان اپنے احمریں لبوں کا گوشہ دبا رکھا تھا۔ ہنسی روکنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی اتر آئی تھی۔ دوسری جانب نہال میگزین میں منہ دیے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

"ہائے اللہ کیسی زبان دراز لڑکی ہے۔ نہ آگے دیکھے نہ پیچھے بولے ہی چلی جاتی ہے۔ اے لڑکے۔" بڑی بی نے نہال کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

نہال کے ہاتھ سے میگزین چھوٹ گیا۔ اس نے جھک کر اٹھایا اور انجان بنتے ہوئے بولا۔

"مجھ سے کچھ فرمایا آپ نے؟"

"اور کیا تیرے فرشتوں سے فرما رہی ہوں۔ یہاں بیٹھ جا آکے اور اس لڑکی سے کہہ دے کہ یہ تیری سیٹ پر چلی جائے۔"

"کیوں کیا آپ دونوں ساس بہو میں ان بن ہوگئی ہے؟" بڑی بی نے یہ سننے کے بعد نہال کی جو کھنچائی کی ہے تو اسے "آ بیل مجھے مار" کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آگیا۔

"تیرا کیا دماغ خراب ہوگیا ہے؟ یہ تجھے میری بہو نظر آ رہی ہے؟ آنکھیں تو پھٹ نہیں ہوگئیں ہیں تیری۔ ارے اللہ نہ کرے جو ایسی دس گز لمبی زبان والی لڑکی کو میں اپنی بہو بناتی، اگلے ہی دن باہر نہ کر دیتی۔"

"مجھے اکیلے ہی کریں یا ساتھ میں "انہیں" بھی نکال دیں؟" لڑکی نے بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

"اے چپ رہ لڑکی! خبردار جو تو نے اب مجھ سے بات کی۔ او لڑکے! تو نے سنا نہیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔" بڑی بی کا غصہ جہاز سے بھی اونچا جا رہا تھا۔

"آئیے پلیز!" نہال براہ راست لڑکی سے مخاطب ہوا۔

لڑکی نے ایک نظر اسے دیکھا۔ نہال کو یوں لگا جیسے اس کی نظروں میں شناسائی ہو۔ وہ چکرا سا گیا۔

"آداب عرض ہے۔" لڑکی نے جھک کر شوخی سے بڑی بی سے کہا اور جلدی سے نہال کی سیٹ پر آگئی۔ دونوں فریقین میں جنگ بندی ہو چکی تھی۔ نہال ان کے درمیان دیوار بن کر اور امن کا جھنڈا لہرا کر بیٹھ گیا تھا۔

لڑکی رسالہ پڑھنے لگی اور بڑی بی آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئیں۔ شاید مراقبے میں چلی گئی تھیں۔ نہال بیٹھا اپنے ذہن کو کوس رہا تھا۔ جسے یہی یاد نہ آ رہا تھا کہ اس لڑکی کو اس نے پہلے کہاں دیکھا ہے۔

ایئر پورٹ کی عمارت میں آنے کے بعد وہ کنویئر بیلٹ کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا۔ سرسری نگاہ جو آس پاس ڈالی تو برابر میں وہی جہاز والی پڑوسن کھڑی تھی۔ بیک وقت دونوں کی نگاہیں ٹکرا گئیں۔ لڑکی نے منہ پھیر لیا۔ اس کی نظروں میں کچھ عجب خفگی کا تاثر تھا۔ نہال الجھ کر رہ گیا۔ اس نے کنویئر بیلٹ پر نظر جما دی۔ اس کا سیاہ رنگ کا سوٹ کیس آ رہا تھا۔ جونہی وہ نزدیک آیا۔ نہال نے آگے بڑھ کر اٹھا لیا۔ اسی لمحے لڑکی نے نہال کی کلائی تھام لی۔

"یہ میرا ہے۔" وہ تڑخ کر بولی۔

نہال نے بے ساختہ سوٹ کیس غور سے دیکھا۔ وہ واقعی اس کا نہیں تھا۔

"آئی ایم سوری۔" وہ شرمندہ ہوگیا۔

"یو شُڈ بی سوری۔" لڑکی نے سر کو جھٹکا دیا اور سوٹ کیس اپنے قریب کر لیا۔

"غضب خدا کا دن دہاڑے منہ در منہ چوری ہو رہی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

نہال کے کانوں میں اس کی آواز پڑ گئی۔ وہ بھنا کر رہ گیا۔ اس نے خونخوار نظروں سے لڑکی کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ڈھٹائی کا بھرپور تاثر تھا۔

نہال پھر بیلٹ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کا سارا سامان آگیا تو اس نے ٹرالی پر لاد لیا۔ لڑکی بدستور وہیں کھڑی تھی۔ شاید اس کا مزید سامان آنا تھا۔ نہال نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی، وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ جانے اس کے چہرے پر کیا تھا۔ خفیف سی مسکراہٹ نہال کے ہونٹوں پر آگئی۔ ہنسی تو اسے بھی آ رہی تھی، مگر اس نے لب بھینچ رکھے تھے۔

کسٹم کے قواعد و ضوابط سے فارغ ہو کر وہ اپنے سامان کی ٹرالی گھسیٹتا ہوا لاؤنج سے باہر آگیا۔ اس نے سرپرائز دینے کے چکر میں کسی کو بھی اطلاع نہیں کی تھی، لہٰذا اس کو ریسیو کرنے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اس نے ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔

"آفریدی!"

پیچھے سے کسی نے اسے آواز دی۔ وہ ایک دم پلٹا۔

کریم شرٹ اور براؤن پینٹ میں ملبوس اس نوجوان پر نگاہ پڑتے ہی لمحے کے ہزارویں حصے میں اسے یاد آگیا کہ اس جہاز والی لڑکی کو اس نے پہلے کہاں دیکھا ہے۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

"عمر — تم!" حیرت اور خوشی کے جذبات ایک دم ہی امڈ آئے۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

عمر اس سے لپٹ گیا۔ "آفریدی! میرے یار! تو کس جہان میں کھو گیا تھا؟"

"اسی جہان میں تھا۔ تم ڈھونڈنے کی کوشش تو کرتے۔" نہال اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"اور تم کیسے ہو؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اب تک رضائے الٰہی سے انتقال کر چکے ہو گے، قبر کا نام و نشان تک مٹ چکا ہوگا۔ قرآن شریف پڑھ کر تمہاری روح کو ثواب پہنچایا کرتا تھا۔"

نہال نے اب تک اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کبھی میرے بارے میں کوئی اچھی بات بھی سوچ لیا کرو۔" عمر نے منہ بنایا۔

"اور سناؤ، امریکہ سے کب آئے؟ ایم۔ بی۔ اے مکمل ہوگیا؟" نہال نے پوچھا۔

"مجھے تو آئے ہوئے کئی مہینے ہوگئے۔ میں نے تو تم سے بھی کہا تھا کہ میرے ساتھ چلو، تم ہی نہیں گئے۔"

"اگر میں تمہارے ساتھ چلا جاتا تو وہ شیطانوں کا ٹولہ میری جدائی میں بیقرار ہو کر تیسرے ہی دن میرے پیچھے امریکہ چلا آتا۔" نہال کا اشارہ اپنے کزنز کی طرف تھا۔

"میں جب واپس آیا تو تم سے ملنے گیا، تم ملے نہیں، پناہ گاہ جانے کا ارادہ تھا، مگر جانہ سکا۔ اس کے بعد ڈیڈی کے کام سے سنگاپور چلا گیا۔ دو ہفتے پہلے ہی آیا ہوں۔ آپ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ آپ دنیا کی خاک چھاننے نکلے ہیں۔"

"ہاں یار تھا تو بزنس ٹرپ ہی، بس اس بہانے کھوم پھر بھی لیا۔"

"یار آفریدی! میں نے تمہیں تقریباً پانچ سال کے بعد دیکھا ہے۔ تم تو بڑے اسمارٹ ہوگئے ہو، نکھر گئے ہو۔" عمر نے اس کے وجیہہ چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے ابھی تک سنگل ہو یا ابا جان بھی کہلانے لگے ہو؟"

"ارے میرے ایسے نصیب کہاں!" اس نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

"بھائی جان!" دونوں باریک سی آواز پر پلٹے۔ وہی جہاز والی لڑکی عمر کے کندھے سے جالگی۔

"میں آپ کو بہت مس کرتی تھی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے "بہت یاد کرتی تھی۔"

عمر بہت محبت سے ہنسا۔ "میں بھی تمہیں یاد کر لیتا، مگر کیا کروں فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔" عمر نے اسے چھیڑا۔

"جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے۔" وہ روٹھ گئی۔

نہال نے اسے بغور دیکھا۔ بالکل بچی لگ رہی تھی وہ اس وقت۔

"ممی ڈیڈی کیسے ہیں؟" وہ ناراض ناراض لہجے میں بولی۔

اس کے انداز پر عمر کو پیار آگیا۔

اس نے بہن کو گلے سے لگا لیا۔ "بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں، گھر پر تمہارے منتظر ہیں۔"

"یہ کون صاحب ہیں؟" اس نے ناک چڑھاتے ہوئے نہال کی طرف اشارہ کیا۔

"حد ہوگئی نشاط، تم بھول گئیں، یہ آفریدی ہے بھئی۔"

"میں بھول گئی یا یہ بھول گئے۔" وہ پھٹ پڑی۔

"ایمان سے بھائی جان! جب یہ میرے برابر والی سیٹ پر آکے بیٹھے تو میں مارے خوشی کے گنگ رہ گئی۔ مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے سوچا کہ جب یہ مجھے مخاطب کریں گے تو میں کہہ دوں گی کہ میں کوئی نشاط وشاط نہیں ہوں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، مگر توبہ کریں جی انہوں نے تو شناسائی کی نگاہ بھی نہ ڈالی۔ ایسے بیٹھے کہ جیسے جانتے نہیں، پہچانتے نہیں، منہ میں کرفیو لگا ہوا تھا۔"

"دراصل میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا تھا کہ وہ اتنی پیاری سی بچی بڑی ہو کر چڑیلوں کی ملکہ نکلے گی۔" نہال نے جلدی سے کہا۔

"آہا! خود تو بڑے حسین ہیں ناں ہونہہ شکل تو دیکھو، ابوالہول کہیں کے۔ اور زیادہ میرے بارے میں رائے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہونہہ! ساحل پہ کھڑے ہو کر سمندر کی گہرائی کا اندازہ کر رہے ہیں۔" وہ کسی لڑاکا بمبار طیارے سے کم نہ تھی۔

"کہیے تو سمندر میں اتر جاؤں۔" نہال بے باکی سے بولا۔

"غرق ہو جاؤ گے۔" وہ تلملا کر بولی۔

"خوش نصیبی کی انتہا ہوگی۔" وہ جوتوں سمیت آنکھوں میں گھس گیا۔

"رشک کرنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔" وہ کلس کر ہی تو رہ گئی۔

"عمر بھائی! سمجھا لیں آپ انہیں۔"

نہال قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اسے بازو سے پکڑ کر خود سے قریب کیا۔

"ارے میری کانچ کی گڑیا! تجھے تو میں اپنی مٹھی میں بند کر لوں۔"

اس سے پہلے کہ نشاط کوئی جواب دیتی، عمر بول پڑا۔ "بھئی تم لوگ یہ اپنی جنگ و جدل کو ملتوی کرو اور گھر چلو۔"

انہوں نے سامان اٹھایا اور پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیے۔

"اوئے ہوئے، نہال بھائی وہ دیکھیں۔" نشاط نے نہال کے کان میں گھس کر کہا۔

نہال نے اس کی جانب دیکھا، جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔ وہی بڑی بی، نہال اور نشاط کو گھور رہی تھیں۔

"نہال بھائی! اگر موصوفہ نے میرے متوقع چار بچوں کے باپ سے ملنے کا شرف حاصل کرنا چاہا تو؟"

"تو مجھ سے ملوا دینا۔" وہ اس پر جھک آیا۔

"میں خون پی جاؤں گی آپ کا۔" وہ اس پر چڑھ دوڑی۔

"آؤ بھئی جلدی بیٹھو۔" عمر نے ڈگی بند کی۔

نہال اور نشاط دونوں ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے بیٹھ گئے۔

عمر، نہال سے بیتے دنوں کی باتیں کرنے لگا۔ اپنی باتوں میں دونوں ایسے گم ہوئے کہ پیچھے بیٹھی نشاط کو بھول گئے۔ وہ خاموش بیٹھی پیچ و تاب کھاتی رہی پھر اس سے رہا نہ گیا تو غصے سے بولی۔

"آپ دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا بھی گاڑی میں بیٹھا ہے؟"

"اوہ سوری!"

"اچھا چلو یہ بتاؤ کہ ارمغان کا دل ایک منٹ میں کتنی دفعہ دھڑکتا ہے؟" عمر نے شوخی سے پوچھا۔

"اوئی اللہ! مجھے کیا پتا؟" وہ ایک دم ہی چکرا گئی۔ جھینپ کر کھڑکی سے باہر منہ کر لیا۔

"یہ ارمغان کون ذات شریف ہیں؟" نہال نے کہا۔

"خیر شریف تو ہرگز نہیں ہیں۔" نشاط بیچ میں بول پڑی۔

"نشاط کے "وہ" ہیں۔ مم۔ میرا مطلب ہے منگیتر۔"

"ہائیں! تم نے منگنی کر لی اور مجھے بتایا تک نہیں۔" نہال نے اپنا دست شفقت ذرا زیادہ ہی شفقت سے اس کے سر پر دے مارا۔

"تو آپ کیا کر لیتے۔" وہ اپنا سر سہلاتے ہوئے بولی۔

"اور خود اپنی بھی تو کہو کہ کیا گل کھلا رکھے ہیں؟"

"نشی پلیز! تم میرا سیکرٹ آؤٹ نہ کرو، میں خود ہی بتا دوں گا۔"

"کیا بات ہے؟ مجھ سے چھپا رہے ہو، فوراً سے پیشتر اگل دو۔" نہال اس کے پیچھے پڑ گیا۔

"بتا دوں گا۔" عمر نے معنی خیز انداز میں آنکھ ماری۔

"نشاط کی شادی کا پروگرام کب تک ہے؟"

"عنقریب! ارمغان اپنا کزن ہے، جرمنی میں رہتا ہے، وہ آجائے گا تو شادی کر دیں گے۔"

"مگر شادی کی اتنی جلدی کیا ہے، نشاط تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

"یہ چھوٹی ہے؟ آفت کی پرکالہ ہے۔ ارمغان بے چارے کا ناک میں دم کر دے گی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ارمغان مجھ پر اور ڈیڈی پر دھوکا دہی کا مقدمہ ہی نہ کر دے۔ ویسے میں نے بھی ممی ڈیڈی سے کہا تھا کہ ابھی دو سال ٹھہر جائیں، مگر ارمغان نہیں مان رہا ہے، اسے جلدی ہے۔"

اس کے بعد نہال نے نشاط کو اس قدر تنگ کیا کہ وہ عاجز آگئی۔

عمر، نہال کو اپنے گھر ہی لے آیا۔ وقار صاحب اور ان کی بیگم نے اس کو کھانے سے پہلے نہ جانے دیا۔ رات کو عمر اس کے فلیٹ پر اسے چھوڑ گیا۔

◆

ٹیلی فون کی گھنٹی زور و شور سے بجی۔ ذیشان جو وہیں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ٹیلی فون کو دیکھا۔ ٹی وی کی آواز بند کی اور ریسیور اٹھا لیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ہیلو۔"

"ہیلو۔" دوسری طرف نسوانی آواز تھی۔

"جی فرمائیے۔ کس سے بات کریں گی آپ؟"

"دیکھیے کسی انسان سے بات کرائیے۔" اطمینان سے فرمایا گیا۔

ذیشان کے پتنگے ہی تو لگ گئے "ہمارے ہاں کے انسان کسی بندریا سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔"

"اچھا تو پھر آپ ہی کر لیجیے، یہ بتائیے نام کیا ہے آپ کا؟"

"معشوق علی عرف دیوانے شاہ۔" ذیشان نے برجستہ کہا۔

"کس کے دیوانے ہیں آپ؟" دوسری جانب ادائے دلبری سے دریافت کیا گیا۔

"کہیئے تو آپ کا ہو جاؤں۔" اس کی ادائے دلبری پر موصوف کی حسِ عاشقی بیدار ہو گئی۔

"تو پھر انتظار کس کا ہے؟"

یہ سن کر ذیشان کی سٹی گم ہو گئی۔ اسے لڑکی سے اس جواب کی توقع نہ تھی۔ ایک لمحے کو اسے کچھ نہ سوجھا کہ کیا

"اچھا یہ بتائیے کہ پڑھتے ہیں آپ؟"

"جی ہاں۔"

"کیا پڑھتے ہیں؟ کتاب یا کتابی چہرے؟"

"کتابی چہرے۔ ویسے میں اس حد تک پڑھا ہوا ہوں کہ خوبصورت اشعار سے لبالب بھرے ہوئے مہارت سے لکھ سکتا ہوں۔"

"پروفیشنل معلوم ہوتے ہیں۔"

"آپ جیسوں کی عنایتیں ہیں۔"

"یہ بتائیں کرتے کیا ہیں آپ؟"

"عشق کرتا ہوں اور کیا کرنا ہے۔"

"کس سے؟"

"اپنی بیوی کے علاوہ دنیا کی ہر عورت سے۔"

"ہائے آپ شادی شدہ ہیں؟"

"جی ہاں جس طرح ہر پھول کے ساتھ ایک کانٹا ہوتا ہے اسی طرح میرے ساتھ میری بیوی ہے۔"

"اس وقت کہاں ہیں آپ کی بیوی؟"

"لڑ جھگڑ کر اپنی ماں کے ہاں گئی ہوئی ہے دو مہینے سے۔"

"ارے آپ منانے کے لیے نہیں گئے؟"

"اجی میں تو وظیفہ پڑھ رہا ہوں کہ ابھی اور دو مہینے وہیں رہے۔"

اسی لمحے ذیشان کو کسی نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز آئی۔ پھر بڑے اطمینان سے کہا گیا۔

"اچھا جی! خدا حافظ، میرا بچہ سو کر اٹھ گیا ہے۔" یہ کہہ کر کھٹاک سے فون بند کر دیا گیا۔

ذیشان ہونقوں کی طرح ریسیور کو گھورتا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ریسیور پہلے دیوار پر دے یا اپنا سر۔

◆ ● ◡

نہال نے شیشے کی دیوار کے پار سے جھانک کر دیکھا۔ وہ سب لوگ ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی رہے تھے۔ اس نے اندر داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

"السلام علیکم!" وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

سب نے چونک کر دیکھا۔ دو چار نہ سمجھ میں آنے والی چیخیں بلند ہوئیں۔ پھر کوئی اس کے گلے میں کوئی بازو سے لٹک گیا، کسی نے پیچھے سے جکڑ لیا، سب اس سے یوں ملے جیسے صدیوں پہلے بچھڑے اب ملنے کی قطعی کوئی امید نہ رہی تھی۔ خوب مگر مچھ کے آنسو بہائے گئے۔ مصنوعی آہیں بھری گئیں۔ ہجر و فرا

تائیں باقاعدہ ترنم سے باآوازِ بلند سنائی گئیں۔

"بھائی جان! ہم سب آپ کے بغیر بہت اداس ہو گئے تھے۔" زیبا لاڈ سے بولی۔

"تم لوگ بھی مجھے بہت یاد آتے تھے۔ کبھی کبھی جی چاہتا تھا کہ اڑ کر تم تک پہنچ جاؤں۔" وہ ان کے درمیان بیٹھا عجیب طرح کی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔

اس کے بعد وہ لوگ باتوں میں ایسے مگن ہوئے کہ وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ وہ لوگ وہیں بیٹھے اپنی اپنی کہتے رہے۔

نہال نے ان سب کے لیے خریدے ہوئے تحفے ان کو دیے۔ اس پر بھی خوب چھینا جھپٹی ہوئی۔ نہال نے نہیر کو جو گھڑی دی اس پر جاذب لٹو ہو گیا۔ زیبا کو دیا ہوا بیوٹی بکس خمار نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ شیراز کا نے کا پین سیٹ ذیشان لے اڑا۔ خمار کے جیولری کیس پر جواہر کا دل آ گیا۔ جواہر کو جو نہال نے ہیر ڈرائیر جیسی ی تھی، زیبا تو اس کو پہن کر ہی بیٹھ گئی۔

کافی رات ہو چکی تھی۔ انا بی نے کھانا لگوا دیا تھا۔ سید صاحب کا انتظار تھا جو سکندر رضا کے ہاں گئے ہوئے ے۔ ان کے انتظار میں وہ سب لوگ وہیں بیٹھے تھے کہ وہ آ گئے۔ نہال سامنے کے رخ پر بیٹھا تھا۔

سید صاحب کی پہلی نگاہ اسی پر پڑی۔ وہ چونک سے گئے۔ نہال بھی ان کو دیکھ چکا تھا۔ وہ اٹھا اور تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔

"السلام علیکم نانا جان!" اس نے ہاتھ آگے کر دیا۔

"وعلیکم السلام!" انہوں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

"کیسا رہا تمہارا ٹور! بہت دن لگا دیے۔ میں سمجھا تھا کہ بیس پچیس دن میں لوٹ آؤ گے۔"

(اچھا تو میں آپ کو یاد رہ گیا تھا۔ کمال ہے) "بس نانا جان! کام بھی زیادہ تھا اور جب نکل ہی گیا تھا تو سیر و تفریح ی کر لی۔"

سید صاحب وہیں بیٹھ گئے اور اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ خاص طور پر ان کا موضوع اس کا بزنس ٹرپ ہی تھا۔

نہال سمیت سبھی حیرت کے سمندر میں سوئمنگ کرنے چل دیے۔

سید وجاہت علی خان اور نہال آفریدی تو ایک خاموش، نامحسوس سی سرد جنگ لڑ رہے تھے۔ سید ب تو نہال کا حال احوال بھی ایک مہینہ چھوڑ کے پوچھا کرتے تھے۔ شاذ و نادر ہی ایسے مواقع آئے تھے کہ ں نے یوں اس سے گفتگو کی تھی۔

"اپیا! آپ صبح کتنے بجے اٹھی تھیں۔" ذیشان نے جواہر کو کہنی ماری۔

اس کے بے تکے سوال پر جواہر نے اسے گھور کر دیکھا۔

"دراصل آج صبح میں دیر سے سو کر اٹھا تھا، اس لیے دیکھ نہیں سکا کہ سورج محترم مشرقی دروازے سے یف لائے تھے کہ مغربی دروازے سے۔" اس نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔ ساتھ ہی آنکھوں سے سید ب اور نہال کی طرف اشارہ کیا۔

جواہر اس کی بات پر مسکرانے لگی۔

انا بی نے ایک بار پھر ان سب کو کھانے کے لیے کہا تو وہ سب اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئے۔ احب اگرچہ سکندر رضا کے ہاں سے کھا کر آئے تھے، مگر وہ بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ وہ سب کزنز ۔ دوسرے کے قریب رکھی کرسیوں پر ٹک گئے، پر سید صاحب گول میز کے دوسری جانب عین ان کے ے بیٹھے تھے۔

سب لوگ خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ تھوڑی دیر میں سبھی نے یہ بات محسوس کر لی کہ سید صاحب خاصے ب کے عالم میں ہیں۔ وہ کوئی بات کہنا چاہ رہے ہیں مگر کہہ نہیں پا رہے۔

شاید سوچ رہے ہیں کہ کہیں یا نہ کہیں۔

یا پھر ان کو مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کبھی وہ ٹکٹکی باندھے جواہر کو دیکھنے لگتے، کبھی نہال کو بغور تکنے لگتے۔ پھر باری باری سب کو دیکھ

"بقر عید میں کتنے دن باقی ہیں؟" ذیشان نے آہستہ سے پوچھا۔

"ابھی عید تو آئی نہیں اور بقر عید کی فکر ہوگئی۔"

"میں دراصل حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے لیے قرآن خوانی کراؤں گا۔" وہ ہمیشہ بے پر کی اُڑایا کرتا تھا

"تمہاری فضول گوئی کی عادت خوب ترقی کر رہی ہے۔" جاذب نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"دراصل دادا جان سوچ رہے ہیں کہ اب کے بقر عید پر کس کو قربان کروں، اسی لیے سب کو ا دیکھ رہے ہیں۔" وہ معصومیت سے بولا۔

کھانے کے بعد انا بی نے اُن کے آگے فروٹ کسٹرڈ لا کر رکھا۔ سیّد صاحب اُٹھ کر شہیر کے قریب کُرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ جواہر سب کو سرو کرنے لگی۔

نہال اپنے نانا کی ایک ایک حرکت بغور نوٹ کر رہا تھا۔ وہ عجیب کشمکش کا شکار لگ رہے بہت اُلجھے اُلجھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ وہ خالی پیالی میں چمچہ چلا رہے تھے۔

"اوہ! میرا تو ڈراما نکلا جا رہا ہے۔" خمار اپنی پلیٹ سمیت وہاں سے یوں کھسکی جیسے ڈراما نہیں کا دم نکل رہا ہو۔

پھر سب بھی کھا پی کر اُٹھ گئے۔

○ ● ◆

سیّد صاحب اپنے بستر پر دراز تھے۔ سینے تک سرمئی ریشمی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ہاتھ میں کتاب مطالعے میں منہمک تھے۔

نہال نے آہستہ سے دروازہ تھپتھپا کے تھوڑا سا کھول دیا۔

"نانا جان! میں اندر آ جاؤں؟"

"آ جاؤ۔" انہوں نے کتاب سینے پر رکھ کر آنکھوں سے چشمہ اُتار لیا۔

نہال کے ہاتھ میں کچھ پیکٹس تھے۔

"نانا جان! یہ میں آپ کے لیے لایا تھا۔" وہ اُن کے بستر کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے پاؤں سمیٹ لیے شاید یہ اس بات کی طرف اشارا تھا کہ وہ بستر پر بیٹھ جائے، مگر وہ کر کرسی کھسکا لایا۔ اُن کے بستر کے قریب رکھی اور اُس پر ٹک گیا۔

اُس نے ایک ڈبے میں سے لکڑی کا خوبصورت پائپ نکالا۔ "یہ لیجیے۔"

انہوں نے اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اور یہ شوپیس آپ کے کمرے کے لیے۔" اُس نے بڑا سا شیشے کا شوپیس نکالا۔ بے حد نفیس سا پیس، جس میں شیشے ہی کی بنی ہوئی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ نہال نے اُسے کارنر ٹیبل پر رکھا اور اُس کا پلگ سوئچ میں لگا دیا۔ ہلکی سی نیلے رنگ کی روشنی ان لڑیوں سے پھوٹنے لگی اور وہ آہستہ آہستہ گھومنے ان کے شیشوں کے ٹکرانے کی آواز اس قدر مدھر تھی کہ دونوں ہی محویت سے دیکھنے لگے۔

"بہت خوب ـــ لاجواب! ہمیں بے حد پسند آیا۔" سیّد صاحب نے بے ساختہ تعریف کی۔

(آپ کو تو بس ایک میں ہی پسند نہیں آیا)، نہال دل ہی دل میں ہنسا۔

"کہاں سے خریدا تھا تم نے؟"

"پیرس سے لیا تھا، اچھا اب میں چلتا ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"شکریہ۔"

نہال رُک گیا۔ اُس نے پلٹ کر سیّد صاحب کو دیکھا جو ایک بار پھر کتاب پڑھنے میں محو ہو چکے نہال کے ہونٹوں پر مجروح سی مسکراہٹ آ گئی۔ بوجھل سا دل لیے وہ اُن کے کمرے سے باہر آ گیا۔

○ ● ◆

"بھائی جان! لے چلیے ناں۔" زیبا منت بھرے لہجے میں بولی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے پاس پہلے ہی کیا کم ہیں۔ درازیں بھری پڑی ہیں۔" شہیر نے صاف انکار کر دیا۔

"جانا کہاں ہے؟" جاذب نے پوچھا۔

"محترمہ کو چوڑیاں پہننی ہیں۔"

"ذیشان تم اُسے لے جاؤ۔" جاذب نے ذیشان سے کہا

"میں بہت تھک گیا ہوں، میرے لیے تو دو قدم چلنا بھی محال ہے۔ میری طرف سے معذرت قبول کریں۔" ذیشان نے کہا۔

"ہونہہ! اب تم مجھ سے کسی کام کے لیے کہنا۔" زیبا چڑ گئی۔ خفا ہو کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

"اچھا ناراض کیوں ہوتی ہو، نہال سے کہو تمہیں لے جائے گا۔" جاذب کو اُس پر ترس آ گیا۔

رمضان کا مہینہ چل رہا تھا۔ نہال کئی دِنوں سے پناہ گاہ نہیں گیا تھا۔ ان لوگوں کو اس کے بغیر چین نہیں پڑا، اس لیے سب اس کے فلیٹ پر دوڑے چلے آئے۔

آج اٹھائیسواں روزہ تھا، کل سب پناہ گاہ چلے جاتے۔ زیبا چاہ رہی تھی کہ بازار جا کر چوڑیاں پہن آئے۔ اسے چوڑیوں کا بہت شوق تھا اور بقول ذیشان اس کا بس چلے تو ہاتھوں کے علاوہ پیروں میں بھی پہن لے۔

نہال مغرب کی نماز پڑھ کر سٹنگ روم میں آیا تو زیبا اُس کی جانب بڑھی۔

"نہال بھائی! مجھے چوڑیاں پہنانے کے لیے چلیں۔"

"گڑیا! اس وقت تو بازار میں بہت رش ہو گا۔"

"نہیں لے کر جانا چاہتے تو صاف کہہ دیں، بہانے کیوں بنا رہے ہیں۔" اُسے غصہ آ گیا۔

"اوہو ناراض کیوں ہو رہی ہو، جاؤ جواہر اور خمار سے کہو کہ وہ بھی چلیں۔"

"میں بھی جاؤں گا۔" "سب جائیں اور ذیشان نہ جائے تو قیامت نہ آ جائے۔"

"تم بھی چوڑیاں پہنو گے؟" زیبا نے طنزاً کہا۔

"میں اِدھر اُدھر دیکھوں گا۔" اُس کے منہ سے پھسل گیا۔ اس کے معنی خیز جملے پر سب مسکرانے لگے، مگر جواہر کے گھورنے پر وہ جلدی سے بولا۔

"میرا مطلب ہے، ونڈو شاپنگ کروں گا۔"

"یہ ذیشان تو اپنے نام کا ایک ہی ہے۔" جواہر نے اُس کو گھورنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں اور بھی پائے جاتے ہیں۔" خمار جلدی سے بولی۔

"کیا مطلب؟"

"ایمیزون کے جنگلوں میں۔"

اور پھر ان کی مسکراہٹیں، قہقہوں میں بدل گئیں۔

نہال ان سب کو طارق روڈ لے آیا۔

"توبہ کس قدر رش ہے۔" جواہر نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"سارا شہر ہی باہر نکلا ہوا ہے۔"

نہال نے ان سب کو خوبصورت کامدار جوڑے دلوائے۔ اپنے نانا اور بھائیوں کے لیے شلوار سوٹ خریدے۔ جواہر وغیرہ نے "میٹرو" سے میچنگ کی چپلیں خریدیں۔

"ارے خمار کہاں چلی گئی؟" جواہر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب نے پلٹ کر دیکھا، خمار غائب تھی۔

"ذیشان یار دیکھ کہاں رہ گئی وہ؟" نہال ایک دم پریشان ہو گیا۔

ذرا دیر میں شایان میاں، خمار بی بی کو پکڑ کر لائے۔ معلوم ہوا کہ ایک بُک اسٹال پر چپک گئی تھیں۔

"سب لوگ ساتھ ساتھ رہو۔ میں کہاں اتنے رش میں ڈھونڈتا رہوں گا۔" نہال نے اُسے ڈانٹ دیا۔

اُس نے ڈھٹائی سے بتیسی کی نمائش کی۔ ہاتھ میں پکڑی کتابیں زیبا کو تھمائیں اور ساتھ چل پڑی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"بھائی وہاں چوڑیوں کی کئی دکانیں ہیں، وہاں چلتے ہیں۔" زیبا نے ایک طرف اشارا کیا۔
"چلو بھئی جہاں چاہے لے چلو، اس وقت میں تمہارے اختیار میں ہوں۔"
چوڑیوں کی دکان پر وہ تینوں چوڑیاں پسند کرنے لگیں۔ ذیشان ان کے سر پر کھڑا ان کی پسند کی ہوئی چوڑیوں کو ناپسند اور ناپسند کی ہوئی چوڑیوں کو پسند کر رہا تھا۔
نہال بیزاری سے چاروں طرف دیکھنے لگا کہ ایک دم چونک اٹھا۔
وہ برابر والی دکان پر کھڑی تھی۔ اس نے بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ نہال کو گمان ہوا کہ شاید یہ رانیہ اچانک ایک موٹی عورت سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ نہال نے دل ہی دل میں اس کو ڈھیروں صلواتوں سے نوازا، جو اس کے چہرے اور نہال کی نگاہوں کے درمیان سماج کی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے فوراً ذرا سا پیچھے ہٹا، مگر سامنے سے عورتوں کا ریلا آ رہا تھا۔ وہ مجبوراً ہٹ گیا۔ اسے وہ نظر نہیں آ رہی تھی مگر اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جس سے اس کا گمان یقین میں بدل گیا کہ وہ رانیہ ہی ہے۔
"یہ والا چوڑیوں کا سیٹ کتنے کا ہے؟"
"جی چالیس روپے کا۔"
"چالیس روپے کا؟ وہ سامنے والا دکاندار تو تیس روپے میں دے رہا تھا، ہم وہاں بھی چھوڑ آئے، آپ اس کی قیمت چالیس روپے بتا رہے ہیں۔"
"بی بی! آپ کو یہ سیٹ میری دکان کے علاوہ کہیں نہیں ملیں گے، آپ چاہے سب دکانیں دیکھ لیجیے۔"
نہال نے جھک کر دیکھا، رانیہ کے ہاتھوں میں سبز رنگ کا بڑا خوبصورت سیٹ تھا۔
"آپ مجھے تیس روپے میں دے دیں۔" اسے پھر رانیہ کی آواز آئی۔
"نہیں جی، میں ایک پیسہ کم نہیں کروں گا۔"
"پھر میں نہیں لوں گی۔"
"آپ کی مرضی ہے۔" دکاندار نے سیٹ واپس اسی جگہ رکھ دیا جہاں سے اٹھایا تھا۔
رانیہ وہاں سے ہٹ گئی۔ نہال نے نگاہ اٹھائی، مگر وہ بھیڑ میں گم ہو چکی تھی۔ وہ تیزی سے برابر والی دکان کی طرف لپکا۔
"یہ چوڑیوں کا سیٹ کتنے کا ہے؟" اس نے وہی سیٹ اٹھا لیا۔
"چالیس روپے کا۔"
نہال نے جیب سے پیسے نکال کر آگے رکھ دیے۔ دکاندار نے سیٹ پیک کر کے نہال کو تھما دیا۔ وہ پھر اسی جگہ آ کر کھڑا ہو گیا، جہاں زیبا کھڑی چوڑیاں پسند کر رہی تھی۔
"بھائی جان! ان تینوں میں سے کون سا اچھا ہے؟" زیبا پوچھ رہی تھی، مگر نہال کی نگاہیں ایک بار پھر ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔
"نہال بھائی! بتائیں ناں۔" اس نے نہال کا بازو ہلایا۔
"کوئی سا بھی لے لو۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔
"تینوں لے لوں؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔
"لے لو۔"
"آپ فضول خرچ تو نہیں کہیں گے؟" وہ اپنا اطمینان کر لینا چاہتی تھی۔ دراصل چار سیٹ اسی دکان پر کھڑے کھڑے پہلے ہی پسند کر چکی تھی۔
"کچھ نہیں کہوں گا، جتنے دل چاہے لے لو سب کے پیسے ادا کر دوں گا۔"
"وہ سبز رنگ کا سیٹ کہاں گیا جو یہاں رکھا تھا؟" رانیہ کی آواز پھر اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ جلدی سے اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر اسی دکان پر کھڑی تھی۔
"وہ تو بھی بک گیا۔"
"اوہ!" وہ تاسف سے بولی۔

"بی بی! جب آپ نے لینا ہی تھا تو اسی وقت لے لیتیں۔"
"مجھے کیا پتا تھا کہ اتنی جلدی بک جائے گا۔ خدا جانے کون لے گیا؟"
نہال اس کی بات پر مسکرا دیا۔
اس کے دل میں آیا کہ وہ ذرا سا قریب ہو کر اس کے شاپنگ بیگ میں وہ سیٹ چپکے سے ڈال دے، مگر نہیں، اگر کبھی زندگی میں قسمت سے اس کے اور میرے درمیان کچھ خوبصورت لمحات آ گئے تو میں اسے خود دے دوں گا۔ اس نے دل میں سوچا۔
"بھائی جان پیسے دے دیں۔"
"کر دو تم مجھے غریب۔" اس نے جیب سے پیسے نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔
وہاں سے نکلنے کے بعد وہ تینوں سارے بازار میں گھومتے رہیں۔ نہال بے چارا ممکن صورت بنائے ان کو بے سارے بازار میں پھرتا رہا۔
ذیشان ادھر ادھر کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتا رہا اور تبصرے کرتا رہا۔ واپسی پر ان لوگوں نے بہادر آباد سے فالودہ کھایا اور گھر لوٹ آئے۔

○ ● ◆

نہال، ذیشان اور جواہر پناہ گاہ کی چھت پر کھڑے چاند دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا خواہ مخواہ ہی گنگنانے پر مجبور کر رہی تھی۔ آسمان اگرچہ کہ صاف تھا، مگر اکا دکا بادل کے آوارہ ٹکڑے بھی نظر آ رہے تھے۔
"اللہ میاں چاند نکل آئے۔" ذیشان نے صدق دل سے دعا کی۔
"نہ نکلا تو کیا ہوا، ایک روزہ اور رکھ لیں گے۔" جواہر نے منہ پر آئے بال ہٹائے۔
"مزا نہیں آتا، جو لطف انیس کی عید کا ہے، وہ تیس کی عید کا کہاں؟"
"جواہر وہ دیکھو، وہ رہا چاند۔" نہال نے انگلی سے اشارا کیا۔
"مبارک ہو آپ کو۔"
"کہاں ہے؟ مجھے نظر نہیں آ رہا ہے؟" ذیشان اپنی گناہ گار آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔
"وہ کھجور کے درخت کے اوپر دیکھو۔"
"ہاں نظر آ گیا، مبارک ہو آپ کو۔" وہ نہال کے گلے میں لٹک گیا۔
نہال نے اسے الگ کر کے باؤنڈری وال سے نیچے جھانکا۔ شہیر سیکنڈ فلور کی گیلری میں اٹکا ہوا تھا۔
"حضور چاند دیکھا آپ نے؟"
"دیکھ رہا ہوں۔" شہیر شوخی سے مسکرا دیا۔
"صاف نظر آ رہا ہے؟" نہال نے ترچھی نگاہ جواہر پر ڈالی۔ اس کا رخ دوسری جانب تھا۔ وہ غالباً دعا مانگ رہی تھی۔
"جی بالکل! بلکہ اکثر تو آنکھیں بند کر کے بھی دکھائی دے جاتا ہے۔"
"نہال! تمہیں شعر سناؤں؟" شہیر نے ایک نظر جواہر کو دیکھا۔
"ضرور۔"

جی میں آتا ہے ابھی تمہیں کہیں
عید کا چاند مبارک ہو تمہیں

ہم ہیں خاموش ہمیں ڈر ہے یہی
لب ہلیں گے تو پکاریں گے تمہیں

مانگنا بھول نہ جانا ہم کو
چاند کو دیکھ کر اگر ہاتھ اٹھیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نہال ہنس پڑا اور جواہر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"کس کے لیے دُعا مانگ رہی تھیں؟"

"اپنے بہن بھائیوں کے لیے، دادا جان کے لیے اور کس کے لیے مانگتی۔" وہ بے حد سادگی سے بولا

"اپیا!" خمار نے اُسے سیڑھیوں پر سے آواز دی۔

"کیا ہے؟"

"نیچے آؤ، انابی بُلا رہی ہیں۔"

"اچھا آرہی ہوں۔" وہ نیچے اتر گئی۔

دل کسی کے تصور میں گم ایسی انجانی ڈگر پر چل نکلا تھا کہ احساس خوشبو بن گئے تھے۔

اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی یوں بدل جائے گی۔

ایک اجنبی سا شخص یوں اس کی ذات کا موسم بدل دے گا۔ یوں چپکے سے دل میں چلا آئے گا کہ آہٹ بھی نہ ہوگی۔

وہ ایک ہی بار تو ملی تھی اُس سے۔

اُس دن اور پھر اس کے بعد کئی دن تک اس کے احساس کی جھیل میں کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ وہ ذرا بھی مضطرب نہ ہوئی۔

نہ راتوں کی نیند اُڑی نہ دل کا چین لُٹا۔

بس ایک دن جو بے خیالی میں اپنے دل کے آئینے میں جھانکا۔

تو اپنا چہرا نظر نہ آیا۔

"اوئی اللہ جی یہ کون گھس گیا دل میں؟"

وہ چونک گئی غور سے دیکھنا چاہا تو شبیہہ دُھندلا گئی۔

وہ ڈر گئی۔ اپنے آپ سے خائف ہوگئی۔

اور اُسی لمحے تقدیر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس لیے کہ اس کے واسطے محبت کی بساط بچھائی جا چکی تھی۔

اور جس دن جویریہ نے اس کے نام کی انگوٹھی پہنی، بس اُسی دن اُس نے اپنی زندگی کے دروازے اُس کے نام کا دیا جلا کر رکھ دیا کہ جب وہ اس کے حقوق کا محافظ بن کر آئے تو اندر باہر راستہ روشن نظر آئے۔

وہ بے دھڑک جویریہ کو تسخیر کرنے چلا آئے۔

کبھی کبھی جھک جانے میں بڑا مزا آتا ہے۔

ہار جانے سے انوکھی خوشی ملتی ہے۔

"معاذ۔"

اس کی تقدیر کا سنہری حرف۔

جو کل اسے اپنے نام اور اپنی ذات کا اعتبار دے کر سارے زمانے سے معتبر کرنے آرہا تھا۔

اُس نے گہرا سانس لے کر کروٹ بدل لی تو آئینے پر نگاہ پڑ گئی۔

"حسن سوگوار ہو تو قیامت بن جاتا ہے۔" آئینہ بول پڑا۔

اُس نے بے دلی سے نگاہ ہٹالی اور برابر میں سوئی زوباریہ کو دیکھا۔ اُٹھ کر اُس کے پاس آئی اور ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔

معاذ کے گھر سے وہ اور اس کی کزنز اپنی بے سُری آواز کا جادو جگا کے اور مہمانوں کے کانوں کے پردے پھاڑ کر خاصی رات گئے لوٹی تھیں۔ صبح سے وہ گھر کے کاموں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ رات معاذ کے گھر مہندی کا فنکشن تھا۔ تھک کر زوباریہ کا بدن چور ہوگیا تھا۔ گاڑی جب گیٹ پر رُکی تھی تو زوباریہ نے اُترنے سے انکار کر دیا تھا اور درخواست کی تھی کہ اس کو گود میں اُٹھا کر لے جایا جائے اور اس کے بستر پر ڈال دیا جائے اس کی مانگوں نے اس کا بوجھ اُٹھانے سے انکار کر دیا ہے۔ نہال جونہی اس کے حکم کی تعمیل کے لیے آگے بڑھا

وہ بھڑک کر اندر کو بھاگی تھی۔ اُس نے میک اَپ صاف کرنے کی زحمت کی اور نہ کپڑے بدلنے کی سیدھی دھپ سے بستر پر گر گئی۔ بند آنکھوں کے ساتھ معاذ کے گھر میں قدم اندر رکھنے سے لے کر واپس قدم باہر نکالنے تک ساری روئیداد، جملہ مہمانوں کی تعداد، ان کے لباس، ان کی گفتگو سب جویریہ کے گوش گزار کر دی۔ نیز یہ بھی بتا دیا کہ پراٹھے بہت خستہ تھے۔ کبابوں میں اگرچہ کہ مرچیں بہت زیادہ تھیں، مگر دہ پھر بھی لذیز اور چٹپٹے تھے۔ اس نے حلق تک ٹھونسے۔ مزید یہ کہ اُس نے دو پتیلیں بھی پی لیں۔ ایک تو مرچیں لگ جانے کے باعث غٹا غٹ چڑھا گئی۔ دوسری تمیز سے گھونٹ گھونٹ کر کے پی۔ اور یہ کہ اس کے سسرالیوں نے اس کے لیے بھی کباب پراٹھا بھیجا ہے، اگر وہ بھی اپنے کانوں سے دُھواں نکلوانا چاہے تو باورچی خانے میں جا کر کباب پراٹھے سے شوق فرمالے۔ یہ کہہ کر وہ اطمینان سے سو گئی۔

جویریہ اُسے دیکھے گئی۔

بس ایک رات کے فاصلے پر قربتیں بھی لکھی تھیں اور دوریاں بھی۔

معاذ ہر پل، ہر لمحے کا ساتھی بن جائے گا۔

اور اپنے ماں باپ اور بہن سے اس کا سالوں کا ساتھ چھوٹ جائے گا۔

اُس کے دل میں درد سا ہونے لگا۔ آنکھوں میں نمکین۔ پانی جمع ہونے لگا۔ وہ ایک دم ہی رو پڑی۔

اُس کے آنسو زوباریہ کے چہرے پر گرے تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔

"باجی!" اُس نے حیرت و تشویش سے اُس کی جانب دیکھا۔

"کیا ہے؟" اُس نے چہرا موڑ لیا۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"کوئی بات نہیں، تم سو جاؤ۔" اُس نے آنسو صاف کیے۔

زوباریہ چند لمحے اُسے دیکھتی رہی۔ بہن کے دل کا درد، اُس کے دل پر از خود منکشف ہوگیا۔

"باجی!" اُس کی آواز بھرا گئی۔ اُس نے جویریہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر دونوں بہنیں ایک دوسرے سے چمٹ کر روئیں تو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی بھرپور کوشش کرنے لگیں۔

"باجی! شادیاں تو سبھی کی ہوتی ہیں، بس یہ سوچ کر دل بیٹھ جاتا ہے کہ تم معاذ بھائی کے ساتھ لندن چلی جاؤ گی۔ سال کے سال آیا کرو گی۔ ہم تمہیں کہاں سے ڈھونڈیں گے۔ تمہاری شکل کو ترسا کریں گے۔" زوباریہ نے گھٹنوں میں سر گھسیڑ کر سسکنا شروع کر دیا۔

اُس کی بات پر جویریہ جو دُھواں دھار روئی ہے تو اس کی ہچکی بندھ گئی۔

"بس کرو باجی! چپ ہو جاؤ ورنہ طبیعت خراب ہو جائے گی۔" زوباریہ اپنا رونا بھول کر اُسے خاموش کرانے لگی۔

وہ اور زور و شور سے رونے لگی۔

"تم خاموش نہیں ہوگی تو میں امّی کو بُلا لوں گی۔" وہ دروازے کی سمت بڑھی۔

"نہیں امّی کو مت بُلاؤ۔" اُس نے روکا۔

اُسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ جویریہ نے جلدی سے چہرا صاف کیا۔

زوباریہ نے دروازہ کھولا۔ نہال کھڑا تھا۔

"یہ جویریہ اس قدر کیوں رو رہی ہے؟ اس کی آواز باہر تک آرہی ہے۔" وہ باہر کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"اندر آجائیں آپ۔" اُس نے راستہ چھوڑ دیا۔

"کیا بات ہے جویریہ؟" وہ اندر داخل ہوگیا۔

"نہال بھائی! آپ یہیں تھے؟" اُس نے اُلٹا سوال کیا۔

"ہاں رات بھی ہوگئی تھی اور صبح شادی کے سلسلے میں کئی کام نمٹانے تھے، گھر جا کر کیا کرتا۔ برابر والے کمرے میں سو رہا تھا کہ تمہارے رونے سے میری آنکھ کھل گئی۔ کیوں رو رہی تھیں اتنا؟"

"نہیں، میں تو نہیں رہی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نہال ہنس پڑا اور اس کے پاس سے کر بیٹھ گیا۔

"بے وقوف لڑکی! سبھی کی شادیاں ہوتی ہیں، سبھی اپنے والدین کا گھر چھوڑتی ہیں۔ دکھ تو بے شک ہوتا ہے مگر وہ جو اس دکھ کا باعث ہوتا ہے، وہ اتنے سکھ دیتا ہے کہ اس درد کی شدتیں رفتہ رفتہ کم ہونے لگتی ہیں۔ دیکھ لینا ایک وقت آئے گا کہ تجی جان تمہیں فون کر کے کہیں گی۔ جویریہ! تم بہت دنوں سے گھر نہیں آئیں، تمہاری صورت دیکھے کئی دن ہو گئے۔

اور تم کہو گی۔

"امی! کیا کروں گھر سے ہی فرصت نہیں ملتی اور بچوں کی وجہ سے الگ پریشان ہوں۔ ایک بستر سے اٹھتا ہے تو دوسرا لیٹ جاتا ہے۔ تیسرا ٹھیک ہوتا ہے تو چوتھا پڑ جاتا ہے اور بچوں کے باپ نے سب سے زیادہ سیراناک میں دم کیا ہوا ہے۔"

"دفع ہو جاؤ۔" جویریہ کانوں تک سرخ ہو گئی۔ گھٹنوں میں منہ دے دیا۔

"اب سو جاؤ، خوامخواہ اتنا مت رو۔" اس نے جویریہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا پھر زوباریہ کی طرف مڑا۔

"محترمہ تم بھی سو جاؤ، ایسا نہ ہو کہ کل مجھے تمہیں گود میں اٹھائے اٹھائے پھرنا پڑے۔ کیا بارات کا استقبال میری گود میں چڑھ کر کرو گی؟"

زوباریہ کو اس کی بات کا جواب نہ سوجھا، بس دانت کچکچا کر بستر میں گھس گئی۔

نہال بھی کمرے سے باہر آ گیا۔

○ ● ◆

اس کی جٹھانی عنبرینہ بھابی اسے خدا بہتر جانے کون کون سی رسموں سے نجات دلا کر اس کے کمرے میں لے آئی تھیں۔

"آرام سے بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے پاس ٹک گئیں۔

"اُف خدا! میری تو کمر تختہ ہو گئی۔ جوڑ جوڑ دہائیاں دے رہا ہے۔" وہ واقعی بے حد تھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔ پھر اس کی طرف مڑیں۔

"تم نے تو روروکر بالکل ہی چہرے کا ستیاناس کر لیا ہے۔ سارا میک اپ صاف ہو گیا۔" وہ جھٹ اس کا بیوٹی بکس لے آئیں۔ اس کی نوک پلک سنوارنے لگیں۔ پھر اس کا دوپٹا دوبارہ سیٹ کیا۔

"ماشاءاللہ! جویریہ تم بہت پیاری ہو۔" انہوں نے ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں کل امی سے کہوں گی کہ تمہاری نظر اتار دیں۔ میں تو ابھی اتروا دیتی مگر ابھی تو بقیہ نظر وہ معاذ کا بچہ لگائے گا۔"

جویریہ نے سر جھکا لیا۔

"تم کچھ کھاؤ گی؟ بھوک لگ رہی ہے؟" انہوں نے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پیسٹری پیو گی؟"

"جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"اچھا میں چلتی ہوں، ذرا دیکھوں جا کر میری شیطان صفت اولاد کہاں کہاں پائی جاتی ہے۔ معوذ کے ماموں آج رات کی فلائیٹ سے دوبئی واپس جا رہے ہیں۔ معاذ اور معوذ دونوں انہیں سی آف کرنے ایرپورٹ گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔ تم آرام کرو۔" وہ باہر نکل گئیں۔

جویریہ کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ سرخ گلابوں سے آراستہ بیڈ روم خاصا بڑا تھا۔ یہاں سے وہاں تک گلاب ہی گلاب بچھے تھے۔ ان کی مہک دیے ہوئے شعلوں کو ہوا دینے کے لیے کافی تھی۔

اسے بیٹھے بیٹھے تھکن سی محسوس ہونے لگی۔ تکیوں کے سہارے وہ نیم دراز ہو گئی۔

ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر جب اس نے اندر قدم رکھا تو رومانی سی فضا اور گلابوں کی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے بیڈ کے پاس آ کر رک گیا۔ قدرے جھک کر دیکھا۔ وہ اس طرح سے سوئی ہوئی تھی کہ ہزار قیامتیں اس کے پہلو میں جاگ رہی تھیں۔

اس نے بغور جویریہ کو دیکھا۔

سرخ لباس میں اس کا حسن دمک رہا تھا۔ معاذ نے اپنا آپ بے بس ہوتا محسوس کیا۔

ایک ہاتھ رخسار کے نیچے رکھے وہ بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔ اس کی نتھ الٹ گئی تھی۔ ٹیکہ بھی ماتھے سے سرک کر بالوں میں الجھ گیا تھا۔ معاذ نے چٹکی میں اس کی نتھ پکڑ کر دوبارہ ہونٹوں پر ٹکائی۔ آہستہ سے ٹیکہ بالوں سے چھڑا کر ماتھے پر رکھ دیا۔

"میری کس دعا کی قبولیت ہو تم؟

میری کون سی نیکی کا صلہ؟

تمہیں اپنی زندگی کے ہمسفر کے روپ میں دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ خدا مجھ پر بہت مہربان ہے۔"

حسن خوابیدہ ہو تو دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

رخِ یار پر آئے ہوئے روپ نے اس کے آنگنوں بھرے جذبات کو بیدار کر دیا تھا۔ اس کی ہر تمنا ہر آرزو پیاس بن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس سے سیراب ہونے کو فریاد کرنے لگی۔

اس کا جی چاہا کہ اسے اٹھا دے۔

قیامت اٹھتی دیکھے۔

حشر کو برپا دیکھے۔

جانے کتنی دیر گزر گئی۔ وہ اسے یونہی دیکھتا رہا۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی پائنتی کی طرف پڑا سرمئی کمبل اٹھا کر آہستگی سے اس پر ڈال دیا اور خود باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

نیند میں اسے محسوس تو ہوا تھا کہ اس پر کمبل ڈالا جا رہا ہے۔ کمبل کی گرمی میں اس کے تھکے ہوئے اعصاب کچھ اور بھی پرسکون ہو گئے۔ اس کی نیند گہری ہو گئی۔ جانے کیا وقت ہوا تھا کہ اس کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس کی پہلی نگاہ گھڑی پر پڑی۔ دو بج چکے تھے۔

"اوہ!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کونے میں نماز پڑھتے ہوئے معاذ پر نظر پڑی تو دھک سے رہ گئی۔

"یہ کب آئے؟" اس کا دل دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ سفید شلوار کرتے میں ملبوس معاذ سجدے سے اٹھ گیا۔ اس نے سرعت سے اپنی ٹانگ واپس گھسیٹی اور رخ موڑ لیا۔

نماز سے فارغ ہو کر معاذ جونہی پلٹا تو ٹھٹک گیا۔ حسن جاگ گیا تھا۔

"آداب!" اس کی گمبھیر آواز کمرے میں گونجی۔

اس نے اپنا سر اتنا جھکا لیا کہ تقریباً سجدے میں چلی گئی۔

"میں جب آیا تو آپ سوئی ہوئی تھیں۔ غالباً آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے عشاء کی نماز نہیں پڑھی تھی، وہ پڑھنے لگا تھا۔" پھر قدرے رک کر خوبصورت ہستی کے ساتھ بولا۔

"خدا کا شکر بھی ادا کرنا تھا کہ اس نے میری تقدیر میں اتنی خوبصورتیاں لکھ دی ہیں۔ آج کی شب میری دعا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی محبت راس آ جائے۔"

"آمین۔" جویریہ کے دل کی گہرائیوں سے صدا نکلی۔

معاذ نے میز پر رکھا پانی کا گلاس اٹھایا اور لبوں سے لگا لیا۔ اس کی معنی خیز نگاہ مستقل جویریہ کے وجود کا طواف کر رہی تھی، جو رخ موڑے بیٹھی تھی۔

گلاس میز پر رکھ کر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"جویریہ!"

اس کے کان کے پاس پھول سا کھلا۔

اس نے دم سادھ لیا۔

"جویریہ!" معاذ کی آواز اور دھیمی ہو گئی۔

اس کا دل رکنے لگا۔ اپنے دوپٹے کے کنارے کو تھام کر اس نے اپنے چہرے اور معاذ کی پرشوق نگاہوں کے درمیان پردہ کرنا چاہا تو معاذ نے جھٹ اس کی کلائی تھام لی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جویریہ کی جان کلائی کے ذریعے نکل گئی۔

"یہ نہ کرو۔" اُس نے آنکھوں سے منع کیا۔ اور اُس کا ٹھنڈا برف ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس کی انگلیوں کی لرزش اُس نے اپنی ہتھیلی پر صاف محسوس کی۔ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

اُس کے فسوں خیز حسن کو آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے بولا۔ "جویریہ! پلیز کچھ تو بولو۔ میں تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں۔"

اُس نے سختی سے لب بھینچ لیے۔

"اچھا چلو کچھ نہ کہو تو میرا نام ہی لو۔"

جویریہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

"کیا نام ہے میرا؟" اُس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

جویریہ کی تو آواز حلق میں پھنسی پڑی تھی۔ کیا بولتی بھلا۔

"جب تک میرا نام نہیں بتاؤ گی، میں تمہارا ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ اُسے تنگ کرنے لگا۔

"معاذ!" اُس کے لب بمشکل پھڑپھڑائے۔

اس کے انداز پر معاذ لٹ کر ہی تو رہ گیا۔

"کیا کہا؟" اُس نے انجان بن کر شوخی سے پوچھا۔ "میں نے سنا نہیں۔"

"آپ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں؟" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

"تنگ کر رہا ہوں؟ مگر میں نے تو اب تک کوئی گستاخی نہیں کی۔"

جویریہ حیا سے کٹ کر رہ گئی۔ وہ اُس کی لرزتی پلکیں دیکھتا رہا۔

"تمہاری پلکیں بہت خوبصورت ہیں۔ خاصی آرام دہ چھاؤں ہے۔"

جویریہ کا جی چاہا کان بند کر لے۔ سانس اور دل کی دھڑکن دونوں بے ترتیب ہو گئے۔

معاذ اُس کے چہرے کے تاثرات سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سرخ مخملیں ڈبہ نکالی اور جویریہ کی نازک انگلی میں خوبصورت انگوٹھی پہنا دی اور تھوڑا پرے ہٹ گیا۔ "تم ایزی ہو کر بیٹھ جاؤ۔"

جویریہ پیچھے کو سرک گئی۔ اُس کے حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔ اُس نے دور ٹیبل پر رکھے پانی کے جگ کو...

"پانی پیو گی؟" وہ اُس کی نظریں پڑھ کر بولا۔

وہ ہاں بولی نہ ناں۔

"ابھی دیتا ہوں۔" وہ اُٹھ گیا۔

جانے اُس کے جی میں کیا آئی۔ ایک نظر بائیں جانب کھڑے معاذ کو دیکھا۔ وہ اُس کی جانب پشت کیے گلاس میں پانی ڈال رہا تھا۔ وہ تیزی سے بیڈ سے اُتری اور دائیں طرف باتھ روم کی جانب بڑھی۔

باتھ روم کے اندر تو کیا گھستی۔ بازوؤں کے کُھلے در میں جا سمائی۔ اگلے لمحے وہ واپس اپنی جگہ پر تھی۔

اُس کے بازو پر معاذ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

○ ● ◆

اگلی صبح اُس کی آنکھ خاصی دیر سے کھلی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ کچھ دیر کسلمندی سے پڑی رہی پھر اُٹھ بیٹھی۔ چہرہ موڑ کر دیکھا۔ معاذ بیڈ کے دوسرے سرے پر آنکھوں پر بازو رکھے سو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو وہ جاگ چکا تھا۔ تکیوں کے سہارے بیٹھا تھا۔

"صبح بخیر بیگم صاحبہ!" وہ خوش دلی سے بولا۔

وہ ذرا سا مسکرا دی۔

اُسی لمحے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ جویریہ نے سر پر دوپٹا ڈالا اور تھوڑا سا دروازہ کھولا۔

"السلام علیکم دُلہن صاحبہ!" عنبرین بھابی نے کہا۔

"وعلیکم السلام!" وہ آہستہ سے بولی۔

"میں دیکھنے آئی تھی کہ تم اُٹھ گئی ہو یا نہیں۔ پہلے بھی دستک دی تھی، غالباً تم سو رہی تھیں، میں واپس چلی گئی تھی۔ کپڑے استری کر کے لائی ہوں۔ فٹافٹ چڑھا لو۔ میں اتنے میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔ پھر تم کو مختلف انواع و اقسام کی خواتین کے نرغے میں چھوڑ دیا جائے گا تاکہ وہ تمہارا بغور معائنہ فرمائیں۔ معاذ اُٹھ گیا کیا؟" ساری بات کہہ کر انہوں نے لمبا سانس کھینچا۔

"جی ہاں۔"

"ٹھیک ہے تم دونوں ناشتا کرو، میں ابھی لائی۔" وہ باہر ہی سے رخصت ہو گئیں۔

معاذ منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا تو وہ ناشتے کی ٹرالی اپنے آگے رکھے اس کی منتظر بیٹھی تھی۔ اُس نے فیروزی رنگ کا لباس تبدیل کر لیا تھا، جس کے شلوار قمیص اور دوپٹے پر زری کا کام ہوا تھا۔ ابھی اُس نے میک اپ نہ کیا تھا۔ دُھلا ہوا صاف ستھرا چہرا بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ بالوں کی اُلجھی لٹیں رخساروں پر پڑی تھیں۔

وہ سامنے آ کر بیٹھ گیا تو جویریہ نے انڈے کی پلیٹ اُٹھا کر اُس کے آگے رکھ دی۔

"پہلے اپنے چہرے پر سے یہ اُلجھی لٹیں ہٹاؤ، میرا دل اُلجھ رہا ہے۔" اُس نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ حیا سے سرخ ہو گئی۔ جلدی سے لٹیں کانوں کے پیچھے اُڑسیں اور ناشتا کرنے لگی۔

معاذ کی شوخ نگاہ بدستور اُس کے چہرے سے اُلجھتی رہی۔ اسے حد درجے حجاب محسوس ہو رہا تھا۔

"آپ مجھے یوں کیوں دیکھ رہے ہیں؟" وہ بالآخر روہانسی ہو کر بولی۔

یہ ہے اعجازِ محبت کہ جنوں خیزی ہے
میں جو دل میں تیرے قدموں کے نشاں تک دیکھوں

میری گستاخ نگاہی کا گلہ کیوں راشدؔ
وہ جہاں تک مجھے کہہ دیں میں وہاں تک دیکھوں

"اُف خدا!" اُس کا دل بند ہوتے ہوتے بچا۔

"اچھا چلو ناشتا کرو، اب نہیں دیکھوں گا۔" اُسے ترس سا آ گیا۔

○ ● ◆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

ٹی وی لاؤنج میں ذیشان اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ نہال نے پیچھے سے اُس کے سر پہ چپت لگائی۔

"کیا ہو رہا ہے ذیشان میاں؟"

"آپ؟" ذیشان کا رنگ اُڑ گیا۔

"کیا ہوا؟" وہ اُسے دیکھ کر چونکے بنا نہ رہ سکا۔

"کک... کچھ نہیں۔" اُس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"کیا بات ہے ذیشان؟" وہ نرمی سے بولا۔

"کچھ نہیں بھائی جان! کیا بات ہوتی بھلا؟" اُس کے لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ تھی۔

نہال چپ ہو گیا۔ "اور سب لوگ کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں اِدھر اُدھر کہیں ہوں گے۔" نہال نے اُس کے چہرے پر پریشانی کے صاف اور واضح آثار دیکھے۔ وہ بہت ڈسٹرب سا لگ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ بہانہ کر کے اس کے پاس سے اُٹھ گیا۔ نہال حیرت سے اُس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ تھوڑی سی دیر میں اُس نے محسوس کر لیا کہ گھر میں کوئی غیر معمولی بات ہو گئی ہے۔

سبھی ایک دوسرے سے کترا رہے تھے، جیسے ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے جھجک رہے ہوں۔ ایک دوسرے سے بات نہ کرنا چاہ رہے ہوں۔ جیسے ایک دوسرے سے شرمندہ ہوں۔

اور نہال سے تو وہ بطورِ خاص الگ الگ سے تھے۔ نہال جس کے پاس جا کر بیٹھتا، وہی اُس سے نظریں چرا چرا کر بات کرتا۔ آنکھ ہی نہ ملاتا اور تھوڑی دیر میں کوئی غیر ضروری سا عذر پیش کر کے رفو چکر ہو جاتا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جواہر کا سرے سے پتا ہی نہ تھا۔ نہ جانے وہ گھر میں بھی تھی یا نہیں۔

نہال حیران و پریشان تھا۔

آخر کیا بات ہوگئی ہے؟

ان لوگوں کو ہو کیا گیا ہے، کہیں سب کے سب باؤلے تو نہیں ہوگئے۔

اُس نے ایک دو بار دبے لہجے میں پوچھنے کی کوشش بھی کی، مگر سب نے اس کو اس کا وہم کہہ کر ٹال دیا۔ وہ کھل کر بات کرنا چاہ رہا تھا، مگر کوئی بھی اس کو موقع نہیں دے رہا تھا۔

رات کو کھانے پر بھی کوئی ڈائننگ ٹیبل پر نہیں آیا۔ خمار اور ذیشان نے کہلا دیا کہ بھوک نہیں ہے۔ جاذب اپنے دوست کے ساتھ کھا لینے کا بہانا کر دیا۔ شہیر کا اس کے بیڈ روم میں بھیجا گیا تو اُس نے بھی واپس کر دیا۔ سید صاحب بھی اپنے کمرے میں تھے۔ وہ بھی باہر نہ نکلے تھے۔

نہال نے کچن میں بیٹھ کر دو چار نوالے زہر مار کیے۔ اُس سے کھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔ سبھی اپنے اپنے کمروں میں بند ہو گئے تھے۔ نہال کچھ سوچ کر شہیر کے کمرے میں چلا آیا۔

شہیر اپنا منہ تکیے میں دیے پڑا تھا۔ اس کے کپڑے خلاف معمول ملگجے سے ہو رہے تھے اور میلے بھی لگ رہے تھے۔ وہ خود بھی جیسے اُجڑا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے شیو بھی نہیں بنائی تھی۔ اُس کا حلیہ دیکھ کر نہال ایک لمحے کو سب کچھ بھول گیا۔ اُس کی فطری شوخی عود کر آئی۔

"اے مجنوں کے ولی عہد! یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔" اُس نے شہیر کے اُوپر سے چادر کھینچی۔

وہ ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

ان نظروں کا مفہوم کیا تھا، نہال سمجھ نہ پایا۔

"نہال مجھے تنگ نہ کرو۔۔۔ لیو می الون۔ (مجھے تنہا چھوڑ دو)"

"سُنو! کیا جواہر سے لڑائی ہوگئی ہے؟ آؤ میں صلح کرا دوں۔"

"شٹ اَپ!" وہ دہاڑا۔ "آیندہ تم جواہر کا نام اس طرح میرے سامنے نہیں لو گے۔" اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"ایسا کیا جھگڑا ہوگیا کہ آپ کا غصّہ عرش کو چھو رہا ہے؟"

"نہال!" شہیر نے اُسے شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا۔ "تم باز نہیں آؤ گے؟ خدا کے واسطے یہاں سے چلے جاؤ۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔"

اور نہال میں بھی جیسے ضبط کا یارا نہ رہا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ یہاں ہو کیا گیا ہے۔ گھر کی فضا اس قدر بدلی ہوئی کیوں ہے؟"

"کچھ نہیں ہوا ہے۔" شہیر اچانک دھیما پڑ گیا۔

"کیسے نہیں ہوا ہے؟" وہ غرّایا۔ "بے وقوف سمجھ رکھا ہے مجھے؟ محسوس کرو کس قدر سناٹا ہے۔ کہاں تو تم لوگوں کے بیٹھ کر کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اب اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی ہے۔ سانسوں کے چلنے کی آواز آ رہی ہے۔ دبے پاؤں بھی چلو تو آہٹیں سنائی دے رہی ہیں۔"

"تمہارا وہم ہے۔" شہیر اُس سے نظریں چرا گیا۔

"دیکھو مجھ سے مت چھپاؤ۔ مجھے پتا ہے کہ تم لوگ صرف مجھ سے چھپا رہے ہو۔ کوئی خاص بات ہوئی ضرور ہے جو تم سب کو معلوم ہے۔ شہیر پلیز مجھے بتاؤ، ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔" اس نے شہیر کا کالر تھام لیا۔

شہیر نے آہستہ سے اپنا کالر چھڑا لیا۔ بغور اسے دیکھنے لگا۔

"کوئی بات بھی ہو، بے دھڑک کہہ دو، میں سن لوں گا، برداشت کر لوں گا، آخر ہوا کیا ہے؟ بولو ناں شہیر میرا صبر نہ آزماؤ۔"

شہیر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "نہال۔۔۔!"

"ہاں کہو۔" وہ اس کے قریب آگیا۔

"کیا بتاؤں میرے بھائی کہ کیا ہوگیا؟" وہ بے بسی سے بولا۔

نہال جھلا گیا۔ "دیکھو میری بات سُنو! یہ لو پین اور یہ رہا کاغذ، تم اس پر لکھ کر کھڑکی کے نیچے پھینک دو۔ میں نیچے لان میں کھڑا ہوں اور اگر تم نے نہ لکھا تو میں ساری رات نیچے کھڑا رہوں گا۔" وہ باہر نکل گیا۔

جانے کیوں اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ پتا نہیں کیا ہوگیا تھا۔ ایک ایک لمحہ صدی بن کر گزر رہا تھا۔ وہ سخت پریشانی کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ بار بار اس کی نگاہ شہیر کے کمرے کی کھڑکی کی طرف اُٹھ رہی تھی۔

اچانک اُس کے پاس ہی ایک کاغذ آ کر گرا۔ اُس نے عقاب کی سی تیزی سے جھپٹا مار کر کاغذ اُٹھا لیا۔ اُس کی بے تاب نگاہیں کاغذ پر لکھی تحریر پر سے پھسل گئیں۔

"او خدایا!" اس کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ اس کا سر چکرا گیا۔ مساموں سے ایک دم ہی پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ شرابور ہوگیا۔

"یہ کیا ہوگیا؟" اُس کی دھڑکنیں تھم سی گئیں۔ سانسیں رُک سی گئیں۔

اُس نے پھر دبی ہوئی مٹھی کھولی اور کاغذ نکالا۔ اُس کے ہاتھوں کے پسینے نے شہیر کے لکھے لفظوں کو دھندلا دیا تھا۔

وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ ان لفظوں کو جنہوں نے سانپ بن کر اسے ڈس لیا تھا۔

"نہال! جواہر تمہاری بیوی ہے، اس سے تمہارا نکاح بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔"

وہ الفاظ تھے کہ زہر کا پیالہ، جو نہال کے حلق سے اُتر چکا تھا۔

وہ الفاظ تھے کہ جلتے ہوئے تیر، جو اس کے دل کے آر پار ہو چکے تھے۔

وہ الفاظ تھے کہ آگ کے شعلے، جنہوں نے اس کا تن من پھونک ڈالا تھا۔

وہ الفاظ تھے کہ بم، جو اس کے وجود کے اندر پھٹ چکا تھا۔

نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں، یہ جھوٹ ہے، مذاق ہے، خواب ہے۔

پروردگار اسے سچ نہ کرنا، اسے تعبیر نہ بخشنا۔

اس کے رُوئیں رُوئیں نے صدقِ دل سے دُعا کی۔

مگر کیا حقیقت سے نظریں چرا لینے سے حقیقت خواب بن جاتی ہے؟

وہ بے حس سا وہیں حوض کے کنارے بیٹھا رہا۔ بار بار اس جملے کو پڑھتا رہا اور بار بار سُولی پر لٹکتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ شہیر اسے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہا ہے۔ حوض کے کنارے لگے مرکری بلب کی روشنی میں نہال اسے صاف نظر آ رہا ہوگا۔

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج، نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں پہ کسی حسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اک ہی گھڑی ہے
ہمت کرو، جینے کو تو اک عمر پڑی ہے

"ہاں ہمت کرو۔" زمین آسمان نے جیسے اسے سہارا دیا۔

اپنی لاش اپنے ہی کندھے پر اُٹھا کر وہ اندر آگیا۔ فریج سے ٹھنڈا پانی نکال کر پیا، مگر اندر کی آگ سرد نہ ہوئی۔ وہ فل اسپیڈ سے پنکھا چلا کر اُس کے نیچے بیٹھ گیا۔

خیالات اس قدر تیزی سے آ رہے تھے کہ سب کچھ ذہن میں گڈمڈ ہوگیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ذہن بُری طرح شل ہوگیا تھا۔ لمبے لمبے دو تین سانس لینے کے بعد اس نے ایک گلاس پانی اور پیا۔ چھوٹے چھوٹے بے جان قدم اُٹھاتا ہوا وہ شہیر کے کمرے کی جانب چل دیا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شہیر بازوؤں میں سر دیے ہوئے بیٹھا تھا۔ وہ اندر آگیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس نے اپنے لہجے کو سپاٹ بنانے کی کوشش کی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"جاذب نے بتایا تھا۔ وہ بابا جان (سکندر رضا) کے ہاں گیا تھا۔ یونہی باتوں باتوں میں ذکر آ گیا تو انہوں نے بتا دیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ دادا جان نے ہم سب کو یہ بات بتا دی ہوگی اور ہم لوگ اس سے باخبر ہوں گے۔"

شہیر رُخ موڑے، اُس سے نظریں ملائے بغیر بولا۔

"جاذب نے تم لوگوں کو کب بتایا؟"

"آج شام ہی۔" اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔

بہت سے لمحے مُردہ گزر گئے۔

"نہال!" وہ بستر سے اُتر کر کھڑا ہو گیا۔

"نہال! میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے جو کچھ سوچا، جو کچھ کیا وہ سب لاعلمی میں ہوا۔ مجھے پتا ہوتا تو میں اس بات کو یوں بے لگام نہ ہونے دیتا۔ کیا تم مجھے اتنا گھٹیا انسان سمجھتے ہو کہ میں اپنے ہی بھائی کی بیوی پر نظر رکھ سکتا؟ میں تو تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ میں "باخبر دل" سے بے حد شرمندہ ہوں۔ میں اپنی بے گناہی کو گواہ بنا کر تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تمہارا مجرم ہوں۔ چاہو تو سزا دے لو، مجھے منظور ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے پناہ چھوڑ دوں گا، تمہاری اور جواہر کی زندگی سے نکل جاؤں گا، تم آسے اپنا لو اور بھول جانا کہ شہیر نامی کوئی شخص تمہاری زندگیوں میں موجود تھا۔ نہال چپ کیوں ہو؟ بولو ناں جواب کیوں نہیں دیتے۔ میں تمہاری دنیا سے چلا جاؤں گا۔ میں وعدہ کر رہا ہوں۔" اُس نے نہال کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"سو جاؤ شہیر، میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔"

"نہال! کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گے؟ میں سب کچھ بھلا دینے کو تیار ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"چھوڑو اس بات کو، مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ واپس جانے کے لیے مڑا۔

"نہال! تم اس بات کو اتنا معمولی کیوں سمجھ رہے ہو؟ کیا تمہیں یقین نہیں آ رہا۔ تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔ خدا کی قسم نہ یہ مذاق ہے اور نہ جھوٹ ہے۔"

"بس چپ ہو جاؤ۔" اُس کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔ زور سے اُس کے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ ساری رات اُس نے دہکتے انگاروں پر گزاری۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ رجا کی اُلجھی ہوئی ڈور میں سے فیصلے کا سرا کس طرح ڈھونڈے۔

کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

کنویں اور کھائی میں سے کس کا انتخاب کرے۔

اس کا ذہن بُری طرح منتشر تھا۔ ذہنی خلفشار نے اس کے اعصاب میں توڑ پھوڑ مچا رکھی تھی۔ سوچتے سوچتے کب اُس کی آنکھ لگ گئی اور جب آنکھ کھلی تو خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔

اُفق کے اُس پار سے سورج کا کنارا ابھی جھانک رہا تھا۔ وہ خالی الذہنی سے آ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُسے سیّد صاحب پناہ گاہ میں داخل ہوتے دکھائی دیے۔ وہ غالباً صبح کی سیر سے واپس لوٹ رہے تھے۔ سنگِ مرمر کی روش پر چلتے ہوئے وہ اندر غائب ہو گئے۔

نہال ان کے آٹھتے بڑھتے قدم دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ تلوار کی دھار پر فیصلہ کر کے عمل کے جہنم میں گرنے کے واسطے وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ سیڑھیاں اُتر کر وہ جواہر کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ غالباً سو رہی تھی۔ اس نے بغور اُس کی صورت دیکھی۔ وہ ایسے پھول کی مانند لگ رہی تھی جسے شاخ سے توڑ کر پھینک دیا گیا ہو اور راہ سے گزرنے والا ہر شخص اس کو روندتے ہوئے گزر رہا ہو۔ نہال نے سر کو جھٹکا دیا اور قدرے فاصلے پر کھڑے ہو کر اُسے آواز دی۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ نہال پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہلدی کی طرح زرد ہو گئی۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر لفظوں نے ساتھ نہ دیا۔

نہال نے آگے بڑھ کر اُس کی کلائی تھام لی۔ اُسے بستر سے باہر کھینچا اور گھسیٹتے ہوئے سیّد صاحب کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ پاؤں سے دھکا مار کر دروازہ کھول دیا۔

سیّد صاحب صبح کا اخبار دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے چونک کر اُسے دیکھا۔

نہال کی نگاہیں اُنہی پر تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اُس نے ابھی تک جواہر کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا بلکہ پکڑا کیا جکڑ رکھا تھا۔ اچانک اُس نے جھٹکا دیا، وہ لڑکھڑاتی ہوئی سیّد صاحب کے بستر پہ جا گری۔

"نانا جان! جواہر میری ماموں زاد ہے، اس کے علاوہ اس سے میرا کیا رشتہ ہے؟" وہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

سیّد صاحب اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

نہال اُن کے قریب پہنچ گیا۔

"نانا جان! آپ خاموش رہ کر میرے اندر کے شعلوں کو ہوا نہ دیں۔ کیا یہ میری منکوحہ ہے؟"

"ہاں۔" سیّد صاحب کی پُرسکون "ہاں" نے نہال کے پورے وجود کو اپنی گردش میں لے لیا۔ اس کے کانوں میں یہی ایک لفظ گونجنے لگا۔

"کب ہوا اس سے میرا نکاح، کس نے پڑھوایا؟" وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"میں نے۔ تم یہاں آرام سے میرے پاس بیٹھو، میں تم کو بتاتا ہوں۔" وہ نرمی برت رہے تھے۔

"نانا جان! میں آپ کی کہنے نہیں، اپنی کہنے آیا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی کوئی بات میرے ارادوں کو متزلزل کر دے۔"

"کیا کہنے کے لیے آئے ہو؟" سیّد صاحب کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"اگر یہ میری بیوی ہے تو میں نہال آفریدی اپنی منکوحہ کو طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

تڑاخ — تڑاخ — تڑاخ —! جتنی تیزی سے اُس کے منہ سے طلاق کے شعلے نکلے، اتنی ہی تیزی کے ساتھ اُس کے منہ پر سیّد صاحب کے ہاتھوں نے لکیریں ڈال دیں۔

وہ لڑکھڑا گیا۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے، دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ میں تمہاری صورت دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔"

اُن کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی، جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

نہال نے شعلہ بار نگاہوں سے جواہر کو دیکھا، جو بے ہوش ہو چکی تھی اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ جونہی باہر نکلا، ایک دم ٹھٹک گیا۔

شہیر سامنے کھڑا تھا۔

"تم جیسا ذلیل اور گھٹیا انسان میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ کاش میں تمہیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا، کہ میں تم سے کتنی شدید نفرت کرتا ہوں۔ کاش میں تم کو اپنے دل کی گہرائی دکھا سکتا۔ نہال میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنی پستی میں گر جاؤ گے کہ میری نظر بھی تم تک نہیں پہنچ سکے گی۔"

اُس کے لہجے اور لفظ لفظ سے نفرت ٹپک رہی تھی۔

نہال نے براہِ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

شہیر جیسے منجمد سا ہو گیا۔

اُس کی اور نہال کی آنکھوں کے درمیان پانی کی دیوار حائل تھی، جو نہال کی آنکھوں میں تھی۔

اُس نے بغور نہال کو دیکھنا چاہا، مگر اب وہ وہاں کہاں تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر باہر کی جانب جا رہا تھا۔ شہیر کا سر چکرا گیا۔

اُس کی آنکھوں کا کانچ بھیگا بھیگا،

اُس کی آنکھوں کا فرش گیلا گیلا،

نہال جیسا فولاد کا مرد اور آنسو،

آگ اور پانی،

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اُس نے اپنا گھومتا ہوا سر تھام لیا۔

جب سب کو پتا چلا تو تمام اپنی اپنی جگہ ششدر ہو گئے۔ ماحول بے حد بوجھل اور سوگوار ہو گیا۔ وہ سب ہی چپ چاپ تھے، گم صم، جیسے خاموشی سے سوگ منا رہے ہوں۔ خمار اور رابی، جواہر کو اُس کے کمرے لے گئی تھیں۔

جاذب نے ڈاکٹر کو فون کر دیا تھا۔ سید صاحب نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا۔ شہیر اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اُس کے دل میں نہال کے خلاف شدید نفرت کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ اُسے اپنا آپ بس سے باہر ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا نہال کو شوٹ کر دے، مگر اسی دل کے کسی نامعلوم کونے میں نہال کے لیے فکر بھی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ واپس جا چکا تھا۔

زیبا نے بتایا تھا کہ اُس نے بہت تیزی سے نہال بھائی کو اپنی بجیرو نکالتے ہوئے اور چشمِ زدن میں ہوا ہوتے دیکھا تھا۔

شہیر نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔

پتا نہیں وہ پہنچا ہے یا نہیں۔

کہیں اُس کا ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے۔

کہیں وہ خود ہی اپنے آپ کو کچھ نہ کر بیٹھے۔

وہ بہت ... ہو رہا تھا ... ڈرائیونگ تو وہ پہلے ہی کرتا تھا اور غصے میں تو انسان ویسے ہی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اپنے لحاظ سے اُس نے وقت کا حساب لگایا اور اُس کے فلیٹ پر فون کیا۔

فون پر بیل بج رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دوبارہ ڈائل کیا، مگر بے سود، کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

شہیر بُری طرح پریشان ہو رہا تھا۔ اُس کو بے طرح نہال کی فکر لگ گئی۔

اب تک تو اُسے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اُس نے دل میں سوچا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اُس کو دیکھنے جائے گا۔

اُس نے ایک دفعہ پھر فون کرنے کی کوشش کی، اب کی بار فون اٹھا لیا گیا اور فون اٹھانے والا نہال ہی تھا۔

"ہیلو۔۔۔!"

شہیر خاموش رہا۔

"ہیلو۔۔۔!"

شہیر نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

پھر اُس نے نہال کی بڑبڑاہٹ سنی اور فون پٹخنے کی آواز آئی۔

شہیر نے آہستہ سے ریسیور کریڈل پر رکھ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔

اُس کی آواز اس کی ذہنی پریشانیوں کی غمازی کر رہی تھی۔ یقیناً بھنور میں تو وہ بھی پھنس چکا تھا۔

نہال بہت عرصے کے بعد پناہ گاہ آیا تھا۔ شہیر اور شیراز دونوں لان میں بیٹھے تھے۔ دونوں ہی اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

شہیر نے بغور اُس کا جائزہ لیا۔

وہ بے تحاشا دبلا ہو گیا تھا۔ اُس کے رخساروں کی ہڈیاں بہت نمایاں ہو گئی تھیں۔ اس کا رنگ بھی سنولا گیا تھا۔ آنکھیں بھی اندر کو دھنسی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

"نہال! تم کہاں چلے گئے تھے؟" اُسے دیکھ کر دو مختلف قسم کے جذبات پر رواداری کے ذریعے قابو پاتے ہوئے شیراز نے کہا۔

"اور یہ کیا حالات بنالی ہے تم نے؟"

"کوشش تو بہت کی مگر دنیا سے نہ جا سکا۔"

وہ خود میں شیراز سے نظریں چار کرنے کی جرأت نہ پیدا کر سکا۔

"جاذب کئی بار تمہارے فلیٹ پر گیا۔ پڑوسیوں نے بھی یہی کہا کہ کافی عرصے سے نہیں آئے۔ فیکٹری میں بھی انکوائری کرنے پہ یہی جواب دیا کہ یہاں بھی کئی دنوں سے نہیں آئے۔" پھر وہ قدرے مدھم لہجے میں بولا۔

"ہم کافی پریشان تھے۔ آخر تم اتنے عرصے سے کہاں غائب تھے۔۔۔؟"

"اسپتال میں ایڈمٹ تھا۔"

"کیا ہو گیا تھا؟" دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"میں نے کافی مقدار میں خواب آور گولیاں کھا لی تھیں۔" جھوٹ کہتے کہتے اُس کے مُنہ سے سچ نکل گیا۔

وہ دونوں سکتے میں رہ گئے۔

"کیا کہا تم نے؟" شیراز کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"تم۔۔۔ تم نے خودکشی کرنے کی کوشش کی؟ بے وقوف آدمی! تم نے مرنے کی کوشش کی، کیوں۔۔۔ مجھے بتاؤ کیوں؟" شیراز نے شدید غصے کے عالم میں اس کا کالر پکڑ لیا۔

"کیا کرتا میں زندہ رہ کر؟ کیا جتنے دُکھ میں نے آپ سب کو دیے ہیں، اس کے بعد بھی زندہ رہنے کی گنجائش تھی؟" وہ بھی تیز لہجے میں بول رہا تھا۔

"کیا مر جانے میں ہی عافیت تھی؟" اس جیسے ٹھنڈے دھیمے مزاج کے آدمی کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

"جینے کا جواز بھی تو کوئی نہ تھا۔ نفرت ہو گئی تھی زندگی سے، خود سے۔"

اس کا کھڑے کھڑے کمزوری کی وجہ سے سر چکرانے لگا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔

"نہال! کیا تم پر صرف تمہارا ہی حق تھا؟ تم اتنے خود غرض کیوں ہو، تم کو ہم میں سے کسی کا خیال نہیں آیا؟"

"شیراز بھائی! میری ذات سے سب کو دُکھ پہنچا ہے۔ میں مزید کوئی دُکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔" اُس نے بوجھل لہجے میں کہا۔ اور اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"نانا جان! میں اندر آ جاؤں؟" نہال نے دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھا۔

وہ اس کی آواز سن کر چونک گئے۔ صورت دیکھ کر طیش میں آ گئے۔

"نہیں۔" وہ دھاڑے۔ "میں تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ سانپ کا بیٹا سانپ ہی ہوتا ہے۔ میں نے اپنی آستین میں سانپ کی پرورش کی ہے۔"

نہال نے دانت سختی سے بھینچ لیے۔ ذلت کے شدید ترین احساس کو مصلحت کے زور سے کچل دیا۔

"نانا جان! پلیز آپ میری ایک بات سن لیں، آپ کو خدا کا واسطہ ہے۔"

"جلدی کہو اور دفعان ہو جاؤ یہاں سے، تم میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو۔ میں تم کو زیادہ دیر اپنے سامنے برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ غصے میں پھنکارے۔

"نانا جان! میں جواہر کے سلسلے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا لہجہ خاصا محتاط سا تھا۔

"مت لو اپنی ناپاک زبان سے میری معصوم بیٹی کا نام۔" اُن کا خون کھولنے لگا۔

"تمہارا اُس سے کوئی واسطہ نہیں۔ خبردار جو آئندہ تمہاری زبان پر جواہر کا نام آیا۔"

"ٹھیک ہے، میں کبھی اس کا نام نہ لوں گا۔ آپ سے صرف اور صرف اتنا کہنے آیا ہوں کہ جواہر کی شادی شہیر سے کر دیں۔"

"نہال!" وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

"شہیر اُسے بہت پسند کرتا ہے۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔" وہ آپے سے باہر ہو گئے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں سچ کہہ رہا ہوں آپ سے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے میری عرض سن لیجیے، میری بات پر عمل کر لیجیے" بڑی لجاجت سے بولا۔

"جواہر کوئی خیرات نہیں ہے جو بانٹ دی جائے۔ وہ سید وجاہت علی خان کی پوتی ہے۔ آتنی ارزاں نہیں کہ اسے یوں ایک کے آگے ڈالا جائے۔ اور تم کون ہوتے ہو اس کے مستقبل کے فیصلوں کے بارے میں اپنی رائے دینے والے؟"

"نانا جان! شہیر، جواہر سے شادی کا خواہاں ہے، آپ نہیں جانتے میں جانتا ہوں، خدا کے لیے آپ سید وجاہت علی خان نہیں، جواہر کے باپ بن کر سوچیے۔ شہیر اُسے نہ صرف بہت پسند کرتا ہے، اعلیٰ ظرف والا بھی ہے، وہ اُسے کھلے دل سے قبول کر لے گا۔"

"ہونہہ! جب وہ بے داغ تھی تو تم نے اُسے قبول نہیں کیا، اب وہ مطلقہ ہے، تو شہیر اُسے کیا قبول کرے گا؟" انہوں نے طنزاً کہا۔

"کیا برائی تھی میری بیٹی میں؟" وہ بے حد دکھ سے بولے۔

"خدا کی قسم کوئی برائی نہ تھی، وہ فرشتوں کی طرح معصوم ہے، اس کے دامن پر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ میں ہی اس کے قابل نہ تھا۔ شاید اس کے خوشیوں بھرے مستقبل کا ضامن نہ بن پاتا۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" اس چھ فٹ کے اونچے، مضبوط انسان نے اپنے ہاتھ ان کے آگے جوڑ دیے۔

"میری بات رد نہ کیجیے، شہیر کو بلوا کر اس کی مرضی معلوم کیجیے۔ نانا جان میں اس کے لیے آپ کے پاؤں چھونے کو تیار ہوں۔"

اور پھر اپنی انا، مردانگی، خودداری، وقار سب کو اس نے خود ہی اپنے پیروں تلے روند ڈالا اور سید وجاہت کے قدموں میں جھک گیا۔

سید صاحب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی۔ سانس تیز تیز چلنے لگی۔ شدتِ جذبات سے نہال کا چہرا سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔ وہ ضبط کی آخری حد پر کھڑا تھا۔

"تم چلے جاؤ یہاں سے، ہم شہیر کو بلوا کر خود اس سے بات کر لیں گے۔" وہ بلا سوچے سمجھے بولے۔

"نانا جان!" اس نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

"چلے جاؤ یہاں سے۔" وہ سخت لہجے میں بولے۔ "ہم سوچ سمجھ کر ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔"

نہال نے ایک نظر انہیں دیکھا اور اپنا ٹوٹا ہوا وجود لے کر باہر آ گیا۔

❂ ❖

اس شام سید صاحب نے شہیر کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ کافی دیر تک پتا نہیں دونوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ نہال بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کچھ دیر بعد شہیر خاموش خاموش سا اپنے دادا کے کمرے سے باہر نکلا۔

نہال نے اسے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے تک چلا آیا۔

"شہیر!"

"کیا ہے؟"

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا، تم مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" وہ بے رخی سے بولا۔

"خدا کے لیے بس ایک منٹ میری بات سن لو پلیز۔"

نہ جانے اس کی آواز میں کیا تھا کہ شہیر چپ سا ہو گیا۔

"آؤ بیٹھو۔" وہ قدرے نرم پڑ گیا۔

نہال صوفے پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیا تم سمجھ رہے ہو کہ میں نے جواہر کو طلاق تمہاری وجہ سے دی ہے کیا میرے ذہن میں یہ تھا کہ تم اسے پسند کرتے ہو اور اس کے حصول کی خواہش رکھتے ہو؟ یقین کرو شہیر ایسا نہیں تھا۔ میں تو اسے تم سے اتنا دور لے جاتا کہ تمہاری سوچ اس کی پرچھائیاں بھی نہ چھو پاتی۔ میں ہمیشہ کے لیے تم لوگوں کو چھوڑ دیتا۔ رہی جواہر کی بات کہ وہ بھی تم کو پسند کرتی ہے، تو مجھ سے شادی کر لینے کے بعد وہ سو فیصد خلوصِ دل سے میری ہو جاتی۔ وہ بڑے مضبوط کردار کی سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ ایسی نہیں کہ تمہارے بارے میں ہی سوچتی رہتی اور اپنی زندگی میں زہر گھولتی۔ وہ اپنے دل و دماغ کو میری سوچوں کا پابند کر دیتی اور پھر جب بچے ہو جاتے تو وہ تم کو کیا مجھے بھی بھول جاتی، اپنی ذات کو ان میں گم کر دیتی۔ میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ میرا مسئلہ تم نہیں تھے شہیر، میں اپنے آپ سے خوفزدہ تھا میری سوچوں کا محور کوئی اور تھا۔ میں بیک وقت ایک ہی فریم میں دو تصویریں کیسے لگا سکتا تھا؟"

شہیر نے ایک دم نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

"اگر مجھے ذرا سا بھی یقین ہوتا کہ میں اس "کو بھول جاؤں گا تو میں دل و جان سے جواہر کو قبول کر لیتا۔ میں منافقت بھری زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ ٹوٹ پھوٹ جاتا میں۔ جواہر اتنی اچھی اور معصوم لڑکی ہے کہ میں اس کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہر دن، ہر رات وہ میرے پاس ہوتی اور میرے خیالات کی دنیا کسی اور تصور سے آباد ہوتی۔ میں ضمیر پر یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ شادی ایک چھت کے نیچے دو آدمیوں کے رہنے کا نام نہیں ہے۔ میرے پاس جواہر کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ عورت سب سے پہلے اپنے شوہر سے وفا کا اعتبار مانگتی ہے، اس کی پرخلوص چاہت کی بلا شرکتِ غیر مالک بننا چاہتی ہے۔ میرے پاس جواہر کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا، نہ وفا نہ اعتبار، نہ خلوص نہ چاہت سکیا دیتا میں اس کو؟ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ اخلاقی طور پر پابند ہو کر میں اسے کھوکھلی پرفریب خوشیاں تو دے سکتا تھا، دل کا سکون نہیں، بہت نامراد رہ جاتی وہ۔ میں جبر کر کے اس کے ساتھ زندگی گزارتا اور وہ صبر کے ساتھ۔"

شہیر نے ایک گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ "میں سمجھا کہ اسے تم نے میری وجہ سے طلاق دی ہے۔"

"نہیں شہیر! نہال اتنا کمزور نہیں ہے کہ وہ جواہر کے دل سے شہیر کی تصویر نہ کھرچ پاتا، مگر یہاں میں اپنے آپ سے ہار گیا۔ جواہر مجھے بہت عزیز ہے۔ میرا فیصلہ اس کے خلاف نہیں، اس کے حق میں تھا۔ میں چاہتا تھا، کہ وہ اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن رہے، تم مجھے معاف کر دو شہیر۔"

اس نے جذباتی ہو کر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

شہیر نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "تو میرا دوست ہے، میرا بھائی ہے، میرا اپنا آپ ہے، میرے آگے ہاتھ جوڑ کر مجھے میری نظروں میں چھوٹا نہ کر۔" وہ اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر ایک دم بولا۔

"مجھے یہ بتاؤ پہلے کہ تم نے خودکشی کرنے کی سوچی کیسے؟" اس نے نہال کا چہرا ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میری منحوس صورت اس قابل ہی کہاں رہی تھی کہ تم لوگوں کو دکھاتا۔" وہ طنزیہ ہنسا۔

"اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو ___؟"

"کاش ہو ہی جاتا۔ ارے میں بڑا بے غیرت ہوں، آسانی سے نہیں مروں گا۔"

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا تھا، ہوش میں تو تھے تم ___؟" وہ خفگی سے بولا۔

"بہت زیادہ مایوس تھا میں، پتا نہیں میں نے کیسے وہ خواب آور گولیاں کھا لیں۔ محض اتفاق تھا کہ چچی جان اور زوبار یہ میرے گھر چلی آئیں۔ وہی مجھے اسپتال لے گئی تھیں۔ بس یار بغیر سوچے سمجھے ہی ایسا ہو گیا ___ غیر ارادی طور پر ___"

"میں جاذب تو قریشی صاحب کے گھر بھی گیا تھا۔ انہوں نے بھی تمہارے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔" شہیر حیرت سے بولا۔

"ہاں میں نے ہی ان کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کسی کو نہ بتائیں اور جس وقت جاذب ان

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کے گھر آیا تھا، میں اُن ہی کے گھر میں موجود تھا۔ خیر چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ کہ نانا جان نے تم سے کیا بات جواہر ہی کے متعلق کی تھی ناں؟"

"میں نے اثبات میں جواب دے دیا ہے۔" پھر قدرے رُک کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "تم نے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اُتار دیا ہے۔"

"بوجھ تو تم نے اُتارا ہے۔ بس اب مجھے جواہر کو مطمئن کرنا ہے۔ اسے میری طرف سے بہت صدمہ پہنچا میں اُس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔"

"رہنے دو، ساری تلافیاں میں خود کر دوں گا۔"

"نہیں شہیر! میں آج کل کانٹوں پر سو رہا ہوں۔ میں چاہے جواہر سے جھوٹ بولوں یا سچ کہوں، بس کچھ بھی کہوں، مگر میں اُسے مطمئن کرنا چاہتا ہوں۔ خوف اور بے اعتباری کی اس کیفیت سے اُسے نکالنا ہوں، جس میں وہ مبتلا ہے۔ اُس کا اطمینان میری زندگی بن گیا ہے۔ اُس کا معاف کر دینا میری سب بڑی آرزو ہے، میں اُس سے ابھی بات کرتا ہوں۔" وہ اُٹھنے لگا۔

"اجی ٹھہریے تو سہی۔" شہیر جاتے ہوئے نہال کا کالر پکڑ لیا۔

"بچے اس کے بارے میں نہیں بتاؤ گے؟"

اُس نے گول گول آنکھیں گھمائیں۔

"ہے یار ایک لڑکی۔ پتا نہیں کون سے لمحے میں میں اتنا کمزور پڑ گیا کہ اس نے بڑے نامحسوس طریقے مجھے شکست فاش دے ڈالی۔ میں جوں جوں اُس کے بارے میں سوچتا ہوں، جیسے بے بس سا ہو جاتا ہوں۔ اُس بے توکسی بات کی بھی خبر نہیں۔ اُس نے کچھ کہا اور نہ ہی میں نے سُنا۔ یار شہیر! میں تو اُسے پوری طرح جانتا بھی نہیں وہ تو مجھ سے شاید بالکل بھی واقف نہیں۔

یار شہیر! میں اُس سے محبت نہیں کرتا، مگر میں اُس سے محبت کرنا چاہتا ہوں۔

میں اُس کی خواہش کرنا چاہتا ہوں، اُسے اپنے گھر میں بسانا چاہتا ہوں۔

میں اُس کا ساتھ چاہتا ہوں، ہر دھوپ میں، ہر چھاؤں میں، ہر اندھیرے میں، ہر سویرے میں، ہر کانٹے نوک پر، ہر پھولوں کی نرمی میں۔

شہیر! میں اُس کا ہمسفر نہیں، اُس کی منزل بننا چاہتا ہوں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ کیسی ہے؟" شہیر نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ابھی تو میں نے خود اُسے ڈھنگ سے نہیں دیکھا۔"

"ایں! یعنی دیکھا نہ بھالا اور تیرے عشق نے ظالم ہمیں مار ڈالا، نام کیا ہے اُس کا؟"

"رانیہ۔"

"تمہیں ملی کیسے؟"

نہال نے اُسے ساری بات تفصیل سے بتائی۔

"جب تم نے اُسے ڈھنگ سے دیکھا تک نہیں تو ریشہ خطمی کیسے ہو گئے؟"

"نہ جانے کیا جادو ہے اُس میں، کیسی کشش ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا چیز ہے اور وہ اُن آنکھیں — بے موت مار ڈالا ہے اُس کی آنکھوں نے مجھے۔"

"ہائے، وہ کیا گانا ہے۔" شہیر گنگنانے لگا۔

زندگی ڈوب گئی اُن کی حسین آنکھوں میں
یوں میرے پیار کے افسانے کو انجام ملا

"دیکھ ایسا ہی سمجھو۔ شہیر بس تم دُعا کرو کہ میں اپنی زندگی کی اور بازیوں کی طرح یہ بازی بھی نہ ہار جاؤں۔"

اُس کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

"ارے پاگل ہوئے ہو کیا؟ بہت دھوم دھام سے تمہاری بارات لے کر جائیں گے اور اُسے پلکوں پر

کر لائیں گے۔"

"اوکے!" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں جواہر کے کمرے میں جا رہا ہوں، تم نہ آنا۔"

"یار! یہ ظلم تو نہ کرو۔" وہ رونی صورت بنا کر بولا تو نہال پھیکے سے انداز میں ہنس دیا۔

کمرے کے دروازے تک پہنچ کر وہ رُک گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔

"سُنو! ایک بات پوچھوں؟" وہ تذبذب کے عالم میں بولا۔

"کیا ہے؟" شہیر نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

نہال چپ رہا۔

"اب پھوٹ بھی چکو۔"

"تم جواہر کو طعنہ تو نہیں دو گے؟" وہ رُک رُک کر بولا۔

"نہال!" شہیر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا "تمہیں مجھ سے یہ بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" وہ جیسے پھنکار کر بولا تھا۔

"سوری بھائی! بس یوں ہی ایک ہلکے سے خدشے نے دل میں سر اُٹھایا تھا۔ تمہارے لہجے کی گہرائی اور صداقت پر میں ایمان لایا۔" وہ اُس سے نظریں ملائے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس بات سے قطعی بے خبر کہ کچھ دیر قبل کمرے کے دروازے پر کھڑا شہیر اُس کے مُنہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اپنے کانوں کے ذریعے دل میں اُتار چکا تھا۔

جواہر اپنے بیڈ پر نیم دراز غالباً کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ نہال نے آہستہ سے اُدھ کھلا دروازہ تھپتھپایا اور اندر داخل ہو گیا۔

جواہر نے اُسے دیکھا اور جیسے سہم سی گئی۔ اس کا رنگ مارے خوف کے سفید پڑ گیا۔

"ڈرو نہیں جواہر، تم مجھ سے بالکل مت ڈرو، میں تم سے کچھ بات کرنے آیا ہوں۔" وہ بے حد نرمی سے اس سے مخاطب تھا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

"میں بیٹھ جاؤں؟"

جواہر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھو جواہر! یہ جو زندگی اللہ نے ہمیں دی ہے، یہ زندہ رہنے کے لیے دی ہے۔ اس کے تمام تر حسن سے لطف اندوز ہونا ہر ایک کا فطری حق ہے۔ زندگی سمجھوتا کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ انسان بے شک سمجھوتے کرتا ہے، مگر مجبوری کے تحت اور یہ اس وقت کیے جاتے ہیں جب کوئی دوسرا راستہ نہ ہو۔ جواہر تم اچھی طرح جانتی ہو کہ شہیر تم کو پسند کرتا ہے۔"

جواہر کی نگاہیں جھک گئیں۔

"اور یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم بھی اُسے پسند کرتی ہو۔ انجانے میں کئی بار تم سے اُس کا اظہار ہوا تھا اور شہیر کا رازدار تو میں خود ہوں۔

جواہر! مرد بہت تنگ نظر ہوتا ہے۔ ظرف کا بھی ذرا چھوٹا ہوتا ہے، اگر میں تم سے اپنا دوسرا رشتہ قبول کر لیتا تو کوئی فرق نہ ہوتا۔ شہیر سے متعلق اپنے خیالات کو اپنے ذہن کی آلائش سمجھ کر انہیں نکال پھینکتیں اور میرے تصورات سے اپنے ذہن کی آرائش کرتیں، مگر میں یہ کیسے بھول پاتا کہ میرا کزن میری ہی بیوی کے عشق میں گرفتار ہے، یا یہ کہ جو کچھ میں اپنی بیوی کے متعلق سوچتا ہوں۔ ایسے ہی خیالات، شدت پسندی کے ساتھ کوئی اور بھی رکھتا ہے۔ بہت کم ظرف اور چھوٹا انسان ہوں میں۔ قوتِ برداشت کی آزمائش میرے بس کا روگ نہیں تھی۔ ہو سکتا تھا کہ تم مجھ سے پُرخلوص طریقے سے پیش آتیں مگر میں تمہاری ذرا سی بھی کوتاہی برداشت نہ کر پاتا جب کہ مجھے یہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بھی علم ہوتا کہ شہیر تمہارے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے۔

دوسری صورت میں اگر تم یہ بات جان لیتیں کہ تمہارے شوہر کو علم ہے کہ تم پہلے ہی کسی کو پسند کرتی تھیں تو شاید تم ساری زندگی ضمیر کی عدالت میں مجرم بنی کھڑی رہتیں۔ جواہر تم جیسی مضبوط کردار کی لڑکیوں کے لیے ضمیر کی چوٹ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ تم ہر قدم سہج سہج کر رکھتیں۔ اپنے آپ کو چھپا چھپا کر رکھتیں، کہیں میں تمہارے دل کی بات نہ جان لوں۔ چوروں کی طرح میرے ساتھ زندگی بسر کرتیں، ہر آہٹ پر کان کھڑے ہو جاتے۔ ہماری ساری زندگی ایک بوجھل اور ناخوشگوار ماحول میں ایک دوسرے کو فریب دیتے ہوئے گزر جاتی۔"

وہ درحقیقت سچ بول کر نہیں بلکہ عورت کی نفسیات کو زیر کر کے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اور دوسری اور بنیادی وجہ یہ کہ میں خود بھی کسی کو پسند کرتا تھا۔" اُس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "اپنے جذبات کی شدتوں کو شکست دینا میرے لیے ناممکن بن گیا تھا۔ ایک شدت سے دوسری شدت کی جانب بغیر دل و ذہن پر بوجھ لیے ایک لمحہ میں سفر کر لینا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں تمہارے لیے کسی طور مخلص ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ میں شادی کے بعد جو کچھ تمہیں دیتا، وہ نرا فریب ہوتا۔"

وہ اُس کے تاثرات بغور دیکھ رہا تھا۔ اپنے ایک ایک لفظ پر اُس کا ردِ عمل جانچ رہا تھا۔

"بولو ناں جواہر، کچھ تو کہو۔"

وہ رونے لگی۔

"باغ اُجڑ جائے تو اس کا دوبارہ لگانا آسان ہوتا ہے، پھول ٹوٹ کر بکھر جائے تو اُسے دوبارہ نہیں کھلایا جا سکتا۔ جواہر، میں نے پوری ایک رات تمہارے بارے میں سوچا۔ میرے کئی راستے تم تک پہنچتے تھے، مگر ان میں روشنی نہ تھی۔ کیا فائدہ ہوتا، میں تو بھٹک جاتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے تمہارے مقدر پر سیاہ لکیریں پھیر دی ہیں، مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شہیر کے وجود سے تمہاری زندگی میں بڑی روشنی ہوگی۔ اُس کے پاس تمہارے لیے بہت ساری خوشیاں ہیں، تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔"

جواہر اور زور سے رونے لگی۔ نہال اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"تم اچھی طرح رو لو۔ میں رونے کو بُرا نہیں سمجھتا۔ اچھا ہے تمہارے اندر کی گھٹن تمہارے آنسوؤں کی صورت بہہ جائے۔"

"جواہر!" وہ اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں نے انجانے میں تمہارا بہت دل دُکھایا ہے۔ بعض اوقات احساس پر لگنے والی چوٹ ایسی ہوتی ہے کہ الفاظ ان کا مرہم نہیں بن پاتے۔ میرے پاس معذرت کے لیے الفاظ تو نہیں ہیں، مگر ——!"

"نہیں نہال بھا ——!" وہ ایک دم چُپ ہو گئی۔

بہت سے لمحے دونوں طرف سے عجب شرمندگی کا احساس لیے گزر گئے۔

"کیا کہہ رہی تھیں نہال بھائی سے؟" وہ قدرے اُداسی سے مسکرا کر بولا۔

وہ خاموش رہی۔

"بس اب سب کچھ بھلا دو۔ آج، ابھی، اسی لمحے۔ آنسو بھی پونچھ ڈالو اور اس گھر کی فضا کو خوشگوار بنانے میں میری مدد کرو۔ آؤ ہم دونوں ایک دوسرے کو اور ان سب کو اس گھٹے گھٹے سے ماحول سے باہر نکال لیں۔ میں تم سب کے ہونٹوں کی ہنسی کو ترس گیا ہوں۔ میں وہی دن واپس لانا چاہتا ہوں جب ہم سب کو ایک دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ یہ دن نہیں کہ ہر کوئی دوسرے سے چھپتا پھر رہا ہے۔"

وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور باہر نیلے آسمان کو دیکھنے لگا۔ پھر پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا اور بولا۔

"نانا جان نے شہیر کو بُلایا تھا۔ اُس نے ہاں کر دی ہے۔ تم سے پوچھیں گے تو تم کیا کہو گی؟"

جواہر چُپ چاپ انگلیاں مروڑتی رہی۔

"کیا پوچھ رہا ہوں تم سے؟"

اُس کے ہونٹوں پر تالے پڑے رہے۔

"جواہر! خوش بختی زندگی کے دروازے پر بار بار دستک نہیں دیتی، تم اقرار کر لینا۔"

اُس نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"جواہر!" وہ اُس کے پاس بیٹھ گیا، "تم نے مجھے معاف کر دیا ناں؟"

"نہال بھائی ایسے نہ کہیں۔"

"نہیں، تم ایک بار اپنی زبان سے کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ پلیز میرے دل کے سکون کی خاطر۔ اور اگر معاف نہ کرنا چاہو تو بے شک سزا دے ڈالو، کم از کم جانکنی کی یہ گھڑی تو مجھ پر سے ٹل جائے۔"

"مَیں نے آپ کو معاف کر دیا۔"

"مجھ سے اب کوئی شکوہ تو نہیں ہے۔"

"نہیں۔"

"خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔" وہ اطمینان کا سانس لے کر باہر آ گیا۔

"جواہر!" سیّد صاحب نے ڈائننگ روم سے کچن کی جانب جاتی جواہر کو آواز دی۔

"جی۔" وہ رُک گئی۔

"بیٹا، فارغ ہو کر میرے کمرے میں آ جانا۔"

تھوڑی ہی دیر میں جواہر ان کے کمرے میں اُن کے سامنے بیٹھی تھی۔

وہ اُس سے شہیر کے رشتے کے متعلق بات کرنے لگے۔ جب اس کا عندیہ جاننا چاہا تو وہ بالکل خاموش رہی۔

"بیٹے!" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "خاموش نہ رہو۔ میری ناعاقبت اندیشی نے مجھے یہ دن دکھایا۔ قصور میرا تھا، سزا تم نے جھیلی۔ اب میں تم سے تمہاری صاف صاف مرضی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں شہیر سے شادی منظور ہے؟"

"دادا جان! مجھے شادی نہیں کرنی۔"

سیّد صاحب افسردگی سے ہنسنے لگے۔ "بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔ میں تمہارے احساسات اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر زندگی تنہا رہ کر بھی تو نہیں گزاری جا سکتی۔ شہیر کو بحیثیت شوہر قبول کر لو گی؟"

اُس کی آنکھوں سے خاموش آنسو ٹپکنے لگے۔

"بولو ناں میرے بچے۔"

"دادا جان! آپ میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہو گا۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بولی۔

سیّد صاحب نے جیب سے ہیروں کی خوبصورت سی انگوٹھی نکالی اور اُس کی انگلی میں پہنا دی۔

"تم خوش رہو گی تو میں بھی پُرسکون رہوں گا۔" انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"اس رشتے میں شہیر کی مرضی کا پورا پورا دخل ہے۔ شیراز کو میں نے گھڑی دی ہے، تمہارے بھائی کی حیثیت سے وہ اُسے پہنا دے گا۔"

اُن کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ ویسے تو سب کے کانوں میں اس بات کی بھنک پڑ چکی تھی کہ شہیر اور جواہر کی نسبت طے کی جا رہی ہے۔ زیبا تجسس کی ماری نے کھلے دروازے سے جو کچھ دیکھا، پیٹ کی ہلکی نے جا کر ایک ہی سانس میں نشر کر دیا۔

اور پھر جیسے سوئی ہوئی زندگی جاگ پڑی۔ سب کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی تھی۔ گھر میں جو افسردگی کے بادل اتنے عرصے سے چھائے ہوئے تھے، یکایک چھٹ گئے۔

جواہر جب اپنے کمرے میں پہنچی تو سوائے شہیر کے باقی سب اس کے سواگت کو موجود تھے۔ پہلے تو وہ انہیں دیکھ کر حیران ہو گئی، پھر اُن کے چہروں کے تاثرات پڑھ کر بُری طرح جھینپ گئی۔

"حبشی، یہ کیا تُک ہے، بھلا دادا جان کو کیا ضرورت تھی اپیا کو انگوٹھی پہنانے کی۔ شہیر بھائی کس مرض

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کی دوا ہیں؟" زیبا نے بڑھ کر جواہر کا رخسار چوم لیا۔

"ہاں، بلاوجہ ہی دادا جان کو شوق ہو رہا تھا۔ وہ ہے اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں آپا بی کو دادا کے لیے راضی کروں؟" ذیشان نے، اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"بے غیرت تیری شرم کہاں چلی گئی؟" خمار اُسے گھورتے ہوئے بولی۔

"ضرورت مندوں میں بانٹ دی۔" اس نے بے نیازی سے جاذب اور نہال کی طرف اشارا کیا۔

وہ دونوں بپھر کر اُس پر حملہ آور ہو گئے۔ ذیشان بچاؤ، بچاؤ کے نعرے بلند کرتا ہوا جواہر کے پیچھے ہو گیا۔

سب نے جواہر کو مبارکباد دی۔ اُس کے مستقبل کی خوشیوں کے لیے ڈھیر ساری دعائیں مانگیں پھر اس کے بعد شہیر کے کمرے میں دھاوا بول دیا۔

"خیریت تو ہے؟ آپ سب لوگ باجماعت کیوں تشریف لا رہے ہیں؟" شہیر اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے ہیں، ہتھکڑیاں پہنانے آئے ہیں۔" جاذب شوخی سے بولا۔ شیراز مسکراتے ہوئے شہیر کی جانب بڑھا۔ اور جیب سے رولیکس کی خوبصورت گھڑی نکال کر اُس کی کلائی پر باندھ دی۔

"شہیر! میری بہن کو ہمیشہ خوش رکھنا۔" وہ ہولے سے بولا۔

"میں تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔" اُس نے شیراز کا شانہ تھپتھپایا۔

"بھائی جان! آپ میرے سر پر بھی ہاتھ پھیر دیجیے، اللہ میری منگنی بھی جلدی کرائے۔" ذیشان نے سر اُس کے سینے میں گھسیڑ دیا۔

"دور ہٹو!" نہال نے اُسے پکڑ کر پیچھے کھینچا "تم سب سے چھوٹے ہو۔ تمہاری باری سب سے آخر میں آئے گی اور شہیر تم آج شام ہم سب کو فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کراؤ۔"

"واہ جی! مجھے یہ کس بات کی سزا دی جا رہی ہے کہ میری جیب خالی کرائی جائے گی۔ میں نے کیا جرم کیا ہے؟"

"منگنی۔" وہ سب بیک وقت بولے تھے۔

☾ ◉ ◆

جواہر گیلری میں اکیلی کھڑی تھی۔ چاندنی چھن چھن کر زمین پر آ رہی تھی۔ پھولوں کی خوشبو سے فضا مہکی مہکی تھی۔ شہیر دبے پاؤں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چپکے سے اُس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"اوہ تھینک گاڈ! تم اکیلی تو نظر آئیں۔"

"آپ یہاں؟" وہ ایک دم گھبرا گئی۔

"آپ جہاں ہیں وہاں۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"کوئی آ جائے گا، آپ چلے جائیں یہاں سے۔"

"بے فکر رہو، ایک ایک گدھے کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔ گھوڑے تو کیا سارے جانور ہی بیچ کر سو رہے ہیں۔ میرا بس چلتا تو سب کو بے ہوشی کی دوا دے دیتا۔ بہت دنوں سے موقع کی تلاش میں تھا، مگر کوئی نہ کوئی ہمزاد کی طرح تم سے چپکا رہتا تھا۔ میں نے اوپر سے دیکھا تھا کہ تم گیلری میں اکیلی کھڑی ہو، اس لیے چلا آیا۔ مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"کیوں؟" وہ بلاارادہ پوچھ بیٹھی۔

وہ ہنس دیا "پھر کبھی اطمینان سے بتاؤں گا کہ جواہر نے حیرانی۔"

اُس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ کہ ابھی زمین سے جا ملیں۔

شہیر خاموش کھڑا اُس کی موجودگی کا احساس کر رہا تھا اور وہ اُس کی موجودگی سے گھبرا رہی تھی۔

"آپ آخر کیوں آئے ہیں؟"

"جواہر!" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا "تم خوش ہو؟"

"آپ خوش ہیں؟" اُس نے اُلٹا سوال کیا۔

"اتنا خوش ہوں کہ اظہار کے تمام الفاظ بے معنی ہو چکے ہیں۔"

جواہر خاموش ہو گئی۔

"تم میرے ساتھ خوش رہ سکو گی؟"

"آپ مجھے خوش رکھ سکیں گے؟"

"کوشش کروں گا۔"

"شہیر!" اُس کی آواز بھرا گئی۔

"جی!" اُس کی ساری حسیات ایک ہی رنگ میں رنگ گئیں۔

"میں بے قصور ہوں۔" وہ رو دی۔

"جانتا ہوں اور شاید قصور کسی کا بھی نہیں ہے۔ نوشتہ تقدیر تھا سو ہو گیا۔ تم اپنے دل سے ہر خدشہ دور کر دو۔ میں زندگی کی آخری حد تک تمہارے ساتھ ہوں۔"

کچھ دیر دونوں خاموش کھڑے چاند کو تکتے رہے۔

"میں نے تمہارے لیے یہ سونے کی انگوٹھی خریدی تھی، اپنے ہاتھ سے پہنانا چاہتا تھا، اجازت ہے؟"

حیا نے اس کی زبان بند کر دی۔

شہیر نے اُس کا ٹھنڈا یخ ہاتھ تھام کر انگوٹھی اُس کی انگلی میں ڈال دی۔

"پتا ہے یہ انگوٹھی میں نے کب خریدی تھی؟"

"کب؟" اُس نے نظروں سے پوچھا۔

"ڈیڑھ سال پہلے۔"

وہ متحیر نظروں سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔

"جب پہلی بار تمہارے حصول کی خواہش نے در دل پر دستک دی تھی۔" وہ آہستہ سے بولا۔

جواہر نے سر جھکا لیا۔

"اب جاؤ آرام کرو۔"

وہ جیسے ہی پلٹا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔

سوائے شیراز کے سبھی اپنے اپنے چہرے کھڑکی کے فریم میں فٹ کیے موجود تھے۔ دونوں شرم سے پانی پانی ہو گئے۔

"تم سب کو اپنی صورتیں یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ سوتے میں بھی چین نہیں ہے تم لوگوں کو۔" اس نے اپنی خفت مٹانے کو خفگی سے کہا۔

"آپ جہاں ہم وہاں۔" بڑے ترنم سے کہا گیا تھا۔

○ ◉ ◆

کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ وقت کی رفتار روک دیں۔

ہر چیز کسی پُرکیف نشے کے زیرِ اثر تھم جاتے۔

چاند تارے اپنی دسترس میں لگتے ہیں۔

خوشبوئیں تسخیر ہو جاتی ہیں۔

کلیوں کا چٹکنا، پھولوں کا کھلنا کسی معصوم شوخ سی ادا کے پابند ہو جاتے ہیں۔

بہاریں اجازت کی طلبگار رہی جاتی ہیں۔

بڑی حسین، بڑی قیمتی ہو جاتی ہے زندگی۔

بڑا پیار ہو جاتا ہے زندگی سے، اپنے آپ سے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اور ایسا تبھی ہوتا ہے جب چاہنے اور چاہے جانے کے جذبات ایک دل سے دوسرے دل تک کا سفر طے کرتے ہیں۔

دل و نظر کی ریاضتیں سُرخروئی کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔
ایسے میں جی چاہتا ہے کہ بس پَر لگ جائیں اور آسمان چھو آئیں۔
یا پھر ایک دوجے کی رُوح کی گہرائی ناپ آئیں۔
اُس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کوئی اُسے یوں ٹوٹ کر چاہے گا۔
کہ جس جگہ وہ اپنا پاؤں رکھے گی، وہاں وہ اپنا دل رکھ دے گا۔
اُس کا دل دھڑکے گا تو وہ سانس لے گا۔

"آئینہ نہ دیکھا کرو۔" وہ اُس کی آنکھوں میں اپنی صورت دیکھنا چاہتا۔
"کیوں"؟ اُس سے نظریں نہ اُٹھائی جاتیں۔
"کہیں تم ٹوٹ ہی نہ جاؤ۔" اور اُس کے ہاتھ کے دباؤ کے نیچے نازک کلائی میں پڑی کئی چوڑیاں ٹوٹ جاتیں۔

"سُنیے! ذرا دیکھیے کتنی تیز بارش ہو رہی ہے۔" وہ توجہ منتشر کرنا چاہتی۔
"تمہارا قصور ہے۔" وہ زُلف منتشر کر دیتا۔
"کیا مطلب؟" وہ بکھر بکھر جاتی۔
"تم زُلف کھولے پھر رہی تھیں۔ بادل شرم سے پانی پانی ہو کر برس گیا۔"
حیا اُسے حواسوں سے دو رلیے جاتی۔
اور اس کے وجود کی چاندنی میں اُس کی ذات مدہوش ہوئی جاتی۔

"یہ تمہارا حسن ہے یا میرے صبر کی آزمائش؟
تم میرے دل کا قرار ہو یا بے قراری؟
میرے جینے کا جواز ہو تم۔
دل کے دھڑکنے کا سبب۔
سانسوں کی آمدورفت کی وجہ۔"

معاذ محبتوں کی انتہا پہ پہنچ کر اُسے رُوح کی گہرائیوں میں اُتار لیتا۔
جویریہ اُس کی چاہتوں کی شدتوں سے گھبرا کر رونے بیٹھ جاتی۔

❁ ❁

اُس نے میک اپ کر کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ پرفیوم کی شیشی کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ بیڈ پر نیم دراز وارفتگی سے اُسے دیکھتے ہوئے معاذ ایک دم بول پڑا۔
"ہاں اِک ستم اور مری جاں! ابھی جاں باقی ہے۔"
جویریہ کے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔
"آپ بہت ستاتے ہیں۔" اُس نے خفگی سے اُس کی جانب دیکھا۔
اور باہر جانے کی غرض سے اُس نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ معاذ اُٹھ کر تیزی سے اُس کے راستے میں آگیا۔
"کہاں جا رہی ہو؟" اُس کی آنکھیں اور لہجہ دونوں شوخ ہوئے جا رہے تھے۔
"امّی کے پاس۔"
"کیا میری شکایت کرنے؟" وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔
"کیا کہو گی؟"
"پرے ہٹیں۔" اُس نے کنی کترا کر نکل جانا چاہا۔
مگر اُس کا بازو فرار کی تمام راہیں مسدود کیے دے رہا تھا۔

"پہلے میری بات سنو۔" اُس کا دل بے ایمان ہونے لگا تھا۔
"معاذ پلیز!" وہ جیسے بے بس سی ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔
اُس کی آنکھوں کا مفہوم پڑھ کر معاذ مُسکرا دیا۔ ہاتھ بڑھا کر ٹیبل پر پڑی کار کی چابیاں اُٹھاتے ہوئے بولا۔
"سوال یہ ہے کہ اس بات کا فیصلہ کیسے ہو کہ ظالم تم ہو یا میں؟"
پر جویریہ وہاں کہاں تھی۔ موقع پاتے ہی فرار ہو چکی تھی۔
وہ نیچے آیا تو اپنی ماں کے پاس اُسے مُنہ پھلائے ہوئے بیٹھا پایا۔ وہ مُسکرائے بنا نہ رہ سکا۔
"امّی! ہم باہر جا رہے ہیں۔ رات کے کھانے پر انتظار نہ کیجیے گا، ہم باہر ہی کھائیں گے۔" وہ ماں سے مخاطب ہوا۔
"ضرور جاؤ۔" وہ بخوشی بولیں۔ "اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔"
دونوں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر پورٹیکو میں نکل آئے۔
"آج کار تم ڈرائیو کرو۔" وہ کار کی طرف بڑھتے بڑھتے رُک گیا۔
"نہیں آپ چلائیں، مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اُس نے انکار کیا۔
"کیا اچھا نہیں لگتا؟" معاذ نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔
"یہی کہ مرد برابر میں بیٹھا ہو اور عورت کار ڈرائیو کر رہی ہو۔"
"اس میں بھلا کیا قباحت ہے؟" وہ قدرے حیران ہوا۔
"ایسا لگتا ہے کہ عورت کار ڈرائیو نہیں کر رہی بلکہ اپنے برابر میں بیٹھے مرد کو ڈرائیو کر رہی ہے۔"
اُس کی بات کے جواب میں معاذ کی ہنسی زندگی سے بھرپور تھی۔ "بے فکر رہو، میں خاصا خود اعتماد ہوں۔ یہ لو پکڑو چابی۔"
جویریہ نے چابی تھام لی۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر سڑک پر ڈال دی۔
"تمہیں یاد ہے جویریہ! جب میں تم سے پہلی بار زبیر چچا کے ہاں ملا تھا۔" معاذ نے کیسٹ پلیئر آن کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں اچھی طرح یاد ہے۔" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"جب میں لندن سے آیا تو امّی نے مجھ سے تمہارے بارے میں تذکرہ کیا۔ مزید یہ بھی کہا کہ وہ تمہارے والدین سے اس سلسلے میں بات کر چکی ہیں۔ مجھے سُن کر بڑا غصہ آیا کہ جس لڑکی کو میں جانتا نہیں، اُسے کبھی دیکھا نہیں، اُس سے وہ میری شادی کرنے چلی ہیں۔ محض اتفاق تھا کہ تم سے میری یوں اچانک ملاقات ہو گئی۔ خیر دیکھتے ہی تو میں فریفتہ نہیں ہو گیا تھا، بس کچھ اچھی سی لگی تھیں تم دل کو۔ بہرحال اُس وقت واپس جاتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے وجود میں مدّھم مدّھم سی روشنی ہے۔ جویریہ مجھ جیسے مرد دل کے دروازے تو کیا سوچ کے دروازے بھی صنفِ نازک کی آہٹ پر بمشکل ہی کھولتے ہیں، مگر تم میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ اس رات میں نے تمہارے بارے میں بہت سوچا۔ تمہاری اور اپنی گفتگو کے ایک ایک لفظ کو دس دس دفعہ دُہرایا۔ ساری رات نہیں سو سکا تھا میں۔ تمہارا تصور ذہن میں لاتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میری ذات کتنی تنہا ہے، ادھوری ہے۔ اب مجھے اپنے وجود کی تکمیل کر لینی چاہیے۔ تم میری ذات کی تکمیل کا باعث ہو جویریہ! جب میں تم کو دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میری زندگی کتنی قیمتی ہے۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔" اُس کی آواز مدّھم ہوتی چلی گئی۔
اور جویریہ کی روح میں جیسے پھول سے کِھل گئے۔
"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" اُس نے گیئر بدلتے ہوئے دھیرے سے کہا۔
"پوچھو۔" اُس کی یہ ادا تو معاذ کا دل کھینچ کر لے جاتی۔ جب بھی وہ کوئی بات شروع کرتی، پہلے یہ ضرور کہتی۔
"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"
"کیا مجھ سے پہلے آپ کو کبھی کوئی لڑکی پسند نہیں آئی؟"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

”نہیں، کم ازکم اس حد تک تو بالکل نہیں کہ دل میں سناٹوں کا احساس ہونے لگتا۔ بہت سے حسین چہرے نظر سے گزرے، مگر دل سے کسی کا گزر نہ ہوا۔ بہت سے چہرے توجہ کے طلبگار تھے اور بہت سے خود ہی توجہ کا مرکز بن جانے کی صلاحیت رکھتے تھے، مگر دل کہیں نہ رُکا۔ جب نظر نے ہی نہ ٹھہرنا چاہا تو دل کیسے ٹھہر جاتا۔“ پھر وہ خمار آلود لہجے میں اس کی جانب جھک کر بولا ”اس دل نے تو جویریہ کے دربارِ حسن میں آکر سجدہ ریز ہونا تھا، کیسے کسی اور کے آگے جھک جاتا؟“

اس نے گیئر بدلتے ہوئے جویریہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا، مگر معاذ نے گرفت سخت کر دی۔

نہال، قریشی صاحب اور ان کی بیگم کے ہمراہ اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا۔ ریسٹورنٹ کا ماحول بہت خوابناک سا تھا۔ اطراف میں ستونوں کے ساتھ بندھی ہوئی مشعلیں جل رہی تھیں۔ ہر میز پر کینڈل اسٹینڈ رکھے تھے، جن میں روشن موم بتیاں ماحول کو خوبصورتی بخش رہی تھیں۔ مدھم مدھم، سرگوشیاں، دبے دبے قہقہے، پرفیوم کی خوشبو اور بجتی ہوئی چوڑیاں احساس پر خوشگوار اثرات چھوڑ رہے تھے۔ اطراف میں کیبنز بھی بنے ہوئے تھے۔ بال بچوں والے لوگ کیبنز میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ویٹر نے اُن کی میز پر کھانا چُن دیا تھا۔

نہال اور زوباریہ کھانا بھی کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کے کان بھی۔

”جویریہ کا فون آیا تھا؟“ نہال نے پوچھا۔

”ہاں، باجی کا فون کل شام کو آیا تھا۔“

”مزے میں ہے وہ؟“

”ہاں ٹھیک ٹھاک ہیں۔“

”دو ہفتے گزر گئے میری بچی کو لندن گئے ہوئے۔“ بیگم قریشی بے حد افسردگی سے بولیں۔

”اس کے جانے کے بعد سے تو گھر ایسا ہو گیا ہے جیسے کوئی رہتا ہی نہیں۔“

”کوئی بات نہیں چچی جان، آہستہ آہستہ عادت پڑ ہی جائے گی۔“ اس نے دلاسا دیا۔

”نہال! اب تم بھی شادی کر ہی لو۔“ قریشی صاحب بولے۔

”چچا جان! ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”ہائے لو، ابھی کیا نوزائیدہ ہی ہو۔“ بیگم قریشی نے پیار سے کہا۔

”ارے بھئی ہمیں دیکھو، چوبیس سال کی عمر میں شادی کر لی تھی۔“ قریشی صاحب نے اپنی جلد بازی کے متعلق بتایا۔

”اتنی جلدی؟“ وہ حیرانی سے بولا۔ ”چچی جان کہیں بھاگی جا رہی تھیں کیا؟“

”نہیں یوں بھاگی جا رہی [illegible] اپنی کلاس فیلو سے شادی کرنا چاہتے تھے۔“ وہ بڑے مزے سے بتا رہی تھیں۔

”پھر کیا ہوا؟“ نہال نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا، ان کے والد کو علم ہوا تو جھٹ پٹ ان کی شادی کر دی۔ خود ہی سیدھے ہو گئے تیر کی طرح۔“

”اور اب تک سیدھا ہوں تیر کی طرح۔“ قریشی صاحب بے چارگی سے بولے۔

نہال نے ہنستے ہوئے جو چہرا اٹھایا تو ایک دم ہی چونک پڑا۔

ہاں وہی تھی۔

بالکل وہی تھی۔

وہ انٹرنس پر ہی رُک گئی تھی۔ شاید اس کا انتظار کر رہی تھی، جس کے ساتھ آئی تھی اور پھر اس کے ساتھ آنے والا اندر داخل ہوا۔

نہال کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

وہ عمر تھا اور وہ یقیناً رانیہ ہی تھی۔

نہال اُن لوگوں سے کافی دور تھا اور قدرے اندھیرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ رانیہ مشعل کے بالکل قریب کھڑی ہوئی تھی۔ دُھندلا دُھندلا چہرا اُس کی نگاہوں کی دسترس میں تھا۔ اُس کا چہرا تو وہ آنکھیں بند کر کے بھی پہچان سکتا تھا۔ اگرچہ وہ اس کو کبھی غور سے نہیں دیکھ پایا تھا، مگر ادھر آنکھیں بند کیں اور اُدھر اُس کی شبیہہ موجود۔ وہ تو اس موڑ پر آ گیا تھا کہ اس کی پرچھائیں کو بھی پہچان سکتا تھا۔

خالی ٹیبل دیکھنے کے لیے رانیہ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک خالی کیبن دیکھ کر اُس نے عمر کی طرف دیکھا۔ عمر نے سر ہلایا اور دونوں آگے بڑھ گئے۔

وہ نہال کی ٹیبل کے پاس سے گزرے تو اُس نے دانستہ سر جھکا لیا تاکہ عمر اُسے دیکھ نہ سکے۔ وہ لوگ جا کر اُس کے بالکل سامنے والے کیبن میں بیٹھ گئے۔

عمر کا صرف ایک بازو نظر آ رہا تھا اور رانیہ اس طرح بیٹھی تھی کہ سائیڈ سے وہ اُسے دیکھ سکتا تھا۔ اُس کے کٹے ہوئے بال ہوا سے اُڑ اُڑ کر اُس کے مُنہ پر آ رہے تھے۔ وہ جدید تراش خراش کے لباس میں ملبوس تھی۔

”نہال بھائی! کیا مراقبے میں چلے گئے؟“ زوباریہ نے اپنا چمچہ اُس کی پلیٹ پر بجایا۔

”آں — نہیں تو۔“ وہ چونک گئے۔

اس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔ اندر سے کوئی چیز ٹوٹ سی گئی تھی اور بُری طرح چبھ رہی تھی روح میں۔

اُس نے پھر رانیہ پر نظریں جما دیں۔ اُس دن بازار میں تو یہ چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ آج یہاں اس انداز میں ایک اجنبی کے ساتھ ہوٹلنگ کر رہی تھی۔

”تم سے کس نے کہہ دیا کہ عمر اُس کے لیے اجنبی ہے، کیا تم جانتے ہو؟“ اُس نے سوچا۔

نہال کو خود اپنے ہی سوال کا کوئی جواب نہ سُوجھا۔ عمر کا خیال کر کے اُس کے اندر جو جذبات اُبھرے، وہ اُن کو کوئی نام نہ دے سکا۔

پتا نہیں عمر کا اُس سے کیا تعلق ہے؟

عمر اُس کا کیا لگتا ہے؟ کیوں آئی ہے یہ اس طرح عمر کے ساتھ —؟

اُس کا جی چاہا کہ دوڑ کر جائے اور اُس سے پوچھے کہ عمر اور اس کے درمیان کیا رشتہ ہے؟

اُسی لمحے نہال نے دیکھا کہ عمر اُس کے قریب ہو کر کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ بے ساختہ ہنس رہی تھی۔ عمر نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھا ہوا تھا۔

نہال کا دماغ چلنے لگا۔ اس کا جی چاہا عمر کو اُٹھا کر دور پھینک دے اور چلا چلا کر اس سے کہے کہ اس کو ہاتھ مت لگاؤ، دیکھو! اسے مت چھوؤ۔“

”کیا بات ہے نہال کیا ہوا؟“ قریشی صاحب اسے بغور دیکھ رہے تھے۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ گڑبڑا گیا۔

”کھانا ڈھنگ سے کیوں نہیں کھا رہے ہو؟“

”میں کھا چکا ہوں۔“ اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

قریشی صاحب پھر اپنی پلیٹ پر جھک گئے اور وہ غیر ارادی طور پر ایک بار پھر ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ہاں یہ وہی ہے۔ نظر کہہ رہی تھی۔

نہیں، وہ نہیں ہے۔ دل نہیں مان رہا تھا۔

پتا نہیں یہ وہی ہے کہ نہیں۔ دماغ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

میرا خیال ہے کہ یہ کوئی اور ہے، مجھے واقعی دھوکا ہوا ہے۔ اُس نے اپنے دل کو تسلّی دینے کی کوشش کی۔ مگر شکل و صورت تو بالکل وہی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ فوراً کیبن میں گھس جائے اور اسے قریب سے دیکھ کر اپنا اطمینان کر لے کہ یہ رانیہ ہے یا نہیں۔ کم ازکم اس کی آنکھوں میں تو ایک بار جھانک ہی لے۔ وہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بمشکل اپنے جذبات قابو میں کیے بیٹھا تھا۔ اُس نے ٹیبل پر سختی سے ہاتھ جما دیے کہ پاگل پن میں واقعی کر نہ چل دے۔

کھانے سے فارغ ہو کر قریشی صاحب نے بل ادا کیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نہال نے پھر ایک اُسے دیکھا۔

نہیں، یہ وہ نہیں ہے۔

ہاں یہ وہی ہے۔

دل و نظر دونوں میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ نہال اپنا سکون لٹا کر گھر آ گیا۔

○ ● ◆

رانیہ — ! کتنا قریب آ گئی تھی وہ اُس کے دل کے۔ بہت آس پاس محسوس ہوتی تھی، مگر اب وہ اتنے فاصلے پر نظر آ رہی تھی کہ جس کو طے کرنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے اور رانیہ کے درمیان عمر آ گیا تھا۔

"پتا نہیں کیا تعلق ہے ان دونوں میں؟" عمر نے تو کبھی ذکر نہ کیا تھا۔

مگر نہیں۔ ایک جملہ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

"بھلا میرے سینے میں دل کہاں۔ وہیں ہے جہاں اُسے ہونا چاہیے۔"

اور جو نہال اس کی بات کی وضاحت چاہتا تو وہ کہتا کہ وہ مُنہ سے کچھ نہ کہے گا بس کسی مناسب وقت پر وضاحت دکھا دے گا۔

کیا یہی وہ "وضاحت" ہے؟

نہال کو اپنا دامن خالی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے دل کا کشکول خالی کا خالی تھا۔

اسی کی خاطر تو اُس نے جواہر کو اُس مقام سے گزارا تھا، جہاں سے گزرنے کے بجائے عورت مر جانے کو ترجیح دیتی ہے۔

اُس کا دماغ گھوم رہا تھا۔

کیوں اس نے اتنی اُمیدیں وابستہ کیں؟

کیوں اپنے جذبات قابو میں نہیں رکھے؟

کیوں سراب کے پیچھے اندھا دھند دوڑ لگا دی۔

کیوں معلوم نہ کیا کہ رانیہ کسی سے وابستہ تو نہیں؟

اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔

آج اس کو درد کا ایک نیا مفہوم معلوم ہوا تھا۔

کبھی اپنے ہی دل کو اپنے پیروں تلے رکھو اور اس پہ چلو تو معلوم ہوتا ہے کہ درد کیسے کہتے ہیں۔

وصل کے لمحات سے پہلے فراق کی نہ ختم ہونے والی گھڑیاں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا کر دیتی ہیں۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے دل کی لگام میں کھینچ لے گا۔ اب وہ کبھی ان کے گھر نہیں جائے گا۔ اس راستے پر نہیں چلنا چاہیے، جس کی کوئی منزل نہ ہو۔

○ ● ◆

نہال اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو — نہال بول رہا ہوں۔" اُس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"بول رہے ہیں تو بولتے رہیے۔ ہم نے کوئی پابندی تو نہیں لگائی آپ کے بولنے پر۔" عمر کی آواز ایرپیس میں اُبھری۔

نہال کی آنکھوں میں ریسٹورنٹ کا منظر گھوم گیا۔

"کیسے فون کیا؟" وہ چاہنے کے باوجود اپنی سرد مہری نہ دبا سکا۔

"نہال زیادہ گپ شپ کا وقت نہیں ہے۔ اس وقت کی اہم ترین خبر یہ ہے کہ نشاط کا منگیتر دس دن کی چھٹی پر آ رہا ہے اور بمعہ بیگم کے واپس جانا چاہتا ہے۔ ڈیڈی شادی کر رہے ہیں نشاط کی۔"

"مبارک ہو۔" اُس نے دل سے مبارکباد دی۔ نشاط اس کو بہت عزیز تھی۔ نٹ کھٹ اور شریر سی۔ ہر وقت ہنگامے رکھتی۔

"بھئی یہ ہمارے بہنوئی صاحب ایسے ہی ہیں۔ ایسے آتے ہیں جیسے فضائی حملہ کر رہے ہوں۔ ادھر آئے، دو بم گرائے اور چل دیے، مگر اب کے وہ بم گرانے نہیں، بلکہ ہمارے گھر کی توپ لینے آ رہے ہیں۔" عمر خوش دلی سے بولا تو نہال مسکرانے لگا۔

"تم شرافت سے میرا ہاتھ بٹاؤ۔ نشاط صرف میرے دھکے سے ہی نہیں سرکے گی، تم بھی میرا ساتھ دو۔"

"آپ حکم کیجیے، میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔"

"محترم حکم نہ کہیے، احکامات کہیے، میں کل صبح آؤں گا تم سے ملنے، میرا انتظار کرنا، ٹھیک — !"

"بالکل ٹھیک — خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

اس کے بعد کے دن بے حد مصروف گزرے۔ نہال عمر کے ساتھ شادی کے کاموں میں اُلجھا رہا۔ وہ قدرے خاموش سا رہنے لگا تھا، مگر عمر اپنی مصروفیات میں اس کی خاموشی نوٹ نہ کر پایا۔ کئی بار نہال کا جی چاہا کہ وہ اُس سے رانیہ کے بارے میں پوچھے، مگر وہ پوچھ نہ سکا۔

نہ جانے کیوں؟

دل کے کسی کونے میں مبہم سی اُمید تھی کہ شاید وہ رانیہ نہ ہو۔ آس کا دیا پوری طرح جل تو نہیں رہا تھا مگر اس کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ ایسا نہ ہو عمر سے پوچھ لینے کے بعد وہ تو بالکل ہی بجھ جائے۔

اُس روز مہندی تھی۔ وقار صاحب چونکہ عجلت میں شادی کر رہے تھے، اس لیے زیادہ مہمانوں کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ نہال گھر کے اندر انتظامات میں مصروف تھا اور عمر باہر۔

رنگین آنچل لہرا رہے تھے، شوخیاں، شرارتیں، چھینا جھپٹی ایسے ہی موقعوں پر بھلی لگتی ہیں۔

نہال جونہی اندر کمرے میں آیا تو ٹھٹک گیا۔ وہ اُسی لمحے کمرے کے دوسرے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ اُس کے کٹے ہوئے بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔

نامعلوم سے درد نے نہال کے وجود کو گھیرے میں لے لیا۔ حلق میں دھواں سا بھر گیا۔ آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں۔

رسم وغیرہ کے بعد ساری عورتیں کھانے کے لیے اُٹھ گئیں۔ نشاط کی سہیلیوں کے لیے اُس کے کمرے میں ہی کھانے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ نہال ہیسج سے گزر رہا تھا کہ عمر نے اُسے آواز دی۔

اُس نے پلٹ کر دیکھا، عمر پیسج کے دوسرے سرے پر اُس کا ہاتھ تھامے نہال کی جانب تیز تیز چلتے ہوئے آ رہا تھا۔

نہال کی آنکھوں کے آگے ایک دم اندھیرا سا چھا گیا۔ کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

اُس نے آنے والے لمحے کے لیے خود کو تیار کرنا چاہا۔ پاؤں کے نیچے زمین مضبوط کی اور کھڑکی کی گرل سختی سے تھام لی۔

عمر قریب آ گیا۔ "نہال ان سے ملو یہ میری منکوحہ ہیں۔"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اُس کے وجود پر ایسا سناٹا طاری تھا، جیسے کسی بے گناہ کو سزائے موت سُنائی جانے والی ہو۔

اُس کا سانس رُکا ہوا تھا اور نگاہیں کسی نامعلوم نکتے پر مرکوز تھیں۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا، کہ اس کی جانب دیکھ سکے۔ خوف تھا کہ کہیں آنکھیں اپنا نور ہی نہ کھو دیں۔

"تمانیہ! یہ میرے دیرینہ دوست ہیں نہال،" عمر تعارف کرانے کے مراحل سے گزر رہا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تانیہ!"

یہ لفظ جا کر اس زور سے سماعتوں سے ٹکرایا کہ سارا وجود جھنجھنا گیا۔ اُس نے ایک دم نظریں اُٹھائیں۔ اپنی براؤن آنکھوں میں کاجل سجائے، ہونٹوں پر نرم مسکراہٹ اور چہرے پر خوشگوار تاثر لیے وہ آ رہی تھی۔

نہال موقع محل کی نزاکت سے قطعی بے نیاز بے اختیار اُسے ایک ٹک تک رہا تھا۔

اُس کی یہ براؤن آنکھیں۔

اور اُس کی وہ سیاہ آنکھیں۔

وہ اور سب کچھ تو بھول سکتا تھا، مگر اماوس کی رات جیسی وہ آنکھیں فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اُن اندھیروں تو خود کو کھو کر اُس نے اپنا سُراغ بھی نہ پایا تھا اور نہ پانا چاہا تھا۔

"اب کیا نظر لگا کر ہی دم لو گے؟" عمر کی آواز نے اُسے حواسوں میں کھینچا۔

نہال اپنی اس قدرے غیر اخلاقی سی حرکت پر حد درجے شرمسار ہو گیا۔ خفت آمیز لہجے میں بولا۔ "آداب"

"آداب!" وہ ہاتھ پیشانی تک لے گئی۔

آواز میں بھی واضح فرق تھا۔

"یہ تمہارے چہرے پر اس قدر زلزلے کی کیفیت کیوں نمایاں ہے؟" عمر اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ تھا، مگر سمجھنے سے بہرحال قاصر رہا تھا۔

"نہیں تو۔" اُس نے خود کو تیزی سے نارمل کیا۔

"دراصل تمہاری بیگم کی صورت دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے، جیسے انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔"

"بھئی کوئی جنت کی حُور ہی میری بیگم سے مشابہ ہو سکتی ہے، ورنہ ــــ!"

تانیہ نے نہال کے سامنے عمر کی ایسی بات پر مارے شرمندگی اور بوکھلاہٹ کے چُپکے سے عمر کی قمیص پیچھے سے کھینچی۔

"میری قمیص کیوں کھینچ رہی ہو؟" اُس نے بڑی مسکینی سے تانیہ کو دیکھا۔

تانیہ کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ عمر کو لے کر اس میں گھُس جائے۔

عمر کی بات پر نہال نے زندگی سے اور عمر نے ڈھٹائی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"میں اندر جا رہی ہوں۔" وہ بُری طرح خجل ہو رہی تھی۔

نہال، عمر کا دوست تھا، تو کیا ہوا، اُس کے لیے تو بہرحال اجنبی ہی تھا اور پھر پہلی ہی ملاقات تھی۔ وہ تیزی سے اندر جانے کو مڑی۔

"ارے بھئی رُکو تو۔" عمر نے اُس کا بازو تھام لیا اور نہال سے مخاطب ہوا۔

"آفریدی! تم ذرا ہماری ایک تصویر تو کھینچ دو۔" اُس نے کیمرا نہال کی جانب بڑھایا۔

"ٹھیک ہے۔" اُس نے عمر کے ہاتھ سے کیمرا لے لیا۔

"سے چیز ــ!" اُس نے کیمرے کی آنکھ سے دونوں کو دیکھا۔

"لاحول ولا قوۃ! جو شے مجھے سخت زہر لگتی ہے مائی! اُس کا نام سُننا بھی پسند نہیں کرتا۔" عمر نے "چیز" پر بُرا سی شکل بنا کر تلملاتے ہوئے کہا۔

"اور یہ تم کیوں مسلسل پرے سرکتی جا رہی ہو۔ کیا نکاح نامہ لا کر دکھاؤں کہ تم میری بیوی ہو۔" اُس نے تانیہ کو خود سے قریب کیا۔

"نہال بھائی جلدی سے تصویر کھینچیے۔" وہ زچ ہو کر نہال سے بولی۔

کیمرے سے جونہی کلک کی آواز نکلی، وہ اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تیزی سے پلٹی اور اپنی ہائی ہیل کے جوتے چکنے فرش پر بجاتے ہوئے سامنے کے کھُلے دروازے میں غائب ہو گئی۔

"لو اپنا کیمرا پکڑو اور یہ بتاؤ کہ اتنی خاموشی سے تم اتنی بڑی واردات کر کے بیٹھ گئے اور میرے فرشتوں کو بھی ہوا نہیں لگنے دی۔" اُس نے عمر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یار! میرے ابا نے مجھے ہی بڑی مشکل سے ہوا لگنے دی، میں تمہارے فرشتوں کو کہاں سے ہوا لگاتا؟ خیر تفصیل پھر کبھی بتاؤں گا۔ ابھی تو نیچے جا رہا ہوں، جہاں والد بزرگوار مجھے حسبِ سابق و عادت "ناہنجار و نالائق" کے نام سے یاد فرما رہے ہوں گے کہ نہ جانے اپنی نالائقی سمیت کہاں مر گیا جا کر؟ اور تم ذرا نشاط کے کمرے میں جھانک لو، اگر کھانے میں کسی چیز کی کمی ہو تو ملازم سے کہہ کر پہنچوا دینا۔" وہ یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اُتر گیا۔

یہ "وہ" نہیں ہے، یہ رانیہ نہیں ہے۔ دل اس وقت بڑی ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ جذبات میں زبردست تلاطم تھا۔ بڑی ہنگامہ خیزی، اور دماغ ایک دم پُرسکون، رُوح حد درجے شانت۔

اُس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر دونوں ہاتھ ٹکا دیے۔

جیسے صدیوں کے آبلہ پا سفر کی تھکن لمحوں میں اُتر گئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کہ ایک ایک قدم جیسے ہواؤں میں رکھتا محسوس کر رہا تھا۔

اُس کو ایک بار پھر پا لینے کی اُمید اُس کے اندر زندگی کی حرارت بن کر دوڑ رہی تھی۔

نہال نے ایک آسودگی سے بھرا سانس فضاؤں کے حوالے کیا اور اس دروازے کی سمت دیکھا، جس کے پیچھے جا کر تانیہ غائب ہوئی تھی۔

کتنی مشابہت ہے اور نام بھی ملتا جلتا سا۔

"حیرت انگیز اتفاق ہے۔" اُس نے خود کلامی کی کیفیت میں کندھے اُچکائے اور نشاط کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

○ ● ◆

دروازے پر گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی جیسے جویریہ کلی سے کھِل کر پھول بن گئی۔

ایک ایک قدم جیسے کہکشاں پر دھرتی ہوئی وہ دروازے تک پہنچی اور ایک دم ہی کھول دیا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرا ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے معاذ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

"آداب!" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"خوش رہیے۔" معاذ نے مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھا، جو ریشم کے دھاگوں سے کڑھے میرون رنگ کے کُرتا شلوار میں ملبوس، لانبے لانبے بالوں کو پُشت پر آوارہ چھوڑے، ہلکے سے میک اپ کے ساتھ دل میں اُتر جانے کو بس تیار کھڑی تھی۔

اُس کی سراہتی نگاہوں کا پیام وصول کر کے وہ شرما کر مڑی اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔

اپنے پیچھے معاذ کے قدموں کی آواز نہ پا کر وہ ایک دم پلٹی۔ اُسے اپنی جگہ کھڑا دیکھ کر حیرت سے بولی۔

"ارے! اندر تو آ جائیں۔"

"پہلے ہوش میں تو آ جائیں۔" وہ مخمور لہجے میں بولا اور اندر چلا آیا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو اس لباس میں، ایسے ہی اچھے اچھے کپڑے پہنا کرو، خوب ہوا، خوب تر لگا کرو۔"

جویریہ نے مسکراتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اُسے کوٹ اُتارنے میں مدد دی۔

"معزز خاتون کیا کرتی رہیں آج آپ سارا دن؟" وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولا۔

"وہی، جو آپ کی غیر موجودگی میں، میں ہمیشہ کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔" وہ اُس کا کوٹ ہینگر پہ لٹکاتے ہوئے بولی۔

"کیا؟" معاذ نے نگاہوں سے پوچھا۔

"انتظار!" وہ ادائے دلبری سے بولی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تمہیں انتظار کرنا اچھا لگتا ہے؟" اُس نے جویریہ کی پیشانی پر بکھرے بال سنوارے۔

"ہاں، آپ کا انتظار کرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔" وہ "آپ" پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"بڑا خوبصورت احساس ہوتا ہے، مگر جب میں آتا ہوں تو یہ خوبصورت احساس تو ختم ہو جاتا ہوگا" وہ دلچسپی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"بے شک! مگر جب آپ آجاتے ہیں تو میرے بے جان وجود میں جان بھی تو آجاتی ہے۔" وہ محبت سے چور چور لہجے میں بولی۔

جواب میں معاذ نے اُسے بڑی گرم نگاہوں سے دیکھا۔

کچھ مہکتے مہکتے لمحے دبے پاؤں گزر گئے۔

"جویریہ! میرے لیے چائے بنا لاؤ، آج میں بہت تھک گیا ہوں۔" اُس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں موندلیں۔

"جی اچھا!" وہ دھڑکنیں اور دوپٹا سنبھالتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ذراسی دیر میں ہی معاذ نے اچانک اپنے پیروں پر نرم نرم ہاتھوں کا لمس محسوس کیا اور اگلے ہی لمحے اس کے پاؤں زیرِ آب آگئے۔

اُس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ اُس کے دونوں پاؤں ٹھنڈے پانی سے بھرے ٹب میں تھے۔ جویریہ اُس کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ معاذ کے ٹخنوں پر اُس کے دونوں ہاتھوں کا دباؤ تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"اس طرح آپ کی ساری تھکن اُتر جائے گی۔" وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"میرے معصوم قاتل! میرے وجود کی تھکن تو تمہاری صورت کی چاندنی اُتار دیتی ہے۔" وہ جذبات سے بوجھل آواز میں بولا۔

اتنی شدید محبت!

محبتوں کی یہ انتہا!

"جویریہ!" معاذ جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس کا بازو تھام کے اُسے اُٹھایا۔

"کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو؟"

"نہیں، میں رو تو نہیں رہی۔" وہ روتے روتے اس درجہ معصومیت سے بولی کہ معاذ کا بے اختیار دل چاہا کہ اُسے اُٹھا کر دل میں رکھ لے۔

"رو رہی ہو اور کہہ رہی ہو، میں رو تو نہیں رہی۔" معاذ نے اُس کی نقل اُتاری۔

"معاذ!" وہ آنسوؤں بھری آواز میں بولی۔

وہ اُس کے انداز پر پگھل سا گیا۔ اپنائیت سے ہنس کر بولا۔

"کہیے، سن رہا ہوں میں۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کس چیز سے؟" وہ متعجب خیز نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"کہیں آپ مجھ سے خفا نہ ہو جائیں۔ کہیں ہمارے درمیان ناخوشگوار لمحے نہ آجائیں۔ مجھے خوف محسوس ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے دور نہ ہو جائیں، کہیں کھو نہ جائیں۔ معاذ محبتوں کے پھولوں میں یہ اتنے سارے وہم کے کانٹے کیوں لگے ہوتے ہیں؟ دل میں چاہت کے ساتھ ساتھ خدشات کیوں پلتے ہیں؟ کسی کو پالینے کے بعد اس کے کھو جانے کا ڈر کیوں لگا رہتا ہے؟ میرے دل میں اتنے خدشات کیوں ہیں، مجھے اتنا ڈر کیوں لگتا ہے؟ یہ خوف کیوں ہے کہ کہیں آپ مجھ سے چھن نہ جائیں۔ معاذ آپ کی محبتوں نے مجھے بزدل بنا دیا ہے۔ بہت زیادہ بزدل۔"

معاذ سختی سے لب بھینچے اُسے دیکھتا رہا۔

"معاذ! آپ مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جائیے گا، میں مر جاؤں گی۔ ہر وہ لمحہ جو آپ کے بغیر گزرتا ہے زندگی سے خالی ہوتا ہے۔ آپ دفتر چلے جاتے ہیں تو میرے اندر سے زندگی کے احساس کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ گھڑی دیکھتی رہتی ہوں کہ آپ کب آئیں گے۔ جوں جوں آپ کے آنے کا وقت قریب آتا جاتا ہے، زندگی قطرہ قطرہ میرے اندر داخل ہونے لگتی ہے۔ معاذ آپ ہمیشہ مجھے اپنے پاس رکھیے گا، آپ مجھے خود سے دور تو نہیں کریں گے ناں؟" وہ روئے چلی جا رہی تھی۔

"پہلے رونا بند کرو، تم رو رہی ہو، مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے۔" اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ٹشو بکس میں سے اُس نے ٹشو نکالا اور اُسے تھمایا۔

"اپنا چہرا صاف کرو۔"

اُس نے ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"جویریہ!" اُس نے اُس کی ٹھوڑی تھام کر چہرا اپنی طرف کیا۔ "تم تو محور ہو معاذ کا، بھلا تم کو چھوڑ کر میں کہاں جاؤں گا۔ بے روح کا جسم لیے زندگی کا سفر کیسے طے کر سکتا ہوں۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر تو اپنی عمر میں اضافہ کرتا ہوں۔" پھر قدرے رک کر گویا ہوا۔ "تمہیں اعتبار کیوں نہیں آتا میری باتوں کا؟"

"آتا کیوں نہیں!" وہ جلدی سے بولی۔

"پھر کیوں ڈر لگتا ہے؟"

"پتا نہیں۔" اُس نے معصومیت سے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔ پھر ایک دم چہرا اُٹھا کر بولی۔

"سوری معاذ! میں نے آپ کو پریشان کیا، پتا نہیں مجھے اچانک کیا ہو جاتا ہے۔"

معاذ ہنس پڑا۔ "محترمہ! میں قطعی پریشان نہیں ہوا۔ تمہارے دل میں جو کچھ ہوا کرے، بلا جھجک مجھ سے کہہ دیا کرو، مجھ سے نہیں کہو گی تو کس سے کہو گی؟"

"یعنی جو منہ میں آئے کہہ دیا کروں؟" اُس نے شریر لہجے میں معنی خیزی سے پوچھا۔

"مگر حدِ ادب میں رہ کر۔" معاذ برجستہ بولا۔

"آپ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جائیے، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" جویریہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

اتنی محبت اور اتنی توجہ کا نہ اُس نے تصور کیا تھا اور نہ تمنا، بن مانگے، بن چاہے ہی سب کچھ ملا تھا۔ کتنا چاہتی تھی جویریہ اُسے۔ بہت بے غرض، بے لوث۔ وہ ایک پیار بھری نگاہ ڈالتا۔ وہ جواباً مجسم محبت بن جاتی۔ بے حد اطاعت گزار، فرمانبردار، اُس کے منہ سے نکلے ہر لفظ کو تعمیل کی صورت میں بدل دینے والی، اُس کے ہر لمحے کی، ہر ضرورت کا خیال رکھنے والی، اُس کے لیے تو جیسے جنت کو زمین پر اُتار لیا تھا۔

وہ جوں جوں جویریہ کے بارے میں سوچتا گیا، اُسے خدا پر پیار آتا گیا، جس نے جویریہ کی صورت میں اُسے اتنی بڑی نعمت، اتنی بڑی خوشی دی تھی۔

"میرے معبود! تیرا یہ گناہ گار بندہ بڑی عاجزی کے ساتھ تیرا شکر ادا کرتا ہے۔"

اُس کا دل خدا کے آگے سجدہ ریز ہو گیا۔

○ ● ◆

دراصل اس کے احساسات چونک سے گئے تھے۔

جیسے کہیں کوئی پتھر گرا ہے، کہیں کوئی ہلچل ہوتی ہے، کوئی آہٹ سی ہوئی ہے۔

مگر کہاں؟ وہ اُلجھن کا شکار تھی۔

اور ہوئی بھی ہے کہ صرف وہم ہے۔ وہ تذبذب میں بھی مبتلا تھی۔

کیا نرم گرم انتہائی سنہرے روپہلے جذبوں پر جمے گلیشئیر میں دراڑ پڑی ہے؟

ہیں۔۔۔! واقعی۔۔۔؟ اُس کا دل اُچھل کر حلق میں ہی تو آ گیا۔

مگر کیسے پڑ گئی دراڑ؟ کس نے ڈالی؟ اُس نے حیران و پریشان ہو کر سوچا۔

اور دراڑ پڑی بھی ہے کہ محض گمان ہے، وہی بے یقینی کی کیفیت۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کیا اس کے احساس کے دروازے پر ہونے والی دستک کسی کے دل کی دھڑکن سے مشابہہ ہے؟

"اُف!" اُس نے دھڑ دھڑ بجتا دل تھام لیا۔

"یہ کس کا دل دھڑک رہا ہے اُس کے احساس کے در پر؟ کون ہے وہ؟"

"واقعی سمجھ نہیں رہی ہو یا سمجھنا نہیں چاہ رہی ہو؟" کوئی بڑے تیکھے لہجے میں اندر سے بولا۔

"مجھے کیا پتا؟" وہ ہراساں ہو گئی۔

"بھئی وہ بلاوجہ تو نہیں آتا یہاں!" بڑے آرام سے کہا گیا۔

"تو میری وجہ سے بھی نہیں آتا یہاں" وہ جھلائی۔

"اس بات کا ثبوت؟"

"مجھے نہیں معلوم" وہ چڑ گئی۔

"کبھی تم نے اُس کی نگاہیں پڑھی ہیں؟"

"اللہ نہ کرے" وہ جیسے بدک گئی۔ "مجھے کیا پڑی ہے کہ کسی اجنبی کی نظریں پڑھنے بیٹھ جاؤں استغفراللہ"

اُس کی نظروں کی خاموشی کیسی بولتی ہوئی سی ہے، جیسے اُس کی نظریں کچھ سمجھانا چاہتی ہوں کسی بات کا احساس دلانا چاہتی ہوں" اندر سے آواز آتی رہی۔

"کس بات کا احساس، آخر مسئلہ کیا ہے؟" وہ چیخ پڑی۔

پتا نہیں بہت دنوں سے اس کا ذہن منتشر کیوں تھا۔ وہ اپنے اندر بڑا ڈسٹربنس محسوس کر رہی تھی۔ کچھ نافہم سے خیالات ذہن کے پردے پر آ رہے تھے، مگر واضح نہیں ہو رہے تھے۔

نہ تو ان کا کوئی عنوان تھا اور نہ ان کی کوئی توجیہہ اور نہ ہی ان میں ربط تھا۔

وہ قطعی اس شخص کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتی تھی، مگر پھر بھی اس کے متعلق سوچیں آکر اُسے پریشان کرتی تھیں (اور شاید گناہ گار بھی)

وہ خود کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ جو کچھ بھی ہے محض اس کے دماغ کا خلل ہے۔ اسے شدید نوعیت کی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کی سوچ خوامخواہ بھٹک گئی ہے۔ مزید یہ کہ اُسے شرم آنی چاہیے اپنے خیالات پر۔ اس شخص سے بھلا اس کا واسطہ ہی کیا ہے، کون سی وابستگی ہے؟

(دل سے دل کا واسطہ اور جذبات کی وابستگی، بھلا اس سے بڑا حوالہ اور اس سے زیادہ مضبوط تاویل اور کیا ہو سکتی ہے)

"لاحول ولا قوۃ" اُس نے سر جھٹک کر گویا سارے خیالات پرے جھٹکے۔ ہاتھ بڑھا کر نل پورا کھول دیا۔ شاید

پانی کا شور اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دے اور چھپا چھپ کپڑے دھونے لگی۔

"اس واشنگ مشین کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا۔" اُس نے لگے ہاتھوں واشنگ مشین کو بھی کوس ڈالا۔

اسی اثنا میں دروازے پر گھنٹی کی آواز آئی۔

"شکر ہے اماں بی آگئیں۔" اُس نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے سوچا۔

کپڑوں سے بھری بالٹی اُٹھا کر ایک طرف رکھی۔ نل کے نیچے ہاتھ دھوئے، دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

اپنے ذہن اور سوچوں میں جس کی موجودگی سے وہ مسلسل انکاری تھی، اُسی کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر وہ بُری طرح نروس ہو گئی کہ مارے بوکھلاہٹ کے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔

باہر کھڑا نہال آنکھیں پھاڑے، مُنہ کھولے ہونقوں کی طرح بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔ لمحہ بھر کو اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مُنہ بند کرکے اُس نے ایک بار پھر گھنٹی کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازہ کُھل گیا۔

"سوری! میں ڈر گئی تھی" وہ خاصی بدحواس نظر آ رہی تھی۔

"کیا میری صورت بہت خوفناک ہے؟" اُس نے جُھک کر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں تو" وہ گھبراہٹ پر قابو پانے کی سعی میں مصروف تھی۔

"پھر بہت اچھی ہے؟" وہ اُس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"جی!" اُس کو تو غش آ گیا۔ پلکوں کی چلمن کی اوٹ سے اُسے دیکھا۔

نہال کا دل اُس کے چہرے پر آ گیا۔ اُس کی لَو دیتی ہوئی آنکھوں کی پتلیوں میں رانیہ کو اپنا عکس اتنا واضح نظر آیا کہ اُس کے ذہن پر چھائی ہوئی کُہر ایک دم ہی چھٹ گئی۔ لمحے بھر میں وہ آگہی کے سارے مرحلے طے کر گئی۔ چشم زدن میں ہر بات روز روشن کی طرح اس پر واضح ہو گئی۔

خیالات کو عنوان مل گیا تھا، ان کی توجیہہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی اور ان میں ربط بھی قائم ہو گیا تھا۔ اُس کا دل صرف "اوہ" کر کے رہ گیا۔ ردِ عمل کے طور پر نہ جانے کیوں اُس کے اندر غصّے اور طیش کی لہر دوڑ گئی۔

"اماں بی تو گھر پر نہیں ہیں" وہ خاصے خشک اور کھُردرے سے لہجے میں بولی۔

(آپ تو ہیں)

"تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں یہاں سے دفعان ہو جاؤں؟" وہ اُلٹا دروازے میں پھیل کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔"

"بھئی کوئی گھر میں موجود ہو اور یہ کہہ دے کہ فلاں تو گھر میں نہیں ہے، اس کا صاف مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ چلو بھئی چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

رانیہ نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، بس گھور کر رہ گئی۔

"آپ سے مجھے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ مجھے اندر آنے کے لیے کہیے۔" اُس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت کے رنگ تھے۔

رانیہ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئی، بس نہیں چل رہا تھا کہ "خدا حافظ" کے بجائے "دفع ہو جائیے" کہہ کر دروازے سے چلتا کر دیتی۔

"آئیے" اُس نے قہراً و جبراً راستہ چھوڑا۔

وہ اندر چلا آیا۔

"مجھے زوبار یہ سے پتا چلا تھا کہ اماں بی کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا ان کی خیریت ہی دریافت کرتا چلوں۔ کیا ہوا انہیں؟"

"اُن کو انجائنا کی تکلیف ہے، دل میں درد سا اٹھا تھا، اب بہتر ہیں پہلے سے۔ اپنے بھانجے کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں گئی ہیں۔" وہ خاصے نپے تلے لہجے میں بول رہی تھی۔

"ہوں" نہال نے سر ہلاتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

کچھ لمحے بغیر سوال جواب کے گزر گئے۔ رانیہ کو اس خاموشی سے اُلجھن سی ہوئی۔

"چائے پئیں گے آپ؟" اُس نے یہ کہہ کر خاموشی سے بھی نجات حاصل کی اور طوعاً و کرہاً اخلاقیات بھی نبھائی۔

"صرف چائے سے ہمارا گزارا نہیں ہوتا" وہ دیوار پر لگی سینری پر نگاہ جمائے اطمینان سے بولا۔

"البتہ چاہت کے ساتھ ملے تو پی لیتے ہیں" وہ یکایک اُس کی جانب گھوم گیا۔

رانیہ کی ریڑھ کی ہڈی کو تو سردی چڑھ گئی۔

"کافی چلے گی؟" اُس نے بظاہر سُنی اَن سُنی کر دی۔

"ناکافی رہے گی" اُس کی ڈھٹائی کی بھی انتہا تھی۔

"زہر لا دوں؟" وہ رہ نہ سکی۔ دانت پیستے ہوئے بولی۔

وہ ہنس پڑا۔ "میں بصد شوق پی لوں گا۔"

"آپ یہاں بیٹھ کر اماں بی کا انتظار کریں، بس آتی ہی ہوں گی۔" وہ رُکھائی سے بولی۔

"کیا مطلب؟ آپ مجھے کمپنی نہیں دیں گی؟" نہال نے حیرت سے پوچھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"جی نہیں، میں مصروف ہوں کام میں۔"

"آپ کو پتا ہے یہ بد اخلاقی کی انتہا ہے۔"

"مجھے بد اخلاق کہنے کا شکریہ۔" وہ جل گئی۔

باہر نکلنے کو مڑنے ہی لگی تھی کہ وہ بول پڑا

"اتنا تو بتاتی جائیے کہ کتنا انتظار کروں۔" اُس کی گمبھیر آواز، کسی انوکھی جذبے سے مہکتا لہجہ، معنی خیز الفاظ تھے۔

رانیہ نے چونک کر پلکیں اُٹھائیں۔ اُس لمحے اُس کی آنکھیں کچھ اور بھی حسین ہو گئیں۔

نہال گہرائی میں اتر گیا۔

"میں نے آپ سے کہا ہے کہ اماں بی بس آتی ہی ہوں گی۔" وہ سخت لہجے میں کہتی ہوئی تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گئی اور باہر نکلتے ہی دل ہی دل میں چار صلواتیں اُس کو سنائیں۔

نہال دھم سے صوفے میں دھنس گیا اور میز پر سے میگزین اُٹھا کر بے دلی سے اُس کے صفحے اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔ حد ہو گئی۔ بد اخلاق، بد تہذیب کہیں کی۔ مروت سے عاری نہ ہو تو اور ساتھ میں تمیز سے بھی محروم۔ ذرا دو منٹ میرے پاس بیٹھ نہیں سکتی تھی، کھا تو نہ جاتا میں اُس کو۔ ذرا دیر بیٹھ کر بات نہیں کر سکتی تھی۔ موضوعات کی کیا کمی تھی بھلا۔ ملک کی سیاسی صورتِ حال پر بات کر لیتی، سیلاب کی تباہ کاریوں پر دو آنسو بہا لیتی، بڑھتی ہوئی مہنگائی کا رونا رو لیتی، ماحول کی آلودگی کم کرنے کے مشوروں پر غور کرتی اوزون کی سطح کے سوراخ کو سینے کا سوچتی، گرتا ہوا تعلیمی معیار، آئے دن بجلی کا بحران، پھل سبزیوں کے تازہ بھاؤ، ٹرینوں کی آمد و رفت کا ٹائم، نیلی کی آنکھیں، ریما کا رنگ، سلمیٰ آغا کی ادائیں، کتنے تو موضوعات تھے۔ ہونہہ! چلتی بنی خود منہ اُٹھا کے اور مجھے یہاں بٹھا کے۔ اُس نے ڈرائنگ روم کا پردہ ذرا سا سرکا کر دیکھا۔ رانیہ اُسے بالکل سامنے نظر آئی۔ باتھ روم میں لکڑی کی چوکی پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ پشت البتہ نہال کی جانب تھی۔ اُس کے لمبے سیاہ بالوں کی خوشنما سی چوٹی زمین پر پڑی تھی اور گیلی ہو رہی تھی۔

نہال بے خودی میں تکے چلا گیا۔ اُس کا بے ساختہ جی چاہا کہ زمین پر گیلی ہوتی اُس کی چوٹی اٹھا کر اُس کی گود میں ڈال دے۔

عین اُسی وقت رانیہ کو اپنی پشت پر نظروں کی چبھن سی محسوس ہوئی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔

"آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟" وہ تنک کر رہ گئی۔

"میں مدد کر دوں آپ کی؟" وہ اپنی چوری پکڑے جانے پر خجل سا ہو رہا تھا۔ اُس کے منہ سے بغیر سوچے سمجھے نکل گیا۔

"کپڑے دھونے میں؟" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

"اپنا منہ دھو لیجیے وہی کافی رہے گا۔"

"آپ اچھی خاصی ہری مرچ کی صفات کی حامل خاتون ہیں، جس کے پلّے پڑیں گی، سی سی کرتا رہے گا، سر پکڑ کر رو دے گا۔" وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے ایک ٹانگ پیچھے دیوار پر ٹکا کر ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔

"سر پکڑ کر روئے یا پیر پکڑ کر، سی سی کرے یا ہی ہی، آپ کو کیا تکلیف ہے؟" وہ سلگ کر بولی۔

(وہ سی سی یا ہی ہی میں ہی تو کروں گا)

"بس دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر میرے دل کو تکلیف ہو جاتی ہے۔" وہ مسمسی شکل بنا کر بولا۔

"اپنے دل کا علاج کرائیے جا کر۔" اُس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

نہال اُس کی بات پر مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"اماں بی کب تک آئیں گی؟" اُس نے گھڑی دیکھی۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ بے رخی سے کہتی ہوئی دُھلے ہوئے کپڑوں کی بالٹی اُٹھا کر باہر آ گئی۔

"ناراض ہو گئی ہیں؟" وہ اپنائیت سے بولا۔

اُس کے چہرے پر تو خفگی کا تاثر بھی بڑا پیارا تھا۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے، اور میرے اور آپ کے درمیان کون سا ایسا رشتہ ہے کہ ناراض ہونے اور منانے والا گیم کھیلنے بیٹھ جاؤں۔ آخر آپ مجھ سے اس قدر فری کیوں ہو رہے ہیں؟" وہ درشت لہجے میں بولی اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی گیلری میں غائب ہو گئی۔

"خدا جانے گیلری میں جا کر سو گئی ہے کہ بے ہوش ہو گئی ہے۔" نہال وہیں کھڑا گیلری کے دروازے کی سمت دیکھتا رہا۔ اللہ اللہ کر کے وہ برآمد ہوئی۔

"میں چلتا ہوں اب، کافی دیر ہو گئی ہے۔"

(یہ دیر ہو جانے کا خیال بھی کس قدر دیر میں آیا ہے) وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

نہال نے باہر کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ دروازے نے باہر کسی کی موجودگی کی اطلاع گھنٹی کی صورت میں دی۔

رانیہ نے بڑھ کر کھول دیا۔

"اتنی دیر لگا دی آپ نے؟" وہ اماں بی کو دیکھتے ہی بولی۔

"کلینک پر رش بہت تھا۔" وہ کہتے کہتے اندر آ گئیں تو نہال پر نگاہ پڑ گئی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" نہال نے دُعا سلام کے بعد پوچھا۔

"ارے بیٹے بس سانس چل ہی رہا ہے۔ رانیہ مجھے پانی پلا دو۔" وہ پہلے نہال سے اور پھر رانیہ سے بولیں۔

وہ جا کر پانی لے آئی۔

"تم نے نہال کو چائے کا بھی پوچھا؟" وہ خالی گلاس اُسے دیتے ہوئے بولیں۔

"زہر کی آفر کی تھی۔" وہ اتنا آہستہ سے بولا کہ صرف وہی سن سکے۔

اُس نے قہر آلود نظروں سے نہال کو دیکھا اور پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

"یہ اچانک کیا ہو گیا آپ کو؟" وہ اُن کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"دل کی تکلیف تو برسوں سے ہے۔ ایک تو بڑھاپا اور اس پر یہ بیماری۔ نہ جانے کب زندگی کی شام ہو جائے۔ مجھے اپنی تو کوئی پریشانی نہیں، مرنا تو ایک دن ہے ہی، بس رانیہ کی مجھے بڑی فکر ہے۔"

(لو بھلا اس جنگلی بلی کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہونہہ! دیکھ تو مجھے ایسے رہی تھی، جیسے ہضم کر کے ہی دم لے گی، ببر شیر کی نانی)

"میرے بھائی میری زندگی میں تو پھر بھی پوچھ لیتے ہیں، مرنے کے بعد تو پتا نہیں کوئی آ کے جھانکے یا نہ جھانکے سب جانتے ہیں یہ میری بیٹی نہیں ہے۔" وہ روانی میں کہہ گئیں۔

"جی۔۔۔!" نہال پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ اس انکشاف پر ششدر رہ گیا۔

اب جب بات منہ سے نکل ہی گئی تھی تو چھپانے کا کیا فائدہ تھا۔ اماں بی افسردگی سے مسکرائیں۔ "ہاں رانیہ میری بیٹی نہیں ہے، مگر خدا گواہ ہے کہ اگر اس کی جگہ میری سگی بچی بھی ہوتی تو میری ممتا میں کوئی فرق نہ ہوتا۔"

"پھر اُس کے والدین کون ہیں؟" وہ خواب کی سی کیفیت میں بولا۔

"شریف اور بھلے مانس لوگ ہی تھے۔"

"آپ کو کہاں مل گئیں رانیہ؟"

"مجھے تو کل ہی کی بات لگتی ہے مگر رانیہ کا وجود احساس دلاتا ہے کہ اس بات کو برسوں گزر چکے ہیں۔" وہ ماضی میں کھو گئیں۔

○ ● ◆

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ٹرین لاہور اسٹیشن پر آکر رک گئی۔ اس کے رکتے ہی پلیٹ فارم گویا زندہ ہوگیا۔ خوانچے لگانے والوں کی آوازیں، قلیوں کی بھاگ دوڑ، مسافروں کی افراتفری، کچھ لوگوں کو ٹرین میں چڑھنے کی جلدی، کچھ کو ٹرین سے اترنے کی جلدی، غرض کہ ایک حشر تھا، جو نشر ہو رہا تھا۔

نادرہ کھڑکی سے باہر تماشا دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد لاؤڈ اسپیکر پر ٹرین کی روانگی کا اعلان ہوا۔ اسی اثنا ایک خوبرو مرد نے کھڑکی سے اندر جھانکا اور پلٹ کر بولا۔

"آؤ زرتاج جلدی کرو، یہی کمپارٹمنٹ ہے۔"

فوراً ہی عورت کا چہرا نمودار ہوا۔

"بہن سنیے ذرا میری بچی کو تو پکڑیے گا۔" اس نے ملتجی لہجے میں نادرہ کو مخاطب کیا۔

نادرہ نے لپک کر چادر میں لپٹی ننھی منی سی بچی کو تھام لیا۔ عورت جلدی سے ڈبے میں چڑھ گئی۔ مرد سوٹ کیس لا کر برتھ کے نیچے رکھا۔

"ذرا جلدی کیجیے گاڑی چلنے ہی والی ہے۔" عورت نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔

"بھائی جان! آپ کی سیٹ مل گئی ہے، جلدی کریں۔" ایک نو عمر لڑکا اور ڈبے میں چڑھ گیا۔

سگنل گرین ہو چکا تھا۔ ٹرین کا ہارن شور مچانے لگا۔

مرد جلدی سے اتر گیا۔ عورت نے کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھا۔ اس کا شوہر دوسرے ڈبے میں سوار تھا۔ اس نے وہیں سے ہاتھ ہلا دیا۔ عورت نے مطمئن ہو کر سر اندر کر لیا۔

"اچھا بھابی! خدا حافظ۔" لڑکا ٹرین کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"خدا حافظ۔" عورت نے لڑکے سے ہاتھ ملایا۔

ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔ وہ لڑکا پیچھے رہ گیا۔

"اوہ بہن! معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو زحمت دی۔" اس نے معذرتی انداز میں کہا۔

"کیسی بات کر رہی ہیں، بھلا بچے کو گود میں لینا بھی کبھی تکلیف کا باعث بنا ہے؟" نادرہ نے بچی کو ماں کی گود میں دے دیا۔

"ایک ہی بچی ہے آپ کی؟"

"جی ہاں، آپ کے کتنے بچے ہیں؟" وہ مسکرا کر بولی۔

"میری شادی کو آٹھ سال ہو چکے ہیں مگر اولاد نہیں ہوئی۔" وہ کسی قدر سوگواری سے بولی۔

"اوہ! اللہ سے ناامید نہ ہوں، کبھی تو اس کو رحم آ ہی جائے گا۔ آپ یوں کریں جب تک میری ہمسفر ہیں میری بچی کو اپنے پاس رکھ لیں۔"

اس لمحے نادرہ کی مامتا کی پیاس اور بھی بڑھ گئی۔ اس نے بے اختیار بچی کو گود میں لے لیا اور پُر شوق نگاہوں سے اس گلابی، گلابی، گول مٹول سی بچی کو دیکھا۔

"کیا نام ہے بچی کا؟"

"رانیہ!"

"ماشاء اللہ نام تو بہت پیارا ہے۔"

"اور مجھے زرتاج کہتے ہیں۔"

"ہاں ابھی کچھ دیر قبل آپ کے شوہر نے آپ کا نام لے کر پکارا تو تھا۔" وہ شوخی سے بولی

زرتاج کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اور آپ؟"

"میں نادرہ ہوں۔ اپنے بھائی کے گھر پنڈی گئی ہوئی تھی، اب واپس کراچی جا رہی ہوں۔"

"میں بھی کراچی ہی میں رہتی ہوں۔ دراصل یہاں لاہور میں میرے شوہر کی کزن کی شادی تھی۔ اچانک اطلاع ملی کہ میری ساس کی طبیعت خراب ہے، بس افراتفری میں روانہ ہوئے، جہاز میں تو سیٹیں ملی نہیں۔ ٹرین بھی بڑی مشکل سے ملی ہیں۔"

دونوں ذرا سی دیر میں خوب بے تکلف ہو گئیں۔ خاندانی سیاست، رشتوں کا جوڑ توڑ، سسرالی مسائل، گھریلو الجھنیں، شوہر سے معرکے، غرض ہر موضوع پر دل کھول کر اظہارِ خیال ہو رہا تھا۔ کبھی کسی خاندانی معاملے میں اپنے بے وقوفانہ عمل دخل پر ماتم ہوتا تو کبھی کسی دانش مندانہ قدم پر فخر، قیمتی مشوروں سے ایک دوسرے کو خوب نوازا جا رہا تھا اور مستقبل میں ایک دوسرے کے تجربوں کی روشنی میں آئندہ کے لائحہ عمل ترتیب دیے جا رہے تھے۔

اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو زرتاج کا شوہر آ گیا۔

"محمود! ذرا مجھے سموسے لا دیجیے۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔" زرتاج نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر کہا۔

"زرتاج! تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا کہ تم کو بھوک لگ رہی ہے؟" نادرہ فوراً بیچ میں بول پڑی۔ "میری بھتیجی جیسی خود چٹوری ہے، ویسا ہی سب کچھ سمجھتی ہے۔ اس نے تو نہ جانے کیا کچھ میرے ٹفن میں رکھ دیا ہے۔"

"ارے نہیں بہن! آپ رہنے دیں۔" زرتاج نے منع کیا۔

"تکلف برت رہی ہو؟" نادرہ خفا سی ہو گئی۔

"اچھا لائیے آپ ہی کھلائیے۔" وہ مسکرا دی۔

نادرہ نے ٹفن میں سے کباب نکالے، زرتاج کو بھی دیے اور اس کے شوہر کی جانب بھی بڑھائے۔

"بھائی صاحب! آپ بھی لیجیے۔"

"شکریہ!" محمود نے بغیر کسی پس و پیش کے لے لیے۔

وہ کچھ دیر بعد اپنے ڈبے میں واپس چلا گیا۔

شام کا دھندلکا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ڈبے میں خاموشی تھی۔ ٹرین پوری رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ زرتاج، نادرہ کے قریب بیٹھی اسے اپنے فوٹو دکھا رہی تھی کہ اچانک نادرہ کی گود میں پڑے چند فوٹو ہوا کے زور سے اڑ کر ادھر ادھر بکھر گئے۔

"افوہ!" نادرہ نے جھک کر فوٹو اکٹھے کیے۔

"لاؤ ادھر رکھ دیتی ہوں۔" زرتاج نے گود میں لیٹی بچی کی چادر کے اندر اڑس دیے۔

"یہ کون ہے؟" نادرہ نے ایک فوٹو پر انگلی رکھ کر پوچھا۔

"یہ میری چھوٹی نند ہے۔ یہ اس کے برابر میں میرے شوہر کھڑے ہیں، یہ میں ہوں، یہ میری بڑی نند اور یہ" اور بس ــــــ!

پھر کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ کیا ہو گیا۔ نادرہ اپنی جگہ سے اچھل کر سامنے کی برتھ سے جا ٹکرائی۔ زرتاج اپنی سیٹ سے نیچے آ گری۔ اوپر کی برتھ پر رکھا ہوا سوٹ کیس نادرہ کے بازو پر آ کر گرا۔ اس کے منہ سے بے حد دردناک چیخ نکل گئی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک کیا ہو گیا۔ گھپ اندھیرا، چیخ و پکار، شور ہنگامہ، رونے کی آوازیں، معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت ہی آ گئی ہے۔

ٹرین کو بڑا خوفناک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ نادرہ کچھ لمحوں کے لیے حواس ہی کھو بیٹھی۔ بڑی دیر میں جا کر اوسان بحال ہوئے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس سے ہلا نہیں گیا۔ اس نے بمشکل تمام اپنے اوپر پڑی بے ہوش عورت کو ہٹایا، پھر بازو پر سے سوٹ کیس سرکایا۔ بڑی مشکلوں سے وہ خود کو گھسیٹتی ہوئی دروازے تک لائی۔ ابھی نیچے اترنے ہی لگی تھی کہ رونے کی باریک سی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ جلدی سے پلٹ کر دوبارہ آئی۔ زرتاج کئی عورتوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ خون میں نہائی ہوئی شاید زندہ نہ رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی بچی کو سختی کے ساتھ خود سے چمٹا رکھا تھا۔ مر گئی بے چاری۔ اس دکھ کے بے اختیار نادرہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ گئے۔ اس نے بڑھ کر بچی کو زرتاج سے الگ کر کے اپنی چادر میں چھپا لیا۔ ابھی مڑی ہی تھی کہ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔ کیا پتا اس کا باپ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

زندہ ہو۔ وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔

اور کیا خبر کہ مر چکا ہو، پھر نہ جانے یہ کن لوگوں کے ہتھے چڑھے، کنول کا پھول کس کیچڑ میں جا گرے، وہ گومگو کیفیت میں مبتلا تھی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ بچّی کو وہیں چھوڑ دے یا ساتھ لے لے۔ پھر کچھ فیصلہ کرکے وہ بچّی کو ساتھ لے کر ڈبے سے نیچے اُتر گئی۔

"بس نہال جب میں گھر پہنچی تو اس وقت تک رانیہ میری بیٹی بن چکی تھی۔ میں نے اپنے شوہر سے صاف کہہ دیا کہ اسے میں ہی پالوں گی۔ میرے شوہر اس بات پر راضی نہ تھے، مگر رفتہ رفتہ اُس کی پیاری صورت اُن کے دل میں گھر کر گئی اور وہ اُسے مجھ سے زیادہ چاہنے لگے۔"

"آپ نے اُن کے گھر والوں کا پتا لگانے کی کوشش نہیں کی؟" نہال نے بے تابی سے پوچھا۔

"کی تھی، مگر بہت زیادہ نہیں۔ اتفاق ہی تھا کہ زرتاج جو تصویریں مجھے دکھا کر بچّی کی چادر کے اندر لگا رہی تھی۔ ان میں سے دو تصویریں اُس کی چادر ہی میں رہ گئیں۔ ہم نے تلاش کرنا چاہا تھا، مگر کافی عرصے تک کچھ پتا نہ چلا۔ سچ پوچھو تو اتنے دن بچّی کو اپنے پاس رکھنے کے بعد میرا دل اُس سے جدا ہونے کو تیار نہ تھا۔ پھر میرے شوہر کا تبادلہ مختلف شہروں میں ہوتا رہا اور ہم نگر نگر گھومتے رہے۔ یوں وہ حادثہ قصۂ پارینہ بن گیا اور رانیہ ہماری اپنی بچّی ــــــ!" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔

ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ دائیں طرف جھکیں اور میز کی دراز میں سے ایک ڈائری نکال کر اس کے کور کے اندر رکھی دو تصویریں نکالیں۔

"یہ دیکھو۔" انہوں نے تصویریں اُس کی جانب بڑھائیں۔

نہال نے تصویریں اُن کے ہاتھ سے لے لیں۔ گروپ فوٹو بلیک اینڈ وائٹ تھا اور خاصا پرانا بھی۔

"یہ رانیہ کی امّی کی تصویر ہے۔" انہوں نے انگلی رکھ کر بتایا۔

نہال نے بغور دیکھا۔ سادہ اور باوقار سی عورت کے چہرے پر مدّھم سی مسکراہٹ تھی۔

"رانیہ جانتی ہیں کہ آپ ان کی والدہ نہیں ہیں؟" اُس نے تصویریں واپس کر دیں۔

"ہاں جانتی ہے۔ میں نے اُسے بڑا پیار دیا ہے۔ اپنی ذات پر اعتماد کرنا سکھایا ہے، انسانوں پر اعتبار کرنا سکھایا ہے اور اس اعتبار کی بنیاد اس جملے پر رکھی کہ میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں پیدا نہیں کیا مگر تمہاری پرورش ماں بن کر ہی کی ہے۔ اب تم خود سوچو بیٹا کہ اگر میں مر جاتی ہوں تو میرے بعد اس کا کون ہوگا؟ یہ کہاں جائے گی۔ یہ دُکھ تو میری ہر پریشانی سے سوا ہے۔" اُن کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"جانے کیوں میں نے یہ سب کچھ تم سے کہہ دیا، ورنہ میں تو کسی سے بھی کچھ نہیں کہتی، بس اپنے اللہ کے آگے دل کھول کر رکھ دیتی ہوں۔ اپنا دُکھ درد اپنے معبود سے کہنے کے بعد دل بڑا ہلکا ہو جاتا ہے۔" وہ بے حد ملول سی دکھائی دے رہی تھیں۔

نہال بند مٹھی پر رخسار ٹکائے، سر جھکائے، چپ چاپ قالین کے پھولوں کو تکتا رہا۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں رانیہ اندر ہونے والی گفتگو سے قطعی لاعلم تنی تنی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ نہال کو کچّا چبا جانے اور اس کا خون پی جانے جیسے خوفناک، جارحانہ مگر مصمم ارادوں کو بمشکل قابو میں کرتے ہوئے صرف کینہ توز نظروں سے گھورنے پر اکتفا کرکے اُس نے چائے نہال کو یوں تھمائی کہ بس صرف یہ کہنے کی کسر رہ گئی کہ۔۔

"لو مرو۔"

پر نہال نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ ابھی تک غیر یقینی کیفیت سے دوچار تھا۔ اُس کا ذہن اس نئی صورتِ حال کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

○ ● ◆

معاذ نہا دھو کر تولیے سے سر رگڑتا ہوا باہر نکلا۔ گیلے بال خشک کرکے اُس نے تولیہ بستر کی جانب اُچھال دیا۔

برش اُٹھانے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ چونک گیا۔ میز پر موتیے کے پھولوں کے چھوٹے سے ڈھیر پر سُرخ گلاب کا تر و تازہ سا پھول رکھا تھا۔ اُس نے گلاب کا پھول اُٹھا لیا۔ موتیے کے پھولوں کے نیچے گلابی رنگ کا کارڈ بھی جھانکتا نظر آیا۔

معاذ نے حیران ہو کر کارڈ اُٹھایا۔ ہلکے گلابی رنگ کے کارڈ پر چھوٹے چھوٹے سُرخ پھول بنے تھے۔

اور اُوپر سُرخ رنگ میں "لَو آر دی وَن آئی لو" لکھا تھا۔

اُس نے کھولا، جویریہ کی طرف سے برتھ ڈے کارڈ تھا۔

اوہ! آج آٹھ مئی تھی، اُس کی سالگرہ کا دن۔ اُس کے ذہن ہی میں نہیں تھا۔ موتیوں جیسے لفظوں پر سے اس کی نگاہیں پھسلنے لگیں۔

میرے ہمسفر تیری نذر ہیں میرے جذبۂ دل کی شدّتیں
میرے خواب میری بصارتیں، میری دھڑکنیں، میری چاہتیں

جو تیرے قدم میرے گھر چلیں، میرے ساتھ شمس و قمر چلیں
تیری قربتوں میں سمیٹ لوں راہِ زندگی کی مسافتیں

یہ ردائے جاں تجھے سونپ دوں کہ نہ دھوپ تجھ کو کڑی لگے
کہیں دُکھ نہ تجھ کو عطا کریں سرِ دشتِ غم کی تمازتیں

تیرے نام سے میری صبح ہو، تیری یاد میں میری شام ہو
تیرے روبرو رہیں سرخرو میرے چشم و دل کی عبادتیں

تیرا پیار میری دُعا رہے، یہی فکر مجھ کو سدا رہے
کہ لہراتا رہے تیرا نخلِ جاں کہ نصیب ہوں تجھے راحتیں

میرے روز و شب کے نصاب میں میرے پاس اپنا تو کچھ نہیں
تیرا قرض ہے میری زندگی، میری سانسیں تیری امانتیں

"ہائے!" اُسے نشہ سا آ گیا۔ اُس کے دل میں جویریہ کے لیے محبتوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ خوشی سے معمور احساس لیے وہ کچن میں چلا آیا۔ جویریہ کی پشت اُس کی طرف تھی۔ اُس نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا۔

"تھینک یو!" موتیے کے پھولوں سے بھری مٹھی اُس کی ناک پر رکھتے ہوئے اُس نے سرگوشی کی۔ "آج سے پہلے معاذ کو کبھی کسی نے اتنے خوبصورت انداز میں وِش نہیں کیا۔ آپ کی جان لیوا ادائیں اور میرا کمزور سا دل، رحم کیجیے میرے حال پر۔" جویریہ مسکرا کر ذرا پرے ہٹ گئی۔

"میرے بس میں نہیں ہے، ورنہ درحقیقت آج کے دن کا اصل تحفہ تو میری عمر کے باقی دن ہوتے کاش میں آپ کے نام لکھ سکتی۔" اُس کی آواز بھیگنے لگی۔

"بس کرو جویریہ، بس کرو، تمہاری اتنی محبت تو مجھے جان سے مار ڈالے گی، مجھے جینے دو تم۔" وہ بے بس سا ہو کر بولا۔

"اچھا آئیے ناشتا کریں۔" وہ جلدی جلدی سب چیزیں میز پر رکھنے لگی۔

"تم آفس جاتے وقت مجھ سے اتنی محبت نہ جتایا کرو۔ میرا پہلے ہی آفس میں دل نہیں لگتا ہے، اگر تم ایسے کرو گی تو میں بالکل ہی گھر بیٹھ جاؤں گا۔" اس نے بچّوں جیسی معصومیت سے کہا۔ جویریہ بے ساختہ مسکرا دی۔ ناشتا کرکے وہ دروازے سے نکلنے ہی لگا تھا کہ پیچھے سے جویریہ بولی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"آج آفس سے جلدی گھر آجائیے گا۔"

"اگر آپ کہیں تو میں آج جاؤں ہی نہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"آجاؤں گا جلدی، تم دروازہ بند کرلو۔" یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

شام کو جویریہ بڑی بے تابی سے معاذ کی منتظر رہی۔ اُس کی کار کا ہارن سنتے ہی جھٹ دروازہ کھول دیا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ جلدی آجائیے گا، اتنی دیر لگادی۔" وہ ٹھنک کر بولی۔

سیاہ رنگ کی سنہری بارڈر والی ساڑھی میں اہتمام سے کیے گئے میک اپ میں وہ چمک رہی تھی۔ پشت پر لمبے کھلے بالوں کا آبشار بہہ رہا تھا۔

"سوری ڈیر! تھوڑا لیٹ ہوگیا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

"اب مزید دیر نہ لگائیے، جلدی سے منہ ہاتھ دھوکر آجائیں آج چائے ہم اپنے کمرے میں پئیں گے۔"

"کیوں؟" اُس نے بھویں اُچکا کر پوچھا۔

"کیوں کا جواب بھی مل جائے گا۔"

معاذ اُس کے پیچھے اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا تو خوشبوؤں کے جھونکوں نے اُس کا استقبال کیا۔ کمرے کا نیم تاریک ماحول بڑا رومانوی سا ہورہا تھا۔ بیڈ پر گلابی رنگ کی جھالروں والی چادر بچھی تھی۔ جویریہ نے گلابی ریشمی پردے بھی ڈال دیے تھے۔ کونے میں میز پر کیک رکھا تھا، ساتھ ہی کچھ اور لوازمات بھی تھے۔ ایک طرف کینڈل اسٹینڈ میں موم بتیاں روشن ہوکر ماحول کو اور خوابناک بنائے دے رہی تھیں۔ موتیے کے پھولوں کی چھوٹی چھوٹی پتیوں سے بستر پر، ریک پر، میز پر، قالین، غرض یہاں سے وہاں تک یہی پر بھرے ٹوماٹی لُٹ رکھا تھا۔ پھولوں سے اٹھتی خوشبو کمرے اور دل دونوں کی فضا مہکائے دے رہی تھی۔

جویریہ کا تخیل بڑا رومانوی تھا۔ وہ خود بھی خوبصورت تھی اور زندگی میں رنگ بھرنا بھی جانتی تھی۔ وقت کے ہر لمحے میں قید اپنے حصے کی خوشی سے بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہونا اور یادگار بنانا اُسے آتا تھا۔

"جویریہ! یہ سب کیا ہے؟" وہ ابھی تک حیران تھا۔

"کمال ہے، صبح کی بات بھی یاد نہیں رہی۔ بابا آپ کی سالگرہ ہے۔ آج کے دن اللہ میاں نے آپ کو اس دنیا میں بھیجا تھا میرے لیے۔" اُس کے چہرے پر دھنک بکھر رہی تھی۔ ادائیں معاذ کے لیے بڑا والہانہ پن تھا۔

"جویریہ! ایک بات تو بتاؤ۔" اُس نے کندھوں سے تھام کر اُس کا رُخ اپنی جانب کیا۔

"کیا ساری عورتیں تمہاری جیسی ہوتی ہوں گی؟ اپنے شوہروں کو اتنا چاہتی ہوں گی؟"

"یقیناً!" وہ بڑے وثوق سے بولی۔

"نہیں، تمہارے جیسی تو شاید کہیں کوئی بھی نہ ہو۔ اتنا بے غرض، بے لوث چاہتی ہو، میرے آرام و سکون کے لیے ہر وقت کوشاں رہتی ہو۔ اتنا ادب و احترام کرتی ہو، میرے ناز نخرے، غصہ سہتی ہو، ناراض ہوجاؤں تو ایسے ایسے ظالمانہ طریقوں سے مناتی ہو کہ تمہارے علاوہ کہیں جائے پناہ نہیں ملتی۔ نہ ضد نہ کوئی فرمائش، نہ لڑائی جھگڑا، ہر صبح چاہت کا نیا انداز، ہر شب نثار ہونے کی نئی ادا، کیا ہو آخر تم؟"

"بڑی ادنیٰ سی ہستی۔ بہت چھوٹی سی۔" اُس نے انگلی اور انگوٹھے کے اشارے سے بتایا کہ کتنی چھوٹی سی۔ "آئیے کیک کاٹیں۔"

وہ اُس کا ہاتھ تھام کر میز تک لے آئی۔ معاذ نے کیک پر چھری پھیر دی۔ جویریہ نے میز کے نیچے رکھا گفٹ اُٹھایا اور اُس کی جانب بڑھایا۔

"سالگرہ مبارک ہو۔"

معاذ نے مسکراتے ہوئے خوبصورت ریپر میں لپٹا ہوا پیکٹ تھام لیا کھول کر دیکھا، میرون رنگ کا لیدر کا بنا ہوا آفس بیگ تھا جس کے کونے پر گولڈن رنگ سے اُس کا نام "معاذ احمد" لکھا تھا اور اس کے ساتھ پرفیوم کی بڑی سی شیشی بھی تھی۔

معاذ نے جویریہ پر ذرا سا اسپرے کیا اور گہرا سانس لے کر خوشبو اپنے اندر سمو کر بولا۔

"اچھی خوشبو ہے۔ سوئے ہوئے انسان اور سوئے ہوئے جذبات دونوں کو جگانے کے لیے کافی ہے۔" یہ کہہ کر ذرا سا جھکا۔

جویریہ بھڑکتی دھڑکنیں سنبھالتی تیزی سے پرے ہٹ گئی اور فہمائشی نظروں سے اُسے گھورنے لگی۔ معاذ بڑی مدہوشی سے ہنسا۔ کچھ دیر جذبے لٹاتی نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"جویریہ! اپنے بال کھلے نہ چھوڑا کرو۔" اُس نے ریشم کی ڈور ہاتھ پر لپیٹی۔

"کیوں؟" جویریہ کی آنکھیں سوال بن گئیں۔

"میرا "جوں" بن جانے کو دل چاہتا ہے۔" اُس نے بڑی مسکین شکل بنا کر کہا۔

"لاحول ولاقوۃ!" جویریہ سر پیٹ کر رہ گئی، جھٹکا مار کر بال چھڑائے۔

"کیک تو کٹوا لیا ہے کھلاؤ گی نہیں؟"

اُس نے بڑا سا پیس کاٹ کر معاذ کو دیا اور اپنے لیے بھی نکال کر برابر والی کرسی پر ٹک گئی۔

"تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟ تم مجھے زیادہ پیار کرتی ہو یا میں تمہیں زیادہ چاہتا ہوں؟" وہ اورنج جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"میں آپ سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔" وہ "میں" پر زور دیتے ہوئے بولی۔ پھر شریر نگاہوں سے اُس کی سمت دیکھا۔

"اور آپ حد سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔"

اُس کی ذہانت سے معاذ خاصا محظوظ ہوا۔

"معاذ!" وہ ٹیبل پر سے چیزیں سمیٹتے ہوئے بولی۔

"ہوں!" اُس نے سوالیہ نگاہیں اُس کے چہرے پر جمائیں۔

"مرد کو عورت کی کون سی ادا سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے؟"

"ارے جویریہ بیگم! یہ مرد ذات بڑی خود غرض ہوتی ہے، جو عورت اس کی خاطر اپنی ہستی کو مٹا دے، یہ اسی عورت کو قبول کرتا ہے حالانکہ بے وقوف کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جو عورت اپنی ذات کے دائرے سے باہر نکل کر اپنا وجود اس کے قدموں میں جھکا رہی ہے، وہی دراصل اس کے سر پر چڑھ رہی ہے۔ اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے لیے۔ مرد کو درحقیقت وہی عورت جیتتی ہے، جو اپنا آپ ہارنے کے واسطے میدان میں اُترتی ہے۔"

"میں نے جیت لیا ہے آپ کو؟" وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"بے موت مار دیا ہے۔" اُس نے تیزی سے اُٹھ کر اُس کے فرار کے سارے راستے بند کردیے۔

نہال اپنے آفس سے سیدھا طارق روڈ آگیا تھا۔ زیبا نے اپنے کچھ کپڑے درزی کو سلوانے کے لیے دیے تھے۔ اُس نے نہال کو فون کرکے کہہ دیا تھا کہ وہ اُس کے کپڑے لیتا آئے۔ اُس کو اپنے لیے بھی کچھ خریداری کرنی تھی۔ آج آفس میں بھی کچھ خاص کام نہ تھا۔ اُس نے سوچا شاپنگ ہی کرلے۔

وہ درزی کی دکان سے نکل کر باہر آیا۔ روڈ کراس کرکے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اُس پر نگاہ پڑ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ پیکٹس تھے۔ شاید وہ بھی شاپنگ کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ اُس نے کریم رنگ کی پھولدار چادر اوڑھ رکھی تھی۔ دھوپ کی تمازت سے اُس کا رنگ سنہری ہورہا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ غالباً کوئی رکشا تلاش کررہی تھی۔

نہال تیزی سے اُس کی جانب لپکا۔ "آپ یہاں؟"

رانیہ نے چہرا موڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"یہاں میرے آنے پر پابندی ہے کیا؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ اُس کو نہال کا یوں سرِ بازار مخاطب کرنا ناگوار گزرا تھا۔

"میں اپنے گھر جا رہا ہوں آئیے آپ کو ڈراپ کر دوں۔" اُس نے رانیہ کا لہجہ نظر انداز کر دیا۔

"شکریہ! میں خود جا سکتی ہوں۔"

"جب منزل ایک ہو تو سفر ساتھ کیوں نہ شروع کیا جائے؟" نہال کی آواز خود بخود آہستہ ہو گئی۔

رانیہ کے اندر سے انگاروں کے چٹخنے کی آواز آنے لگی۔ "ضروری نہیں کہ راستے مل جائیں تو منزل بھی ایک ہو جائے۔ آپ ازراہِ کرم مجھے تنگ نہ کیجیے۔"

بیٹے! تو بھی ڈھیٹ بن جا۔ دل نے نہال کو مشورہ دیا۔ نہال میاں وہیں جم گئے۔

"دیکھو لوگ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے ہیں، فوراً گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" اُس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

رانیہ نے سرسری سی نگاہ آس پاس ڈالی۔ لوگ واقعی معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اُس نے مجبوراً نہال کی طرف شناسا مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور اُس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بیٹھنے کے بعد اُس نے گاڑی کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کیا۔

"دیکھیے! یہ دروازہ بھی میرے دل کی طرح نازک ہے۔ آخر کیا کیا توڑیں گی آپ؟" اُس نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی شریفانہ طریقہ تو نہیں ہے۔" وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

"کیا؟" اُس نے صدمے کے مارے نڈھال ہونے کی ایکٹنگ کی۔

"آپ کو میری شرافت پر شک ہو رہا ہے۔ محترمہ! میں ضرورت سے زیادہ نیک، شریف اور باکردار انسان ہوں۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں، روز صبح تلاوت کرتا ہوں۔ آج تک کسی لڑکی کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ ایک کو دیکھا تھا اس کے بعد قسم لے لیں، جو آج تک کسی پر ترچھی نگاہ بھی ڈالی ہو۔"

"جوتے جو پڑ گئے ہوں گے۔" رانیہ تڑخ سے بولی۔

"نہیں، نظر پلٹ کر واپس ہی نہیں آئی۔" اُس نے رانیہ کی سمت دیکھا پھر ہولے سے بولا۔

"اُس پر قربان ہو گئی۔" اُس نے تیزی سے بریک لگائے۔

رانیہ نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔ گاڑی مسٹر برگر کے سامنے کھڑی تھی۔

"ایک منٹ بیٹھو، میں ابھی آیا۔" اُس نے تیزی سے رانیہ کا شاپنگ بیگ اُٹھایا اور اس پر ایک شوخ نگاہ ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔

رانیہ اس کی حرکت پر کھول کر رہ گئی۔ وہ جب واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں برگر، فرنچ فرائیز اور سلش کے گلاس تھے۔

"یہ لو۔" اُس نے بے تکلفی سے کہا۔

"میں ہرگز نہیں کھاؤں گی۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

نہال نے بڑی غصیلی نگاہ اس پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے سلش کے دونوں گلاس باہر سڑک پر تھے۔ اُس نے اپنی گود میں رکھے برگر اور فرنچ فرائیز بھی باہر پھینکنا چاہے کہ رانیہ نے بوکھلا کر اُس کے ہاتھ پکڑ لیے اور پھر چھوڑ دیے۔

نہال نے ایک بار پھر برگر اُس کی جانب بڑھایا۔ رانیہ نے خاموشی سے لے لیا۔ وہ اپنا برگر کھانے لگا۔ رانیہ یونہی ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔

"اسے کھاتے بھی ہیں۔" نہال نے اشارہ کر کے کہا۔

رانیہ نے چبا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"برگر کھائیے، مجھے نہ کھائیے، یہ میں نے اسی لیے خریدا ہے تاکہ آپ مجھے نہ چبائیں۔"

رانیہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ کچھ دیر کار میں مکمل طور پر خاموشی رہی۔

"اچھی بھلی لڑاکا ہو۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ "خیر دیکھتے ہیں اس جنگ میں کون جیتتا ہے؟"

"میں کوئی جنگ نہیں لڑ رہی ہوں۔" وہ بپھر کر بولی۔ "میرا آپ سے قطعی کوئی واسطہ نہیں۔"

نہال نے اُس کی بات پر ذرا دھیان نہ دیا۔ "اس جنگ میں جو جیتے گا، وہی شکست خوردہ ہو گا اور جو ہارے گا وہی فاتح کہلائے گا۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ قطعیت سے بولی۔ "فاتح وہی ہو گا جو جیتے گا اور جو شکست کھائے گا اُسے پیچھے ہٹنا ہو گا۔"

"آئی نو دی آرٹ آف وننگ (میں جیتنے کا فن جانتا ہوں) میں تم کو جیت لوں گا، خواہ اس کے لیے مجھے اپنا آپ ہارنا پڑے۔" اُس نے بے حد کھلے الفاظ میں اپنے جذبات اور ارادے اس پر آشکار کر دیے۔ لہجہ بے شک گھمبیر تھا۔

"میں اتنی سستی نہیں ہوں۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

"مجھے مہنگی چیزیں ہی پسند ہیں۔" وہ بے نیازی سے گویا ہوا۔

"نہال صاحب! میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں۔" غم و غصے کے مارے اُس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ انجانے میں نہال نے اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اُس کے وقار، اس کے احساس کو مجروح کیا تھا۔ اُسے حد درجے اپنی توہین کا احساس ہوا۔

"میں بھی تمہیں خرید نہیں رہا ہوں اور بالفرض تمہارا دل خریدا بھی تو اپنی محبت کے سکوں کے عوض خریدوں گا۔"

رانیہ کا جی چاہا اُس کا منہ توڑ دے۔ اُس نے نہال کو اُوپر سے نیچے تک دیکھا۔

متناسب نقوش، کھلتی ہوئی گندمی رنگت پر سیاہ گھنی مونچھیں، سیاہ بال جو ہولے سے بار بار ماتھے پر آ رہے تھے۔ اُس کی ذہین آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی۔ دیکھتا وہ یوں تھا جیسے مقابل کو بولنے کا موقع نہیں دے گا۔ اس کی بولتی ہوئی نگاہیں دوسرے کی قوتِ گویائی کو سلب کر لیتی تھیں۔ اُس کا لہجہ متاثر کن تھا، جب وہ بولتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ جیسے آس پاس برف گر رہی ہو۔ اُس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر یوں جمے ہوئے تھے جیسے اسٹیئرنگ کو نہیں دنیا کو تھامے ہوئے ہوں۔ اُس نے آف وائٹ شلوار قمیص پہن رکھی تھی، پاؤں کالے رنگ کے جوتوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اُس کی شخصیت بڑی باوقار، بہت امپریسیو تھی۔

"کیسا لگا؟" نہال نے کھنکارتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" وہ بے خیالی میں پوچھ بیٹھی۔

"نہال آفریدی۔" ضبط کرنے کے باوجود اُس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ پھسل گئی۔

"ہونہہ!" وہ جل بھن کر خاک ہو گئی۔ اُس نے کھڑکی سے باہر منہ کر لیا۔ وہ اُس کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ اُس کا بس چلتا تو گاڑی سے اُتر جاتی۔ مجبوراً ضبط کیے بیٹھی رہی۔ اپنی تذلیل کے احساس سے اُس کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔

پھر باقی راستہ خاموشی سے کٹا۔ نہ نہال نے اُسے چھیڑا اور رانیہ کے بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی نہال کے دھیمے سُروں میں گنگنانے کی آواز سکوت توڑ دیتی۔

آپ برہم ہی سہی بات تو کر لیں ہم سے
کچھ نہ کہنے سے محبت کا گماں ہوتا ہے

رانیہ کا گھر آ گیا تو وہ جلدی سے گاڑی سے اُتر گئی۔

"رانیہ!" اُس نے بے حد سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ "میں آپ کو ہر اُس راستے پر کھڑا ملوں گا، جس پر آپ چلیں گی۔"

"اور میں وہ ہر راستہ کاٹ دوں گی جس پر آپ نظر آئیں گے۔" اُس کے لہجے سے نفرت ٹپک رہی تھی۔

"میرا ہر راستہ آپ کی منزل ٹھہرے گا اور میں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔" اُس کے لہجے کی کاٹ اور تلوار کی کاٹ میں زیادہ فرق نہ تھا۔ ایک جلتی نگاہ کا تیر اُس کی طرف چلا کر وہ گاڑی لے کر ہوا ہو گیا۔

رانیہ اُڑتی دھول دیکھتی رہ گئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں کہہ رہا ہوں تم کھڑے ہو جاؤ شرافت سے۔" عمر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

"عمر پلیز! تم مجھے کام کرنے دو۔ مجھے آج ہی یہ لیٹرز ڈسپیچ کرانے ہیں۔" نہال کی انگلیاں تیزی سے ٹائپ پر حرکت کر رہی تھیں۔

"تمہاری ریسپشنسٹ کہاں چلی گئی؟" عمر بدستور اُس کے سر پر لٹک رہا تھا۔

"وہ چھٹی پر ہے۔"

"اسی لیے تمہارے آفس میں کچھ رونق نہیں ہے۔"

"شرم کرو بے غیرت کہیں کے۔"

عمر ڈھٹائی سے ہنسا۔

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ کیوں تم میرے سر پر سوار ہو؟" نہال نے اُس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

"مجھے تمہاری گاڑی چاہیے۔"

"تمہاری کہاں ہے؟" وہ پوری طرح اپنے کام میں منہمک تھا۔

"مائی کار از آؤٹ آف آرڈر۔"

"انکل کی کہاں ہے؟ اُن کی لے جاؤ۔"

عمر جھنجھلا گیا۔ "جہنمی سوال پر سوال کیے جا رہا ہے۔ ڈیڈی کی کار اُن کے پاس ہے۔ بائیک برابر والوں کا لے گیا ہے، مجھے تانیہ کے ہاں جانا ہے۔ آج اُس کی برتھ ڈے ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"کمال ہے تمہاری بیوی کی سالگرہ ہے تم انجوائے کرو۔ مجھے خواہ مخواہ کیوں گھسیٹ رہے ہو۔" نہال نے لحظہ بھر رُک کر اُسے دیکھا اور پھر مصروف ہو گیا۔

"بھئی میں تو خالہ جان کے خیال سے کہہ رہا ہوں میرا مطلب ہے تانیہ کی امی کی وجہ سے، وہ کیا سوچیں گی کہ چلا آیا بیوی کی سالگرہ پر مبارکباد کا ٹوکرا اُٹھائے۔ اب تم ساتھ چلو گے تو میں کہہ دوں گا آفریدی، تانیہ سے ملنے آیا ہے۔" عمر اپنی جھنجلاہٹ ضبط کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"یہ بات ہے۔ اب تو میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔" نہال اینٹھ گیا۔

"قسم سے آفریدی! شرافت بالکل مفقود ہو گئی ہے تم میں۔ او ہو تم کھڑے کیوں نہیں ہوتے۔" وہ تہیہ کر آیا تھا کہ نہال کو لے کر اُٹھے گا، ورنہ مر کے اُٹھے گا۔

"عمر وہ سامنے کی بورڈ پر سے گاڑی کی چابی اُٹھاؤ اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

"نہیں چاہیے مجھے تمہاری گاڑی۔" عمر نے مُنہ پھلا لیا۔

نہال نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہ رُخ موڑے کھڑا تھا۔ وہ ہنس دیا۔ یہ دوستیاں اور محبتیں انسان کو بے بس کر دیتی ہیں۔

"چلو مرو نکلو باہر۔" اُس نے کاغذ فائل میں رکھتے ہوئے کہا۔ اپنی دراز مقفل کی اور کی بورڈ پر سے چابی اُٹھائی۔

"اب آؤ بھی۔" اُس نے مڑ کر عمر کو دیکھا جو کچھ فاتحانہ سی مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔

"جہنم میں جاؤ تم۔" نہال اُس کے انداز پر تلملا گیا۔ عمر ہنستا ہوا اُس کے پیچھے چل دیا۔

"تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تانیہ سے تمہارا نکاح کب اور کیسے ہوا؟" نہال گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"کوئی اتنا زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ کیسے ہوا؟ تو نہ پوچھو، اچھی بھلی دُکھ بھری داستان ہے۔ عین ممکن ہے کہ تمہارے آنسو نکل آئیں، مگر یار اس اسٹوری کا اختتام بڑا اچھا ہے۔ آخر میں سلائیڈ آتی ہے، جس پر لکھا ہے۔ لو از لائف اینڈ لو از فار ایور۔" ہانکنے میں تو عمر لاجواب تھا۔

"سچی بات ہے آفریدی کہ میں امریکہ سے واپس ہی نہیں آ رہا تھا۔ میرا وہاں دل لگ گیا تھا۔" عمر لہجے میں بولا۔

"کتنی جگہ دل لگایا تھا آپ نے؟" نہال نے اُسی کے انداز میں پوچھا۔

"زیادہ نہیں، یہی کوئی پندرہ بیس جگہ۔"

"فائنل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔" دونوں ہی بے پر کی اُڑا رہے تھے۔

"کیا بتاؤں یار! ہر مرتبہ سیمی فائنل میں ہار جاتا ہوں۔ ایک مرتبہ خوش قسمتی سے فائنل میں پہنچ ہی گیا مگر ڈیڈی نے بغیر اطلاع آ کر کام خراب کر دیا۔ ایک دن صبح ہی صبح بیل بجنے پر میں نے دروازہ کھولا تو قبلہ والد صاحب بمعہ اپنے جاہ و جلال کے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے دروازے میں ایستادہ تھے۔ میرا تو سانس ہی رک گیا، اس پر غضب یہ ہوا کہ ڈوروتھی اُسی وقت میرے گھر پہنچ گئی۔"

"یہ ڈوروتھی کون؟"

"اوہو! تمہاری ہونے والی بھاوج اور کون؟"

"کون سا نمبر تھا اُس کا؟"

"غالباً سولہویں تھی۔ وہی فائنل میں پہنچی تھی میرے ساتھ۔"

"باقی پندرہ کہاں گئیں؟"

"کچھ کو میں نے چلتا کر دیا، کچھ نے مجھے جھنڈی دکھا دی۔ خیر ڈیڈی کے سامنے ڈوروتھی کو دیکھ کر میری ایسی سٹی گم ہوئی کہ مارے بوکھلاہٹ کے میں نے اس کو سرے سے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔"

نہال اُس کی بات پر جو ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا۔

"بہرحال وہ غصے میں مجھ پر، میری دوستی اور میری سو فیصد ممکنہ محبت پر، اور آخر میں میز، صوفے اور دروازے پر لات مار کر چلتی بنی۔ دوسری طرف ڈیڈی مجھے کان سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے پاکستان لائے۔ یہاں آ کر مجھے پتا چلا کہ انہوں نے میری نسبت تانیہ سے طے کر دی ہے۔ مجھے سن کر بڑا غصہ آیا، کئی دن تک میں بھاپ اُڑاتا رہا۔ ڈیڈی بھی سخت طیش میں تھے۔ ہم دونوں میں بہت دنوں تک پھنکاریں مارنے کا مقابلہ ہوتا رہا۔ میں نے بڑی دھمکیاں دیں۔ پہلی تو بھوک ہڑتال کی دی۔ ڈیڈی نے فرمایا اچھا ہے نہیں کھائے گا تو گھر کا خرچہ ہی کم ہو گا۔ دوسری دھمکی اپنی مرضی کی دوسری شادی کی دی۔ وہ بھی کارگر نہ ہوئی، کیونکہ بقول ڈیڈی کے انسان کے پہلی شادی سے ہی چودہ کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ دوسری شادی کے لیے طبق بچتے ہی نہیں، ان کے روشن ہونے کا امکان ہو۔ تیسری دھمکی بالآخر خودکشی کرنے کی دی۔ ڈیڈی نے اطمینان سے کہلوا دیا کہ اس سے کہو کہ خودکشی کی زحمت نہ کرے، مجھے دوسرے جہان پہنچانے کا مبارک فریضہ وہ خود ہی انجام دے لیں گے۔ برخوردار کے پاس ریوالور رکھا ہے، اس کا کوئی تو مصرف ہو۔ ایک دن اتفاق سے نشاط نے مجھے تانیہ کا دیدار کرا دیا۔ بس یار میں نے ریشہ خطمی ہونے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ ڈیڈی تو منگنی کرنا چاہ رہے تھے، مگر میں اَڑ گیا کہ نکاح کروں گا۔ یوں ڈیڈی، چچا جان اور بڑے ماموں کو ساتھ لیا اور نکاح پڑھوا کر اُس کو اپنے قبضے میں لیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اب آج کل میں بحرِ عشق میں تانیہ کے نام کے موتی چنتا رہتا ہوں۔" عمر نے اپنی دُکھ بھری داستان جس کا اینڈ اچھا تھا اور جس کے آخر میں "لو از لائف اینڈ لو از فار ایور" کی سلائیڈ آتی تھی۔ بڑی تفصیل سے سنائی۔

"اگر تمہاری بکواس ختم ہو گئی ہو تو مجھے اپنے کوچۂ جاناں کا راستہ بھی بتا دو یا یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہوں؟"

عمر اُسے راستہ بتانے لگا۔ کچھ ہی دیر میں تانیہ کا گھر آ گیا۔ چوکیدار نے عمر کو دیکھتے ہی گیٹ وا کر دیا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

تانیہ اُن کو لان میں کھڑی مل گئی۔

"آداب عرض ہے بیگم عمر۔" عمر نے دور سے ہی ہانک لگائی۔

"آداب!" وہ قریب آ گئی۔

"سالگرہ مبارک ہو۔" نہال نے سلامتی کے تبادلے کے بعد اُس کو مبارکباد دی۔

"شکریہ!"

"ہیپی برتھ ڈے! اگر آج کے دن تم دُنیا میں نہ آئی ہوتیں تو میری زندگی کی شاہراہوں پر کتنا اندھیرا ہوتا۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وہ جذبات سے چور لہجے میں بولا۔
تانیہ، نہال کے سامنے جھینپ گئی۔
"ہیں، تمہارے طبق روشن تو ڈور ۔۔۔!" نہال کی بات منہ ہی میں رہ گئی عمر نے چپکے سے مگر سختی سے پیر اُس کے پیر پر رکھ دیا۔
"آپ تحفہ بھی لاتے ہیں یا ۔۔۔؟" تانیہ، عمر سے مخاطب ہوئی۔
"بھئی تحفہ کیسے بھول سکتا تھا۔ بڑی دیر سے جیب میں ٹٹول رہا تھا مگر مل ہی نہیں رہا ہے۔ اوہ ہاں! جناب یہ رہا آپ کا گفٹ۔" اُس نے تانیہ کا ہاتھ تھام کر ہاجمولا کینڈی اُس کے ہاتھ پر رکھ دی۔
"تانیہ! کون آیا ہے؟" ابھی وہ عمر کو خشمگیں نگاہوں سے گھور ہی رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔
"آئیے نہال بھائی! میں آپ کو امّی سے ملواؤں۔" وہ اُسے لے کر اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی امّی کھڑی تھیں۔
"امّی جان! یہ عمر کے دوست ہیں نہال، اور نہال بھائی! یہ میری امّی ہیں۔"
اور دروازے ہی میں اٹکے نہال کے کانوں سے تانیہ کی نہیں اماں بی کی آواز ٹکرا رہی تھی۔
"یہ رانیہ کی امّی کی تصویر ہے؟"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

اُس نے دُھندلاتی نگاہوں سے دیکھا۔ گرے پلین ساڑھی میں ملبوس وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی قریب آرہی تھیں۔
"السلام علیکم خالہ جان!"
عمر کی آواز نہال کے کانوں سے ٹکرائی تو اُسے احساس ہوا کہ اسے بھی سلام کرنا چاہیے۔ اس کے ساکن لب خود بخود کھل گئے۔ جانے کیا منہ سے نکلا۔
"میرے بیٹے کے دوست ہو تو جیسے میرے بیٹے ہی ہوئے" وہ اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
نہال کو اُن کی آواز بہت دور سے آرہی تھی۔ دفعتاً فون کی گھنٹی کی معمول سے زیادہ تیز آواز نے اُس پتھر وجود پر آبِ حیات چھڑکنے کا کام کیا اور پھر سے گوشت پوست کا ہو گیا۔
"اُفوہ! یہ فون کی گھنٹی ہے یا حضرت اسرافیل کا صور۔" تانیہ بڑبڑاتے ہوئے فون اُٹھانے چل دی۔
اس کی بڑبڑاہٹ سے نہال اُس کی سمت متوجہ ہو گیا۔
(تو یہ راز ہے دونوں کی مشابہت میں۔ دونوں بہنیں ہیں، نام بھی ملتا جلتا سا)
"تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو، اندر آجاؤ۔" وہ دونوں کو اندر لے آئیں۔
"بیٹھو!" انہوں نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔
"کیا کرتے ہو تم؟" خود بھی صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ نہال سے مخاطب ہوئیں۔
"جی میری ماربل کی مصنوعات بنانے کی فیکٹری ہے۔" اس نے مؤدب انداز میں جواب دیا۔
"کتنے بھائی بہن ہو؟"
"شاید ایک بھی نہیں اور شاید بہت سارے۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔
"دراصل میرا اپنا تو کوئی بھائی بہن نہیں ہے، البتہ ماموں زاد بہن بھائی ہیں، وہی میرا سب کچھ ہیں۔"
"اور تمہارے والدین؟"
"اُن کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ میری پرورش میرے ننھیال کی ہے۔"
"اچھا، اچھا۔" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"ہونہہ! خبیث نہ ہو تو۔" تانیہ جھنجلاتی، پاؤں پٹختی اندر داخل ہوئی۔
"کس کا فون تھا؟" اس کی امّی نے دریافت کیا۔
"خدا جانے کون تھا، بکواس کر رہا تھا۔" وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔
"کچھ کہہ بھی رہا تھا تم سے؟"

"مشورہ مانگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، مجھے نیند نہیں آرہی ہے کیا کروں؟ میں نے کہا آپ کے کمرے میں پنکھا ہے؟ اُس نے کہا، ہاں جی بالکل ہے۔ میں نے کہا ایک رسی کا پھندا بنا کر گلے میں ڈالیں اور پنکھے سے لٹک جائیں، ابدی نیند آجائے گی۔" وہ ہونٹ چباتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
عمر اور نہال دونوں ہنس پڑے۔
"میں نے تمہیں ہزار دفعہ منع کیا ہے کہ اس قسم کے فون آئیں تو ریسیور رکھ دیا کرو، آگے سے جواب نہ دیا کرو۔ بعض لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں۔" انہوں نے بیٹی کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔
"ہونہہ۔ خدا جانے ایسے لوگوں کو دوسروں کو تنگ کرنے میں کیا لطف آتا ہے۔" وہ ابھی تک بڑبڑا رہی تھی۔ "اور کل ایک فون اور آیا تھا۔ اس قدر بے تکلفی سے مجھ سے مخاطب ہوا جیسے میرے سگے تایا کا بیٹا ہو۔ پوچھ رہا ہے، کیا کر رہی ہو؟ میں نے کہا تمہارے قتل کا منصوبہ بنا رہا ہے، چھرا تیز کر رہی تھی، ابھی آرہی ہوں۔" وہ بھناتے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔
نہال کی مسکراہٹ قہقہے میں بدل گئی۔ تانیہ کی امّی نے بھی لب بھینچ کر مسکراہٹ روکی۔
"اچھا آؤ تم ان لوگوں کے پاس بیٹھو، میں چائے بنا لاؤں۔" وہ کہہ کر باہر چلی گئیں۔
"اور سنائیں نہال بھائی کیا حال چال ہیں؟" وہ اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
عمر نے ایک نظر کمرے کے دروازے سے باہر جہاں تک نظروں کی رسائی تھی، وہاں تک دیکھا۔ تانیہ کی امّی کی آس پاس غیر موجودگی کا اطمینان کر کے وہ جھٹ بولا۔
"نہال بھائی سے پہلے تم ہمارا حال پوچھو۔"
"آپ کو کیا ہوا، کون سی نئی تکلیف لاحق ہو گئی؟"
؏ "بے چین اس قدر تھا سویا نہ رات بھر"
عمر نے حتیٰ الامکان لہجے میں بے چینی سموتے ہوئے کہا۔
"کیوں؟" اُس نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔
؏ پلکوں سے لکھ رہا تھا تیرا نام چاند پر
"اُف خدایا! عمر انتہا ہو گئی۔ شرم اگر آپ کو چھو کر نہیں گزری تو آپ ہی شرم کو چھو لیا کریں جا کر۔" تانیہ نے سر کو جھٹکا دیا۔ عمر کے یہ کھلے انداز اگر اسے ناپسند نہیں تھے تو پسند بھی نہیں تھے۔
"بہرحال آج رات چاند نکلے تو غور سے دیکھنا "تانیہ عمر" لکھا نظر آئے گا۔" عمر باز آنے والوں میں سے نہیں تھا تانیہ چڑتی تھی، عمر کو لطف آتا تھا، سو اسی لیے وہ اُسے چھیڑتا رہتا تھا۔
"اور یہ تحفے ہاجمولا کینڈی ہی رہ گئی تھی لانے کے لیے؟" اُسے اچانک ہاجمولا کینڈی یاد آگئی، جو نہایت عقیدت واحترام سے اُس کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔
"بھئی میں تو سینے سے دل نکال کر پیش کرنا چاہتا تھا، مگر اس طرح میں آپ کا قبول کرنے کا انداز دیکھنے سے محروم رہ جاتا، سو ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس سے قبل نکاح کے موقع پر بھی مہر میں اپنا دل ہی لکھ رہا تھا۔ والد صاحب نے فرمایا۔ ناہنجار گدھے، مہر میں دل گردے پھیپھڑے نہیں لکھے جاتے۔ خیر میں تو ۔۔۔!"
"تانیہ! مجھے آپ اور آپ کی سماعت سے دلی ہمدردی ہے۔ میں آپ کے کانوں کے لیے صرف دُعا ہی کر سکتا ہوں۔" نہال نے عمر کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی بے چارگی کے ساتھ تانیہ سے اظہارِ ہمدردی کیا۔
"ایک منٹ! میں دیکھتی ہوں کون ہے۔" بیل کی آواز پر وہ باہر نکل گئی۔
عمر نے تیزی سے اُٹھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر سڑک پر دیکھا۔ پھر نہال کی جانب معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔
کچھ ہی دیر میں تانیہ خوشنما پھولوں کا گلدستہ، ایک بڑا سا کیک کا ڈبا اور ایک خوبصورت گفٹ پیک اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کون آیا ہے تانیہ!" اُس کی امّی داخلی دروازے سے نمودار ہوئیں
"وہ امّی — یہ ٹی سی ایس سے آیا ہے۔" اُس نے بوکھلا کر ہاتھ میں جو تھا آگے کیا۔
"کس نے بھیجا ہے یہ؟"
"امّی جی! وہ میری سہیلی ہے ناں پلوشہ، اُس نے بھیجے ہیں۔" اُس کا لہجہ بدستور گھبراہٹ کا شکار تھا، ساتھ ہی ایک نگاہ عمر پر ڈالی، جو سوڑھوں سمیت دانتوں کی نمائش میں مصروف تھا۔
"اچھا تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔" یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ گئیں۔
"آ رہی ہوں۔" اُس نے سب چیزیں میز پر رکھیں اور باہر نکلنے لگی۔
"تو گویا آج سے میرا نام پلوشہ ہے۔" پیچھے سے عمر کی شوخ آواز آئی۔

وہ خونخوار نظروں سے عمر کو دیکھتے ہوئے غرّاپ سے اندر گھس گئی۔
نہال اور عمر دونوں ہنس دیے۔ ذرا دیر میں ہی وہ چائے کی ٹرے اُٹھائے اپنی والدہ کے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی۔
جلدی جلدی میز پر لوازمات سجانے لگی۔
"نہال بیٹے! تکلف نہ کرنا۔" انہوں نے ایک خالی پلیٹ نہال کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔
نہال نے نظریں اُٹھا کر انہیں بغور دیکھا۔
تصویر میں اور ان میں صرف جوانی اور ادھیڑ عمر کا تو فرق تھا، یا پھر اس سنہری فریم کے چشمے کا جو ان کی آنکھوں پر لگا تھا۔
وہ دل ہی دل میں موازنہ کر رہا تھا۔
"کیا تم کو یقین ہے کہ وہ رانیہ کی ماں ہے؟" اماں جی نے بے یقینی سے پوچھتے ہوئے نہال کو دیکھا۔
"یقین سے تو آپ ہی کہہ سکتی ہیں۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ وہی رانیہ کی والدہ ہیں۔" نہال نے وہ خیال کی طرف نظریں جماتے ہوئے کہا۔
"اوہ میرے خدا!" نادرہ بیگم خاصی پُرجوش اور تھوڑی بوکھلائی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔
آج صبح ہی فون پر نہال نے ان کو ساری بات سے آگاہ کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ایک دو روز میں آج تانیہ کی والدہ سے ملوانے لے جائے گا، مگر ان سے ایک دو گھنٹے بھی صبر نہیں ہو سکا۔ زوباریہ سے نہال کا فون نمبر لے کر اُسے فون کر ڈالا اور کہا کہ وہ اسی وقت تانیہ کی والدہ سے ملنا چاہتی ہیں، وہ فوراً ان کے گھر آ جائے۔ یوں وہ دونوں اس وقت تانیہ کے گھر جا رہے تھے۔
"ذرا گاڑی تیز چلاؤ ناں بیٹے!" بے تابی اُن کے ایک ایک انداز سے مترشح تھی۔
نہال ہنس پڑا۔ "آپ بہت بے چین ہیں اُن سے ملنے کے لیے۔"
"بات ہی ایسی ہے۔" وہ جواباً مسکرائیں۔
"رانیہ سے ذکر تو نہیں کیا آپ نے؟" وہ موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔
"نہیں ابھی تو نہیں کیا، مناسب نہیں سمجھا۔ پہلے مجھے یقین ہو جائے کہ وہ زرتاج ہی ہے۔ ایسا نہ ہو خوامخواہ میری بچی کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ اُسے صدمہ ہو اور یوں بھی وہ یونیورسٹی جا چکی تھی، جب تمہارا فون آیا تھا۔"
تانیہ کے گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کر کے اُس نے اپنا کارڈ اندر بھجوا دیا۔ فوراً ہی ملازم دوبارہ نمودار ہوا۔
"آپ لوگ اندر ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے، بیگم صاحبہ ابھی آتی ہیں۔"
اُس نے ان لوگوں کے لیے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔
انہیں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ تانیہ کی امّی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"سوری بیٹا! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوئیں۔
"کوئی بات نہیں۔"
"کیسے ہو تم؟ خیریت سے تو ہو؟" وہ اپنائیت اور شفقت سے بات کر رہی تھیں۔
"اللہ کا فضل ہے، بالکل ٹھیک ہوں۔"
اسی لمحے اُن کی نگاہ نادرہ بیگم پر پڑی، جو اُن کو ایک ہی نظر میں پہچان چکی تھیں۔ دھڑکتے دل اور تیز تیز آتی جاتی سانس کے ساتھ ان کو دیکھے چلی جا رہی تھیں۔
"آپ؟" زرتاج نے تعارف حاصل کرنا چاہا۔
"زرتاج! تم مجھے نہیں پہچانیں؟" وہ ایک دم بول پڑیں۔
"جی — جی نہیں۔" انہوں نے بغور دیکھا "معاف کیجیے گا مجھے قطعی یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں اس سے قبل آپ سے کہاں ملی تھی۔" وہ کچھ حیرانی اور پریشانی سے کہہ رہی تھیں۔
"نادرہ!" انہوں نے زیرِ لب دُہرایا۔ ٹکٹکی باندھی ہوئی آنکھیں اور پیشانی کی لکیریں اس بات کی طرف اشارا کر رہی تھیں کہ وہ مستقل ذہن پر زور ڈال رہی ہیں۔
"تم یاد کرو، آج سے اٹھارہ بیس سال قبل تم دونوں ایک ہی ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ اُس ٹرین کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔"
"اوہ نادرہ!" زرتاج گرمجوشی سے اُن کے گلے لگ گئیں اور پھر ایک دم ہی بلک بلک کر رو پڑیں۔
نادرہ اچانک ہی اُن کے یوں بُری طرح رو دینے پر پریشان ہو گئیں۔ خود سے اُنہیں الگ کیا، مگر ان پر تو جیسے ہذیان طاری ہو چکا تھا۔ انہوں نے نادرہ کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔
"نادرہ! تمہیں میری بیٹی یاد ہے، تمہیں اُس کا مس یاد ہے؟ کیسی معصوم پھول سی بچی تھی ناں میری، کھو گئی وہ اس حادثے میں، مجھ سے جُدا ہو گئی۔ نہ جانے میری بیٹی کہاں چلی گئی۔ میں پاگل ہو گئی اپنی بیٹی کے غم میں، جیتے جی مر گئی۔ ہر رات مجھے اُس کے رونے کی آواز آتی ہے۔ اُس کے ننھے منے بازو مجھے بلاتے ہیں اُس کی آنسو بھری آنکھیں مجھے سونے نہیں دیتیں۔ یہاں آؤ تم۔" وہ بے خود و بے اختیار اُن کو کھینچتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئیں۔ ان پر تو جیسے دیوانگی طاری تھی۔
"یہ دیکھو، یہ میری رانیہ کا کاٹ ہے۔ اس الماری میں اُس کے چھوٹے چھوٹے کپڑے رکھے ہیں۔ یہ اس کے ننھے منے جوتے ہیں۔ اُس کا فیڈر بھی میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔ اُس کے کھلونے بھی موجود ہیں۔ سب کچھ ہے، مگر رانیہ نہیں ہے۔ خدا جانے وہ کن ہاتھوں میں ہے۔ پتا نہیں اس کا کیا حشر ہوا۔ زندہ بھی ہے یا مٹی کی تہوں میں ہے۔ کاش! مجھے کوئی آ کر صرف اتنا ہی کہہ دے کہ رانیہ مر چکی ہے، تو مجھے صبر تو آ جائے۔ میں ایک دفعہ ہی رو لوں۔"
"اللہ نہ کرے۔" نادرہ کی اپنی مامتا ہول گئی۔
"بس چپ ہو جاؤ، اللہ کے واسطے خاموش ہو جاؤ۔"
زرتاج کی دیوانوں کی سی کیفیت پر ان کے اپنے آنسو بے اختیار ہو گئے تھے۔ انہوں نے بڑھ کر زرتاج کو سینے سے لگا لیا۔
نہال سُتا چہرا لیے کمرے کے دروازے سے ٹیک لگائے، خاموش کھڑا افسردگی کے ساتھ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔
کمرے میں زرتاج کی سسکیوں کی آواز اُبھر رہی تھی۔ ماحول سخت بوجھل اور سوگوار تھا۔
جب زرتاج کے آنسو کچھ تھمے تو نادرہ نے بڑی آہستگی سے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نرم سا دباؤ ڈال کر بولیں۔
"اگر تم سے آ کر کوئی یہ کہے کہ رانیہ زندہ ہے تو —؟"
زرتاج ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ کچھ لمحے تک اُن کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔
"کہاں ہے میری بیٹی؟" وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نادرہ ان کے سامنے کھڑی ہوگئیں اور ہولے سے بولیں "میرے پاس ہے۔"

"تم تک کیسے پہنچی؟" ان کی آواز اندھے کنویں سے آ رہی تھی۔

نادرہ نے ساری بات ان کو کہہ سنائی۔

"اللہ گواہ ہے کہ اس وقت مجھے یقین کامل ہو چکا تھا کہ خدانخواستہ تم مر چکی ہو۔ اگر تمہارے اندر مجھے ذرا سی بھی زندگی کی رمق محسوس ہوتی تو میں ہرگز تمہاری بچی کو تمہاری گود میں سے نہ اٹھاتی۔ میں تو خود اولاد کے لیے ترسی ہوئی تھی۔ کسی ماں سے اس کا بچہ چھیننے کا گناہ کیسے کر سکتی تھی۔ میں خالی گود کا دکھ سہہ رہی تھی، تمہاری گود کیسے خالی کر سکتی تھی۔ اللہ جانتا ہے کہ میری نیت صاف تھی۔ محض اس لیے کہ معصوم بچی کہیں غلط ہاتھوں میں پڑ کر معاشرے کے منہ پر بدنما داغ نہ بن جائے۔ شرافت اور باعزت زندگی اس کے لیے خواب نہ بن جائے۔ میں نے اسے اپنے وجود میں چھپا لیا کہ اگر ماں کی محبت نہ دے سکی تو معاشرے میں باعزت مقام تو دے سکوں گی۔ سر اٹھا کر جینے کا حق تو دے سکوں گی۔ اس راستے کا نشان تو بتا سکوں گی، جو خدا کا پسندیدہ راستہ ہے۔" وہ یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"نادرہ! مجھے میری بیٹی سے ملوا دو۔ خدا کے لیے ایک نظر مجھے میری بچی دکھا دو۔" انہوں نے نادرہ کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"کیوں نہیں، وہ تمہاری ہی ہے۔" انہوں نے زرتاج کے ہاتھ تھام لیے۔

"آؤ گھر چلیں، ابھی تو وہ یونیورسٹی گئی ہوگی، جب تک ہم گھر پہنچیں گے، وہ بھی آ جائے گی۔"

نادرہ انہیں اپنے گھر لے آئیں۔ نہال نے ان کو ڈراپ کر دیا تھا۔ زرتاج، نادرہ سے رانیہ کی ہی باتیں کرتی رہیں۔ اس کے متعلق پوچھتی رہیں۔ وہ کیسی ہے، کیا کرتی ہے، کیا پڑھ رہی ہے، اس کا بچپن، اس کی پسند ناپسند، اس کی عادت و اطوار، اس کے مشاغل، اس کی صورت، اس کی سیرت، ایک ایک بات پوچھتی رہیں۔ کبھی ہنسنے لگتیں اور کبھی رونے لگتیں۔ گھڑی گھڑی بے صبری سے دروازے کی سمت دیکھنے لگتیں۔

نادرہ نے انہیں رانیہ کا کمرا دکھایا۔ زرتاج اس کے بستر پہ بیٹھ گئیں۔ اس کا بستر، تکیہ، کتابیں، کپڑے ہر چیز کو چھو چھو کر دیکھا، جیسے اس کا لمس تلاش کر رہی ہوں۔

"تم بیٹھو، اپنی بیٹی کی خوشبو سے باتیں کرو، میں دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ بنا لوں۔ آج کھانا اپنی بیٹی کے ساتھ ہی کھانا۔" نادرہ خوش دلی سے بولیں۔

"ہاں ضرور، کیوں نہیں۔" ان کی آنکھوں میں پھر آنسو چمکنے لگے۔

رانیہ یونیورسٹی سے تھکی ہاری لوٹی تو گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

کمال ہے اماں بی نے دروازہ کھلا چھوڑ رکھا ہے۔"

وہ جونہی اندر داخل ہوئی ٹھٹک گئی۔ ایک اجنبی خاتون سامنے ہی کھڑی سکتے کی سی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھیں، اور پھر ایک دم ہی چکرا کر فرش پر گر پڑیں۔

○ ● ◆

وہ بے حد خوش تھی، بہت زیادہ۔

کتنا ۔۔۔ ؛

یہ وہ بھی نہیں جانتی تھی۔ البتہ اس نے خوشی کا مفہوم پا لیا تھا۔ اس کی تو جیسے دنیا ہی بدل گئی تھی۔

اسے ماں مل گئی تھی۔

گرچہ کہ اماں بی نے اسے ماں بن کر پالا تھا، مگر اپنی ماں کی قربت میں چھپا ابدی سکون، اس کے جسم کی خوشبو، اس کے ہاتھوں کا لمس، آواز کی حلاوت۔

اُف کتنی انوکھی لذت تھی، کتنا خوبصورت اور کیف انگیز تھا یہ سب کچھ۔

اور یہ سب ۔۔۔ کچھ اسے مل گیا تھا۔

ماں۔

سراپا رحمت، مجسم محبت۔

دنیا کی سب سے اعلا و ارفع ہستی۔

اس کی محبت خدا کا سب سے خوبصورت تحفہ۔

اگرچہ کہ وہ ماں کی محبت سے محروم نہیں رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اماں بی اس کی ماں نہیں ہیں تب بھی اس کی زندگی میں کوئی خلا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اماں بی نے اپنا وجود ماں کی طرح ہی اس پر نثار کیا تھا۔

مگر اب جب کہ اسے اپنی سگی ماں ملی تھی، تو اسے احساس ہوا کہ ماں کا تو کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ ماں کی تو ایک غصیلی نگاہ کے سامنے دنیا بھر کی ساری محبتوں کی نرمی، گرمی، سب ماند ہوتی ہیں۔

اور تانیہ ۔۔۔ اس کی بہن!

کتنی خواہش تھی اس کی کہ اس کی کوئی بہن ہوتی۔ اور یہ خواہش خاص طور پر اس وقت حسرت بن کر دل میں اتر جاتی جب وہ دو بہنوں کو بالکل ایک جیسے کپڑے پہنے دیکھتی۔ ایک ساتھ ہنستے دیکھتی، آنکھوں آنکھوں میں اشارے کرتے دیکھتی۔

بہن تو ماں کی پرچھائیں ہوتی ہے۔ ہنسی کو معنی دینے والی، آنسوؤں کو شیئر کرنے والی۔ لڑائی جھگڑے، راز و نیاز، بلند قہقہے، دبی دبی ہنسی، تلخ کلامی، چھینا جھپٹی، ڈھال، سہارا، کتنے معنی ہوتے ہیں اس ایک لفظ "بہن" کے، اور یہ سب کچھ ڈھیر ساری محبتوں میں لپٹا ہوا ہوتا ہے۔

اس کے ہاتھ تو جیسے خزانے لگ گئے تھے۔

"اے میرے پروردگار! میرا تو رواں رواں تیرا شکر ادا کرتا ہے۔" وہ ربِ جلیل کے حضور سربسجود ہو جاتی۔

وہ ابھی بھی اماں بی کے پاس ہی رہ رہی تھی اور انہی کے ساتھ رہنے کا اس کا ارادہ تھا۔ یہ فیصلہ اس کا اپنا تھا، اگرچہ کہ اماں بی نے بخوشی اس کو اجازت دے دی تھی کہ وہ چاہے تو زرتاج کے ساتھ چلی جائے، مگر یہ کہتے ہوئے وہ ایک آنسو جو ان کی آنکھ سے ٹپکا تھا۔ رانیہ کا سارا وجود اس ایک آنسو میں بہہ گیا تھا۔

اماں بی ماں نہیں تھیں۔ انہوں نے تخلیق کا کرب نہیں سہا تھا۔ اس کے باوجود ممتا کے لازوال جذبات رکھتی تھیں۔

شاید وہ پیدائشی ماں تھیں۔

اس کو تکلیف ہوتی، درد اماں بی سہتیں۔

اسے نیند نہ آتی، جاگتی وہ بھی رہتیں۔

اس کے دل کی بات بغیر کہے جان لیتیں۔

اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ انہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ یہ ان کی چاہتوں کا صلہ تو نہ تھا مگر بہرحال ان کی عظمتوں کا اعتراف تو ہوتا۔

زرتاج نے اس پر قطعی کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ انہیں تو ان کی کھوئی ہوئی بچی مل گئی تھی۔ دین کا شعور رکھنے والی، زندگی کے صحیح اور غلط راستوں کی پہچان رکھنے والی، پاکیزہ و معصوم، سلجھی ہوئی طبیعت کی مالک، اعلا اخلاقی قدروں کی حامل۔

نادرہ نے بہترین تربیت کی تھی اس کی۔ اس کی روح تک کو پاکیزگی عطا کی تھی۔ ان کے احسان کا بدلہ تو وہ چکا ہی نہیں سکتی تھیں۔ ہاں مگر اتنا ضرور کر سکتی تھیں کہ نادرہ کی بیٹی انہی کو دے دیتیں۔ اس پر اپنا حق نہ جتاتیں۔ تقریباً روز ہی وہ گاڑی بھیج کر رانیہ کو بلوا لیتیں۔ کچھ وقت ان کے ساتھ گزار کر وہ واپس آ جاتی۔ زندگی میں خوشیوں کا ایک دم ہی بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔

ایسے میں کہیں بھولے بھٹکے اسے نہال آفریدی کا خیال آ جاتا۔

وہی تو ان ساری خوشیوں کی بنیاد بنا تھا۔ یوں اچانک ان کی زندگیوں میں آیا تھا تو شاید اسی لیے آیا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وہ اس کی بھی بے حد مشکور و ممنون تھی، ساری زندگی کے لیے احسان مند ہوئی تھی۔

ہاں سب باتوں کے قطع نظر جو کبھی اُس سے وہ ملاقات یاد آ جاتی، جب نہال نے اپنی کار میں اسے لفٹ دی تھی۔ تو اس کے اعصاب تن جاتے، عزتِ نفس سسک پڑتی۔

وہ اس کے بارے میں پسندیدگی کے جذبات رکھنے کا دعوے دار تھا۔

کیا محبتوں کے لہجے اتنے سخت اور کھردرے ہوتے ہیں، جو اُس نے اختیار کیے تھے۔

شاید نہیں۔

کیا یہ کومل کومل، نازک سے جذبات اتنے پتھریلے ہوتے ہیں کہ سدا احساس کو زخمی کرتے رہیں؛ دل میں چبھتے رہیں؛

ہرگز نہیں۔

وقت میں تو جیسے جمبو جیٹ کا انجن لگ گیا تھا۔ اُڑا چلا جا رہا تھا۔ جویریہ کو لندن آئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔

اب وہ اس زندگی کی عادی ہو گئی تھی اور تنہائی کی بھی۔ شروع شروع میں اُسے ایڈجسٹ کرنے میں کافی دقت ہوئی۔

کہاں وہ پارہ صفت لڑکی، کہ جب تک دن میں چار چھ بار زلزلے نہ لے آتی، اُسے سکون نہ آتا جس کی موجودگی میں ہر وقت ہنگامی صورتِ حال کا گمان رہتا اور کہاں یہ اپنے لوگوں، اپنے پیاروں سے ہزاروں میل دور ایک چھوٹے سے گھر کی خاموشی اور سکوت۔ کوئی بھی تو جان پہچان والا نہیں تھا، جس کے ہاں وہ آتی جاتی۔ البتہ معاذ کی ایک پھوپھی تھیں، مگر وہ بھی کافی دور رہتی تھیں، تقریباً دو گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ معاذ کسی ویک اینڈ پر ان کے ہاں لے جاتا تھا اور کسی ویک اینڈ پر ان کی بیٹی، بیٹا اور بہو آ جاتے۔ معاذ صبح کا گیا شام کو لوٹتا اور وہ سارا دن گھر میں بور ہوتی رہتی (قینچی زبان) کی دھار الگ زنگ آلود ہوتی جاتی۔ (صبح سے شام تک تالو سے جو چپکا رہنا پڑتا تھا)

"اُفوہ! ان پڑوسیوں بے حسوں کو اتنی توفیق نہیں کہ کبھی میرے گھر آ کر بھی جھانک لیں (تاکہ مجھے ان کے گھر میں جھانکنے کا موقع مل سکے) کس قدر خشک اور روکھی قوم ہے یہ بھی اور ایک یہ سامنے والا گھر ہے آج تک اس کا دروازہ ہی کھلتے بند ہوتے نہیں دیکھا۔ پتا نہیں کیا گھر کے مکین دروازے کے نیچے جھری میں سے آتے جاتے ہیں یا اوپر چمنی میں سے آمد و رفت جاری رکھتے ہیں۔ آوازیں تو ان کے گھر سے خوب آتی ہیں۔ اس وقت بھی گھاس کاٹنے کی مشین کے چلنے کی آواز آ رہی ہے۔ جویریہ دریچے میں کھڑی آس پاس کے گھروں کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھی اور ساتھ ساتھ مکینوں کی بے حسی، خشک مزاجی اور روکھے پن کا صدمہ برداشت کرنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ دلِ ناتواں کو صبر اور حوصلے کی تلقین بھی جاری تھی۔

ایک بڑی بی اکثر اس کو شام کے وقت سڑک پر ٹہلتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اللہ کی بندی ناک کی سیدھ میں چلتی چلی جاتی۔ مجال ہے جو دائیں بائیں دیکھنے کی زحمت گوارا کرے۔

ایک بار جویریہ نے انہیں دیکھ کر ہیلو کہتے ہوئے بڑے زور و شور سے ہاتھ ہلایا تھا۔ موصوفہ نے جواباً رُکے بغیر ایسی کرخت نگاہ اس پر ڈالی کہ سارا جوش و خروش وہیں ٹھنڈا پڑ گیا بلکہ اُلٹا بوکھلا کر وہ دریچہ بند کر کے اندر گھس گئی۔

اگلی مرتبہ ان بڑی بی پر نظر پڑتے ہی اُس نے "ہیلو ہائے" کہنے کے بجائے ناک کی سیدھ ہی میں دفع ہو جایئے۔ بائے، کہنا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔

ہاں البتہ کونے والے گھر کے سامنے ایک سات آٹھ برس کا بچہ، اپنے اسکول کی بس کا انتظار کرتا روزانہ اسے دکھائی دیتا تھا۔ وہ اکثر جویریہ کو دیکھ کر ہاتھ، بلکہ ہاتھ کیا پورا بازو ہلایا کرتا تھا۔ عجیب ہی انداز تھا اس کا، ایسا معلوم ہوتا، جیسے فضا میں وائپر چلا رہا ہو۔ جویریہ اس کو اشارے سے پاس بلاتی، مگر وہ جواباً ایسے نفی میں سر ہلاتا، جیسے کہہ رہا ہو "نہ بابا، میں نہ آؤں"۔ وہ مصنوعی غصے سے اُسے گھورتی اور وہ ناک چڑھا کر ہنستا۔ اتنے

میں اس کی بس آ جاتی اور وہ اُس میں سوار ہو جاتا۔ جویریہ کو یہ بہت پیارا لگتا، اسی لیے اکثر اُس کو دیکھنے کے لیے دریچے میں آ کھڑی ہوتی۔

وہ بے حد آرام و اطمینان سے تیار ہو رہی تھی۔ اپنے دُھلے ہوئے خشک بالوں کو کلپ میں قید کرتے ہوئے وہ وارڈ روب کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ کافی سوچ بچار کے بعد کھلتے ہوئے اورنج رنگ کا کُرتا شلوار منتخب کیا، جس کے گلے اور آستینوں پر سبز اور سُنہرے رنگ سے نازک و نفیس کڑھائی بنی ہوئی تھی۔

لباس تبدیل کر کے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ چہرے اور ہاتھوں پر لوشن لگا کر اُس نے فیس پاؤڈر لگایا، پھر رخساروں پر بلش آن لگانے کے بعد پلکوں کو مسکارے سے آراستہ کرنے لگی۔ آخر میں ہونٹوں کو اورنج لپ اسٹک کا ہلکا سا ٹچ دیتے ہوئے لپ گلوس لگا لیا۔ اُس کے نازک لب دہکتے انگارے بن گئے۔ برش سے لمبے بالوں کو سلجھا کر سادہ سی چوٹی کی شکل دے دی۔ سیف کھول کر سبز اور سفید موتیوں سے بنے سونے کا ہلکا سا سیٹ نکال کر پہن لیا، پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر۔ ناک میں پڑی ہیرے کی لونگ اُتار کر نیکلس کے ہم رنگ موتیوں کی لونگ ناک میں ڈال لی۔ ڈریسنگ ٹیبل کی نچلی دراز سے کانچ کی چوڑیوں کا ڈبا نکال کر اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ سُنہری، سبز اور اورنج رنگ کی چوڑیوں کا سیٹ بنانے لگی۔ چوڑیوں کو کلائی کی زینت بنانے کے بعد اُس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر تفصیلی جائزہ لیا۔

ع جو بھی تم ہو، خدا کی قسم لاجواب ہو آئینہ بھی گنگنانے پر مجبور تھا۔

مطمئن ہو کر وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ گولڈن چپلوں کو پاؤں میں ڈالتے ہوئے وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔

لونگ روم میں آ کر اُس نے میز پر سے کین کی چھوٹی سی ٹوکری اُٹھائی، جس میں اُس نے پہلے سے موتیا کے ڈھیر سارے پھول توڑ کر رکھے تھے اور صوفے پر بیٹھ کر پھولوں کو دھاگے میں پروتے ہوئے اُن کی لڑیاں بنانے لگی۔ لڑیاں بنانے کے بعد وہیں سامنے کی دیوار پر آویزاں سُنہری فریم میں جڑے بیضوی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے بالوں میں پھول لگا لیے۔

دراصل آج دوپہر کو معاذ کا فون آیا تھا کہ شام میں اُس کے کسی دوست نے کھانے پر بلایا ہے سو وہ تیار رہے۔ وہ سن کر خوش ہو گئی تھی کہ چلو کہیں تو ملنے ملانے کا سلسلہ ہوا۔ گھر میں پڑے پڑے تو اُسے پھپھوندی لگی جا رہی تھی۔ معاذ کے حلقے میں زیادہ تر کاروباری لوگ تھے جن سے ذاتی نوعیت کے تعلقات تھے، ان کی فیملیز یا تو پاکستان میں تھیں یا پھر سرے سے تھیں ہی نہیں کہ بہت سے ان میں غیر شادی شدہ تھے۔

جویریہ نے گھڑی پر نظر ڈالی، وہ وقت سے پہلے ہی تیار ہو گئی تھی۔ بُک شیلف میں سے ایک کتاب نکال کر اُس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں، تو اُس نے بیزار ہو کر کتاب رکھ دی اور دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔

"ارے خدا کے بندے! اب آ بھی جاؤ" سخت کوفت میں مُبتلا وہ سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

دور سے معاذ کی گاڑی آتی دکھائی دی، تو وہ چین کا سانس لیتے ہوئے دریچے سے ہٹ گئی اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ معاذ اندر آیا تو اُس نے خفگی بھری نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

"خدا کے واسطے یوں آزمائش بن کر میرے سامنے نہ کھڑی ہوا کرو" معاذ نے اس کے بے خودی کے راستے پر لے جانے والے حسن کو نظر بھر کر دیکھا۔

کتنا دلفریب انداز تھا اُس کا کتنے خوبصورت اور انوکھے لفظوں میں وہ اُس کو سراہتا تھا۔ جویریہ کے احساسِ تفاخر کو تقویت ملی۔ اُس کا دل مغرور ہوا، پھر بھی بناوٹی غصے سے بولی۔

"حد کر دی آپ نے، مجھے جلدی تیار ہونے کا کہہ کر خود اتنی دیر سے آئے ہیں۔ اب مزید ایک لمحے کی تاخیر کی تو سخت گناہ ہوگا۔ فٹافٹ جا کر تیار ہو جایئے۔ میں نے آپ کے کپڑے باتھ روم میں لٹکا دیے ہیں۔ آپ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کے پاس صرف دس منٹ ہیں۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

معاذ مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے اُڑے جا رہے تھے۔

"آپ نے اپنے اُس دوست کا پہلے تو ذکر نہیں کیا تھا۔" اس نے پرس میں سے ٹشو نکالتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ میرا ایک بہت قریبی دوست ہے، آج کل ورلڈ ٹور پر گیا ہوا ہے، جس دن ہم لندن پہنچے اُس سے دو روز قبل روانہ ہوا تھا، اب ایک ہفتہ پہلے ہی آیا ہے۔"

"شادی شدہ ہے؟"

"نہیں، مگر بے فکر رہو، تم کو اچھی کمپنی مل جائے گی، اُس کی ایک بہن بھی ہے۔"

گھر زیادہ دور نہیں تھا، دونوں جلد ہی پہنچ گئے۔ ایک خوش شکل سا نوجوان ان کو باہر کھڑا مل گیا۔

"اس قدر دیر کر دی، میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید تم راستہ ہی بھول گئے۔"

"ارے نہیں یار، نہ دوست کو بھولا اور نہ اس کے گھر کا راستہ بھولا۔" معاذ بے حد گرمجوشی سے اُس کے گلے لگ گیا۔

پھر اس نے جویریہ اور خرم کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ خرم انہیں لان میں لے آیا جہاں لان چیئرز سلیقے سے رکھی تھیں۔

"تشریف رکھیے بھابی! میری بہن اندر ہے، آتی ہی ہوگی۔"

جویریہ ایک کرسی آگے کر کے اس پر بیٹھ گئی۔ معاذ، خرم سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔ جویریہ ادھر اُدھر کا جائزہ لینے لگی۔ گو کہ رات کا وقت تھا، مگر برآمدے میں لگی لائیٹوں کی وجہ سے بالکل اندھیرا نہیں تھا۔ لان خاصا بڑا تھا۔ اطراف میں چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنی ہوئی تھیں، جن میں لگے خوش رنگ پھولوں کی مہک فضا میں رچی ہوئی تھی اور ماحول پر خوشگوار تاثر چھوڑ رہی تھی۔ جویریہ نے گہرا سانس لے کر خوشبو اپنے اندر سموتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"ارے بھئی فریال! کہاں ہو؟" کافی دیر ہو گئی جب وہ نہ آئی تو خرم نے اُسے آواز دی۔

"بس آ رہی ہوں۔" قریب سے ہی مدھر سی آواز آئی۔

جویریہ نے اشتیاق بھری نگاہوں سے آواز کی سمت دیکھا۔ فوراً ہی وہ لان کے عقبی حصے سے نمودار ہوتی دکھائی دی۔ جویریہ کو ایک لمحے کے لیے ایسا لگا، جیسے چاندنی کوئی کرن ہے جو انسانی وجود میں ڈھل کر اُس کی جانب آ رہی ہے۔ بے ساختہ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ بغیر پلک جھپکائے، سانس روکے سحر زدہ نظروں سے وہ اُسے دیکھنے لگی۔ وہ چاندنی میں لپٹا ہوا وجود اُس کے قریب آ گیا۔

حسن کی دو ہی تو قسمیں ہوتی ہیں۔

شعلہ یا پھر شبنم۔

جیسے جویریہ یا پھر فریال۔

"ماشاء اللہ! بے حد پیاری ہیں آپ۔" اپنی ضیاپاشیوں سے نگاہوں کو خیرہ کر دینے والا حسن رکھنے والی

جویریہ نے بے حد کھلے دل سے اُس کے ملکوتی حسن کا اعتراف کیا۔

جواب میں اُس کے لبوں میں موہوم سی جنبش ہوئی۔

جویریہ کو یوں لگا جیسے گلاب کی کلی نے کھلنے کی ذرا سی کوشش کی ہو۔

"جب کہ میرا خیال ہے کہ آئینہ آپ سے روزانہ یہی بات کہتا ہوگا۔" اُس نے مسکراتی نگاہوں سے جویریہ کو دیکھا، جس کے چہرے کی آب و تاب دلوں کو منور کرنے کے لیے کافی تھی۔

"یہ لیجیے، میری طرف سے قبول کریں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے پھول اُس کی جانب بڑھائے۔

"سچ پوچھیں تو میں پھول کبھی نہیں توڑتی۔ پھول از خود مرجھا کر ٹوٹ جائیں تو اور بات ہے ——

مجھے آپ کی "خوشبو بھری" گفتگو پسند آئی۔" جویریہ نے شرارت بھری معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔"

"کس کا، پھولوں کا یا میرے خلوص کا؟"

"پھولوں کا، کیونکہ کسی کے خلوص کا شکریہ تو اُس وقت ادا کیا جا سکتا ہے، جب جواباً اُس سے زیادہ خلوص کا مظاہرہ کیا جائے۔ میں اگرچہ کہ بہت زیادہ خلوص کا دعوا تو نہیں کرتی، مگر بہرحال ہم جب بھی ملیں گے، آپ مجھے مخلص پائیں گی۔" وہ پُر اعتماد لہجے میں بول رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں قدرے خنکی ہے، آئیے ہم دونوں اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" وہ اُسے لے کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

"آپ بیٹھیں میں ابھی آتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

جویریہ نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ کمرے کی تزئین و آرائش گھر والوں کے باذوق ہونے کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

جویریہ کی نگاہ میں ستائش اُبھر آئی۔

فریال جب اندر آئی، تو اُس کے ہاتھ میں اورنج جوس کے گلاس تھے۔ وہ اُس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

جویریہ سدا کی بے تکلف، تھوڑی دیر میں ہی دونوں ایک دوسرے سے خوب گھل مل گئیں۔ تقریباً وہ تمام موضوعات جو عموماً پہلی ملاقات میں جان پہچان کے مراحل کو طے کرنے اور بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں، زیرِ گفتگو آ گئے۔

فریال کم گو اور دیر زود رہنے والی لڑکی تھی۔ لوگوں سے ملتے ہوئے عموماً اپنے گرد حصار کھینچ لیا کرتی تھی مگر جویریہ میں کوئی غیر معمولی بات تھی۔ اس کا خلوص اتنا سچا، سادہ اور بے ساختہ تھا کہ دوسرا فریق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ مقناطیسی کشش رکھنے والی جویریہ سے بات کرتے ہوئے اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اجنبیت اور فاصلوں کو تیزی سے کم کر کے ہستی پر چھا جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

دوسری جانب دھیمے دھیمے لہجے میں بولتی فریال، جویریہ کے دل میں اُتر گئی تھی۔ اُس کے چہرے پر خواب کی سی کیفیت نمایاں تھی۔ اس کی گہری گہری آنکھوں میں اداسیاں سی ہلکورے لیتی محسوس ہوتی تھیں، جنہوں نے اُس کے چہرے کی خوابناکی کو مزید نکھار دیا تھا۔ جویریہ اُس کے چہرے کی خوابناکی میں ایسی کھو سی جاتی تھی کہ کئی مرتبہ یہ سوال کہ "تمہاری آنکھیں اتنی اداس کیوں ہیں" زبان کی نوک پر آتے آتے ذہن سے ہی محو ہو جاتا تھا۔

"آؤ میں تمہیں اپنی بنائی پینٹنگز دکھاؤں۔"

جویریہ کو تو پٹری سے اُترتے زیادہ دیر نہیں لگتی تھی تو "آپ" سے "تم" پر اُترنے میں تو وہ کیا دیر لگاتی۔ جواب میں فریال نے بھی اُسے "تم" کہہ کر مخاطب کیا تھا اور اُس کا ہاتھ تھام کر اپنے بیڈ روم میں لے آئی۔ اس کا کمرا خاصا کشادہ تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کا قالین اور ہم رنگ پردے کمرے کا بڑا خوبصورت تاثر پیش کر رہے تھے۔

"واہ بھئی، تم تو رنگوں کی زبان بھی جانتی ہو۔" جویریہ نے ایک بڑی سی پینٹنگ کو تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں، مگر اس زبان کے جاننے کا کیا فائدہ جو دوسرا نہ سمجھے۔" اُس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"مگر سمجھانے کا انداز صحیح اور واضح ہو تو سبھی سمجھ جاتے ہیں۔" جویریہ اپنی دُھن میں کہہ کر اگلی پینٹنگ کے آگے رُک گئی۔

فریال کی بنائی ہوئی پینٹنگز واقعی خوبصورت تھیں، مگر ساری تصویروں کے پس منظر میں سورج کو ڈوبتے دکھایا گیا تھا اور یہ بات جویریہ نے نوٹ کر لی تھی۔

وہ گھومتے گھومتے ایک دم فریال کی طرف مڑ گئی جو اُس پر نظریں جمائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"تمہاری تصویریں اگرچہ کہ بہت خوبصورت ہیں، مگر ان سے اداسی اور قنوطیت چھما چھم برس رہی ہے اس کی وجہ تسمیہ بیان کرو اور یہ تم نے ہر تصویر کے پس منظر میں سورج کو ڈوبتے ہوئے کیوں دکھایا ہے؟"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"جب سورج ڈوب ہی رہا ہو تو اس میں اُبھرنے کی سی خوبصورتی کیسے پیدا کی جا سکتی ہے۔" اُس کے یاسیت بھرے لہجے پر جویریہ غور نہ کر پائی۔

"کیا اپنی آنکھوں کی اُداسی بھی رنگوں میں گھول دیتی ہو؟" اُس نے قریب آ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا میری آنکھیں اُداس ہیں؟" وہ نظریں چرا گئی۔

"اچھا! تو آپ اتنی بے خبر ہیں؟" اُس نے بھنویں اُچکاتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہ اُداس ہیں یا رہتی ہیں۔" وہ سرگوشی میں گویا ہوئی۔

"محترمہ! اگر میری آنکھیں اُداس ہیں یا رہتی ہیں تب بھی بے فکر رہیں۔ ان ہی اُداس آنکھوں سے میں کائنات کے رنگ اور روشنیاں با آسانی دیکھ لیتی ہوں۔" اُس نے لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میری پینٹنگز پسند آئیں؟" اُس نے سرسری انداز میں کہتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے بات بدل دی۔

"ہاں، مگر ازراہِ کرم آئندہ سے ایسی تصویریں بنایا کرو، جو زندگی کے احساس کو اُجاگر کریں۔ جینے کی اُمنگ پیدا کریں۔ ایسی نہیں کہ دیکھتے ہی انسان کی چار چھ دن کے لیے بھوک اُڑ جائے۔ خودکشی کر لینے کے خیالات دل میں آنے لگیں۔"

"ہاں میں ضرور ایسی تصویریں بناؤں گی، اس لیے کہ میں نے آج تم کو دیکھا ہے۔ زندگی کے علامتی روپ کو دیکھا ہے۔ میں ضرور تصویر بناؤں گی۔ اُبھرتے سورج کی، اُونچائی کی جانب اُڑتے پرندوں کی، کھلتی کلیوں کی۔" وہ زندگی سے بھرپور جویریہ کو دیکھتے ہوئے جیسے کھو سی گئی تھی۔ چونکی اس وقت جب وال کلاک نے نو بجنے کا اعلان نو دفعہ کیا۔

"اوہ میرے خدا! نو بج گئے، کھانے کو دیر ہو گئی۔ میں ابھی کھانا لگاتی ہوں۔" وہ یہ کہتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔

جویریہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی۔

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد فریال نے کافی بنا کر پلائی۔ کچھ دیر بعد ان دونوں نے رخصت کی اجازت چاہی۔

خرم اور فریال دونوں گیٹ تک چھوڑنے آئے۔ معاذ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ جویریہ، فریال کے قریب آ گئی اور اُس کا ہاتھ تھام کر محبت سے بولی۔

"مجھے تم سے مل کر سچی ——— خوشی ہوئی۔ تمہارا ظاہر بہت خوبصورت ہے اور باطن اس سے بھی زیادہ۔"

"حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ میری ذات کے آئینے میں تمہارا اپنا آپ جھلک رہا ہے۔ اور یہ خوبصورتی درحقیقت تمہاری اپنی ہے، جو تم کو دکھائی دے رہی ہے۔ آج رات میں کافی دیر تک تمہارے بارے میں سوچوں گی۔" اُس نے ہولے سے جویریہ کا ہاتھ دبایا۔

جویریہ اُس کو خدا حافظ کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ معاذ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"آپ نے فریال کو غور سے دیکھا معاذ؟" وہ چھوٹتے ہی بولی۔

"غور سے تو نہیں دیکھا، البتہ صرف دیکھا ہے۔" اُس نے "صرف" پر سارا زور صرف کر دیا۔

"کتنی پیاری ہے ناں وہ۔"

"کیا تم سے بھی زیادہ؟" اُس نے ایک نظر اُس پر ڈالی اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔

"بہت زیادہ۔" وہ لفظوں پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"ہونہہ!" معاذ نے سر کو یوں جھٹکا دیا، جیسے اُس نے کوئی ناقابلِ یقین سی بات کہہ دی۔

"اچھا یہ بتایئے کہ آپ کے نزدیک حسن کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے؟"

"حسن کی خوبی یہ ہے کہ وہ معصوم ہو، میری جویریہ کی طرح۔" اُس نے اسٹیئرنگ پر سے ہاتھ اُٹھا کر اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"جی نہیں، حسن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے حسن سے بے خبر ہو۔" اُس نے جیسے معاذ کی ناقص معلومات پر اُسے شرمندہ کیا۔

"اور عشق کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے؟" وہ معاذ کی طرف دیکھنے لگی۔

"کہ وہ دیوانہ ہو معاذ کی طرح۔" وہ شوخی سے کہہ کر اُس کی جانب جھکا۔

"جناب عشق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی گہرائیوں سے باخبر ہو۔ اوں جیسے ———!" وہ آنکھیں بند کر کے سوچوں کے سمندر میں غوطہ لگانے چل پڑی۔

"جیسے ———؟" معاذ نے مصنوعی خفگی سے اُسے گھورا۔

"جیسے آپ ———" وہ ہنس پڑی۔

○ ● ◆

جویریہ محبتوں سے گندھی ہوئی لڑکی تھی۔ فریال نے اس کے جذبوں کی پذیرائی گرمجوشی سے کی تھی۔ کوئی انجانا احساس تھا، جو اِن کو ایک دوسرے سے قریب لا رہا تھا۔ کوئی اَن دیکھی ڈور تھی، جو انہیں ایک دوسرے سے باندھ رہی تھی۔ خاص طور پر جویریہ کے سر پر فریال کی محبت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور اب تو اس کے پاس فرصت کے لمحات بھی کم ہوتے۔ یا تو وہ فریال کے گھر جا رہی ہوتی یا اس کے گھر سے آ رہی ہوتی۔

فریال کے لیے کیک بنا رہی ہوں۔

فریال کا سوٹ سی رہی ہوں۔

فریال کا سوئیٹر بُننے کے لیے اون خرید کر لائی ہوں۔

غرض صبح شام فریال کے نام کی تکرار تھی۔

اور جویریہ کا یہ بڑھتا ہوا التفات معاذ سے پوشیدہ نہیں تھا۔

اُس دن تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا جب اپنے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اسے ڈریسنگ ٹیبل پر سنہری فریم میں لگی فریال اور جویریہ کی تصویر نظر آئی۔ اُس نے تصویر ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھی۔ دونوں بالکل ایک جیسی فیروزی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھیں۔ ایک کے چہرے سے سورج کی شعاعیں اور دوسری کے چہرے سے چاند کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

"کیسی ہے تصویر؟"

وہ اپنے خیال میں اتنا گم تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب جویریہ اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"ہوں، اچھی ہے۔" اُس نے مبہم سے لہجے میں کہا۔ ذہن اُلجھن کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ ساڑھی میں نے اپنے لیے خریدی تھی، بہت پسند آئی مجھے، پھر سوچا کہ بالکل ایسی ہی فریال کے لیے بھی لے لوں۔ وہ تو لے ہی نہیں رہی تھی اور نہ ہی فوٹو کھنچوانے پر راضی تھی۔ میں نے ہی زبردستی کھنچوائی ہے۔"

تصویر ابھی تک معاذ کے ہاتھ میں ہی تھی۔ وہ پریشان کن نظروں سے تصویر دیکھ رہا تھا۔ سوچ کا طائر فکر و تشویش کی گھٹی ہوئی حبس زدہ فضا میں پرواز کر رہا تھا۔

○ ● ◆

جویریہ اپنے بیڈ روم میں آئی تو اُس نے معاذ کو جاگتا پایا۔

"ارے آپ سوئے نہیں ابھی تک؟"

"ہوں۔" وہ جیسے کسی گہری سوچ سے جاگا، پھر حاضر ماحول میں آتے ہوئے بولا۔ "تم کہاں تھیں؟"

"نماز پڑھ رہی تھی۔" وہ سر کے گرد لپٹی چادر اُتارتے ہوئے بولی۔

"تم عشاء کی نماز میں بہت دیر کرتی ہو، اوّل وقت پر پڑھنے کی کوشش کیا کرو۔" معاذ نے تنبیہہ کی۔

"جی اچھا۔" وہ شرمساری سے بولی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اپنے بالوں کو کھول کر برش پھیرنے لگی۔

"جویریہ! یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔"

جانے معاذ کا انداز کیسا تھا، اُس نے مڑ کر حیران کن نظروں سے دیکھا۔ ذہن منتشر، چہرے پر اضطرابی کیفیت، لہجہ پریشان کن اور لفظوں میں چاہت۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اُس نے سر کو جھٹکا دیا اور بال کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتی اُس کے قریب آگئی۔

"جی جناب! بیٹھ گئے۔"

"تم بہت چاہتی ہو فریال کو؟" پتا نہیں وہ جاننے کے باوجود تصدیق کیوں چاہ رہا تھا۔

"بہت زیادہ، وہ ہے ہی پیار کے قابل۔ اس سے تو جو ایک بار مل لے اُس کا گرویدہ ہو جائے۔ اس پر لٹو ہو جائے۔"

سر کو جھٹکا دے کر اُس نے جوڑا کھولا اور پھر دوبارہ بنانے لگی۔

"تم اسے اتنا نہ چاہو۔" وہ بے حد مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔

"کیوں؟" وہ سخت تعجب میں رہ گئی۔

"جویریہ!" وہ تذبذب سے اُسے دیکھنے لگا۔ "ذرا حوصلے سے سننا فریال شراب زندگی کے ہر قطرے کو آخری قطرہ سمجھ کر پی رہی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں!"

"اُسے ٹیومر ہے دماغ میں۔" اس نے جویریہ کی طرف سے نظریں چرا لیں۔

جویریہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ جو کچھ سماعتوں سے ٹکرایا تھا، ذہن نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ وجود میں چلنے والے جھکڑ اسے ادھر اُدھر ڈھکیل رہے تھے۔ وہ ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی۔

"جویریہ!" معاذ بے اختیار اس کی جانب بڑھا۔

اس کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ وہ جنونی انداز میں اس کے قریب آئی۔ اس کا کالر تھام کر ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔ "کیوں بتایا آپ نے مجھے، کیوں بتایا۔ بولتے کیوں نہیں آپ۔ کیوں کہا آپ نے مجھ سے یہ سب کچھ۔ کیوں نہیں چھپایا مجھ سے؟"

معاذ نے اپنا کالر چھڑا کر اس کی دونوں کلائیاں سختی سے پکڑ لیں اور بڑی بے بسی سے بولا۔ "جویریہ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ مجھے تمہاری بہت پروا ہے۔ تم جس تیزی سے فریال کی محبت میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ اگر آگے جا کر تم کو یہ بات پتا چلتی تو شاید تمہیں اس سے بھی کہیں زیادہ صدمہ ہوتا جتنا آج پہنچا ہے اور میں تم کو غمگین نہیں دیکھ سکتا۔ تمہارا دکھ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ تمہیں کوئی معمولی سی پریشانی بھی لاحق ہو تو میرا سانس رُکنے لگتا ہے۔"

"معاذ۔ کیا وہ کانچ کی گڑیا ٹوٹ جائے گی؟ کیا وہ مر جائے گی؟" وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پاگلوں کے سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔" وہ سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "نہ تو ان کا فیصلہ انسان خود کر سکتا ہے اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی بات یقین سے کہہ سکتا ہے۔"

"معاذ! فریال پیاری ہے ناں؟" وہ جیسے بڑی رازداری سے پوچھ رہی تھی۔ آنسو قطرہ قطرہ کر کے آنکھوں سے ٹپکنے لگے تھے۔

"ہاں شاید!"

"تو پھر خوبصورت لوگوں کی تقدیریں خوبصورت کیوں نہیں ہوتیں؟" وہ دھاڑیں مار مار کر روتے لگی۔ سر اس کے بازو سے ٹکرانے لگی۔

"اللہ تعالیٰ صورتیں دیکھ کر تو تقدیر نہیں لکھتا۔ ویسے بھی اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ بعض مصلحتیں ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں اور بعض سمجھ سے بالاتر رہتی ہیں اور ان کی پوشیدگی میں بھی خدا ہی کی کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔ سو ان باتوں کو سوچنا بیکار ہے۔"

جویریہ کے رونے میں اور بھی شدت آگئی۔ "معاذ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔" اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"خدا کے لیے خود کو سنبھالو۔" وہ بُری طرح گھبرا گیا۔

"مجھے رونے دیں معاذ مجھے رونے دیں ورنہ میرا دل شدتِ غم سے پھٹ جائے گا۔ کاش میں ... مر جاتی!" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر زار زار رو رہی تھی۔

معاذ انتہائی پریشانی کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صورت حال کو کس طرح قابو کرے۔ وہ اُٹھ کر جویریہ کے لیے پانی کا گلاس لے آیا۔

"پانی پیو۔" اس نے گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ "خود پر قابو پانے کی کوشش کرو جویریہ! حوصلے اور ہمت سے کام لو۔ لیٹ جاؤ تم۔ کچھ مت سوچو۔ کسی قسم کا بوجھ ذہن پر نہ ڈالو۔" اس نے نرمی سے اس کا سر تکیے پر رکھ دیا۔

وہ اب بھی گھٹی گھٹی آواز میں رو رہی تھی۔

معاذ اس کے سرہانے ہی بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ اس کا سر سہلانے لگا مگر اس کی بالوں میں سرسراتی انگلیاں جویریہ کے اعصاب کو پُرسکون کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

معاذ کو پچھتاوا ہونے لگا کہ اس نے جویریہ کو بتایا ہی کیوں۔ جویریہ کا ردِعمل اس کی توقع سے زیادہ شدید تھا۔ اسے وہ لاعلم ہی رکھتا تو بہتر تھا۔

جویریہ کی گھٹی گھٹی سی آوازیں سسکیوں میں بدل گئیں اور پھر شاید وہ روتے روتے سو گئی۔ معاذ نے غور سے اس کی آنسوؤں میں بھیگی بند پلکوں کو دیکھا۔ اس کے واقعی سو جانے کا یقین کر کے وہ گہرا سانس لیتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور پائینتی پر پڑی چادر کھول کر اس کے اوپر ڈال دی۔ سوتے میں بھی اس کے نرم ہونٹوں سے سسکیاں آزاد ہو جاتیں تو معاذ کے دل میں جیسے کوئی چٹکی لے لیتا۔

صبح جویریہ کی آنکھ کھلی تو کچھ دیر تک وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ کھڑکیوں پر نظر ڈالی۔ موسم چونکہ ابر آلود تھا اس لیے قدرے اندھیرا سا تھا۔

"اُٹھ گئیں تم؟" معاذ کھلے دروازے سے اندر آیا۔

جویریہ تکیوں کے سہارے نیم دراز ہوگئی۔

"کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟"

"سر بھاری ہو رہا ہے۔ ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔ ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"دس بجنے والے ہیں۔"

"اچھا۔ آپ آفس نہیں گئے؟"

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں آفس کیسے چلا جاتا۔ تم کو اس حال میں چھوڑ کر۔ اچھا اب اُٹھ جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔"

"نہیں معاذ۔ آپ خوامخواہ زحمت نہ کریں۔ میں اپنے لیے چائے خود بنا لوں گی۔" اسے شوہر سے چائے بنوانا اچھا نہ لگا۔ سو جلدی سے بولی۔

معاذ ہنس دیا۔ "بے فکر رہو۔ اگر ایک دن تم کو چائے بنا کر پلا دوں گا تو میری مردانگی اور انا پر حرف نہیں آجائے گا۔"

جب تک وہ چائے بنا کر لایا جویریہ منہ ہاتھ دھو چکی تھی۔ صوفے پر نیم دراز بے حد اُداس نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ معاذ اندر آیا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"دس بج گئے آپ نے مجھے اتنی دیر تک سونے دیا۔" اس نے معاذ کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے چائے لے لی۔

"رات تم بہت بے چین رہیں۔ صحیح طرح نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے تم کو نیند کی گولی کھلا دی۔ اُس کے زیرِ اثر تم اتنی دیر تک سوئی رہیں۔" اس نے ڈوری کھینچ کر کھڑکی کے پردے پوری طرح ہٹا دیے اور کھڑکی کھول دی۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر چائے کے کپ سے اُٹھتی گرم بھاپ دیکھتی رہی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سے پتا ہی نہیں چلا کہ کب معاذ اس کے بالکل قریب آکر بیٹھ گیا۔
"کچھ بھی نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

معاذ خفیف سا مسکرایا۔ "جس کے بارے میں سوچ رہی ہو وہ ابھی کچھ ہی دیر میں یہاں آ
سے ہے۔"

"فریال آرہی ہے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں۔ تھوڑی دیر پہلے اس کا فون آیا تھا۔ تمہیں پوچھ رہی تھی۔ میں نے بتایا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کہنے لگی کہ میں ابھی آدھے گھنٹے تک آتی ہوں۔"

پھر اس نے جویریہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نرم سا دباؤ ڈال کر بولا۔

"جو کچھ میں نے تمہیں فریال کے بارے میں بتایا ہے اس کا ذکر تم اس سے نہیں کرنا۔ اوّل تو ہے کہ خرم نے اسے بتایا ہو۔ بہرحال اگر اسے علم بھی ہے تو شاید وہ تمہارے منہ سے سننا نہ چاہے اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے اور بعض لوگوں کو ہمدردی کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی۔ سمجھ رہی میری بات؟"

وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھے چلی گئی۔

"تم بھی حوصلہ رکھو۔ میں جانتا ہوں کہ تم بہت زیادہ حساس ہو۔ دوسروں کی پریشانیوں اور تکا میں گھلنے والی۔ ان کے دکھ درد کو اپنی جان کا روگ بنا لینے والی مگر یاد رکھو کہ یہ زندگی دکھ او دونوں ہی سے عبارت ہے۔ دعا اور جدوجہد زندگی کو بہتر بنانے میں معاون ثابت ہو مگر بہرحال یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ تقدیریں انسان کے ہاتھوں میں نہیں آجاتیں۔"

"خرم بھائی اس کا علاج کیوں نہیں کرلیتے۔" اس کا دل رونے لگا۔

"اس کا علاج آپریشن ہے۔ اور مرض اتنا بڑھ چکا ہے کہ آپریشن کی کامیابی کے صرف چند فیصد ہیں اور گزرتے وقت کے ساتھ یہ چند فیصد چانسز مزید کم ہوتے جارہے ہیں۔ خرم بے حد خوفزدہ وہ ان چند فیصد چانسز کا رسک لینا نہیں چاہتا اسے ڈر ہے کہ اگر آپریشن ناکام ہوگیا تو۔" اس ادھوری چھوڑ دی۔ "آپ کو کس نے بتایا یہ سب؟"

"ظاہر ہے خرم نے ہی۔" اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے ٹیک لگالی۔ "بہت محبت ہے خرم اپنی بہن سے۔ شدید محبت۔ مجھے ہمیشہ وہ دن یاد رہے گا جب اس نے میرے دفتر میں آ یہ سب کچھ بتایا تھا۔ بہت پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا وہ۔ حالت غیر ہوگئی تھی اس کی روتے رو بہت دکھ پہنچا تھا مجھے اس وقت جب اس نے کہا کہ معاذ تم دعا کرو کہ میں اپنی بہن کے ساتھ ہی م میں نہ اس سے پہلے مرنا چاہتا ہوں نہ اس کے بعد جینا چاہتا ہوں۔ اس کا تو بس نہیں چلتا کہ وہ اپنی ز بہن کو دے دے۔ بہت خیال رکھتا ہے وہ فریال کا۔ اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے ہی ہر خواہش کر دیتا ہے۔ اس کے لیے ہر ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے دکھ کو اتنا م نہیں کرتا جتنا اس کے چاہنے والے اس کے درد کی اذیت میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ سچی بات تو کہ محبتیں دکھ بھی بہت دیتی ہیں۔ خیر چھوڑو ان سب باتوں کو۔ اپنا حلیہ درست کرو۔ بال وغیرہ ٹھیک کرو۔ فریال آتی ہی ہوگی۔"

جویریہ نے ڈریسنگ ٹیبل پر سے کنگھا اٹھایا اور بال سلجھانے لگی۔ آئینے میں جھانکتے معاذ کے عکس سے نظریں چار ہوئیں تو افسردگی سے مسکرا دی۔

"آپ میری وجہ سے کتنے بے آرام ہوئے ناں۔" وہ چوٹی میں بل ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "آفس نہ جاسکے۔" "کوئی فرق نہیں پڑتا تم خوامخواہ اس کی فکر نہ کرو۔" وہ رک کر قدرے توقف کے بعد بولا۔ "بس ہر وقت خوش رہا کرو۔ کھلی کھلی سی، ہنستی مسکراتی، تم ذرا سا بھی اپ سیٹ ہوجاتی ہو تو میں سخت پریشان ہوجاتا ہوں۔" وہ تردد سے کہہ رہا تھا۔

جویریہ سر جھکائے کنگھے میں سے ٹوٹے ہوئے بال نکال کر انگلی پر لپیٹتی رہی۔

"بہت محبت ہے مجھے تم سے۔ بہت زیادہ۔" اس کا لہجہ اور بھی دھیما ہوگیا۔
جویریہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی پاس آگئی اور اس کے کندھے پر نازک ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
"معاذ! آئی لو یو ٹو۔"
"مگر تھوڑا سا جنگلی۔" وہ برجستہ بولا۔

دونوں بے ساختہ مسکرا دیے۔

"اچھا خاتون اگر آپ اجازت دیں تو خاکسار تھوڑا سا آرام کرلے۔ تھکن سی محسوس ہورہی ہے۔"
"ہاں کیوں نہیں۔" وہ بے حد پیار سے بولی۔ "آپ ایسا کریں، برابر والے کمرے میں سوجائیں۔"
"اوکے۔" وہ تکیہ اٹھا کر باہر چلا گیا۔

جویریہ نے بالوں کا گچھا ڈسٹ بن میں پھینکا اور دوبارہ بستر پر آکر بیٹھ گئی۔ بے دلی سے سائیڈ پر پڑا رسالہ اٹھایا ہی تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور فوراً ہی فریال اندر داخل ہوگئی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی جویریہ کا دل پھیلنے اور سکڑنے لگا۔ پتھرائی آنکھوں سے وہ اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر چاندنی بکھرائے فریال اس کے بیڈ کے قریب آگئی۔

"ارے بھئی یہ بستر کیوں پکڑ لیا؟" وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

جویریہ ضبط نہ کرسکی۔ وہ ایک دم ہی اس کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
اس کے اس طرح رو دینے پر فریال بری طرح بوکھلا گئی۔

"جویریہ۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"
وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ بس روتے چلی گئی۔
"ارے بھئی کچھ بتاؤ تو سہی۔" اس کے حواس گم ہونے لگے۔
"کچھ نہیں۔" اس نے فریال کی گود سے سر اٹھا لیا۔
"کیا بات ہے جویریہ مجھے بتاؤ ناں۔ میں پریشان ہورہی ہوں۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟"
"میں ڈر گئی تھی۔" وہ رخ موڑ کر چہرا صاف کرنے لگی۔
"ڈر گئی تھیں؟" وہ حیران رہ گئی۔ "کس چیز سے؟"
"خواب سے۔" اس کی آواز ابھی تک بھرائی ہوئی تھی۔
"ہیں؟" وہ مزید ہونق ہوگئی۔
"بہت بھیانک خواب تھا۔ بہت برا۔ فریال۔" اس نے فریال کا ہاتھ تھام لیا۔ "تم دعا کرو نا اس کی برائی ہو۔"

"ارے بے وقوف خواب کبھی حقیقت نہیں بنتے۔" فریال ہنس پڑی۔
(ہاں اور حقیقتیں بھی خواب نہیں بنتیں۔)
"بھلا خوابوں سے بھی کوئی ڈرتا ہے۔" فریال نے سر کو جھٹکا دیا۔ "حد کردی تم نے۔ مجھے دیکھو میں کتنی ... ہوں۔"

جویریہ نے چہرا اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔
(ہاں تم بہت بہادر ہو۔ زندگی کے اندھیرے راستوں پر اندھا دھند دوڑی جا رہی ہو۔ یہ جانتے ہوئے کہ آنے والا کوئی بھی موڑ آخری ہوسکتا ہے اور میں۔ میں بہت بزدل ہوں۔ خوشیوں کے سارے ... مٹھی میں قید کرکے مٹھی سختی سے بند رکھنا چاہتی ہوں۔ ڈرتی ہوں کہ اگر ایک بھی جگنو نکل گیا تو کہیں ... نہ جاؤں)

○ ● ◆

وہ اپنے خیالوں میں مگن آس پاس کے ماحول سے یکسر بے نیاز کمرے میں مستقل ٹہل رہی تھی۔ ... نے آپ سے اس قدر بے خبر تھی کہ اسے ہوش ہی نہیں تھا کہ اس کا دوپٹا پھسل کر نیچے گر گیا ہے ... تے جاتے اس کے پیروں میں الجھ رہا ہے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

معاذ بظاہر تو ٹی۔وی دیکھ رہا تھا مگر درحقیقت وہ اس کی حرکات نوٹ کر رہا تھا۔
جویریہ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔ کبھی نفی میں سر ہلاتی اور کبھی اثبات میں۔ گویا اپنے ہی کی تردید کرتی یا پھر اس سے متفق نظر آتی۔ کبھی پُرعزم اور پُرجوش دکھائی دیتی اور کبھی مایوس اور کبھی جھنجلانے لگتی اور کبھی مطمئن نظر آتی۔
اس کی پل پل بدلتی کیفیات دیکھ کر معاذ کے اندر تجسّس کا پیدا ہونا فطری تھا۔
جویریہ کی پُرسوچ نگاہیں کسی غیر مرئی نکتے پر مرکوز تھیں اور پھر شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی انداز میں سر ہلانے لگی۔
"بات سنیئے۔" وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔
معاذ نے اس کی جانب یوں دیکھا جیسے وہ ... اس کی طرف سے قطعی غیر متوجہ تھا۔
"میں چاہتی ہوں کہ فریال شادی کر لے۔" ... تو اتنا کر توپ داغ دی۔
معاذ کے تو سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی دیر سے فریال کی شادی کے خطوط پر غور کر رہی
"کیا فضول بات ہے۔" وہ صرف اتنا ہی کہ ...
"کیوں؟ کیا کسی کی شادی کے بارے میں سوچنا بری بات ہے۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔
"میں فریال کی شادی کی بات کر رہا ہوں اور تم جانتی ہو کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔ ہونہہ۔" سر کو جھٹکا دیا گویا کہنا چاہتا ہو ... حق کہیں ...
"اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ وہ شادی ... بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔
"کیا مطلب ہے آخر تمہارا؟" وہ جھلّا گیا۔
"معاذ۔" وہ اس کے قریب سرک آئی۔ "میں چاہتی ہوں کہ فریال کی جتنی بھی زندگی ہے وہ بھرپور طریقے سے گزارے۔ ازدواجی زندگی کی خوشیاں دیکھے۔ ان سے مکمل طور پر لطف اندوز ... میں چاہتی ہوں کہ کوئی اسے بہت ٹوٹ کر چاہے۔ اتنا کہ زندگی کی دی ہوئی تلخیاں، محرومیاں، احساس سب کچھ فریال کے لیے بے معنی اور بے وقعت ہو جائے۔ وہ کسی کی پُرخلوص رفاقت میں سب کچھ بھلا ... اپنا آپ۔ اپنی بیماری، زندگی کی بے وفائی۔ کوئی اپنی بے لوث چاہتوں سے اس کی آرزوؤں اور ... کی تکمیل کرے۔ نہ اسے گزرے کل کے دُکھ یاد آئیں اور نہ وہ آنے والے کل کی پروا کرے۔ ہر اس ... جس میں وہ موجود ہو کسی کی بھرپور چاہتوں کے سائے میں امر کر دے۔ اور جب وہ اس دُنیا سے جا ... مکمل آسودگی کے ساتھ۔ اس احساس کے ساتھ کہ اسے بے انتہا چاہا گیا ہے۔ اس نے بہت تھوڑی زندگی گزاری مگر بھرپور۔ اس کی وہ تھوڑی سی زندگی بھی کسی کے لیے یادوں کی صورت میں سرمایۂ حیات بن گئی ہے۔" وہ جذب کے عالم میں بولے چلی گئی۔
معاذ خاموشی سے اس کی ساری بات سنتا رہا۔ "تمہارا خلوص اور جذبۂ ہمدردی قابلِ ستائش ہے۔ یقیناً متاثر کن بھی مگر قطع نظر اس بات کے اس سے کون شادی کرے گا، تمہارا کیا خیال ہے کہ فریال شادی پر راضی ہو جائے گی؟"
"اسے راضی ہونا پڑے گا۔ میں اسے راضی کروں گی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "اگر وہ میری بات نہ مانے گی تو میں خرم بھائی سے بات کروں گی۔ ان کے ذریعے فریال کو مجبور کروں گی۔" پھر قدرے رُک کر بولی۔ "اب آپ یہ نہ پوچھنے بیٹھ جائیے گا کہ کیا خرم ایسی صورتِ حال میں اپنی بہن کی شادی کے لیے رضامند ہو جائے گا۔ ظاہر ہے معاملہ ان کی بہن کی خوشیوں اور مسرتوں کا ہو گا اور وہ یقیناً بہن کی ... کے حصول کے لیے خواہ وہ کسی طرح بھی حاصل ہوں، راضی ہو جائیں گے۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ خرم بہن سے شدید محبت کرتا ہے۔ اس کے لیے ہر ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔" وہ غالباً اپنی سوچ پر کئی پہلوؤں سے غور کر چکی تھی۔
معاذ کو اگرچہ کہ اس کی بات نہایت فضول اور مہمل لگی تھی مگر اس کے باوجود جویریہ کا یوں بحث کرنا دلچسپ لگا تھا پھر بھی وہ سنجیدگی سے بولا۔

"یہ بتاؤ کہ کیا فریال ایسی محبت کو قبول کر لے گی کہ اس کا شوہر محض اس سے ہمدردی کے نام پر محبت کر رہا ہے۔ ترس کھا رہا ہے۔ جویریہ بیگم — جذبات خالص ہونے چاہئیں۔ ترس یا رحم کی ذرا سی بھی آمیزش محبت کے خوبصورت چہرے پر بڑا بدنما داغ ہوتی ہے۔ آپ کو یہ معلوم ہو کہ جس محبت کو آپ اعزاز سمجھ کر قبول کر رہے ہیں۔ درحقیقت وہ بھیک سمجھ کر دی جا رہی ہے۔ عزتِ نفس کے قتل کا اس سے زیادہ بدترین طریقہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ اپنی انا، اپنا غرور، ذات پر اعتماد، خود پر مان، ہر چیز کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔ عزتِ نفس تار تار ہو جائے اور آپ کو خود سے بھی چھپنے کی جگہ نہ ملے تو بعض اوقات انسان خودکشی تک کے جذبات کو پہنچ جاتا ہے۔" بولتے بولتے اس کا لہجہ سخت اور برہم ہو گیا۔
"میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں ایسے شخص کا انتخاب کروں گی جو اسے بے لوث چاہے گا۔ صرف اسی کے لیے اس سے محبت کرے گا۔" اس نے معاذ کی دلیلوں پر ذرا بھی کان نہ دھرے۔
"بہت خوب"۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "کون سا ایسا مرد ہو گا جو یہ جان کر کہ اس کی ہونے والی شریکِ حیات ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہے اور چند مہینوں کی مہمان ہے، اس سے شادی کرے گا۔ محبتوں میں تو صدیاں بھی گزر جائیں تو یوں لگتا ہے کہ چند لمحے ہی گزرے ہیں۔ اور جس کو چند لمحے ہی عطا کیے جائیں تو آخر میں اس کے ہاتھ کیا رہ جائے گا۔ ہر شخص محبت کو زندگی کی خوبصورت حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے کسی بھیانک خواب کی صورت نہیں۔ محبت کے جذبات انسان کی ذہنی، جسمانی، روحانی آسودگی کا باعث ہوتے ہیں۔ کسی مستقل پریشانی کا آغاز نہیں۔"
"آپ فکر نہ کریں۔ فریال کے لیے میں نے شوہر منتخب کر لیا ہے۔" اس نے یوں اطمینان سے کہا جیسے جو کچھ سوچا ہے وہ بہت آسان ہو۔
"کون ہے وہ؟" معاذ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
"نہال بھائی۔"
اس کی بات پر معاذ کے ہوش اُڑ گئے۔ چند ثانیے وہ غیر یقینی نظروں سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ اب تک اس کا خیال تھا کہ جو خرافات جویریہ کے ذہن میں سمائی ہے وہ اس کا وقتی جذباتی پن ہے۔ مگر اس لمحہ اسے معاملے کی سنجیدگی بلکہ سنگینی کا احساس ہوا۔
"تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟ نہال نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ اسے یہ سزا دی جائے۔"
"معاذ، فریال سزا نہیں ہے۔" وہ سخت خفا ہو گئی۔ "بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ضرور اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی قدم اُٹھاؤں گی۔ نہال بھائی بہت اچھے ہیں۔ حساس دل کے مالک ہیں۔ میں عنقریب ان کو تفصیلاً خط لکھوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات رد نہیں کریں گے۔ میرا مان رکھیں گے۔" وہ پُرعزم دکھائی دے رہی تھی۔
"دماغ چل گیا ہے تمہارا۔ خبردار جو تم نے کسی سے بھی اس قسم کی احمقانہ بات کی ہو گی۔" اس نے نہایت سختی سے اسے تنبیہہ کی۔ "کیسی مہمل باتیں تمہارے ذہن میں آتی ہیں اور تم فوراً ارادہ باندھ کر عمل کرنے کو تیار ہو جاتی ہو۔" جویریہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر خاموشی سے اس کے پاس سے اُٹھ گئی۔
"ہونہہ۔ اپنی بقراطیت جھاڑنے بیٹھ گئے۔" کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ بڑبڑائی۔
"مگر میں ایسا ضرور کروں گی۔" وہ ہٹیلے لہجے میں خود سے بولی۔
اور سچ پوچھو اگر تو خود اس کو بھی یقین تھا کہ جو کچھ اس نے سوچا ہے وہ قابلِ عمل نہیں ہے بلکہ دل ہی دل میں تو وہ تقریباً ناامید ہی تھی مگر کیا حرج ہے کوشش کر کے دیکھ لینے میں۔
اس نے پہلے فریال اور پھر نہال سے بات کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

◯ ● ◆

وہ اپنے گھر سے تہیہ کر کے چلی تھی کہ آج ضرور فریال سے شادی کے موضوع پر گفتگو کرے گی۔ فریال کے خیال میں جویریہ اس کی بیماری سے لاعلم تھی۔ ایسی صورت میں وہ جویریہ کے شادی سے متعلق سوال کا کیا جواب دیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی تھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

فریال اس کے سامنے بیٹھی اپنی قمیص کے ڈیزائن اسے دکھا رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس سے بات کرنے کے لیے لفظوں کو تول رہی تھی کہ ڈور بیل کی آواز آئی۔

ایک منٹ میں ابھی آتی ہوں۔" فریال باہر نکل گئی پھر ذرا دیر میں پلٹ کر آئی۔

"جویریہ تم بیٹھو۔ میری پڑوسن کے گھر کا دروازہ اس کے بچے نے اندر سے لاک کر لیا ہے اور کھول نہیں رہا ہے۔ پتا نہیں سو گیا ہے یا اور کوئی مسئلہ ہے۔ میں اپنی چابیوں سے کھولنے کی کوشش کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر چلی گئی۔

جویریہ تنہا بیٹھی اپنے خیالوں سے اُلجھتی رہی۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہو گیا تو اس نے سارے خیالات ایک طرف جھٹک دیے اور کمرے میں رکھی چیزوں کا بے مقصد جائزہ لینے لگی۔ الماری کے پاس میز پر رسالہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے اُٹھ کر رسالہ اُٹھا لیا پھر جونہی مڑی تو اسے جھٹکا لگا۔ اس کی بالیشمی کا آنچل الماری کے کونے میں اٹک گیا تھا۔ جویریہ نے کھینچا تو الماری کا پٹ کھلتا چلا گیا۔ شاید دروازہ اچھی طرح بند نہیں تھا۔ دھڑا دھڑ فریال کے کپڑے گرنا شروع ہو گئے۔

"تو یہ ہے ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں گولے بنا بنا کر الماریوں میں ڈالتی ہیں۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اسے اپنی اور نزہ یاریہ کی الماری کے "گولے" یاد آ گئے۔ وہ قالین پر بیٹھ گئی اور فریال کے کپڑے سمیٹنے لگی۔

"اوہ کس قدر خوبصورت ہے"۔ کپڑوں میں موجود نیلے رنگ کی نہایت خوبصورت ڈائری جویریہ کے ہاتھ لگ گئی۔ بے خیالی میں جو اس نے ڈائری کھولی تو جیسے ساکت رہ گئی۔

ڈائری کے کور کی اندرونی جانب معاذ کی بڑی سی مسکراتی ہوئی خوبصورت تصویر لگی ہوئی تھی۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

لمحے بھر کو جویریہ کا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہو گیا۔ وہ کہاں ہے، کیا کر رہی ہے اسے ذرا بھی احساس نہیں رہا۔ ذہن جیسے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ وہ تصویر کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے رفتہ رفتہ صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اسی وقت اس کو بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

اس کا سویا ہوا ذہن ذرا سا جاگا۔

اور اس پر یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ اس کے ہاتھ میں فریال کی ڈائری ہے اور اس میں اس کے شوہر معاذ کی تصویر موجود ہے۔

اس نے ایک پل کو تصویر غور سے دیکھی پھر باہر قدموں کی آہٹ کی طرف کان لگائے۔ لحظہ بہ لحظہ قریب آتی آواز نے اس کو بوکھلا دیا۔ اس نے تیزی سے ڈائری الماری میں رکھ کر پٹ بند کیا اور انتہائی سرعت سے الماری کے پاس سے ہٹ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور باہر لان میں جھانکنے لگی

اسے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پانے کے لیے ایک لمحہ درکار تھا۔

"جویریہ!" فریال پھولی سانسوں کے ساتھ اندر آئی۔

"ہوں"۔ جویریہ کے دل میں چور تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں فریال اس کے چہرے کے تغیرات نہ پڑھ لے۔ اس کا چہرا، اس کی آنکھیں، اس کا لہجہ اور الفاظ بالکل بھی اس وقت ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیتے سو اس نے اپنا چہرا کھڑکی سے باہر ہی رکھا۔

"میری پڑوسن کے ہاتھ میں شیشہ گھس گیا ہے۔ کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر داخل ہونے کے چکر میں وہ خود کو خاصا زخمی کر بیٹھی ہے، میں اس کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں جا رہی ہوں، تم جانا نہیں۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔ دروازہ اندر سے بند کر لو۔" وہ عجلت سے کہہ رہی تھی۔

جویریہ نے ذرا کی ذرا مڑ کر اس کی جانب دیکھا، مگر وہ اتنی دیر میں کمرے سے باہر نکل چکی تھی۔ جویریہ نے دروازہ لاک کیا اور واپس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

اسے عجیب خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ تجسس کہہ رہا تھا کہ فوراً سے پیشتر ڈائری پڑھ لے اور ذہن روک رہا تھا کہ نہ جانے اس میں کیا ہو، کہیں یہ چوٹ نہ لگ جائے۔

کیسی چوٹ؟ جیسے کچھ کچھ اس کی سمجھ میں بات آ رہی تھی مگر شاید اس کا دل وہ سب کچھ قبول کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ ڈائری میں معاذ کی تصویر کی موجودگی بے معنی نہیں تھی۔

درحقیقت اُسے اس معنی خیزی سے خوف آ رہا تھا۔

اس سے رہا نہ گیا۔ الماری کھول کر اس میں سے ڈائری نکالی اور واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ معاذ کی تصویر کو بغور دیکھی، خوبصورت مسکراہٹ آنکھوں میں چھپائے معاذ میرون پل اوور میں بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس نے تصویر پلٹ کر دیکھا۔

خوبصورت رائٹنگ میں شعر درج تھا۔

؎ حسن و جمال آپ سا اس میں مگر کہاں
گو خوبصورت ہے بہت تصویر آپ کی

اس کا دل گھاٹیوں میں جا اُترا۔ وہ فریال کی رائٹنگ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اس نے گود میں پڑی ڈائری دیکھا۔ وہ اسے سانپ کی پٹاری کی مانند لگی کہ جونہی وہ اسے کھولے گی، سانپ اسے ڈس لے گا۔ پھر بھی اس نے لرزتے ہاتھوں سے جہاں سے ڈائری کھلی وہیں سے پڑھنا شروع کر دی۔

لکھنے والی نے جیسے پین میں انک نہیں جذبات بھر کر لکھا تھا۔

"معاذ! آپ باتیں بہت اچھی کرتے ہیں، جی چاہتا ہے کہ سنتے ہی رہو۔ چاہے آپ کسی اور سے گفتگو کر رہے ہوں، مگر مجھے یوں لگتا ہے کہ آپ مجھ ہی سے مخاطب ہیں اور جب آپ واقعی مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں تو میرا رواں رواں ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ اس لمحے میں آپ کی آواز سنتی نہیں ہوں بلکہ جذب کرنے لگتی ہوں اور گفتگو کے دوران آپ کا بے پروائی سے بار بار بالوں میں ہاتھ پھیرنے کا انداز اس قدر دلکش ہے، کہ میرا دل تو دھڑکنا ہی بھول جاتا ہے۔

کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ اپنا آپ اجنبی لگنے لگے اور کوئی اجنبی اپنا لگنے لگے۔

معاذ! میں آپ سے ایک بات کہوں؟

وہ اجنبی آپ ہیں۔

؎ غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہے اور راستے میں شام ہو جائے
ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

جویریہ کے ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس نے صفحہ پلٹا۔

"آج ہمارے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ دل میں صبح ہی سے انجانی خوشیوں نے گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ آج موسم بھی بہت خوشگوار تھا اور ذات کے موسم کا تو کیا ہی کہنا۔ مسحور کن ہوائیں، آمدِ بہار کی نوید سناتی پھر رہی تھیں کسی انوکھی خوشی کے ملنے کا احساس، پُرکیف نشے سے دوچار کر رہا تھا۔

معاذ! میں پھول کبھی نہیں توڑتی، مگر آج جی چاہ رہا تھا کہ آپ کے راستے میں پھول ہی پھول بکھیر دوں۔ (بلکہ خود ہی پتی پتی بن کر بچھ جاؤں) آپ جب آئے تو میں پھول توڑ رہی تھی۔ آپ نے ڈارک گرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور ہمیشہ سے کہیں زیادہ اچھے لگ رہے تھے۔ میری تو آنکھیں ساکت رہ گئی تھیں آپ کی وجاہت، آپ کی شخصیت کا وقار — میرا دل دو زانو ہو گیا۔ آپ ہی نے کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ اُف توبہ! آپ نے بھی کیا سوچا ہو گا۔ میں نے تو چاہتے ہوئے بھی ہاتھ میں تھاما ہوا پھول آپ کو نہیں دیا۔ جی تو چاہ رہا تھا تو یہ بھی تھا کہ سینے سے نکال کر دل پکڑا دوں)

؎ دل یہ کہتا ہے کہ اظہارِ تمنا کر دوں
عقل یہ کہتی ہے کہ یہ خواب کہیں ٹوٹ نہ جائے

کھانے کی میز پر آپ میرے سامنے بیٹھے تھے۔ میری نگاہیں بے اختیار ہو رہی تھیں۔ بھٹک بھٹک

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کر آپ کا چہرا چھو رہی تھیں۔

معاذ! کیا آپ نے کبھی اپنی سوئی سوئی آنکھوں کو غور سے دیکھا ہے؟ میں نے دیکھا ہے، میرا ہے کہ آپ کی آنکھوں سے باتیں کروں، آپ کی پلکوں سے کھیلوں۔ جانے کیوں آپ کی آنکھوں دیکھتے دیکھتے نیند سی آنے لگتی ہے۔

تیری مخمور نگاہوں کے تصور میں کبھی دوست
سو بھی جاؤں تو تیرے خواب جگا دیتے ہیں

ایک صفحے پر لکھا تھا۔

"آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں اعتراف کروں۔ اُڑتے بادلوں سے کہوں، چلتی ہواؤں کو کی بوندوں سے کہوں، پھول کی خوشبو کو سناؤں، زمین و آسمان کے درمیان موجود ہر شے کو اپنا راز میں سب سے کہوں کہ میں معاذ سے پیار کرتی ہوں۔"

جویریہ نے ایک دم ڈائری بند کر دی۔ اُس کا دل یک لخت ساکت ہو گیا۔ ہر سُو مہیب سناٹا ہر شے پر جیسے روزِ ازل کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ جانے لمحے گزرے یا صدیاں بیتیں۔

پھر کسی سمت سے مدھم سی آواز اُبھری۔

"میں معاذ سے پیار کرتی ہوں۔"

اور پھر یہ آواز ہر طرف پھیلتی چلی گئی۔ زمین و آسمان، مشرق اور مغرب، ہر سمت سے اسی جملے کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

"فریال، معاذ سے پیار کرتی ہے نا۔"

جویریہ کو کوئی اِدھر سے کوڑے مار رہا تھا اور کوئی اُدھر سے۔

کوئی آسمان سے زمین پر پھینک رہا تھا اور کوئی زمین سے پاتال میں۔

انکشاف کے اس خوفناک عفریت نے اس کو نگل لیا تھا۔ وہ چیخنا چلانا چاہتی تھی، مگر اس کی آواز میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ آنسوؤں کا سیلاب اُس کی آنکھوں تک بہا چلا آ رہا تھا، مگر شاید باہر کہیں راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کا دل اپنے ہی آنسوؤں میں ڈبکیاں کھانے لگا۔

وہ بالکل بے حس و حرکت صوفے پر پڑی تھی۔ جانے کتنی دیر تک پڑی رہتی کہ اچانک فون کی گھنٹی شور سے بجنے لگی۔ وہ بُری طرح ڈر گئی۔ خوفزدہ نظروں سے ٹیلی فون کو دیکھا، پھر تیزی سے اُٹھ کر ریسیور اُٹھا لیا۔

دوسری جانب خرم تھا، جو فریال کا پوچھ رہا تھا۔ جویریہ نے مختصراً بتا کر فون بند کر دیا۔ جھک کر نے ڈائری اُٹھائی اور غیر ارادی طور پر پتھرائی آنکھوں سے پھر پڑھنے لگی۔

"کاش! معاذ آپ مجھے قبول کر لیں، میرا دل، میرے جذبات قبول کر لیں۔

جانے کس لمحۂ تسخیر میں تُو مجھ سے ملا
اب تو جس شے کو بھی چھو لوں تیری مہکار آئے

اگلے صفحے پر لکھا تھا۔

"پروردگار یہ کس موڑ پر آ کر زندگی ٹھہر گئی ہے۔ یہ یقین اور بے یقینی کی کیسی کیفیت ہے، سا درد بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ یہ کیسی آگ ہے، جو نہ بجھتی ہے نہ جلا کر خاکستر کرتی ہے۔ معاذ اس کی تپش محسوس کیوں نہیں ہوتی۔ میرا تو یہ حال ہے کہ

یا تیرا تذکرہ کرے ہر شخص
یا کوئی ہم سے گفتگو نہ کرے

جویریہ نے چند صفحے ایک ساتھ اُلٹ دیے۔

"آج میں اور خرم بھائی آپ اور آپ کے کزنز کے ساتھ پاکستانی فنکاروں کا شو دیکھنے کے لیے گئے

میں مجھے آپ کے برابر جگہ ملی۔ شاید میرے جذبے سچے تھے یا خدا مہربان تھا، ورنہ آپ تو خرم بھائی کے ساتھ بیٹھنا چاہ رہے تھے۔ سارا وقت میں اپنے دل کو سنبھالتی رہی، جو ہمک ہمک کر آپ سے لپٹ رہا تھا اور جب آپ نے مجھے چپس کا پیکٹ دیا تو آپ کی انگلیوں کا لمس — جیسے انگاروں نے چھو لیا ہو (اور میں نے چپس کا پیکٹ تھامنے کے بجائے وہ انگارے تھام لیے تھے)

اور — اور جب میں اور آپ اکٹھے ہی پیکٹ اُٹھانے کے لیے جھکے تھے تو ہمارے سر ٹکرا گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ اندھیرا تھا، ورنہ میرے شوریدہ جذبات جو میرے چہرے سے عیاں ہو رہے تھے۔ میرا بھید کھول دیتے۔

اور جب واپسی پر آپ نے ارم کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ایک طرح سے میں اور ارم دونوں ہی آپ کے بازو کے حلقے میں آ گئے۔ اے کاش! آپ مجھے ہمیشہ کے لیے اس حلقے میں قید کر دیں۔ کاش یہ عمر قید آپ میری تقدیر کر دیں۔"

اگلے صفحے پر تحریر تھا۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔ آپ ہمارے ڈیپارٹمنٹل اسٹور آئے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ مجھے بھی وہاں کچھ کام تھا۔ خرم بھائی کہیں گئے ہوئے تھے۔ عتیق پاکستان جا رہے ہیں۔ آپ اپنے رشتہ داروں کے لیے کچھ تحائف لینے آئے تھے۔ بالکل اچانک میرے ذہن میں آیا کہ میں آپ کو پرفیوم تحفے کے طور پر دوں اور میں بے اختیار اپنے ارادے پر عمل کر بیٹھی۔ آپ نے شکریہ کہہ کر لے لیا۔

معاذ! مجھے یوں لگا کہ آپ نے مجھے قبول کیا ہو، میری محبت قبول کی ہو۔

وہ بات کہ ہر ایک کو حیرت کمال ہو
مجھ کو ہر اک بیاں پہ قدرت کمال ہو
وہ مجھ کو چاہنے لگے بے حد اور اس کے بعد
اس بات کی جہاں میں شہرت کمال ہو

جویریہ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ آتی جاتی سانسیں اس کے جذبات کی غمازی کر رہی تھیں۔ اس کے کانپتے ہاتھوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی ذات کے اندر کتنے طوفان اُٹھ رہے ہیں۔

اُس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"بھائی جان بتا رہے تھے کہ آپ پاکستان جا رہے ہیں۔ معاذ کیا میں آپ کے بغیر رہ سکوں گی؟ کتنی کٹھن ہو جائے گی زندگی آپ کے جانے کے بعد۔ صبح ہو گی تو پھر شام ہونے میں نہیں آئے گی اور جب شام ڈھلے گی تو صبح ہونے کا نام نہیں لے گی۔ کاش! آپ جاتے جاتے کوئی ایسی بات کہہ جائیں، ایک ایسی نگاہ ڈال جائیں کہ میں ہر احساس سے عاری ہو جاؤں۔ نہ کچھ سوچوں، نہ دیکھوں، نہ سنوں، بس صرف انتظار کروں۔"

تیری رسوائی کا ڈر ہے، وگرنہ خواہش ہے
کہ تم میرے ہو سبھی جگہ یہ خبر ٹھہرے
تیرا وجود ہے کتنا مجھے عزیز کہ میں
رہوں کہیں بھی نظر تیری منتظر ٹھہرے

جویریہ نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر پڑھنے لگی۔

"آج میں نے وہ تمام رپورٹس پڑھ لیں، جو بھائی جان نے مجھ سے چھپا کر اپنی الماری کی دراز میں رکھی تھیں۔ آج مجھے ان کی اُداسی کا سبب معلوم ہوا۔ مجھے برین ٹیومر ہے۔ موت کے اندھیرے بہت تیزی سے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ شمع زیست کسی وقت بھی بجھ سکتی ہے۔"

یہ کیسا مذاق ہے قسمت کا۔ تقدیر نے یہ کیسا مجھ سے کھیل کھیلا ہے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اب تو مجھے زندگی سے پیار ہونے لگا تھا۔ جینے کی آرزو پیدا ہوتی تھی۔ معاذ کے سنگ بہت دور تک زیست کا سفر طے کرنے کا ارادہ کیا تھا میں نے۔ زندگی کے لطف کا مفہوم سمجھ میں آیا تو عمر کے دن اب اتنے گنے چنے کیوں رہ گئے؟

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

جویریہ نے گھبرا کر بہت سارے صفحے پلٹ دیے۔

"میرا جی چاہ رہا ہے ساری کائنات کو آگ لگا دوں۔ میں اتنا روؤں کہ زمین آسمان اپنے آنسوؤں میں بہا دوں۔ معاذ آپ نے زندگی کا ساتھی چن لیا ہے، آج آپ کی شادی ہے، آپ کتنے مسرور ہوں گے۔ خوشی آپ کے چہرے سے پھوٹ رہی ہوگی۔ آنے والے کیف آگیں لمحات کا سوچ کر کتنے خوبصورت احساسات آپ کے دل میں جنم لے رہے ہوں گے۔

اور میں ——— میں بدنصیب یہاں اپنے ارمانوں کی چتا کو آگ دکھاؤں گی اور ارمانوں کے ساتھ میری محبت، میرے جذبات بھی ستی ہو جائیں گے۔

معاذ! یہ کیا کیا آپ نے؟

آپ نے تو میرے دل کی آگ بجھانی تھی، پھر کیسے اپنے دامن میں کسی اور کی محبت کی آگ لگا بیٹھے۔

آپ کی اسیر تو میں ہوگئی تھی، پھر آپ کیسے کسی اور کی زلفوں کے قیدی ہو گئے۔

میں نے اپنے دل پر آپ کا نام لکھا تھا تو پھر تقدیر نے آپ کا نام کسی اور کے ساتھ کیوں جوڑ دیا؟

کل تک اگر آپ میرے نہیں تھے تو کسی اور کے بھی تو نہیں تھے۔

معاذ! یہ کیا ہو گیا، آپ مجھ سے دور ہو گئے۔ میں نے آپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔

ہم دشت تھے کہ دریا، ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو، جب وہ نہیں تھا پیاسا

جویریہ آخری صفحات پڑھنے لگی۔

"معاذ! آج آپ اپنی بیوی کو لے کر ہمارے گھر آئے تھے۔ آپ پہلے سے بھی کہیں زیادہ خوبرو لگ رہے تھے۔ شاید یہ نکھار اس محبت اور آسودگی کا اعجاز ہو، جو آپ کو اپنی بیوی کی طرف سے ملی ہے۔ میں کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس وقت میری پہلی نگاہ آپ کی بیوی پر پڑی تھی۔ وہ گاڑی سے باہر آ رہی تھی۔

وہ گاڑی سے یوں اتری، جیسے اندھیری رات کو چیر کر سورج طلوع ہوا ہو۔

وہ چلی تو جیسے بجلیاں کوندی ہوں۔

وہ بیٹھی تو جیسے ساری کائنات ساکت ہو گئی ہو۔

وہ بولی تو جیسے بلوریں جام ٹکراتے ہوں۔

وہ مسکرائی تو جیسے فضائیں نہال ہوتی ہوں۔

اُس کی ایک ایک ادا اُٹھتی قیامت ہے۔

وہ لفظوں سے، لہجوں سے، آنکھوں سے، اپنے ہر ہر انداز سے محبتوں کا ریشمی جال اس طرح پھینکتی ہے کہ انسان بے اختیار اس چاند کا چکور بن جائے۔

اُس کا دل جیسے خلوص کا سمندر، جس کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب کر ابھرنے کا جی نہ چاہے۔

وہ تسخیر کرنے کا ہنر جانتی ہے۔

جویریہ بہت پیاری ہے، بہت اچھی، معاذ وہ آپ سے شدید محبت کرتی ہے۔ جب وہ آپ کا ذکر کرتی ہے تو سارے زمانے کی روشنیاں اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں سمٹ آتی ہیں۔ اس کے لفظ مہکنے لگتے ہیں۔

معاذ! آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ آپ کو اتنا چاہا گیا کہ بہت سی محبتیں تو آپ کے علم میں بھی نہ آ پائیں۔"

جویریہ نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے اگلا صفحہ کھولا۔

"جویریہ بہت تیزی سے میرے اندر اتر رہی ہے۔ اس کے التفات کا دائرہ بہت تیزی سے میرے گرد تنگ ہو رہا ہے۔ وہ میری ہستی پر چھا رہی ہے، میں اس سے محبت نہ بھی کرنا چاہوں تب بھی میرا دل اس سے محبت کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ وہ بھی مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ اکثر اس کے محبت بھرے جذبات کو محسوس کر کے میں سوچتی ہوں کہ جویریہ کو کیا معلوم کہ میں کون ہوں۔ سوچتی ہوں کہ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میں اس کے معاذ کو بے پناہ چاہتی تھی اور شاید اب بھی چاہتی ہوں تو پھر اس کی نظروں میں میرا کیا مقام ہوگا، وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی؟ اس کا ردِ عمل کیا ہوگا؟

کیا اس کے اور میرے درمیان دوستی اور چاہت اسی طرح برقرار رہے گی؟ کیا اس کے بعد بھی وہ مجھ سے اسی طرح ملتی رہے گی۔

نہیں ہرگز نہیں، جویریہ کو کبھی بھی یہ معلوم نہ ہوگا کہ معاذ! آپ تک پہنچنے والی چاہتوں کی رہگزر پر میرے قدموں کے نشانات اس سے پہلے ہیں۔ ہاں مگر میری بدقسمتی مجھے اندھیروں میں بھٹکا گئی اور وہ روشن تقدیر کا سہارا لے کر منزل تک پہنچ گئی۔"

انکشافات کے اس طویل راستے کو طے کر کے تھک کر نڈھال جویریہ نے ڈائری بند کر دی۔

طوفان تو آتا ہے اور آ کر گزر ہی جاتا ہے، ہاں مگر بعد میں انسان اس کی تباہیاں اور اپنی بربادیاں دیکھتا رہتا ہے۔

جویریہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جو طوفان اس پر سے گزرا ہے، وہ خود پر اس کی تباہی کے اثرات پر روئے یا فریال کی بربادی پر ماتم کرے۔

مگر اس وقت نہ تو رونے کا وقت تھا اور نہ ماتم کرنے کا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ پہلا خیال اسے یہی آیا کہ فریال بس آتی ہی ہوگی۔

کس طرح سامنا کروں گی میں اس کا، وہ جتنا خود کو سمیٹ رہی تھی، اتنا ہی بکھر رہی تھی۔

"اے پروردگار تو مجھے حوصلہ دے۔" اس نے صدقِ دل سے دعا کی۔

باتھ روم میں جا کر آئینے میں صورت دیکھی۔ یوں لگا کہ جو کچھ اس نے پڑھا ہے، وہ چہرے پر تحریر ہو گیا ہے۔

وہ رگڑ رگڑ کر منہ دھونے لگی، جیسے ساری تحریر مٹا دینا چاہتی ہو۔ وہ منہ دھو ہی رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس کے ساتھ ہی جویریہ کا دل بری طرح دھڑک گیا۔

وہ جلدی سے باہر نکلی۔ فریال کی ڈائری میز پر پڑی تھی۔ اس نے گھبراہٹ میں اسے اپنے بیگ میں ڈالا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔

"سوری جویریہ! مجھے بہت دیر ہو گئی۔" فریال آتے ہی بولی۔

"یقین کرو سارا وقت تمہاری طرف ہی دھیان لگا رہا کہ بیٹھی بور ہو رہی ہوگی۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ جبراً مسکرائی۔

"کیا کرتی رہیں تم؟" اس کا لہجہ سرسری تھا۔ ساتھ ہی اس نے فریج کھولا اور پانی کی بوتل نکالی۔

جویریہ کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اسے یوں لگا کہ فریال نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

"رسالہ پڑھ رہی تھی۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"اچھا تم بیٹھو میں لا تنے ــــــ!"

"نہیں فریال! مجھے دیر ہو رہی ہے، میں اب چلتی ہوں۔" اُس نے تیزی سے بات کاٹ دی۔

وہ قطعی رُکنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اُسے گھبراہٹ ہو رہی تھی، دل دھنسا چلا جا رہا تھا۔

"کہاں چلیں؟" باورچی خانے کی طرف جاتی فریال ایک دم رُک گئی "میں ہرگز جانے نہ دوں گی، میں نے تمہارے لیے پزا اور قیمے کے رول تیار کیے ہیں، بس پزا اوون میں رکھ کر رول فرائی کرتی ہوں۔ فٹافٹ دونوں چیزیں تیار ہو جائیں گی، خبردار جو جانے کا نام لیا تو۔"

"مگر فریال! میں نے تو رات کے لیے کھانا بھی تیار کرنا ہے۔" وہ جانے پر مُصر تھی۔

"بہت وقت پڑا ہے ابھی۔" اُس نے لاپروائی سے کہہ کر جویریہ کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔

جویریہ بے بس سی ہو گئی۔ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئی۔

سامنے کچن میں کھڑی فریال رول بھی فرائی کر رہی تھی اور اُس سے باتیں بھی۔

جویریہ اپنے خیالوں میں اُلجھی اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

(ہم دونوں میں سے وسیع دل کا مالک کون ہے، تم یا میں؟

تم، جس نے شدتوں کے ساتھ جس کو چاہا، اُس کی بیوی سے کتنے خلوص اور کھلے دل سے ملتی ہو، حسد اور رقابت کا کوئی شائبہ نہیں ہے تمہاری آنکھوں میں، نفرت کا کوئی رنگ نہیں ہے تمہارے چہرے پر۔

یا پھر میں کہ تمہارے بارے میں سب کچھ جان لینے کے باوجود تمہارے خلاف کوئی بھی بات سوچنے پر میرے دل و دماغ راضی نہیں۔ تمہارے متعلق کوئی منفی سوچ میرے ذہن میں نہیں۔ قطع نظر اس بات کے کہ معاذ میرے شوہر ہیں، مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ مجھے بے حد دُکھ ہے کہ تم نے جس کو چاہا وہ تم کو نہ مل سکا)

○ ● ◆

گھر آ کر وہ جی بھر کر روئی تھی۔ دل تو ویسے ہی پھٹ پڑنے کو بے قرار تھا۔ اُس نے فریال کی ڈائری دوبارہ بلکہ سہ بارہ پڑھی تھی، پھر اُس نے وہ خط نکالا، جو کل شام ہی اُس نے نہال کو تحریر کیا تھا۔ اُسے فریال کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا تھا۔ اپنی سوچ سے اس کو آگاہ کیا تھا اور اس کی رائے مانگی تھی۔

"واہ جویریہ! کیا سوچا تھا تم نے فریال کے بارے میں۔" اُس نے خط کے پُرزے پُرزے کر دیے۔

"کیا کرنے چلی تھیں تم ــــ ہونہہ! اس کی شادی۔" اُس نے جیسے اپنا ہی تمسخر اُڑایا۔

"اُس کی خوشیوں کے حصول کے لیے کیسی انہونی اور ناممکن باتوں پر عمل کرنا چاہا تھا۔ کس قدر جذباتی ہو گئی تھیں تم۔ اس بات سے بے خبر کہ تم خود اس کے سنہرے خوابوں کی تاریک حقیقت ہو۔ اس کی خواہشوں اور ارمانوں کا خون تمہارے ہی ہاتھوں ہو گیا۔ تم اس کی مختصر سی زندگی میں پھول بکھیرنا چاہتی تھیں ناں، وہ تو تمہارے ہی نام کے کانٹوں سے لہولہان ہے۔"

"مگر اس میں میرا کیا قصور ہے؟" وہ بے بسی سے رو پڑی۔

"میں تو شادی سے پہلے معاذ کو جانتی تک نہ تھی۔"

"مگر معاذ تو فریال کو جانتے تھے۔" اُس کے ذہن میں بجلی سی چمکی۔

"ہاں واقعی معاذ ہی تو اس کہانی کا اہم ترین کردار ہیں۔" اس کی سوچ کا دھارا یک لخت مخالف سمت مڑ گیا "معاذ کو کیوں نہ اس بات کا احساس ہوا کہ فریال ان میں دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ اتنے بھولے اور ناسمجھ تو نہیں ہیں۔ وہ تو آنکھیں، چہرے، لہجے سبھی کچھ پڑھ لیتے ہیں، پھر وہ کیوں فریال کی محبت کی خاموش زبان نہ سمجھ پائے۔"

کیا وہ واقعی نہیں سمجھے یا انہوں نے نظر انداز کر دیا۔

مگر فریال تو نظر انداز کر دینے والی شے نہیں ہے۔

آہ! کیا گزرتی ہو گی فریال پر جب وہ مجھے معاذ کے ساتھ دیکھتی ہو گی۔ میں اس کے دل پر چلتی ہوں گی اور وہ جلتے انگاروں پر۔

جانے کتنی دیر تک جویریہ سوچوں کے جنگل میں بھٹکتی رہی۔ کسی گھنے پیڑ کی چھاؤں تلے رُک کر دم بھر کو سانس لینے کی چاہ میں کانٹوں سے اُلجھتی رہی۔

○ ● ◆

"معاذ!" اُس نے اندھیرے میں پکارا۔

"ہوں۔" وہ تکیے میں سر گھسائے ہوئے تھا۔

"سو گئے ہیں کیا؟"

"نہیں۔" اُس نے جویریہ کی جانب کروٹ بدل لی۔

"معاذ! آپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں ناں؟" شاید اُس نے سوال نہیں کیا تھا، اپنے ہی یقین کو مزید مستحکم کیا تھا۔

جواب میں معاذ کی ہنسی اندھیرے میں روشنی کے جھماکے کی مانند تھی۔

اندھیرے میں جویریہ نے محسوس کیا کہ معاذ اس کے قریب آ گیا ہے۔ اس کے حوصلوں کو توانائی ملی۔

"اگر میں آپ سے کوئی چیز ایسی مانگوں، جو دینا آپ کے لیے بہت مشکل ہو، تقریباً ناممکن مگر میری خوشی بھی اسی میں ہو تو آپ کیا کریں گے؟" وہ بے حد ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بول رہی تھی۔

"تمہاری خوشی پوری کر دوں گا۔"

"سچ کہہ رہے ہیں؟"

"بالکل، اگر کوئی عمل میرے لیے مشکل ہے بھی، تب بھی یہ احساس کہ میری جویریہ اسی میں خوش ہے۔ اس کام کو میرے لیے ممکن اور سہل بنا دے گا۔ تمہاری خوشی اور آسودگی کا احساس مجھے تقویت دیتا رہے گا۔"

"تو پھر آپ فریال سے شادی کر لیجیے۔" اُس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تلوار کی دھار پر پہلا قدم رکھ دیا۔

کمرے میں ایسا سناٹا چھا گیا، جیسے صرف معاذ ہی نہیں بلکہ ہر شے ششدر رہ گئی ہو۔ معاذ سرعت سے بیڈ سے اُترا اور کمرے کی لائٹ جلا دی۔

اس کے بیڈ سے اُتر کر سوئچ بورڈ تک پہنچنے کے عمل کے دوران جویریہ نے خود کو ہر طرح سے معاذ کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لیا

"کیا کہا تم نے؟" اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا تھا۔ اُس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا تھا۔

"وہی جو آپ نے سنا ہے۔" اُس کی آواز بے حد نرم تھی "فریال سے شادی کر لیں۔"

"جویریہ!" معاذ کے مُنہ سے کوئی بات ہی نہ نکل سکی، وہ اُسے یوں دیکھ رہا تھا، جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو رہا ہو۔

"کیا تمہیں احساس ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو، ذرا لمحہ بھر کو اپنے لفظوں پر تو غور کرو۔"

"لمحے بھر کو؟ میں تو پچھلے چار دنوں سے اس بات پر غور کر رہی ہوں، اب آپ غور کیجیے۔ یہ لیں۔" اُس نے تکیے کے نیچے سے فریال کی ڈائری نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ ابھی تک شاک کی سی کیفیت میں تھا۔ جویریہ اس وقت اُسے بہت ہی پُراسرار لگ رہی تھی۔

"اس کو پڑھ لینے کے بعد یقیناً میں آپ کے بہت سے سوالوں کا جواب دینے سے بچ جاؤں گی۔ اور ساتھ ہی بہت سی باتوں پر عمل کرنا خود آپ کے لیے بھی بہت آسان ہو جائے گا۔"

معاذ نے اس کو گھورتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ڈائری جھپٹ لی۔ وہ جوں جوں پڑھتا گیا، جیسے زمین کے اندر دھنستا چلا گیا۔ پاتال میں اُتر کر بالآخر اُس نے ڈائری بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا گھومتا ہوا سر تھام لیا۔

"پروردگار! یہ سب کیا ہے؟ یہ کیسے اور کیوں ہو گیا۔" اس کا ذہن چک پھیریاں کھا رہا تھا۔

جویریہ اس دوران اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ دیکھتی رہی۔ اسے معاذ کی کیفیت کا اندازہ ہو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

رہا تھا کہ اس کے وجود میں کیسا جوار بھاٹا اُٹھ رہا ہوگا۔ وہ دھیرے سے اٹھی اور اس کے پاس آ

"ٹھیک از ایزی معاذ! آپ پریشان کیوں ہو گئے؟ میرا یا آپ کا تو کچھ نہیں بگڑا، ہاں مگر کو ضرور ٹوٹا ہے، لیکن اس نے کرچیاں ہمارے راستے میں بکھرنے نہیں دیں۔" اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا پھنسنے لگا۔ آواز بھرّانے لگی۔

"ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ ہماری چاہتوں کے تاج محل کی بنیاد کسی کی آرزوؤں کی تربت پہ رکھی گئی اور ذرا اس کی وسعتِ دل تو دیکھو کہ اس کے آنسو اور آہیں ہم تک ہنسی بن کر پہنچتے رہے ہیں۔" کے آنسو بے اختیار ہو گئے۔

"تمہیں میری محبت پر تو شک نہیں ہو گیا؟" اُس کا ذہن بُری طرح منتشر ہو رہا تھا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں؟ میں جانتی ہوں کہ آپ کی زندگی میں ایک ہی لڑکی آئی ہے۔ آپ کی تو ایک ادا سے میرے لیے عشق کا رس ٹپکتا ہے۔ میں آپ کی محبت پر شک جیسے عظیم گناہ کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آپ کا پیار میری زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔" اس نے معاذ کے خدشات دور کرنے کی کوشش کی۔ معاذ نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے صوفے سے سر ٹکا دیا اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"جو کچھ بھی فریال کے ساتھ ہوا ہے، مجھے اُس کا افسوس ہے۔ بدقسمتی سے زندگی بھی اس سے وفا نہیں کر رہی ہے، مگر ہم اس کے لیے کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

"کم از کم ایک دُکھ تو آپ اس کا کم کر ہی سکتے ہیں معاذ۔"

"کون سا؟" اُس نے خالی خالی نظروں سے جویریہ کو دیکھا۔

"نارسائی کا دُکھ۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ ٹوٹ رہی ہے معاذ، اس سے پہلے کہ بالکل ہی بکھر جائے، آپ اُسے سمیٹ لیں۔"

"کیسے؟" اُس کا دماغ بالکل ماؤف ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"شادی کر لیں اُس سے۔" پتا نہیں کس جذبے نے اُسے اتنا حوصلہ بخشا تھا۔ وہ خود پر کچھ کم حیران نہیں تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو، بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟" وہ بُری طرح جھلا گیا۔

"یہ ناممکن بھی نہیں ہے۔"

"جویریہ! میں ایک شادی شدہ مرد ہوں، میری زندگی میں اب کسی کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں۔" ایک تو فریال کی محبت کا انکشاف کچھ کم نہ تھا اور اُوپر سے جویریہ کی بات۔ معاذ کے اعصاب بُری طرح چٹخنے لگے۔

"گنجائش پیدا کریں معاذ! میں ہوں ناں آپ کے ساتھ، میں آپ کی مدد کروں گی۔"

"تم میری بیوی ہو کر کس دل سے یہ سب کچھ کہہ رہی ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے، میں تمہارا شوہر ہوں۔" جویریہ پر بھی حد درجہ حیرت ہو رہی تھی۔

"آپ ـــ!"

"خدا کے لیے جویریہ چُپ ہو جاؤ۔" وہ برہم ہو گیا۔

"میں بہت پریشان ہوں اس وقت، مجھے تنگ مت کرو۔ جو کچھ تم کہہ رہی ہو یہ ناممکن ہے، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اور نہ ہوگا۔ بغیر سوچے سمجھے مُنہ سے بات نکال دیتی ہو۔"

"بغیر سوچے سمجھے؟ معاذ! کیا کوئی اپنے وجود کی تقسیم کا فیصلہ بھی بغیر سوچے سمجھے کرتا ہے، چار دن لگے ہیں مجھے اپنے اندر کی عورت کو شکست دینے میں۔ اس زبان کو خاموش کرنے میں جو آپ کی محبت کا واسطہ دے کر میرا راستہ روکتی۔ آپ کی محبت میری زندگی ہے۔ اور میں نے خود کو زندگی کی بازی داؤ پر لگانے کے لیے تیار کر لیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس کھیل میں آپ کو کھونا ہوگا، مگر مات مجھے نہیں ہوگی، اس کا مجھے یقین ہے۔ میں آپ کی ابتدا ہوں، میں ہی آپ کی انتہا رہوں گی۔"

اُسے ایک دم خاموش دیکھ کر معاذ نے اپنا لہجہ پست کر لیا۔

"فریال مجھ سے محبت کرتی ہے، یہ اُس کا اپنا عمل ہے۔ میں نے کبھی اس کے جذبات کی پذیرائی نہیں کی جب میں اُس کے جذبوں کو سمجھ ہی نہیں پایا تو حوصلہ افزائی تو کیا ہی کرتا۔ اُس کی قسمت نے اگر اس کا ساتھ نہیں دیا تو اس میں تمہارا یا میرا قصور نہیں ہے، نہ ہی اب ہم اس کے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔ اب اس کے دُکھ کا کوئی مداوا نہیں۔ میں اس کے درد کا درماں نہیں بن سکتا۔" وہ دوٹوک کہہ رہا تھا۔

جویریہ نے جواب میں مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی۔ اس وقت معاذ سے اس موضوع پر مزید بات چیت کرنا بے کار تھا۔ دل ہی دل میں وہ اپنے حوصلے اور ارادوں دونوں کو مضبوط کرتے ہوئے اُس کے پاس سے اٹھ گئی۔

ایک تو فریال کی اس خاموش محبت سے آگاہی اور اس پر جویریہ کی نرالی تجویز اور فضول گفتگو نے اس کے وجود کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ اس کے ذہن میں ایک دم ہی بہت ساری گرہیں پڑ گئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پہلے کون سی گرہ کھولے۔ خیالات میں اس قدر انتشار تھا کہ ذہن کسی ایک نکتے پر مرکوز ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔

دماغ میں جیسے الاؤ جل رہا تھا۔ وجود میں دھواں ہی دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ اس کے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی کھول دی۔ باہر ہر سُو سناٹا طاری تھا۔

وہ سوچوں کی یلغار میں گھرا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اُس کی نظر ریک پر پڑی، فریال کی ڈائری پر پڑی۔ وہ اسے کھول کر دوبارہ پڑھنے لگا۔ جوں جوں اُس کی نظر لفظوں پر سے پھسل رہی تھی، اُس کے اعصاب کھنچتے جا رہے تھے۔ اُس نے ڈائری ایک طرف پھینک دی، تو اس میں سے اُس کی تصویر نکل کر گر پڑی۔

"میری تصویر ـــ!" اُس نے جھک کر اُٹھالی اور بغور دیکھنے لگا۔

خیالات کی آندھی اُڑا کر اُسے ماضی میں لے گئی۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب وہ خرم سے پہلی بار ملا تھا۔

◆ ● ◡

معاذ بے خبر سو رہا تھا کہ اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کال بیل بجی تھی یا شاید اس کے کان بجے تھے۔ اُس نے مڑ کر دوسرے بستر پر نگاہ ڈالی عتیق آڑا ترچھا پڑا گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ اتنے میں بیل دوبارہ بجی اور بجتی ہی چلی گئی۔ شاید کوئی بیل پر ہاتھ رکھ کر ہٹانا بھول گیا تھا۔

"یہ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" اُس نے گھڑی دیکھی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

گاؤن پہن کر وہ نیچے آیا۔ کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ اندھیرے میں کوئی ہیولا سا کھڑا دکھائی دیا۔ اُس نے پہلے دروازے کے باہر لگی لائٹ جلائی اور پھر دروازہ کھول دیا۔ اُس کے سامنے شال میں لپٹی لڑکی کھڑی تھی۔

"فرمائیے، اتنی رات گئے آپ کیوں لوگوں کے گھروں کی گھنٹیاں بجا رہی ہیں؟"

"پلیز میری مدد کیجیے، میرے بھائی کی طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے، میں اسی گلی کے آخر میں کارنر والے گھر میں رہتی ہوں، میرا فون بھی کام نہیں کر رہا ہے۔ میں نے ایک دو گھروں کی بیل بھی بجائی تھی، مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ آپ کے گھر کی بتی جلتی دیکھی تو یہاں آ گئی۔" اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "پلیز میری مدد کریں۔"

معاذ نے مڑ کر دیکھا کچن کی بتی جلی ہوئی تھی۔ شاید عتیق بند کرنا بھول گیا تھا۔ وہ دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے بغور اُسے دیکھا، خاصی خوبصورت تھی۔ اُس کے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔

وہ التجائیہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے اُمید و بیم کی کیفیت میں کھڑی تھی۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے سختی سے دبا رکھا تھا، جیسے بہت ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"پاکستانی ہیں آپ؟" معاذ نے اُوپر سے نیچے تک اس کا جائزہ لیا۔ ویسے تو اس کے لباس اور گفتگو کے انداز سے وہ سمجھ گیا تھا پھر بھی اُس نے تصدیق چاہی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"جی ہاں"۔ وہ جلدی سے بولی۔

معاذ نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولا "ایک منٹ ٹھہریے، میں ابھی آتا ہوں"۔

وہ کپڑے بدل کر آیا، کی بورڈ پر سے گھر کی چابی اُتاری اور اس کے ساتھ چل دیا۔

لڑکی تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں چلتی ہوئی ایک کارنر ہاؤس میں داخل ہوگئی۔ معاذ بھی اس کے ہمراہ اندر چلا گیا۔

ایک خوش شکل سا نوجوان صوفے پر بیٹھا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کا سارا وجود پسینے میں شرابور تھا۔

لڑکی تیزی سے اُس کے قریب آئی اور اُس کے کندھے تھام لیے۔

"کیا ہوا ہے انہیں؟" معاذ نے تشویش بھری نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

"تقریباً ایک گھنٹے سے بے تحاشا اُلٹیاں ہو رہی ہیں، کسی طرح نہیں رُک رہیں"۔ وہ ضبط کرتے کرتے تھک گئی بالآخر رو پڑی۔

"گاڑی ہے آپ کے پاس یا میں اپنے گھر سے لے کر آؤں؟"

"جی نہیں، آپ جانے کی زحمت نہ کریں۔ ہمارے پاس گاڑی ہے"۔ اُس نے جلدی سے چابی لا کر معاذ کو تھمائی۔

دونوں نے مل کر اُسے گاڑی میں ڈالا۔ معاذ اسے اسپتال لے گیا۔

ڈاکٹر نے چیک اَپ کرنے کے بعد بتایا کہ اسے فوڈ پوائزن ہوگیا ہے۔ پھر اسے ضروری ٹریٹمنٹ دیا گیا۔ آدھے گھنٹے تک اُس کی حالت قدرے سنبھل گئی۔

معاذ کو عتیق کا خیال آیا، وہ اُسے بغیر بتائے آگیا تھا۔

"میں ذرا اپنے گھر فون کر دوں، بغیر بتائے ہی چلا آیا تھا"۔ اُس نے لڑکی سے کہا۔

کوئی دس پندرہ ٹیلی فون کی گھنٹیاں بج چکی تھیں۔ کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا۔

"کہیں بے ہوش تو نہیں ہوگیا، بدبخت موبائل سے بھی تو مردوں سے بدتر"۔ وہ جھنجلانے لگا۔

دوسری طرف کافی دیر کے بعد عتیق نے آنکھیں بند کیے ہی اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر ریسیور اُٹھایا۔

"ہیلو!" اُس کی نیند میں ڈوبی آواز سے ٹیلی فون کے تار جھنجھنائے۔

"شکر ہے تم نے اُٹھایا تو سہی"۔ معاذ نے اطمینان کا سانس لیا۔

"کیا مطلب، کون بول رہے ہیں آپ؟"

"گدھے ہو تم"۔

"اچھا اچھا! آپ میرے بھائی بول رہے ہیں۔ میں پہچان گیا آپ کو۔"

"ذرا پیچھے مُڑ کر دیکھو تم"۔

بے اختیار عتیق نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ معاذ کا بستر خالی تھا۔

"ہیں ـــ معاذ!"

"جی میں!"

"یہ رات ہی رات میں کہاں پرواز کر گئے؟"

"میں یہیں فرنٹی اسپتال سے بول رہا ہوں"۔

"کیا مطلب؟ کیا قفس عنصری سے بھی پرواز کرنے کا پروگرام ہے، خیریت سے تو ہو؟"

"ہاں ٹھیک ہوں، صبح تک آجاؤں گا، تم پریشان نہ ہونا"۔

"کچھ بتاؤ تو سہی"۔

"آکر بتاؤں گا، سو جاؤ اب خدا حافظ"۔

عتیق نے کریڈل پر ریسیور پٹخا اور کروٹ بدل کر دوبارہ سو گیا۔

معاذ فون کر کے واپس آیا تو لڑکی اُسی جگہ کھڑی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کے بھائی کی؟"

"اب بہتر ہیں"۔ اُس کی آواز بھرا گئی۔

"ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ آپ پریشان نہ ہوں"۔ اُس نے تسلی دی۔ "کوئی اور نہیں ہے آپ کے ساتھ، میرا مطلب ہے کہ کوئی رشتہ دار وغیرہ؟"

"نہیں"۔ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

کچھ دیر میں اس شخص کی حالت نارمل ہوگئی۔ ڈاکٹر نے اس کو نیند کا انجکشن دیا تھا اور اب وہ سکون سے سو رہا تھا۔

لڑکی کے حواس بھی قابو میں آئے۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ، اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو پتا نہیں بھائی جان کا کیا حال ہوتا"۔

"ارے کوئی بات نہیں، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے"۔ وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

"اب میں چلتا ہوں۔ کسی قسم کی کوئی ضرورت ہو تو مجھے اس نمبر پر فون کر دیجیے گا، میرا نام معاذ احمد ہے"۔ اُس نے ایک کاغذ پر اپنا فون نمبر لکھ دیا۔

"میرا نام فریال ہے"۔ اُس نے کاغذ ہاتھ میں لے کر اُس پر نگاہیں دوڑائیں۔

ابھی بھلی صبح ہو چکی تھی، جب وہ تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟" عتیق نے پوچھا۔

وہ ناشتا بنا رہا تھا۔

"بتاتا ہوں، صبر تو کرو"۔ وہ دھم سے صوفے پر گر گیا۔

"کل رات ایک لڑکی آئی تھی"۔

"لڑکی ـــ ہائیں ـــ مجھے نہ جگایا؟" وہ چھلانگ مار کر اُس کے قریب آیا۔

"بکواس مت کرو، اُس کے بھائی کی طبیعت خراب تھی، اُسے لے کر اسپتال گیا تھا"۔ اُس نے کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا۔

"نہ جان نہ پہچان اور چل دیے اسپتال"۔

"یار یہ اسی گلی میں کونے والے گھر میں رہتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر کی بتی جلتی دیکھ کر یہاں آگئی تھی۔ تم کچن کی بتی بند کرنا بھول گئے تھے"۔

"لڑکی کیسی تھی؟" اشتیاق کے مارے عتیق کا دم نکلنے کو تھا۔

"میں نے غور نہیں کیا"۔ وہ کشن سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔

"یار جو چیز دیکھنے کی ہوتی ہے، وہ تم دیکھتے نہیں ہو۔ اب اگر میں پوچھوں کہ اس کے بھائی کا حلیہ کیسا تھا تو تم فر فر بتا دو گے"۔

"اپنی ٹرٹر بند کرو، میں سونا چاہتا ہوں"۔ وہ اُس کو منہ لگانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"ایک تو مجھے آج تک تمہاری کسی رومانوی کارروائی کی اطلاع نہیں ملی۔ اتنے گہرے ہو کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کسی سے عشق فرما رہے ہو یا نہیں۔ دیکھو اگر دل کرائے پر دے چکے ہو تو بتا دو۔ قسم سے میں نے تو تمہیں ایک ایک نظر، دل کی ایک ایک دھڑکن کا حال سنا رکھا ہے۔ ہجر کے غمگین لمحات میں دلِ بیقرار کی کیفیات نیز آنسوؤں کے بہاؤ کی رفتار اور اُن کی سمت بھی بتا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ کروٹ بدلنے کا ایک ایک پوز عملاً سمجھا چکا ہوں اور وصل کے رنگین لمحات میں اُن کا شرمانا، اِٹھلانا، اترانا اور اپنا درجہ حرارت، دل کا دھڑکنا، کلیجے کا پھڑکنا، ہاتھ پیروں کا لرزنا، غرض سب بات بتا چکا ہوں۔ تم کو اتنی توفیق نہیں کہ مجھے اپنا ہمراز بنا لو، کچھ نہیں کر سکتا تو کم از کم اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں تم کو مفید مشورے تو دے ہی سکتا ہوں۔" عتیق کی زبان جیسے خود اس کے قابو سے باہر ہوگئی تھی۔

معاذ نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ایک بات تو بتاؤ۔ یہ پتھر چبھتا نہیں ہے؟" اُس نے رازداری سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" معاذ نے بھنویں اُچکائیں۔

"یہ جو تمہارے سینے میں ہے۔" اُس نے معاذ کے سینے پر زوردار ہاتھ مارا۔

معاذ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"قسم سے میرا دل تو اتنا موم ہے کہ ——؟"

"کہ ہر لڑکی سے پہلی نظر میں محبت ہو جاتی ہے۔" معاذ نے اُس کی بات کاٹی۔

"بالکل، میں کفرانِ نعمت نہیں کرتا۔"

"بے غیرت! تمہاری چھٹیاں ہو گئی ہیں، اب پاکستان دفع ہو جاؤ۔"

"میں اس سال نہیں جاؤں گا، یہیں رہوں گا، اور پھر ابھی کچھ مہینے پیشتر ایک چکر لگا کر تو آیا تھا۔"

"اوہ ہاں۔" معاذ کو جیسے کچھ یاد آیا۔ "کل شام کو روحہ کا فون آیا تھا، میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔"

"کل میں اُس سے ملنے نہیں گیا تھا۔ غریب میرے بغیر اُداس ہو گئی ہوگی۔" عتیق نے عجیب مسمسی صورت بنائی۔

"یہ جو تم نے اتنی تھوک کے حساب سے بطخیں پالی ہوئی ہیں، کسی کے ساتھ سنجیدہ بھی ہو یا نہیں؟"

"میں تو نہیں البتہ وہ سب کی سب میرے ساتھ سنجیدہ ہیں۔" وہ اترایا۔

"ویسے سنجیدگی سے اگر تمہاری مراد شادی ہے، تو شادی کے لیے لڑکی میں نے اُسی وقت پسند کر لی تھی جب میں چوتھی کلاس میں پڑھتا تھا۔" وہ توس کھاتے ہوئے بڑے مزے سے کہہ رہا تھا۔

"کون ہے وہ؟" معاذ نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بھئی! ارم اسی زمانے میں پیدا ہوئی تھی، جب میں چوتھی کلاس کا امتحان دے رہا تھا۔"

"اچھا تو ارم سے شادی کریں گے آپ؟"

"ہائے کتنی معصوم ہے وہ کلیوں کی طرح۔" عتیق بے خودی سے بولا۔

"ہائے، اور کتنے خبیث ہو تم شیطان کی طرح۔" معاذ اُسی کے انداز میں بولا۔

"اور یہ جو تم وقفے وقفے سے لڑکیوں پر مرتے رہتے ہو؟"

"ارے لعنت بھیجو ان سب پر، بات تو ساری ارم کی ہے، وہ کہیں تو جی لیں ہم اور وہ کہیں تو مر جائیں۔" وہ مستی میں جھوم جھوم کر بولا۔

"میری طرف سے چاہے جیو چاہے مرو، مگر اس وقت سونے دو، سخت نیند آ رہی ہے۔" معاذ اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا۔

"صرف نیند آ رہی ہے یا خواب میں بھی وہ آ رہی ہے؟" عتیق کھنکتی ہوئی آواز میں بولا۔

"وہ کون؟" معاذ ٹھٹک گیا۔

"جس سے ابھی مل کر آ رہے ہو۔" عتیق نے بے حد شریر نظروں سے اُسے دیکھا۔

"تم کسی دن ضائع ہو جاؤ گے میرے ہاتھوں۔" معاذ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں غائب ہو گیا۔

ٹی وی لاؤنج میں عتیق صوفے پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ اب تم روزِ محشر ہی جاگو گے۔" اُس نے اخبار پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"ہاں بہت دیر ہو گئی، تم مجھے اُٹھا ہی دیتے۔" وہ سستی سے کہتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

"میں کیسے اُٹھاتا بھلا؟"

"کیوں؟"

"میں خود سو رہا تھا۔" وہ برجستہ بولا۔

معاذ اُس کے انداز پر بے ساختہ مسکرایا۔

"چائے پیو گے تم؟"

"ضرور، مگر پہلے نہالوں، پھر اُس شخص کو دیکھنے اسپتال جاؤں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" عتیق جھٹ بولا۔

"بھائی کو دیکھنے یا بہن کو؟" اُس نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"ظاہر ہے بھائی کو دیکھنے ہی جاؤں گا، مگر اگر ایک آدھ نظر پھسل گئی کہیں اِدھر اُدھر پڑ گئی تو میرا تو کوئی قصور نہ ہو گا، آخر بندہ بشر ہوں، کوئی فرشتہ تو ہوں نہیں۔" وہ مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

معاذ نہا دھو کر باہر نکلا تو عتیق بھی تیار ہو چکا تھا۔ کریم شرٹ اور ڈارک براؤن پینٹ میں اچھا لگ رہا تھا۔

"کیا لگ رہا ہوں میں؟" اُس نے معاذ کو چائے دیتے ہوئے پوچھا۔

"جیسے ہمیشہ لگتے ہو، ویسے۔" اُس نے چائے کا کپ تھام لیا۔

"یعنی کہ بے حد خوبرو۔" اُس نے خیالی کالر جھاڑا۔

"جی نہیں، زہر۔ چلو اب اُٹھو، زیادہ پھیلنا نہیں وہاں جا کر۔" معاذ اُٹھ کھڑا ہوا۔

اسپتال پہنچ کر پہلے فلاور شاپ سے خوبصورت سا بُوکے خریدا اور پھر مطلوبہ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر ہلکی سی دستک دی۔

"یہ بُوکے بھائی کو پیش کرنا ہے یا بہن کو؟" عتیق نے ہاتھ میں تھامے پھولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

"شٹ اَپ! دوا دھر مجھے تم سے کوئی بعید نہیں ہے۔" معاذ نے اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

اُسی لمحے دروازہ کھل گیا۔ سامنے فریال کھڑی تھی۔

عتیق ہی کی نظر پہلے پڑی۔ وہ لمحے بھر کو ساکت ہوا اور پھر پلٹ آئی۔

(ایک ٹھٹکی ہوئی نگاہ تو حسن کا حق ہوتی ہی ہے)

"آئیے۔" اُس نے علیک سلیک کے بعد خوش اخلاقی سے کہتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔

"بھائی جان! یہ معاذ صاحب ہیں۔"

"او ہو، اچھا!" اُس نے گرم جوشی سے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً فریال اس کو معاذ کے بارے میں پہلے ہی بتا چکی تھی۔

"میرا نام خرم ہے۔"

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" معاذ نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

"اللہ کا شکر ہے، اب تو ٹھیک ہوں، اگر آپ نے بروقت مدد نہ کی ہوتی تو شاید اب تک فوت ہوئے بھی کئی گھنٹے گزر چکے ہوتے۔"

"اللہ نہ کرے۔" فریال بے ساختہ بولی تو خرم مسکرا دیا۔

"یہ میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں عتیق۔" معاذ عتیق کا تعارف کرانا ہی بھول گیا تھا۔

"بڑی جلدی خیال آ گیا۔" معاذ کے کان میں جلی بُھنی سرگوشی ہوئی۔ سرگوشی میں دانت پیسنے کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

معاذ دل ہی دل میں خاصا محظوظ ہوا۔

"آپ کھڑے کیوں ہیں، تشریف رکھیے ناں۔" فریال نے صوفے کی سمت اشارہ کیا۔

وہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ معاذ، خرم سے بات چیت کرنے لگا۔ کچھ ایک دوسرے کے بارے میں ابتدائی معلومات کا تبادلہ کیا گیا اور کچھ ہلکے پھلکے موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ عتیق بیچ بیچ میں کبھار ایک آدھ بار بات کر لیتا ورنہ زیادہ تر خاموش ہی بیٹھا رہا۔

فریال، خرم کے بیڈ کے داہنی سمت رکھی کرسی پر بیٹھی رسالے کا مطالعہ کرتی رہی۔ اُس نے گفتگو کا حصہ نہ لیا۔

"میرا خیال ہے کافی دیر ہو گئی ہے، اب چلنا چاہیے۔" معاذ کو گزرتے وقت کا خیال آیا۔ ساتھ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہی اُس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

"معاذ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرسکوں" خرم نے تشکر آمیز لہجے میں کہا

"مجھے شرمندہ نہ کیجیے! آپ میرے ہم وطن ہیں مجھ پر حق رکھتے ہیں" وہ بے حد اخلاق سے بولا

"پھر ملاقات ہوگی" خرم نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"انشاء اللہ!" عتیق جلدی سے بولا۔

معاذ نے اس کے پیر پر پیر رکھ دیا۔ وہ تلملا کر رہ گیا۔

دونوں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر آ گئے۔

واللہ! اس سے پہلے قیامت کا صرف ذکر سُنا تھا، آج دیکھ بھی لیا" عتیق باہر نکلتے ہی بولا۔

"ایمان سے میرا دل ابھی تک ہچکولے کھا رہا ہے"

ایسا سویا جاگا حُسن دیکھ کر موصوف کی آنکھیں خیرہ ہو چکی تھیں۔ دل الگ پھسلتے پھسلتے بچا تھا۔

"اچھا! دل سا تھ لے آئے، میں سمجھا کہ وہیں چھوڑ آئے" اُس نے معنی خیز نظروں سے عتیق کو دیکھا

"کہو تو چھوڑ آؤں؟" اُس نے جیسے معاذ سے مشورہ طلب کیا اور ساتھ ہی فوری عملدرآمد کے لیے

دوبارہ کمرے میں جانے کی غرض سے مڑا۔

"بکواس نہ کرو" معاذ نے اس کا بازو تھام لیا اور گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا۔

"ذرا دیکھو عتیق دروازے پر کوئی ہے، بیل بج رہی ہے" معاذ نے کچن میں سے آواز لگائی۔

عتیق نے دروازہ کھولا تو خرم کھڑا تھا۔

"آئیے، آئیے جناب تشریف لائیے"

"یار! تم تو بھول ہی گئے۔ میں نے سوچا کہ یاد دہانی کرا آؤں کہ ابھی تک بقیدِ حیات ہوں" وہ خوش دلی سے بولا۔

"اسلام علیکم" معاذ کچن سے برآمد ہوتے ہوئے بولا۔

"کہاں رہتے ہو بھئی؟ دو ماہ میں خبر ہی نہیں لی۔ میرا خیال ہے کہ اس عرصے میں بمشکل دو چار بار ہی فون پر بات ہوئی ہوگی" اُس کے لہجے میں خلوص اور شکوہ دونوں شامل تھے۔

"بس مصروفیت ہی کچھ ایسی رہی، پاکستان سے مہمان بھی آئے ہوئے تھے۔ عتیق اپنے امتحانوں میں مصروف رہا، تمہاری طرف آنا ہی نہیں ہو سکا" معاذ تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "سناؤ کیسے ہو؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔ اس وقت تو بطورِ خاص اس لیے حاضر ہوا تھا کہ میں نے گھر تبدیل کر لیا ہے۔ تم دونوں کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا"

وہ ان دونوں کو نئے گھر کا پتا سمجھانے لگا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوا

"اب میں چلتا ہوں، کل انتظار کروں گا"

"آپ بے فکر رہیے، انشاء اللہ وقت سے پہلے ہی ہمارا نزول ہو جائے گا" عتیق اُس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

خرم ہنستا ہوا رُخصت ہو گیا۔

"بھئی یہ بے تکلف سی دعوت میں ایسا فارمل سا ڈریس پہننے کی کیا ضرورت ہے؟" معاذ تیار ہو کر باہر نکلا تو عتیق نے سر سے پیر تک اُس کا تنقیدی جائزہ لیا۔

ڈارک گرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس خوبرو معاذ کی وجاہت اور بھی نکھر آئی تھی۔ اُس کے وجود سے اُٹھتی "ڈریکر نوائر" کی خوشبو جو اُس پر خوشگوار اثر چھوڑ رہی تھی۔

"ہاہ" عتیق نے خوشبو سانسوں کے ذریعے اپنے اندر سمیٹی۔

"اب سمجھا۔ ظاہر ہے عشق حُسن کے مقابلے کے لیے چلا ہے، سو کچھ تو تیاری کرنی ہی تھی۔ ویسے اگر جیت نہ پائے تو یقین مانو کہ ہار و گے بھی نہیں" اُس نے تعریفی نگاہوں سے معاذ کو دیکھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر سر کے پیچھے رکھ کر صوفے کی پشت سے سر ٹکاتا ہوا بولا۔

"ایمان سے اگر میں نے چوتھی کلاس میں اپنا دل نہ ہارا ہوتا تو آج سوٹ کے بجائے شیروانی پہن کر اور قاضی کو لے کر پہنچ رہا ہوتا"

"عتیق! میں تمہاری ان باتوں سے تنگ آ چکا ہوں" معاذ چڑ گیا۔

"کھانے کے بعد تمہیں واپس گھر ڈراپ کر کے مجھے فوری طور پر ایئرپورٹ جانا ہے۔ اٹلی سے کچھ کاروباری لوگ آ رہے ہیں، ان کو ریسیو کرنا ہے، پھر ان کے ساتھ ہوٹل جانا ہے"

"اچھا!" عتیق کو جیسے بڑی مایوسی ہوئی۔

"اب چلو گے بھی یا یہیں بیٹھے رہو گے، پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے" معاذ نے کلائی پر گھڑی باندھی اور اپنا والٹ جیب میں رکھا۔

مقررہ وقت سے خاصا لیٹ وہ دونوں خرم کے گھر پہنچ گئے۔ عتیق گاڑی لاک کرنے لگا، معاذ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ دائیں جانب بنے چھوٹے سے لان میں اسے فریال کھڑی نظر آ گئی۔ وہ پھول توڑ رہی تھی غالباً۔

معاذ نے چکنے فرش پر دھیرے سے اپنے جوتے بجاتے "السلام علیکم!"

فریال ایک دم پلٹی اور پھر اس کی نظریں جیسے معاذ کے چہرے پر سمٹ کر رہ گئیں۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے چلی گئی۔

معاذ کو بڑا عجیب سا احساس ہوا۔ وہ اس کے یوں دیکھنے پر کنفیوز سا ہو گیا تھا۔ آسمانی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس پاکیزہ سے حُسن کا خوبصورت احساس لیے، ہاتھ میں پھول تھامے وہ یوں کھڑی تھی جیسے طویل انتظار کی کیفیت اچانک ختم ہو جانے پر ٹھٹک گئی ہو۔

اُس نے سٹپٹا کر فریال کو دیکھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غلط فہمی کس نوعیت کی ہے اور اس کا شکار کون ہو رہا ہے، وہ یا فریقِ ثانی۔

اُس نے کھنکھار کر پتا نہیں اُسے اپنی موجودگی کا احساس کرانا چاہا یا خود اپنی گھبراہٹ کم کرنا چاہی۔

اسی اثنا میں خرم اندر سے باہر اور عتیق باہر سے اندر آ گیا۔

"آؤ یار! بہت ہی انتظار کرایا، پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں" خرم بولا۔

"ایک بلی کھا لو سارے چوہے ختم" جیسا عتیق خود تھا، ویسے اُس کے مشورے۔

سب مسکرا کر اندر کی طرف بھاگ گئے۔ معاذ بھی سر جھٹک کر اپنے ذہن کو اُلجھن سے آزاد کرا کر ان کے پیچھے ہو لیا۔

"فریال پلیز، مزید تاخیر کیے بغیر فوراً کھانا میز پر لگا دو" خرم نے بہن کو مخاطب کیا۔

"کتنے وقتوں کے فاقے سے ہو؟" عتیق صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"گھڑی دیکھو تم" خرم سُلگ گیا۔

"میری گھڑی ذرا آگے ہے" ڈھٹائی میں عتیق لاجواب تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں فریال نے میز پر کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔ وہ تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میز پر فریال، معاذ کے عین سامنے والی کرسی پر بیٹھی۔ عتیق، معاذ کے برابر میں اور خرم، فریال کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کھانے کے دوران ہلکے پھلکے موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ عتیق جس رفتار سے کھانا کھا رہا تھا، اس سے دگنی رفتار سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔

"برائے مہربانی ذرا کم بولا کرو" معاذ اُس کی مستقل ٹر ٹر سے عاجز آ کر بولا۔

"بکومت، میں خاموش ہو گیا تو تمہیں کائنات کے گونگا ہونے کا گمان ہونے لگے گا۔ میرے دم سے تمہارے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گھر میں رونق ہے۔ میں یونیورسٹی چلا جاتا ہوں تو ـــــ!"

"گھر میں سکون ہو جاتا ہے۔ معاذ نے اس کی بات کاٹی۔

"ارے رہنے دو، میری وجہ سے تمہاری زندگی میں بہار ہے، تمہارے اردگرد روشنی ہے اور کیا کہتے ہیں کہ وہ مزید کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ معاذ بولا۔

"حضور! میری اس سماعتِ ناتواں پر آپ کی اس گفتگوِ بے سروپا کا بار ناقابلِ برداشت حد تک گراں گزر رہا ہے، اگر خاطرِ ناگوار نہ ہو اور طبیعت پر جبر نہ ہو تو ازراہِ کرم خاموشی اختیار کیجیے۔"

عتیق بُری طرح چڑ گیا۔ "معاذ! تم سے ہزار دفعہ کہا ہے کہ اس قدر ثقیل گفتگو مت کیا کرو۔ تم سے ہم قسم کے الفاظ نہیں بولے جاتے، تم سے بات کرتے ہوئے کبھی کبھی تو یوں لگنے لگتا ہے، جیسے میر امّن کی باغ و بہار سن رہے ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دونوں گھر میں کس طرح رہتے ہو۔" خرم ہنسی روک کر بولا۔

"بس صبح شام طلاق کی نوبت آتی رہتی ہے۔" معاذ کی اس بات پر زوردار قہقہہ پڑا۔

کھانا کھانے کے بعد فریال نے سب کو کافی بنا کر پیش کی۔

"خرم! مجھے ایئرپورٹ جانا ہے، معذرت خواہ ہوں، زیادہ دیر نہ رک سکوں گا۔" معاذ نے اس سے اجازت چاہی۔

"او کے! پھر آنا کبھی کسی وقت۔"

"تم چکر لگاؤ ناں کبھی! میں تو آفس سے چھ بجے تک گھر آجاتا ہوں، اس کے بعد بوریت ہی بوریت۔"

"کیوں، عتیق آپ کو کمپنی نہیں دیتے؟" فریال براہِ راست معاذ سے مخاطب ہوئی۔

ایک لمحے کو معاذ کا ذہن کسی گزرتے وقت کے کسی پل میں اٹکا اور پھر فوراً ہی حاضر ماحول میں آگیا۔

"ان کی اپنی کمپنیاں بہت ہیں۔" اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

خرم اور فریال دونوں ہی انہیں گیٹ تک رخصت کرنے آئے۔

"معاذ! فریال تمہیں بغور دیکھ رہی تھی۔" عتیق گاڑی بیک کرتے ہوئے بولا۔

"عتیق بور نہ کرو، تمہارے پاس تو بس اسی قسم کے موضوعات ہیں۔" اس نے ٹشو بکس سے ٹشو نکال کر کیسٹ پلیئر آن کرتے ہوئے کہا۔

"بار بار دیکھ رہی تھی۔"

"تو میں کیا کروں؟" وہ سچ مچ چڑ گیا۔

"تمہارے پاس تو دل ہی نہیں ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے عتیق، چاہنے اور چاہے جانے کے جذبات تو بے حد فطری ہوتے ہیں۔ میں محبت جیسے فطری جذبے سے کیسے منہ موڑ سکتا ہوں۔ میں بھی محبت کرنا چاہتا ہوں، مگر اس کی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ اس کے تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے۔ محبت بے شک دیوانگی ہو مگر رسوائی کا باعث نہ بنے۔ بلندی کی جانب پرواز کی مددگار قوت ہو، پستیوں میں اُتار دینے والا الزام نہ بنے، تمہارا خیال غلط ہے کہ میرے پاس دل نہیں ہے، میں بھی سینے میں دل رکھتا ہوں مگر ـــــ!"

"مگر کیا ـــ؟" عتیق نے چہرا موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"مگر سنبھال کر۔" معاذ نے معنی خیزی سے ایک آنکھ میچ کر کہا۔

عتیق بے ساختہ ہنس پڑا۔

"ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتاؤ گے؟"

"ہوں کہو۔" معاذ نے کیسٹ پلیئر کی آواز آہستہ کر دی۔

"فریال تمہیں کیسی لگی؟"

"اگر تم اس کی خوبصورتی کی بات کر رہے ہو ـــ تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ بے حد حسین ہے۔ میں اس سے

اب تک کئی بار مل چکا ہوں۔ شاید اس کی خوبصورتی نے میری آنکھوں کو متاثر کیا ہو، مگر بہرحال میرے دل نے مجھے کوئی اشارہ نہیں دیا۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ اس کے امکانات پیدا ہو جائیں۔ کبھی کبھی سوکھ کر پوری طرح جلنے میں کچھ وقت لگ ہی جاتا ہے۔"

"نہیں۔" معاذ قطعی لہجے میں بولا۔

"جو بات اب تک نہ ہو سکی، وہ آگے جا کر بھی نہیں ہو گی۔ محبت میں بے اختیار عمل اور بے ساختگی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ محبت میں بہت سی باتوں کا شعوری طور پر عمل پذیر ہونا جذبوں کی خوبصورتی کو گہنا کر جذبے کا عنوان تبدیل کر سکتا ہے۔"

"عتیق! میں یہ تو نہیں کہتا کہ میری شریکِ حیات کوئی ماورائی شے ہو گی۔ ساری دنیا سے الگ تھلگ۔ کوئی جنت کی حور۔ نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی بہت عام سی لڑکی ہو، مگر یقیناً اس میں ایسی کوئی بات ضرور ہو گی کہ میں نے اس سے شادی سے قبل، اپنی تنہائیوں میں اپنی سوچوں کا شریک بنا کر ذہن کو مطمئن اور ذات کو ادھورا محسوس کیا ہو گا، جس کی ادا مجھے بیک وقت آسودگی اور تشنگی کا احساس دے جاتے، وہی میری محبت ہو گی اور میں اسے بہت ٹوٹ کر چاہوں گا اس لیے کہ وہ اسی قابل ہو گی۔"

"وہ بہت خوش نصیب ہو گی جسے تم چاہو گے۔" عتیق جیسے اس سے متاثر سا ہو گیا تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

معاذ اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ عتیق کا فون آیا۔

"معاذ! ایک شو ہونے والا ہے کچھ پاکستانی فنکاروں کا۔ دیکھنے چل رہے ہو؟"

اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر ہامی بھرتے ہوئے بولا۔ "چلتے ہیں تم ٹکٹوں کا انتظام کر لو۔"

"میں نے مظہر، زارا اور ارم سے بھی کہہ دیا ہے۔ تم کہو تو خرم اور فریال کو بھی پروگرام میں شامل کر لیں۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

"اگر ٹکٹیں مل گئیں تو میں تمہیں دوبارہ کال کر دوں گا۔" اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

خرم اور فریال، معاذ کے گھر پہنچ گئے تھے۔ طے یہی پایا تھا کہ سب معاذ کے گھر سے ہی ہال جائیں گے۔ مظہر وغیرہ کا دور دور تک پتا نہ تھا اور شو کا ٹائم نکلا جا رہا تھا۔

"آخر کہاں رہ گئے یہ لوگ، عتیق تم فون کر کے معلوم کرو۔" معاذ جھنجلاتے ہوئے بولا۔

عتیق نے فون کیا تو دوسری جانب ارم نے ریسیو کیا۔

"بھئی آخر کب تک آپ کی سواریِ بادِ بہاری آئے گی؟" ارم کی آواز نے حواسوں پر خاصا خوشگوار اثر ڈالا۔ موصوف چہچہاتے ہوئے بولے۔

"بس ابھی دس منٹ میں پہنچتے ہیں۔ آپ تھوڑا انتظار کریں۔"

"میں تو پتا نہیں کب سے انتظار کر رہا ہوں (چوتھی کلاس سے)" وہ دھیرے سے بولا۔

"بس آ ہی رہے ہیں۔" ارم نے ان سنی کر دی۔ "یہ ذرا بھائی جان نے دیر لگا دی۔"

جلدی کرو۔ خرم اور فریال کب کے آچکے ہیں۔"

"اچھا۔" ارم نے فون رکھ دیا۔

دس منٹ میں وہ تینوں بھی پہنچ گئے۔

ہال میں اس قدر رش تھا کہ الاماں۔ وہ سب پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکے تھے۔ افراتفری میں اندر داخل ہوئے سیٹیں بھی بڑی دقت سے ملیں۔ جس کو جو سیٹ ملی غنیمت جان کر اسی پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ معاذ کے ایک جانب فریال دوسری جانب زارا بیٹھے تھے۔ خرم کو مظہر کے برابر جگہ ملی۔ جبکہ عتیق جان بوجھ کر ارم کے پاس بیٹھ گیا۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ سب اسٹیج کی جانب متوجہ ہو گئے۔

"معاذ بھائی، فریال کو چپس دے دیں۔" زارا نے چپس کا پیکٹ معاذ کو پکڑا دیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"لاؤ" اس نے زارا کے ہاتھ سے پیکٹ لے کر فریال کی طرف بڑھایا۔

اندھیرے میں ان کی انگلیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں اور پیکٹ فریال کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ یک دم دونوں نیچے کو لپکے تو سر ٹکرا گئے۔

"سوری" ایک ساتھ ایک دوسرے کو کہا گیا۔

پھر دونوں ہی بے ساختہ ہنس پڑے۔ معاذ نے پیکٹ تلاش کر کے اٹھایا اور اسے دے دیا۔

پروگرام ختم ہونے پر سب باہر نکلنے لگے۔ گیٹ پر خاصا ہجوم تھا۔ ارم اور فریال ساتھ ساتھ آہستہ روی سے چل رہی تھیں۔ معاذ ان دونوں کے پیچھے تھا۔ کچھ اوباش قسم کے نوجوان جان بوجھ کر خواتین سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک لڑکے نے ارم کو جان بوجھ کر کندھا ٹکرا دیا۔ ارم نے چونک کر پلٹ کر دیکھا۔ وہ لڑکا خباثت سے مسکرا دیا۔ معاذ نے اس لڑکے کو گھورتے ہوئے دو قدم آگے بڑھ کر ارم کے شانے پر اپنا بازو رکھ دیا۔ یوں ایک طرح سے ارم اور فریال دونوں ہی اس کے بازو کے حلقے میں آ گئیں۔

واپسی پر سب لوگ خرم کے اصرار پر اس کے گھر رک گئے۔ فریال نے سب کو کافی پلائی۔ خاصی دیر گپ شپ کے بعد وہ لوگ رات گئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔

● ◆

عتیق کے والدین ان دنوں لندن آئے ہوئے تھے۔ اس کے والد کو گردے کی تکلیف تھی۔ وہ اپنا چیک اپ کرانے آئے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عتیق نے ارم کے متعلق اپنی پسندیدگی سے انہیں آگاہ کر دیا تھا۔ بھلا اس کے والدین کو کیا اعتراض تھا۔ یوں ایک سادہ سی تقریب میں عتیق نے ارم کو انگوٹھی پہنا کر اس کے حقوق اپنے نام محفوظ کرا لیے تھے۔ ارم کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد شادی طے پائی تھی۔ جبکہ عتیق اپنا کورس مکمل کر چکا تھا اور اب اپنے والدین کے ساتھ ہی واپس پاکستان جا رہا تھا۔

عتیق بے حد خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی ارم بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ کچھ دیر تک اس کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر چپکے سے کان میں جا کر سیٹی بجا دی۔

"ہائے اللہ" ارم ڈر گئی۔

"بس ڈر گئیں؟" عتیق نے ہوا میں مکھی اڑائی۔

"اب جن بھوتوں سے کون نہیں ڈرتا؟" وہ جل کر بولی۔ پھر ایک دم ہی دانتوں تلے زبان دبالی۔ غالباً منگنی کی انگوٹھی پر نظر پڑ گئی تھی۔

"سوری" وہ آہستگی سے بولی۔ اور دوپٹا شانوں پر برابر کرنے لگی۔

"گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ نہ امی اور نہ بھائی جان، بھابی" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"جس سے ملنے آیا ہوں وہ تو ہے" وہ مسکرا کر بولا "تم سے ملنے کی ہزار کوششیں کر چکا ہوں۔ موقع ہی نہیں ملتا آج ہماری اور تمہاری طرف کے سب لوگ کاظمی صاحب کے ہاں دعوت میں گئے ہیں۔ زارا بتا رہی تھی کہ تم نہیں جاؤ گی۔ میں نے بھی بہانا کر دیا کہ میں کسی اور کام سے جاؤں گا۔ بیٹھو ناں۔ کھڑی کیوں ہو؟" اس نے ارم کا ہاتھ تھام کر پاس بٹھا لیا۔

وہ جھٹکے سے اٹھی اور سامنے والے صوفے پر جا بیٹھی۔

"عتیق ہنس پڑا" گویا یہ فاصلہ طے کرنے کے لیے مجھے دو تین سال کا سفر کرنا ہوگا"

"میں چائے لاؤں آپ کے لیے" وہ اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر بولی۔

"جی نہیں۔ تشریف رکھیے۔ جتنے لمحے میسر ہیں میں انہیں کیش کر لینا چاہتا ہوں۔ پرسوں تو میں جا ہی رہا ہوں۔ یاد کرو گی مجھے؟"

ارم نے جھجکتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"خط لکھو گی؟"

"ہرگز نہیں" وہ بوکھلا کر بولی۔

"کیوں؟"

"نہیں پلیز۔ میں یہ بات نہیں مان سکتی آپ کی"

"خالہ جان سے ڈر لگتا ہے؟"

"دم تو آپ کا بھی نکلتا ہے ان سے"

"خیر ایسی تو کوئی بات نہیں" وہ کان کھجانے لگا "اچھا ہاں۔ یہ تو تمہارے لیے لایا ہوں" اس نے خوبصورت ریپر میں لپٹا ہوا پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔

ارم نے شرگیں مسکراہٹ کے ساتھ لے لیا۔ گفٹ یونہی ہاتھ میں تھامے اور ہاتھ کو گود میں دھرے بیٹھی رہی۔

"کھول کر نہیں دیکھو گی؟" اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔

ارم نے کھولا تو بڑی خوبصورت سی رسٹ واچ برآمد ہوئی۔

"شکریہ"

"اسے کلائی پر باندھتے بھی ہیں" اس نے قریب آ کر ارم سے کہا اور جانے کیا جتانا چاہا۔

اس کے اتنے قریب آ کر کھڑے ہونے سے ارم کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔

"جی۔ میں باندھ لیا کروں گی" وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

عتیق ہنسنے لگا "اچھا جا رہا ہوں میں۔ باہر آ کر خدا حافظ تو کہہ دو"

"خدا حافظ" وہ وہیں سے بولی۔

عتیق کی ہنسی قہقہے میں بدل گئی "اچھا باہر کا دروازہ تو بند کر لو" پھر اسے چھیڑتے ہوئے شرارت سے بولا "ایسا نہ ہو کوئی اور بھوت آ کر ڈرا دے"

"آپ جائیے، میں بند کر لوں گی" وہ اب باہر آنے پر تیار نہیں تھی۔

عتیق نے سر کو جھٹکا دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ارم نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی بڑھا لے گیا۔ اور وہ اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ گلی کا موڑ نہ مڑ گیا۔

○ ● ◆

معاذ، خرم کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوا۔ کاؤنٹر کی جانب نگاہ دوڑائی۔ خرم کہیں نظر نہ آیا۔ البتہ سامنے سے فریال آتی دکھائی دی۔ شاید وہ اسے پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔

"السلام علیکم۔ خرم نہیں ہیں؟" اس نے سلام کے ساتھ ہی سوال داغ دیا۔

"بھائی جان کام سے گئے ہوئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے"

"دراصل میں اس لیے آیا تھا کہ عتیق اپنے والدین کے ساتھ پاکستان جا رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ اپنے والدین اور بھائی بھابی کے لیے کچھ تحفے ہی لے لوں" اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"آئیے گفٹ کارنر پر آئیے" وہ معاذ کو ایک طرف لے گئی۔

وہ مختلف چیزیں دیکھنے لگا۔ فریال پاس ہی کھڑی رہی۔ معاذ چیزیں پسند کر کے ٹرالی میں رکھنے لگا۔ اچانک فریال کاؤنٹر کی دوسری سمت گئی اور البیسٹن کی خوبصورت شیشی نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔

"یہ لیجیے۔ میری طرف سے قبول کریں"

معاذ نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ سے پرفیوم لے لیا۔

"شکریہ۔ میں تحفے قبول کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ ویسے دینے کی کوئی خاص وجہ؟" اس نے یونہی پوچھا۔

"تحفہ دینے کے لیے وجہ کا ہونا ضروری تو نہیں ہوتا" اس نے پلکیں جھپکا کر کہا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں" وہ مسکرا کر پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

"یادداشت کہاں ہو؟" اسے اپنے پیچھے سے خرم کی آواز آئی۔ ساتھ ہی کندھے پر اس کی دھپ وصول کرنی پڑی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"یہیں ہوں۔ تمہاری نگاہوں کے سامنے۔" وہ مڑے بغیر بولا۔
"عتیق کب جا رہا ہے؟" وہ اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔
"تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"اس کا فون آیا تھا۔" خرم نے بتایا۔
"صبح چار بجے کی فلائٹ ہے۔"
"اس کے جانے کے بعد تم بہت اکیلا پن محسوس کرو گے۔"
"ہاں بہت زیادہ۔" معاذ افسردگی سے بولا۔ "اتنے سالوں سے ساتھ رہ رہے ہیں۔ مجھے اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ وہ صحیح کہتا ہے وہ واقعی میرے گھر کی رونق ہے۔"

وہ ٹرالی دھکیلتے ہوئے کاؤنٹر تک لایا۔ بل بنوایا۔ خرم نے خاصی بحث و تکرار کے بعد اس سے پیسے لیے ورنہ وہ پیسے لینے پر آمادہ نہیں تھا۔

"دیکھو یا تو آج رات کو عتیق سے ملنے آیا یا پھر سیدھا ایرپورٹ پر ہی پہنچوں گا۔" اس نے معاذ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

معاذ لدا پھندا گھر پہنچا تو عتیق اس کا انتظار کر رہا تھا۔
"کہاں چلے گئے تھے۔ پتا نہیں کتنے کنوؤں میں بانس ڈلوا چکا تھا۔" وہ اس کی شکل دیکھتے ہی بولا۔
"یار تم جا رہے تھے میں نے سوچا کہ تمہارے ہاتھ گھر والوں کو کچھ سامان ہی بھجوا دوں اور کچھ چیزیں دل کی عنبرینہ بھابی نے بھیجنے کی تاکید بھی کی تھی۔ سو خریدنے گیا تھا۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔
"معاذ۔" عتیق کا لہجہ افسردہ تھا۔ "بہت یاد آؤ گے تم مجھے۔ ہم نے ایک ساتھ بہت اچھا وقت گزارا ہے۔"
"میں بھی تمہیں بہت مس کروں گا۔" عتیق نے بے ساختہ بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔
"تم کب آؤ گے پاکستان؟"
"مستقبل قریب میں تو ارادہ نہیں ہے۔ دیکھو کب آنا ہوتا ہے۔ پھوپی جان نظر نہیں آ رہی ہیں۔" اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے عتیق کی والدہ کے بارے میں استفسار کیا۔
"امی، ابا دونوں ہی خالہ جان کے ہاں ہیں۔ آج رات وہیں ٹھہریں گے۔"
"عتیق بہت تھک گیا ہوں میں۔ آج آخری بار اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پلا دو۔" اس نے اُداس نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمائش کی۔
عتیق مسکراتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گیا۔

○ ● ◆

عتیق کے جانے کے چھ ماہ بعد ہی معاذ کا بھی پاکستان جانے کا پروگرام بن گیا۔ جس دن اس کی فلائٹ تھی اس سے ایک دن قبل وہ خرم سے ملنے کے لیے اس کے گھر چلا گیا۔
"کسی خاص مقصد سے جا رہے ہو؟" خرم نے ایک آنکھ میچ کر کہا۔
"خاص مقصد کیسا؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔
"بھئی کوئی منگنی ونگنی، کوئی شادی وادی۔"
"جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"
"خالی ہے؟" خرم نے معاذ کے دل پر اُنگلی رکھ کر کہا۔
"بالکل خالی ہے۔" اس نے بھنویں اُچکائیں۔
"آئیڈیل کی تلاش میں ہو؟"
"ارے نہیں یار، بس جہاں دل ٹھہرا ہم بھی ٹھہر جائیں گے۔" وہ خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
اور اس سے اگلی صبح معاذ پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا۔
اسے نہیں معلوم تھا کہ پاکستان پہنچ کر اس کی زندگی ایک نیا مگر بے حد حسین موڑ اختیار کرنے والی ہے۔

○ ● ◆

رات کا سفر تیزی سے جاری تھا۔ معاذ نے گھڑی دیکھی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس نے بیڈ پر نگاہ ڈالی۔ جویریہ آنکھوں پر بازو رکھے بے خبر سو رہی تھی۔ وہ بھی بوجھل دل و دماغ کے ساتھ اُٹھا۔ بیڈ روم ریفریجریٹر کھول کر پانی کی بوتل نکالی۔ پانی پینے کے بعد وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔
کتنا دُور تک سفر کر آیا تھا وہ ماضی میں۔

کہیں کوئی اشارا، کوئی لفظ، کوئی نگاہ، کوئی بھی تو سراغ نہیں ملا تھا جو اس کے لیے الزام بن سکتا۔ اس سے کوئی بھی تو خطا سرزد نہیں ہوئی تھی۔
پھر آخر اس کی کون سی ادا کو فریال محبت کا عنوان دے بیٹھی۔
"فریال میں بالکل بے قصور ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ "اور قصوروار تو تم بھی نہیں ہو اس لیے کہ محبت خطا نہیں ہوتی۔
تم وہ لکیر تو پہچان گئیں جو میرے نام کی تھی مگر جس ہاتھ میں وہ لکیر تھی وہ تمہارا نہیں تھا۔
میں اب تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک ہی لفظ ہے۔
"سوری۔"

اس نے کروٹ بدلی۔ تو جویریہ نگاہوں کی دسترس میں آ گئی۔

جویریہ۔
اس کی شریکِ زندگی، اس کی محبت، اس کی ہمراز و دمساز۔
جو پہلے اس کی سوچوں میں بسی، پھر نگاہ میں اُتری۔ وہاں سے دل کو فتح کر کے روح بن کر وجود میں سما گئی۔ اس کی زندگی بن گئی۔
کون سی جگہ خالی ہے؟
نہ سوچ نہ نگاہ، نہ دل نہ وجود، اور نہ ہی زندگی۔
جویریہ ہر جگہ موجود ہے تو پھر کہاں گنجائش ہے کسی اور کی؟
ناممکن۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ جویریہ کس دل سے مجھے یہ مشورہ دے رہی ہے۔ اس بات کا تو مجھے احساس ہو چلا تھا کہ وہ فریال کے بہت قریب آ گئی ہے۔ اس سے بہت محبت کرنے لگی ہے خاص طور پر اس کی بیماری کے متعلق جان لینے کے بعد تو فریال کے متعلق جویریہ کی ہر سوچ بے حد جذباتی ہو گئی۔ اس کی چاہتوں میں شدت آ گئی تھی۔ اتنی کہ اگر وقت پڑتا تو شاید وہ اس کے لیے اپنی جان بھی دے دیتی۔ اپنا شوہر دے دے گی۔ اس کا تو میں قیامت تک تصور نہیں کر سکتا تھا۔

ہونہہ۔ جذباتی ہو گئی ہے بلکہ پاگل۔ اس کو اندازہ نہیں ہے کہ جو کچھ وہ سوچ رہی ہے اس پر عمل خود اس کے ذہنی اور روحانی اذیت کا باعث بن جائے گا۔ کوئی بھی عورت اتنی وسیع ظرف کی مالک نہیں ہوتی۔ چاہے کتنی ہی روشن خیال کیوں نہ ہو شوہر کے معاملے میں فطری طور پر تنگ نظر ہوتی ہے۔ جویریہ بھی عورت ہی ہے۔ فطرت کو شکست دینے کی کوشش میں سب سے زیادہ نقصان میں وہ خود رہے گی۔ ہونہہ جب جلتے انگاروں پر چلے گی اور پیروں کی جگہ روح جھلسے گی تب پتا چلے گا۔ احمق، بے وقوف کہیں کی۔
اسے جویریہ پر حد درجے غصہ آیا۔ ایک غصیلی نگاہ اس پر ڈال کر اس نے جویریہ کی جانب سے کروٹ بدل لی۔

○ ● ◆

شہیر اور جواہر کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ پناہ گاہ میں آج کل شام گفتگو کا ایک ہی موضوع تھا۔ شادی۔ وہ سب کے سب بے حد ایکسائیٹڈ تھے۔ ہر کوئی اپنی جگہ یوں ور رہا تھا گویا اس کی اپنی شادی ہے۔ خمار اور زیبا خاص طور پر آپے سے باہر تھیں۔ ان کے اکلوتے بھائی کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

شادی تھی، وہ جتنی بھی خوشی منائیں کم تھی۔ اگرچہ کہ ایک بے حد تلخ واقعہ اس سلسلے میں رونما ہو چکا تھا مگر اسے شعوری طور پر فراموش کر دیا گیا تھا۔ پناہ گاہ میں یہ پہلی شادی تھی اور وہ سب کے سب بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔

جواہر نہا کر باہر نکلی تو خمار اور زیبا کو اپنا منتظر پایا۔ دونوں اپنے آگے ڈھیر سارے پیکٹس بکھرائے بیٹھی تھیں۔

"کہاں چلی گئی تھیں تم دونوں، اتنی دیر لگا دی۔" وہ سر پر لپٹا گیلا تولیہ کھولتے ہوئے بولی۔

"اپیا اب شاپنگ کرنے نکلو تو دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ خیر تم یہاں آ کر بیٹھو، یہ کپڑے دیکھو۔" خمار پیکٹس کھولنے لگی۔

جواہر ڈریسنگ ٹیبل پر سے برش اٹھا کر اس کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ تولیہ زانو پر پھیلا کر بال بھی سلجھانے لگی اور ان دونوں کے لائے ہوئے کپڑے بھی دیکھنے لگی۔

"یہ کیسا ہے؟" زیبا نے ایک فیروزی رنگ کا دوپٹا کھول کر پھیلاتے ہوئے کہا۔ جس پر زری، سیاہ دھاگے اور سیاہ موتیوں سے کام کیا ہوا تھا۔

"بے حد خوبصورت ہے۔" جواہر نے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ "تم دونوں کی پسند لاجواب ہے۔"

"ہم تینوں بہن بھائی کی پسند لاجواب ہے۔" زیبا شرارت سے مسکرائی تو جواہر جھینپ گئی۔

"زیادہ تر کپڑے گلابی رنگ کے نہیں ہیں۔ پرسوں ہم شاپنگ کرنے گئے تھے تو اتفاق سے گلابی شیڈ زیادہ آ گیا تھا۔ آج بھی تم دونوں زیادہ تر اسی رنگ کے لائی ہو۔"

"دراصل بھائی جان کا فرمان تھا کہ گلابی رنگ کے کپڑے زیادہ بنانا۔ انہیں یہ شیڈ بہت پسند ہے ناں۔" خمار اپنے بھائی کی بات کہتے ہوئے خود بھی جھینپ سی گئی۔

کوئی خوبصورت سا تصور جواہر کے چہرے پر جیالے آیا۔

"ہاں بھئی، اپیا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ واقعی آتشی گلابی رنگ بہت ہو گیا۔ بس اب اس رنگ پر پابندی۔" زیبا نے آتشی ساڑھی تہ کرتے ہوئے کہا۔

"اپیا، کل ہم ریشم چلیں گے وہاں میں نے شرارے کے بہت خوبصورت ڈیزائنز دیکھے تھے۔ دو تین پر تو میرا دل بھی آ گیا تھا۔ بس جلدی سے شادی اور ولیمے کا جوڑا بن جائے تو تیاری مکمل سمجھو۔" خمار نے سارے ڈبے اٹھا کر جواہر کی الماری کے نچلے حصّے میں رکھ دیے۔

"بی بی۔" ریشماں اندر داخل ہوئی۔ اسے سب اناجی کی سیکریٹری کہتے تھے۔ "نیچے چائے پر انتظار ہو رہا ہے۔"

"جا کر کہو ابھی آ رہے ہیں۔" زیبا نے مڑ کر جواب دیا۔

"اپیا تم نہیں چل رہیں؟" خمار، جواہر کو ساتھ آتے نہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"نہیں، میرا چائے پینے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔" اس نے بات بنائی۔

خمار یوں مسکرائی جیسے وہ اس کی بات سمجھ گئی ہو۔ دراصل وہ سب لوگ شہیر کی موجودگی میں اس کا بیٹھنا مشکل کر دیتے تھے۔ کوئی ذومعنی اشارے کرتا، کسی کو جو معنی خیز کھانسی شروع ہوتی تو کسی طرح رکنے کا نام نہ لیتی۔ کوئی حسب حال شعر سنانے بیٹھ جاتا۔ کسی کو ٹھنڈی آہیں بھرنے کا دورہ پڑ جاتا۔ اور کچھ نہیں تو سب مل کر شادی بیاہ کے گانے گانا شروع کر دیتے۔ جس کے ہاتھ جو چیز لگتی، وہ اسے آلاتِ موسیقی کے طور پر بجانا شروع کر دیتا۔ جواہر شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ سو وہ اب ایسی محفل میں جہاں شہیر کی موجودگی کا امکان ہوتا، جانے سے گریز کرتی۔

"چلو تمہارے لیے چائے اوپر ہی بھجوا دیتے ہیں۔" خمار کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔

"شہیر بھائی کے ہاتھ۔" زیبا نے آگے سے اضافہ کیا اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

"کہاں تھیں تم دونوں؟ یہاں کب سے انتظار ہو رہا ہے۔" تاج محل میں بیٹھے شیراز نے ان دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپیا کے کمرے میں تھے۔" خمار کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"جواہر نہیں آئی؟" نہال نے پوچھا۔

"نہیں۔ انہوں نے خود ساختہ نظر بندی اختیار کر لی ہے۔" اس نے بسکٹ چباتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" ذیشان کا چلتا ہوا منہ رک گیا۔

"تمہاری وجہ سے۔" زیبا نے اس کو آنکھیں دکھائیں۔

"کیوں جی؟ میں نے کیا کیا ہے؟" وہ تنک کر بولا۔

"کل جب وہ یہاں آ رہی تھیں تو تم ہی نے ان کو دیکھ کر قوالی پیش کرنا شروع کر دی تھی۔

؎ شرما کے یہ کیوں سب پردہ نشین آنچل کو سنوارا کرتے ہیں
کچھ ایسے نظر والے بھی ہیں جو چھپ چھپ کے نظارا کرتے ہیں

زیبا نے منہ اور چائے دونوں بناتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو اس میں شک بھی کیا ہے؟ ہیں کچھ ایسے نظر والے جو چھپ چھپ کے نظارا کرتے ہیں۔" اس نے کن اکھیوں سے شہیر کو دیکھا۔ جواباً شہیر نے اس کو ایسی کھا جانے والی نظروں سے گھورا کہ اس نے جھٹ نگاہیں نیچی کر لیں۔

"اور اس کے علاوہ ان کو دیکھ کر تم ایسے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہو جیسے اللہ جانے تمہارے سینے میں کتنے برفانی جھکڑ چل رہے ہوں۔" زیبا نے اس کو لتاڑنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "صبح تم نے ان کو ڈھنگ سے ناشتہ کرنے بھی نہیں دیا۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ شہیر بھائی کے دل کی موسمی صورتِ حال کی رپورٹ تفصیل سے پیش کرو اور حاضرین کو مبصرین بنا کر تبصرے کی دعوت دو۔"

"شہیر بھائی نے۔" وہ جھٹ بولا۔ اس کے انداز پر سب ہنس پڑے۔

"ذیشان تم پٹ جاؤ گے میرے ہاتھ سے۔" شہیر نے بظاہر غصّے سے کہا۔ حالانکہ صبح ناشتے پر جو صورتِ حال تھی اس نے بڑا لطف لیا تھا۔

اسی لمحے ان کو گیٹ کی جانب سے جاذب آتا دکھائی دیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ وہ دونوں انہی کی جانب آ رہے تھے۔ وہ سب اس کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ اجنبی کے کپڑے دھول مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ بال بے ترتیب تھے۔ اس نے گرے کلر کی پینٹ اور سلیٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سیاہ جوتوں پر بھی مٹی لگی ہوئی تھی۔

"ڈیر کزنز! ملاقات کا شرف حاصل کیجیے۔ یہ اطہر ہیں۔" جاذب نے قریب پہنچ کر تعارف کرایا۔

"کس قدر پرخطر ہیں۔" زیبا نے ذیشان کی جانب جھک کر سرگوشی کی۔

"ہوں۔ ذرا مونچھیں تو دیکھو۔" ذیشان نے بھی ناقدانہ جائزہ لیا۔

"ایسا لگ رہا ہے کہ دو چوٹیاں لٹک رہی ہیں۔" اس کو حد سے زیادہ مبالغہ آمیزی کرتے ہوئے ذرا خدا کا خوف نہ آیا۔ "سچ ذیشان اگر میں رات کے وقت دیکھ لیتی تو دو دن تک چیخیں ہی قابو میں نہ آتیں۔"

دوسری جانب شہیر، شیراز، نہال وغیرہ اطہر سے بڑی گرم جوشی سے ملنے میں مصروف تھے۔ سیّد صاحب کے دیرینہ دوست، سکندر رضا، اطہر کے دادا تھے اور اطہر کا بچپن اپنے گھر سے زیادہ پناہ گاہ میں انہی لوگوں کے ساتھ کھیلتے کودتے گزرا تھا۔

"تم تو اس طرح فرار ہوئے تھے جیسے ایٹمی راز چرا کر بھاگے ہو۔" نہال اس کے گلے سے لگتا ہوا بولا۔

اطہر ہنس پڑا۔ "بھئی کیا کرتا ممّی اس زمانے میں اتنی سخت بیمار ہو گئی تھیں کہ مجھے اچانک جانا پڑا اور پھر بس وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ویسے تم لوگ مجھے دیکھ کر ڈر تو نہیں گئے؟" اس نے اپنے مٹی بھرے کپڑوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ اپنے اس قدر خراب حلیے پر وہ بے حد الجھن محسوس کر رہا تھا۔

"نہیں۔ کہیں کہیں سے ایسا لگ رہا ہے کہ تمہارا تعلق انسانوں سے رہا ہو گا۔" نہال نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"دراصل یہاں سے کافی دور میری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ میں پیدل چلتا ہوا آ رہا ہوں۔ راستے میں دھول اتنی اڑ رہی تھی کہ یہاں تک آتے آتے زیرِ تعمیر عمارت کی طرح ہو گیا۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"اب تمہارے مستقبل میں کیا ارادے ہیں؟" شہیر ازنے اس کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مستقبل بعید میں تو ایک پرائیویٹ ہاسپٹل کھولنے کا ارادہ ہے اور مستقبل قریب میں فوری طور پر نہانے دھونے کا ارادہ ہے تاکہ پورے کا پورا انسان لگ سکوں۔"

"اقل تو اس کا امکان کم ہی ہے مگر کوشش ضرور کرنی چاہیے اور امید پر دنیا قائم ہے۔" زیبا نے آہستگی سے کہا کہ آدھی دنیا سن لے۔

اطہر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ دوسری جانب شہیر نے زیبا کو نہاتی نظروں سے گھورا۔ پتا نہیں اس نے بے ساختگی میں بھولپن کا مظاہرہ کیا تھا یا بدتمیزی کا۔

"چلو میں تمہیں اپنے کمرے میں لے چلتا ہوں۔ خمار! انابی سے کہہ کر ذرا میرے کمرے میں ہی چائے بھجوا دو۔" جاذب نے پہلے اطہر سے اور پھر خمار سے کہا۔

"چلو۔" اطہر اس کے پیچھے چل دیا۔ زیبا کی کرسی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

"زیبا۔" انابی نے سیڑھیاں چڑھتی زیبا کو پکارا۔

"جی۔" وہ رک گئی۔

"ذرا دیکھنا یہ ریشماں کہاں رہ گئی۔ اس کو چائے دے کر جاذب کے کمرے میں بھیجا تھا۔ یہ سینڈوچز کی پلیٹ بھول گئی اور وہ ہے کہ وہیں جا کر بیٹھ گئی۔"

"لائیے مجھے دے دیجیے۔ میں اوپر ہی جا رہی ہوں۔" اس نے ریلنگ کے اوپر سے جھک کر ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر پلیٹ تھام لی۔

وہ جاذب کے کمرے میں داخل ہوئی تو ایک اجنبی کو صوفے پر بیٹھے پایا۔ جاذب ڈیک پر کیسٹ لگا رہا تھا۔

"ہائیں۔ یہ ایک نمونہ اور آ گیا۔ توبہ یہ جاذب بھائی بھی دوستوں کے معاملے میں خاصے خود کفیل ہیں۔ تھوک کے حساب سے موجود ہیں۔" اس نے صوفے پر براجمان شخص پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔

"زیبا پلیز ذرا چائے بھی بنا دو۔" جاذب نے مڑ کر کہا۔

"ٹھنڈی ہو جائے گی۔ پہلے اس بندۂ خدا کو تو آنے دیں۔ وہ کیا ابھی تک مٹی میں سے نمودار ہونے کی کوششوں میں ہی لگا ہوا ہے۔" اس نے ہاتھ روم کی سمت اشارا کرتے ہوئے، جاذب کے قریب جا کر آہستہ سے کہا۔

مگر اجنبی کے کان ادھر ہی فٹ تھے۔ اس نے زیبا کی بات پر ملتفت ہوتے ہوئے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کون؟ تم کس کی بات کر رہی ہو؟" جاذب کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"بھئی وہی۔" وہ جیسے اس کے سمجھنے پر جھلا گئی۔ "جو ابھی آپ کے ساتھ آئے تھے۔"

"کون آیا تھا؟ اطہر؟ یہ بیٹھا تو ہے۔" اس نے اشارا کیا۔

"جی۔" زیبا پر حیرت کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے آنکھیں حتی الامکان پھاڑ کر اطہر کو دیکھا۔

سفید کلف لگے کرتا شلوار میں ملبوس، دھلا دھلایا خوشبوؤں میں بسا ہوا فریش سا اطہر اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے گیلے گیلے سیاہ بال بے حد قرینے سے جمے ہوئے تھے۔ اس کی سرخ و سفید رنگت پر چوٹیاں (مونچھیں) بے حد بھلی لگ رہی تھیں۔

زیبا مارے شرمندگی کے زمین میں گڑ گئی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ بس زمین پھٹے اور وہ اپنی جملہ حماقتوں اور بے وقوفیوں سمیت اس میں سما جائے۔ اس نے تڑخ بھری اور اگلے ہی لمحے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اطہر کے قہقہے نے خاصی دور تک اس کا پیچھا کیا۔

"ذیشان تم نے دیکھا؟" وہ سلسلہ سے آتے ذیشان سے جا ٹکرائی۔

"کس کو؟" اس نے جھلا کر اسے پرے جھٹکا۔

"اطہر پر خطر کود۔"

"کیوں؟ فوت ہو گئے کیا؟"

"ابھی کہاں؟"

"پھر کیا ہوا؟"

"وہ تو ڈرائی کلین ہونے کے بعد بالکل ہی برانڈ نیو ہو گئے۔ میں تو پہچان ہی نہیں پائی۔" اس نے ساری بات ذیشان کو بتائی۔ دوسرے معنوں میں اپنی حماقت کا رازدار بنایا۔

وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

"اب تم میرا مذاق تو نہ اڑاؤ۔ توبہ ہے۔ حد ہی ہو گئی۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہے ہوں گے۔" وہ بے حد خفت کا شکار ہو رہی تھی۔

اس کی تو ویسے بھی اس خیال سے راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی کہ اتنی بڑی دنیا میں کسی نے اس کے بارے میں کوئی بھی غلط رائے قائم کر لی۔

"سوچ رہے ہوں گے دنیا میں اس احمقوں کی بالکل کمی نہیں ہے اور تم جیسے تو جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔" وہ اس کی چوٹی کھینچ کر بولا۔

زیبا برا سا منہ بنا کر، شرمندہ شرمندہ سی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی خفت کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔

"ہائے اللہ جی! یہ کیسا بے وقوفی کا مظاہرہ ہو گیا۔" وہ دھم سے بیڈ پر گر پڑی۔

○ ● ◆

شہیر اور جواہر کی مہندی کی رسم ایک ہی دن ادا کی جا رہی تھی۔ اس دن پناہ گاہ کی شان نرالی تھی۔ روشنیوں میں ڈوبا ہوا الگ رہا تھا۔ مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ ستاروں کی جیسے بارات اتر آئی تھی۔ خوشی کا احساس فضا میں گھلا ملا تھا۔ ہر دل بے حد یکسا ٹنڈ تھا۔ ایک کیف سا سب پر چھایا ہوا تھا۔ پھولوں کی مہک، چوڑیوں کی کھنک، دبی دبی مسکراہٹیں، بے فکر قہقہے، رنگین آنچل، شوخ جملے بہار بن کر چھا رہے تھے۔ آرکسٹرا پر دھیمے دھیمے بجتی موسیقی کانوں کو بے حد بھلی لگ رہی تھی۔

ایک تو وہ کزنز خود بھی شیطان کی کابینہ کے اراکین میں سے تھے۔ اس پر شہیر کے دوستوں اور جواہر کی سہیلیوں نے ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا۔ گانوں کی نسبت وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے میں زیادہ مصروف تھے۔ دونوں طرف سے جملے بازی، گولہ باری کی طرح ہو رہی تھی۔

خمار انتہائی کوفت کے عالم میں سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا چاندی کا تھال تھا جس میں مہندی سجی تھی۔ اور اس پر خوش رنگ موم بتیاں روشن تھیں۔ اس کا سبز رنگ کا دوپٹا جو اس کے اپنے وزن جتنا بھاری تھا، اس کا ایک پلو قالین پر گویا قالین کی صفائی کرتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اس کو اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیتی۔

"خدا جانے کہاں رکھ دیا۔ ذیشان بے حد لاپرواہ ہے۔" جھلایا ہوا جاذب، ذیشان کو بکتا جھکتا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

"جاذب بھائی سنیے۔"

وہ ٹھٹک گیا۔

"ذرا یہ دوپٹا تو اٹھا کر میرے کندھے پر ڈال دیں۔" اس نے بڑی بے بسی اور بے چارگی سے اشارا کیا۔

جاذب اس کے قریب آ گیا۔ موم بتیوں کی روشنی اس کے چہرے کا ہالہ کیے ہوئے تھی۔ وہ خود بھی کسی شے سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا سبز رنگ کا کرتا شلوار جس پر دبکے کا کام بنا ہوا تھا۔ اس پر بہت جچ رہا تھا۔

جاذب نے اس کے چہرے پر ٹکی نگاہ جیسے مجبوراً ہٹائی۔ وہ قالین پر سے اس کے دوپٹے کا سرا اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ بجلی کی سرعت سے مہندی بھرا تھال اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ خمار خود جھک کر اپنا دوپٹا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اُٹھا کر کندھے پر ڈال رہی تھی۔ اس نے دوپٹے میں اٹکی کھلی ہوئی سیفٹی پن نکال کر صحیح طرح دوپٹا سیٹ کر کے دوبارہ پن لگالی۔

"شکریہ۔" اس نے نظر ملائے بغیر جاذب کے ہاتھ سے تھال لے لیا اور تیزی سے پلٹ گئی۔

جاذب مبہوت کھڑا اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔

"جاذب مودی کیمرا کہاں رکھا ہے؟" نہال پیچھے سے بولا۔

"میرے کمرے میں ہے۔" اس پر کچھ دیر پہلے کا طلسم شاید ابھی تک طاری تھا اس لیے اس کا لہجہ کچھ بہکا بہکا سا تھا۔

"کیا دوسرے کیمرے سے مودی تم خود بنا رہے ہو؟" نہال نے اسے بغور دیکھا۔

"ہاں۔"

"رہنے دو۔ خمار کی مودی تم پھر کبھی بنا لینا۔"

"کیا مطلب؟" جاذب کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

"اچھا اس کا مطلب ہے کہ ہم سے ہی نہیں اپنے آپ سے بھی چھپا رہے ہو۔ برخوردار تمہارے چہرے پر بڑا بڑا لکھا ہے۔

ے آنکھوں سے میری دیکھ کہ تو کتنا حسیں ہے
اور دل سے میرے پوچھ کہ تو اس کا مکیں ہے

کسی لو اسٹوری کا چلتا پھرتا اشتہار بنے ہوئے ہو۔"

"بھئی کزن سے سجن بن جائیں گے تو کیا حرج ہے؟" جاذب شرارت سے بولا۔

"مجھے کچھ کچھ اندازہ پہلے ہی ہو گیا تھا۔ آپ آج کل کچھ زیادہ ہی خمار کے آس پاس منڈلانے لگے تھے۔ بہرحال مجھے خوشی ہوئی۔ بس زیبا ہی ہم سے دُور ہو جائے گی۔" اس نے مبہم لہجے میں کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا چلو۔ تم باہر چلو میں مودی کیمرا لے کر آتا ہوں۔" جاذب یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گیا اور نہال باہر جانے کی غرض سے اُتر گیا۔

خمار اور زیبا دونوں جواہر کو رسم کے لیے باہر لائیں۔ اسے تاج محل میں بٹھایا گیا۔ اس کے اردگرد فیش لائٹوں کی چکا چوند ہونے لگی۔ اسے مہندی لگائی گئی۔ پھولوں کا زیور پہنایا گیا۔ سب نے مل کر اس کے منہ میں بھر بھر کے لڈو ٹھونسے۔ اس کے جانے کے بعد شہیر کچھ جھینپا جھینپا سا دوستوں کے جلو میں برآمد ہوا۔ آف وائٹ شلوار قمیص میں وہ خاصا وجیہہ لگ رہا تھا۔

ذیشان نے اس کو دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا۔ "نعرۂ دولہا!"

"جیسے دولہا، شہیر کے دوست جواباً دھاڑے۔

"ہائے، جواہر کا دولہا تو بڑا شاندار ہے۔" جواہر کی ایک سہیلی نے دوسری کے کان میں سرگوشی کی۔

مگر سرگوشی ذیشان کے کان میں پڑ گئی۔

"آپ پہلے کہہ دیتیں۔ اب تو اپیا انہیں چُگ گئیں۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔" اس نے مارے تاسف کے خراب سی شکل بنائی۔

وہ لڑکی بُری طرح سلگ گئی۔

"ویسے کوئی بات نہیں۔ مایوس نہ ہوں۔ دولہا کے بھائی بھی ایک سے ایک ہیں یہ لیجیے ایک تو یہ پاس ہی کھڑے ہیں۔" اس نے ہاتھ سے اس طرح اشارا کیا کہ بہت بے ساختہ لڑکیوں نے گردن گھما کر پاس ہی کھڑے کیمرے میں ریل ڈالتے خوبرو شیراز کو دیکھا۔

"احتیاط سے کہیں اُنگلیاں نہ کاٹ لیجیے گا۔" وہ شوخی سے بولا۔

سب لڑکیوں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنا شروع کر دیا۔

"پسند آئے؟" وہ بڑے بھولپن سے پوچھ رہا تھا۔ اور پھر خود ہی کان پھاڑ قہقہہ لگایا۔

دوسری طرف زیبا اور خمار اب جواہر کی طرف سے رسم ادا کر رہی تھیں اور شہیر کے مہندی لگا رہی تھیں۔

پھر جب مٹھائی کھلانے کا وقت آیا تو۔

"اوہو ہٹاؤ یہاں سے۔ تم کو پتا ہے کہ مجھے لڈو پسند نہیں ہیں۔" اس نے خمار کا منہ کی طرف بڑھا ہاتھ پرے کیا۔

"آپ کو گھاس اور چنے پسند ہیں؟ کوئی بات نہیں ذرا یہ پتا تو توڑنا۔" جواہر کی کسی شوخ سہیلی نے دوسری سے کہا۔

اس نے تو حکم کی تعمیل میں الدرین کے جن کو بھی مات کر دیا۔ لپک کر کیاری سے پتا توڑ کر سہیلی والی کے ہاتھ میں دیا اور وہ آفت کی پرکالہ پتا شہیر کے منہ میں ٹھونسنے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" شہیر اس سرسبز افتاد سے بُری طرح بوکھلا گیا۔ "بھئی یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" اس نے بڑی بے چارگی سے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا۔ جو عموماً ایسے موقعوں پر دفاعی مورچے سنبھالے ہوتے ہیں۔ مگر وہ اس وقت ایسی پیاری پیاری نوخیز صورتیں دیکھ کر سارے حفاظتی اقدامات بھول بھال گئے تھے۔

"کچھ نہیں ہے۔ بس یونہی مکھیاں ہیں۔" اطہر نے بے پروائی سے کہا اور ساتھ ہی اس کا کندھا تھپتھپایا جیسے دلاسا دیا ہو۔

"یہاں مچھروں کی بھی کمی نہیں ہے۔" پتا بردار سہیلی جل کر بولی اور اطہر کو یوں دیکھا جیسے سالم ہی تو نگل جائے گی۔

"اس طرح نہ دیکھیے۔ ورنہ اس خوش جمال کے تصور سے کئی راتوں تک نیند نہیں آئے گی۔" اطہر اترا تے ہوئے بولا۔

"ہونہہ۔ ذرا خوش فہمی تو دیکھو۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

دوسری جانب نہال اور خمار میں کچھ خفیہ مذاکرات ہوئے اور خمار کمر کس کر میدان میں اُتر گئی۔ اس نے شہیر کی اُنگلی پکڑ لی۔

"لائیں بھائی جان پچیس ہزار روپے نکالیں۔"

"ہائیں۔" اس کی تو آنکھیں باہر کو اُبل پڑیں۔ "وہ کس لیے؟"

"ہمارا نیگ دیں۔"

"یہ نیگ ہے یا تاوان؟" پیچھے کھڑا جاذب، خمار کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

"کوئی زیادہ نہیں ہیں۔" وہ ملتجی پر بل ڈال کر بولی۔ "بھائی جان جلدی کریں۔ ہم اپیا کی بہنیں بھی ہیں۔ ہم کو ہمارا نیگ دیں۔ کدھر ہے آپ کی جیب؟" اس نے شہیر کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اطہر نے جھٹ شہیر کی جیب پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "اس قمیص میں جیب نہیں ہے۔"

"واہ جی واہ۔ ہماری بلی اور ہم ہی سے میاؤں۔ ذرا یاد کرو۔ میں تمہارا ہی بھائی ہوں۔" شہیر نے جیسے خمار کی یاد داشت واپس لاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی مجھے بچاؤ۔ میں کہاں پھنس گیا۔" وہ دہائیاں دیتے بیٹھ گیا اور مدد طلب نگاہوں سے نہال کو دیکھا۔

"بچ کر کہاں جاؤ گے؟ عافیت اسی میں ہے کہ جو کچھ تمہاری جیب میں ہے نکال دو۔" نہال لمحے بھر میں طوطا ہنٹوں کا لیڈر بن گیا۔

اُس کی اس غداری پر شہیر نے تلملاتے ہوئے اسے گھورا۔

"بھائی جان کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟" نزیبا منہ پر آئے بال ہٹاتے ہوئے بولی۔

ذیشان اور نہال ان دونوں کے ہمنوا تھے۔ جبکہ اطہر اور جاذب، شہیر کی طرف کے ہو کر ہر ممکن کوشش کر رہے تھے کہ پھوٹی کوڑی بھی نہ جانے پائے۔

"شہیر بھائی! آپ انکار کریں یا اقرار، یا کریں تکرار، ہمیں ہے اصرار کہ آپ کو دینے ہیں پچیس ہزار۔" خمار کا مطالبہ شاعرانہ انداز اختیار کر گیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

”لو بھئی۔ یہاں تو شاعری فرمائی جا رہی ہے۔“ اطہر، جاذب سے بولا۔

”فکر نہ کریں۔ ہاں تو جوابی کارروائی عرض ہے کہ یہ بحث ہے بیکار، آپ نہ ہوں ہمارے سر پر سوار، زرا ہم کو نہ بجار۔“ اور یہ کہنے کے ساتھ ہی جاذب نے اطہر کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔

موصوف نے داد کی صورت میں دو ہتڑ جاذب کی کمر پر جڑ دیے۔

”جاذب بھائی آپ نہ بولیں۔“ خمار نے جاذب کا ہاتھ پیچھے کیا۔

”اب تو یہ تمہارے ہر معاملے میں بولیں گے۔“ نہال شرارت سے بولا۔ جاذب نے اس کی بات پر اپنے پیر سے اس کا پیر تقریباً کچل دیا۔

”اچھا چلیں آپ بھی کیا یاد کریں گی۔ یہ لیجیے چوتی۔“ اطہر صاحب نے حاتم کی شکستہ قبر پر بلڈوزر سا چلا دیا۔

”ہونہہ۔“ زیبا نے جل کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

چوتی اللہ جانے کس طرف کو پرواز کر گئی۔

”تمہیں شرم نہیں آتی چار آنے نکالتے ہوئے۔ دس پیسے نہیں تھے تمہارے پاس۔“ جاذب نے اس پر برستے ہوئے کہا۔

”اچھا بھئی جھگڑا ختم کرو۔ یہ لو ہزار روپے۔“ شہیر نے جیب سے والٹ نکال کر اس میں سے ہزار کا نوٹ نکالتے ہوئے ان سے کہا۔

ابھی وہ پرس واپس جیب میں رکھنے نہیں پایا تھا کہ ذیشان نے جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے پرس اچک لیا اور قلانچیں بھرتا ہوا وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔

”ارے جاذب اسے پکڑو۔ میرے پرس میں میرا دستخط شدہ بلینک چیک ہے۔“

”کیا؟“ اطہر اور جاذب دونوں سر پیٹ کر رہ گئے۔

”شکریہ۔“ زیبا اور خمار کورنش بجالاتے ہوئے بیک وقت بولیں۔

شہیر اس بات کو ڈاکا ڈالنے کی مہذب واردات قرار دیتے ہوئے دوستوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔

○ ● ◆

جواہر کی سہیلی، زیبل کے ہاتھ پر مہندی لگا رہی تھی۔

”باجی ڈیزائن خوبصورت ہونا چاہیے۔ میرے ہاتھوں پر سٹرکیں نہ بنا دیجیے گا۔“ اسے مہندی کے ڈیزائن کی سخت فکر تھی۔

”بے فکر رہو۔ ڈیزائن خوبصورت ہی ہو گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اُف اللہ۔ آج میں بہت تھک گئی۔“ خمار تھکن کا اعلانیہ اظہار کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

”آپی تم کہاں چلی گئی تھیں؟“ زیبل نے پوچھا۔

”نہال بھائی گئے ہیں، ان سے کچھ چیزیں منگوانا تھیں۔ لسٹ بنا کر دے رہی تھی۔“ خمار بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔

”کیا نہال بھائی چلے گئے؟“ وہ صدمے کے عالم میں بولی۔ ”ہائے روکا نہیں۔“

وہ ہاتھ چھڑا کر کمرے سے یوں نکلی جیسے بندوق سے گولی۔ پر ہائے ری قسمت۔ عین اسی وقت جاذب کے کمرے سے باہر نکلتا اطہر اس کے سامنے آ گیا۔ زیبل نے اپنے آپ کو اس سے ٹکرانے سے بچانے کے لیے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ اطہر کی سفید براق قمیص پر مہندی کے بڑے بڑے دھبے لگ گئے۔ وہ بہ نفسِ نفیس خود بھی اس سے جا ٹکرائی۔

”اوہ سوری۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ صورتِ حال نے اسے بوکھلا دیا۔

”سبحان اللہ کیا کہنے ہیں۔“ وہ ڈپٹ کر بولا۔ ”آپ نے سوری تو کہہ دیا مگر ہمارا جو گیا سو گیا۔ سوری کہہ دینے سے بھلا کسی کا نقصان پورا ہو جاتا ہے؟“

”کیسا نقصان؟“ وہ حیران رہ گئی۔

”یہ جو آپ نے ہزار نیوٹن کی فورس سے دھکا مارا ہے۔ کیا پتا اندر سے کچھ ٹوٹ گیا ہو، کچھ کھو گیا ہو۔“

”جی۔“ وہ اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

”آپ نہیں جانتیں۔“ وہ سرگوشی میں رازدارانہ انداز میں گویا ہوا۔ ”بعض اوقات واردات اس صفائی اور خوشی سے ہو جاتی ہے کہ انسان کو ساری زندگی پتا نہیں چل پاتا کہ وہ کتنی قیمتی چیزوں سے محروم کر دیا گیا۔“ وہ معنی خیزی سے بولا۔

اس کی بات زیبل کے کچھ سر کے اوپر اور کچھ اندر سے گزر گئی۔ وہ بُری طرح نروس ہو گئی۔

”آپ اکیلے آئے ہیں؟“ اس نے گھبرا کر بات بدل دی اور جاذب کے بارے میں پوچھا۔

”آپ کہتیں تو بارات لے کر آتے۔“ وہ ابھی تک پچھلے موڑ پر تھا۔

زیبا کی پلکیں اس کے رخساروں پر سایہ فگن ہو گئیں۔

ے نیچی نظروں میں قیامت کا اثر ہوتا ہے
حُسن کچھ اور نکھر جاتا ہے شرمانے سے

”اور اس تحفے کا شکریہ۔“ اس نے اپنی قمیص پر لگے بڑے بڑے دھبوں کی طرف اشارا کیا۔ ”میں یہ داغ ہی نہیں چھوٹنے دوں گا۔“ وہ جذب کے عالم میں بولا اور آگے بڑھ گیا۔

زیبا اپنی جگہ بت بنی اسے دیکھتی رہ گئی۔

○ ● ◆

”بھئی ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔ ایمان سے ایسا لگ رہا ہے جیسے بھولے بھٹکے جنّت میں آ گیا ہوں۔“ ذیشان کمرے میں داخل ہوتا ہوا بولا۔

”بے فکر رہو تم بھولے بھٹکے ہی جنّت میں جاؤ گے۔ تمہارا اعمال نامہ بہت سیاہ ہے۔“ خمار آئینے کے سامنے کھڑی میک اپ کر رہی تھی۔

جواہر اور زیبا دونوں کچھ ہی دیر قبل پارلر سے تیار ہو کر پہنچی تھیں۔ خمار اپنا ہیر اسٹائل دوپہر میں ہی بنوا آ گئی تھی۔ البتہ میک اپ وہ خود ہی کر رہی تھی۔

جواہر دلہن بنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس پر بہت روپ آیا تھا۔ چہرے پر آسمانی چھب تھی۔ نظر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ زیبا اس کے پاس ہی کھڑی اپنے دوپٹے کو اسٹائل دے رہی تھی۔

”ذیشان تم جاؤ یہاں سے۔“ زیبل سے پن نہیں لگ رہی تھی۔ اس پر جھلاہٹ سوار تھی۔

”لاؤ میں تمہاری مدد کر دوں۔“ وہ اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھا۔

”نہیں کوئی ضرورت نہیں۔ اچھا چلو ذرا میرا دوپٹا اس طرح پکڑ لو۔“ وہ واقعی بے حد معصوم اور سادہ تھی۔

خمار نے آئینے میں سے بہن کو دیکھا اور سر کو جھٹکا دیا۔ ایک نظر ذیشان پر ڈال کر بولی۔

”ویسے ذیشان ایک بات ہے۔ آج تم بہت اچھے لگ رہے ہو۔“ اس نے کھلے دل سے کہا۔

سیاہ شیروانی اور سفید شلوار میں ملبوس کم عمر ذیشان کی نوجوانی پر خاصا نکھار آیا ہوا تھا۔

”کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔“ اس نے زیبا کی انگلی اپنے دانتوں کے درمیان دبا کر زور سے کاٹ لی۔

وہ بُری طرح چیخ پڑی۔ ”بدتمیز۔ جنگلی کہیں کے۔“

ذیشان خمار سے مخاطب ہو گیا۔ ”اے میری ازلی دُشمن! یہ ہمارے کان بجے ہیں یا تم نے ہماری تعریف میں تھوڑے ناکافی الفاظ ادا کیے ہیں؟“

”اب تم پھول کر کپّا نہ ہو جانا۔ ورنہ دروازے سے باہر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔“ زیبا نے اپنے دوپٹے کا سرا اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔

”پلیز خواتین آپ جلد از جلد تیار ہو جائیے۔ دادا جان نے کہا تھا کہ ٹھیک آٹھ بجے یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ راستہ کافی لمبا ہے۔ ہوٹل کا ایک کمرا آپ لوگوں کے لیے بُک ہے۔ تیاری میں جو کمی ہو آپ ہوٹل

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جاکر پوری کر لیجیے گا۔ نو بجے تک آپ لوگوں کا ہال میں حاضر ہونا ضروری ہے کیونکہ مہمانوں کی آمد و رفت شروع ہو چکی ہوگی۔ جتنی دیر میں مہمان آئیں گے اور نکاح ہوگا۔ اپیا ہوٹل کے کمرے میں آرام کر لیں گی۔" اس نے زیبا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بس ہم لوگ تھوڑی دیر میں تیار ہوتے جاتے ہیں۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" خمار نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں نیچے انتظار کر رہا ہوں۔ آپ لوگوں کے ساتھ میں ہی جاؤں گا۔" وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"سنو ذیشان، شیراز بھائی کہاں ہیں؟" جواہر نے مدھم لہجے میں اپنے بھائی کو پوچھا۔

"اپیا وہ اور نہال بھائی ہوٹل جا چکے ہیں۔ ذرا ہال وغیرہ کے انتظامات دیکھنے تھے۔" وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

"بھئی میں تو تیار ہو گئی ہوں۔" زیبا نے گویا اعلان کیا۔ "بس اب مجھے زیور ہی پہننا ہے۔"

"تمہارا زیور میرے سیف میں ہے۔" خمار نے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا کر، ٹشو دونوں ہونٹوں کے درمیان دبا کر دوبارہ لپ اسٹک لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں آپی میں نے نکال لیا تھا۔"

اپنے کمرے میں آ کر اس نے الماری کھولی۔ اور دراز میں سے بڑا سا ڈبہ نکالا۔ اس میں اس کا سفید، سرخ، سبز موتیوں سے سجا طلائی سیٹ موجود تھا۔ اس نے نیکلس گلے میں ڈال کر کانوں کے بندے بے حد احتیاط سے کانوں میں اٹکائے اور ان کے سہارے پنوں کی مدد سے بالوں میں لگا لیے۔ آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر باہر نکلنے لگی۔

"اوہ چوڑیاں تو بھول ہی گئی۔" وہ واپس پلٹی۔

اس نے چوڑیاں خمار کے سیف سے نکال کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی تھیں۔ اب جو اس نے میز پر نظر دوڑائی تو چوڑیاں غائب۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ جلدی جلدی میز کی درازیں کھول کر دیکھا مگر وہاں ہوتیں تو ملتیں۔ اس کی صبیح پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔

"کہاں چلی گئیں۔" اس نے اپنی پوری الماری کھنگال ڈالی مگر کہیں نہیں ملیں۔ مارے پریشانی کے اسے رونا آ گیا۔

"کہاں جاؤں، کہاں تلاش کروں؟" وہ کمرے کے وسط میں کھڑی اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہی تھی۔ اسی لمحے ذیشان اس کے کمرے کے آگے سے سیٹی بجاتا ہوا گزرا۔

"ذیشان۔" اس نے پکارا۔

"کیا ہے؟" اس نے دروازے سے اندر جھانکا۔

"ذیشان۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"کیا ہو گیا؟" وہ ایک دم پریشان ہو کر اس کی طرف بڑھا۔

"میری سونے کی چوڑیاں گم ہو گئی ہیں۔ دادا جان نے پرسوں ہی نئی بنوا کر دی تھیں۔ میں نے آپی کے سیف میں رکھ دی تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے نکالا کہ یہاں اپنی ڈریسنگ ٹیبل پر لا کر رکھی تھیں۔ اب وہاں نہیں ہیں۔" آنسو اس کی پلکوں میں پھنس کر رہ گئے۔

"اوہ۔" ذیشان تشویش سے بولا۔ "کون لے جا سکتا ہے بھلا۔ تم صحیح طرح یاد کرو کہ تم نے کہاں رکھی تھیں۔ تم چیز رکھتی کہیں ہو اور ڈھونڈتی کہیں ہو۔"

"نہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میز پر ہی رکھی تھیں اور یوں بھی میں نے ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔" وہ باقاعدہ رونے لگی۔

"افوہ اب روؤ تو نہیں۔ مل جائیں گی یہاں سے بھلا کہاں جائیں گی۔ فی الحال پرانی والی پہن لو۔ بعد میں تلاش کر لینا۔" اس نے زیبا کا شانہ تھپتھپا کر تسلی دی۔

مگر اس کے موٹے موٹے آنسو ٹپکتے چلے گئے۔

"زیبا پلیز رونا بند کرو۔ تم روتی ہو تو میں اپ سیٹ ہو جاتا ہوں۔ دیکھو تمہارا میک اپ بھی اس طرح رونے سے خراب ہو جائے گا۔"

"آپی مجھ سے ضرور پوچھیں گی کہ میں نے نئی چوڑیاں کیوں نہیں پہنیں۔" اسے چوڑیوں کی گمشدگی کے ساتھ ساتھ خمار سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔

"اوہو ایک تو یہ آپی بھی جلّاد ہی ہے۔ کہہ دینا کہ کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔ دیر ہو رہی تھی اس لیے تلاش کرنے کے بجائے پرانی پہن لی تھیں۔ جاؤ اب جا کر چہرا صاف کرو اور جلدی سے باہر آؤ۔ ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" وہ باہر نکل گیا۔

زیبا افسردگی سے کچھ دیر وہیں بیٹھی رہی۔ پھر اُٹھ کر ٹشو پیپر سے چہرا صاف کر کے ہلکا ہلکا فیس پاؤڈر لگایا۔ الماری کھول کر اپنی پرانی سونے کی چوڑیاں نکال کر پہنیں اور جواہر کے پاس جانے لگی کہ راستے میں اس کو اطہر مل گیا۔

"کیا بات ہے آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔" اس نے زیبا کی روئی روئی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔

"جی نہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ رُکھائی سے کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

"یہی ہیں ناں آپ کی چوڑیاں۔" اسے اپنے پیچھے سے آواز آئی۔

زیبا تیزی سے پلٹی۔ اطہر کی ایک اُنگلی میں اس کی چوڑیاں جھول رہی تھیں۔

"ہاں۔" اس نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر لینا چاہا مگر اطہر نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"خاصی بے پروا ہیں آپ۔"

"کہاں سے ملیں آپ کو؟" اس نے بے تابی سے سوال کیا۔

"یوں رکھ چھوڑتی ہیں آپ اتنی قیمتی چیزوں کو۔" وہ اپنی کہے گیا۔

"ہم یوں نہ چھوڑیں تو لوگ چرائیں کیسے۔" اس کے مُنہ سے پھسل گیا۔

"بہت خوب۔" وہ خاصا محظوظ ہوا۔ "بھئی ہم چوری کی ہوئی چیزیں واپس نہیں کرتے۔" اس نے یہ کہہ کر کمال اطمینان سے چوڑیاں کوٹ کی جیب میں ڈال لیں۔

"مسٹر اطہر۔" اسے اس کی ڈھٹائی پر غصّہ آ گیا۔

"صرف اطہر۔ میں تکلفات کا بالکل قائل نہیں ہوں۔" وہ بڑے مزے سے بولا۔

"میری چوڑیاں واپس کر دیجیے۔ آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔" اس نے اطہر کی بات نظر انداز کر کے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں واقعی حد سے بڑھ چکا ہوں۔" وہ ذو معنی انداز میں بولا۔

"آپ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟"

"آپ بتانے کی مہلت تو دیجیے۔" اس نے برجستہ کہا۔

"اُف۔" زیبا بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اطہر کو اس پر ترس آ گیا۔

"یہ لیجیے۔" اس نے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چوڑیاں بالآخر واپس کر دیں۔

اس کو شرارت بھری نظروں سے دیکھتا، مُسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ اس کی پُشت کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

"ذیشان مجھے چوڑیاں مل گئی ہیں۔" وہ اس کے پاس آ کر مطمئن سے انداز میں بولی۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ اطہر بھائی سے کیا گفتگو فرمائی جا رہی تھی۔ من و عن میرے گوش گزار کر دو۔" اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ چور کہیں کے۔" اس نے بُرا سا مُنہ بنایا۔ "انہوں نے ہی چُرائی تھیں۔"

"چوڑیاں کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے تو بڑی انمول شے چُرا لی۔"

"کیا؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "اور بھی کچھ چُرایا ہے۔ پروفیشنل معلوم ہوتے ہیں۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ہاں۔ زیبا کو چرا لیا انہوں نے ہم سے۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ذیشان تم ہوش میں ہو۔"

"بھئی بابا جان (سکندر رضا) آئے تھے دادا جان کے پاس، کہ جب سے میرے پوتے نے تمہاری پوتی کو دیکھا ہے۔ اس کی نیند، بھوک، پیاس سب اڑ گئی ہے۔ اور وہ مرضِ عشق میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس کا فوری علاج یہ ہے کہ تمہاری پوتی سے اس کی شادی کر دی جائے۔ دادا جان نے غور و خوض کرنے کے بعد ہم لوگوں سے بھی رائے لی۔ پھر دادا جان نے شہیر بھائی سے کہا کہ وہ تمہاری رضا بھی معلوم کر لیں۔ ہمیں سوجھی شرارت۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ تم کو زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز دیا جائے۔ لہٰذا اس بات کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ویسے بھی چونکہ اطہر بھائی معقول قسم کے انسان ہیں اس لیے یہ فکر نہیں تھی کہ تم کو کسی قسم کا اعتراض ہو گا۔"

"ہونہہ۔ تم سے کس نے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔" وہ جلے بھنے لہجے میں بولی۔

"اچھا چلو۔ اٹھاؤ تم کوئی نکتۂ اعتراض۔" وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اطمینان سے بولا۔

زیبا کو فوری طور پر کوئی بات نہ سوجھی۔ بس الجھی الجھی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

ذیشان اس کی خاموشی پر معنی خیزی سے مسکرایا۔ "تم ان کے ساتھ ہمیشہ خوش رہو گی۔ وہ ہر لحاظ سے بہت اچھے ہیں۔ شادی کا ابھی اتنی جلدی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ فی الحال ان کا ایک اپنا ہاسپٹل کھولنے کا ارادہ ہے۔ تم جانتی ہو وہ ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں۔" وہ لمحہ بھر کو رکا پھر شرارت سے گویا ہوا۔

"خیر اب تو پیشنٹ بھی ہو گئے۔"

"ہائے۔ کیا دل کی بیماری بھی ہے؟" اس کا اپنا دل دھڑک گیا۔

"ہاں ہو گئی ہے۔" اس نے خراب سی شکل بنائی۔

"کوئی خطرناک قسم کی ہو گی۔ اس کے باوجود دادا جان میری شادی ان سے کر رہے ہیں۔" زیبا کو اپنے مستقبل میں ہر طرف بلیک آؤٹ نظر آنے لگا۔

"علاج بھی تو تمہارے پاس ہے۔" وہ منہ پھاڑ کر ہنسا۔

"اوہ شٹ اپ۔" اس کی تو سمجھ میں ہر بات دیر سے ہی آیا کرتی تھی۔

"ویسے ذیشان۔" اس نے بھولپن اور معصومیت کا فقید المثال مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے ساری بات تو بتا دی مگر یہ نہیں بتایا کہ شہیر بھائی کے نکاح کے بعد منگنی کی رسم بھی ادا کی جائے گی۔" اس نے دانتوں تلے لب دبا کر مسکراہٹ دبائی۔

"ہیں۔" ذیشان چکرا گیا۔ گھورتے ہوئے بولا۔ "تو تم کو سب معلوم تھا۔ مجھے اتنی دیر سے بے وقوف بنا رہی تھیں۔"

"ہوں۔" اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ "ویسے کیا خیال ہے؟ میں اداکاری بڑی اچھی کرتی ہوں ناں؟" وہ اترائی۔

"بکواس نہ کرو۔" اسے اپنے بے وقوف بنائے جانے کا خاصا صدمہ ہوا۔ "تم کو یہ سب کس نے بتایا؟"

"نہال بھائی نے۔" وہ مزے سے کہہ کر چلتی بنی۔

ذیشان اس کو گھورتا رہ گیا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

دولہا بن کر شہیر بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی سرخی بن کر جھلک رہی تھی۔ نکاح کے بعد سب نے اس کو گلے سے لگا کر مبارکباد دی۔ نہال اس کے قریب آیا، تو وہ خود دو قدم بڑھ کر اس کے سینے سے لگ گیا۔

"اے جانِ دوست! زندگی کی حسین ساعتیں مبارک ہوں۔" نہال کی آواز بھیگ گئی۔

"نہال آج میں بہت خوش ہوں، بہت آسودہ۔" شہیر کا لہجہ بھی جذبات سے بوجھل تھا۔

اس سے علیحدہ ہو کر نہال، سید صاحب کی طرف بڑھا۔

"ماما جان! آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔" اس نے ان کے گلے لگنا چاہا۔

"ہاں تم کو بھی مبارک ہو۔" سید صاحب نے ہاتھ سے اشارا کیا۔ بے رخی سے کہہ کر وہ دوسری جانب متوجہ ہو گئے۔ جلتے ہوئے نیزے کی انی نہال کے سینے میں گڑ گئی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ ضبط کرنے کی کوشش میں اس نے اپنے لب کاٹ لیے۔ ابھی ابھی وہ دیکھ چکا تھا کہ سید صاحب نے شیراز اور ذیشان کو بڑی محبت سے سینے سے لگایا تھا۔

"میں ہر دفعہ کیوں بھول جاتا ہوں کہ میں وادیٔ پرخار کا مسافر ہوں۔" اس کے دل کو اس وقت بڑی ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ بری طرح ہرٹ ہوا تھا۔

کچھ دیر تک وہ ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑا خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر چہرے پر خوشگواری کا ماسک چڑھا کر وہ دوبارہ اسٹیج پر چڑھ گیا، جہاں روشنیوں کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ فوٹوگرافر دھڑا دھڑ شہیر اور جواہر کے فوٹو کھینچ رہے تھے۔ جواہر سمٹی ہوئی سی شہیر کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ شہیر چوری چوری ایک آدھ نظر اس پر بھی ڈال لیتا تھا۔

"ذرا صبر بھئی۔" جاذب نے اس کی چوری پکڑ کر اس کے چٹکی بھری۔

"چلیے شہیر بھائی! جلدی سے اپنا جوتا اتاریں۔" زیبا اپنا شرارہ سنبھالتی ہوئی میدان میں اتری۔

"کس کی تواضع کرنی ہے؟" ذیشان نے دخل در معقولات کی۔

"تمہاری!" خمار نے جوتا تو نہیں البتہ اپنا ہاتھ اس کے سر پر زور سے جڑ دیا۔

"تمہارا ہاتھ ہے یا ہتھوڑا؟" ذیشان نے برا سا منہ بنا کر کہا اور ساتھ ہی سر ہلانے لگا۔

"زیبا تمہارا دماغ خراب ہے؟" شہیر جوتا چھپائی کی رسم سے ناواقف تھا۔ "غضب خدا کا، بھلا بتاؤ معزز مہمانوں کی اتنی گیدرنگ میں دولہا جوتے اتار کر ایک طرف رکھ کے ننگے پاؤں بیٹھا ہے۔" ایسے شرمناک اور افسوسناک قسم کے تصور کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر شرمندگی کے واضح آثار نمودار ہو گئے۔

اس نے چاروں جانب نظر دوڑائی۔ مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کچھ ان کی جانب بھی متوجہ تھے۔

"میں ہرگز جوتا نہیں اتاروں گا۔" اس نے اپنے کھسوں میں قید پاؤں پیچھے کر لیے۔

"کیوں کیا جلدی میں دو مختلف رنگ کے موزے پہن کر آ گئے۔" نہال نے جملہ کسا۔

"شہیر بھائی! ہم کو جوتا چھپائی کے پیسے دیں، آپ جوتا اتار کر نہیں دیں گے، تو ہم خود اتار لیں گے۔" خمار کے عزائم جارحانہ لگ رہے تھے۔ اس نے مڑ کر زیبا اور ذیشان کی طرف دیکھا۔ "چلو بھئی حملہ کر دو۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ تینوں شہیر پر پل پڑے۔ جاذب اور اطہر پاس ہی کھڑے تھے۔ وہ سرعت سے ان کے حملے کو پسپا کرنے کے لیے آگے بڑھے۔

عجیب مضحکہ خیز صورتِ حال تھی۔ زیبا، خمار اور ذیشان اس کے داہنے پیر کا جوتا اتارنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے اور جاذب اور اطہر دوبارہ پہنانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔

دلہن صاحبہ اپنے نئے نویلے، نوزائیدہ قسم کے دولہا کی یہ درگت بنتے دیکھ کر اپنی مسکراہٹ ضبط کر رہی تھیں۔

"بے وقوف کہیں کے۔" نہال جو قدرے فاصلے پر اطمینان سے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑا تھا۔ ان وغیرہ کو دیکھ کر بولا۔ پھر سکون سے آگے بڑھ کر شہیر کے بائیں پیر سے جوتا نکال لیا۔

"غدار! تم کو تو میں دیکھ لوں گا۔" شہیر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"لائیے پچیس ہزار روپے۔" خمار نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

جوتے کے حصول کی کشمکش میں اس کی کافی چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اس کی کلائی سے کہیں کہیں سے خون رس رہا تھا۔

"ہرگز ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ کیسی عجیب و غریب لڑکیاں ہیں اور کس قدر بے ہودہ طریقۂ واردات

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہے؟" وہ بھنا کر بولا۔

اُس کا ایک پاؤں جوتے سے محرومی کا شکار تھا۔ اُسے خجالت محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنا پاؤں ٹیڑھا کر کے صوفے کے نیچے کر لیا تھا۔

"سارے زمانے میں یہی دستور ہے۔" زیبا بے نیازی سے گویا ہوئی۔

"ہاں تو پھر آپ پچیس ہزار نہیں دیں گے؟"

"قطعی نہیں۔"

"تو بیس ہزار دے دیں۔" زیبا کی بات اور اُس کے برجستہ لہجے پر زوردار قہقہہ لگا۔

"بالکل نہیں، حد ہو گئی۔"

"اچھا ہم پانچ روپے کم کر دیتے ہیں۔" خمار نے اُس کی اگلی پچھلی نسلوں پر احسان کرتے ہوئے بارگیننگ کا آغاز کیا۔

"شہیر! بہنوں کی بات رد نہ کرو۔" سید صاحب پوتیوں کا جھگڑا بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے مسکراتے ہوئے دخل انداز ہوئے۔

"واہ دادا جان! میں تو لٹ گیا پہلے ہی ان لوگوں کے پاس میرا بلینک چیک موجود ہے۔" اُس نے سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

بہر حال خوب بحث و تکرار کے بعد اُس کو دینے ہی پڑ گئے، تب کہیں جا کر اُس کے جوتے کی رہائی عمل میں آئی۔

"میرا خیال ہے وجاہت کہ منگنی کی رسم بھی ادا ہو جائے۔" سکندر رضا، سید صاحب کے قریب آ کر بولے۔

"ضرور۔" سید صاحب نے خمار کو اشارا کیا۔

اُس نے مزے سے اِدھر اُدھر مٹر گشت کرتی زیبا کو جا پکڑا۔

"چلو بھئی تمہاری منگنی کی رسم بھی ادا ہو جائے۔" اُس نے اپنے خیال میں دھماکہ کیا۔

زیبا بیگم مزے سے اُس کے ساتھ چل پڑیں۔ زیبا کا ردِ عمل اُس کی توقع کے قطعی برخلاف تھا۔

"تم کو حیرت نہیں ہوئی؟" وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"حیران وہ ہو جو انجان ہو، ہمیں سب خبر ہے بچہ۔" اُس نے بڑی فقیرانہ شان سے جواب دیا۔

خمار اُس کو گھورتی ہوئی اسٹیج تک لائی اور جواہر کے برابر میں بٹھا دیا۔

"آؤ اطہر۔" شیراز نے آواز دی۔

اطہر میاں شریر شریر سے انداز میں زیبا کے برابر دھم سے آ کر بیٹھ گئے۔ اُس نے ہرگز جان بوجھ کر اسے کہنی نہیں ماری تھی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا کہ اس کی کہنی بہت زور سے زیبا کی پسلی میں لگ گئی تھی۔ زیبا کو یوں لگا جیسے کسی نے کیل ٹھونک دی۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔

اطہر نے بے حد دھیرے سے اُس کے چھوٹے سے ہاتھ کی نازک انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔

"بارات گھوڑے پر لاؤں یا ——؟" اُس نے دوپٹے کی اوٹ سے بغور معائنہ فرماتے ہوئے کہا۔

"گھوڑے پر گدھا اچھا نہیں لگے گا۔" وہ بدستور بلبلاہٹ کا شکار تھی۔ اطہر کی شوخ آواز پر اُس نے اپنی جھلاہٹ میں تلملاہٹ کا اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ پسلی میں لگ شدید درد کا احساس تھا اور وہ سہلانے کی پوزیشن میں نہ تھی۔

"مگر گدھے کے ساتھ گدی تو بے حد اچھی لگ رہی ہے ناں؟" اُس نے شرارت سے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

"میرا خیال ہے کہ گھوڑا ہی مناسب رہے گا۔ میں گھوڑے پر بیٹھ کر ہی آؤں گا۔"

"میری طرف سے گھوڑے کو اپنے اُوپر بٹھا کر لے آنا۔" وہ دانت بھینچ کر بولی۔

اطہر نے بمشکل اپنا قہقہہ حلق میں گھونٹا۔ اُس کا دل تو اس وقت اتنا آؤٹ آف کنٹرول ہو رہا

تھا کہ بس چلتا تو اسی وقت نکاح پڑھوا کر زیبا کو ساتھ لے کر چلتا بنتا۔

"یہ لو شہیر! تم اطہر کو گھڑی پہنا دو۔" سید صاحب نے جیب سے رسٹ واچ نکال کر شہیر کے ہاتھ میں دی۔

"نہال تم پہنا دو۔" شہیر نے قریب کھڑے نہال سے کہا۔

"شہیر! میں نے تم سے کہا ہے۔" سید صاحب کی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔

نہال کو یوں لگا، جیسے سید صاحب نے بھری محفل میں اُسے چانٹا رسید کیا ہو۔

"جلدی کرو ناں نہال، منہ کیا دیکھ رہے ہو۔" شیراز نے تیزی سے بڑھ کر شہیر کے ہاتھ سے گھڑی جھپٹی اور نہال کے ہاتھ میں تھما دی۔

اُس نے نہال کے جھکے سر کو اونچا کر دیا تھا۔

نہال نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر وہی مخصوص سی نرمی تھی۔ وہ مسکراتی نگاہوں سے اطہر اور زیبا کو دیکھ رہا تھا۔ نہال نے ایک نظر سید صاحب کے سپاٹ چہرے پر ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر اطہر کی کلائی میں گھڑی باندھ دی۔

"اطہر! تم ہماری بہن کو ہمیشہ خوش رکھنا، یہ بہت بھولی اور معصوم ہے۔"

"معذرت کے ساتھ اضافہ ہے کہ تھوڑی سی بے وقوف بھی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ اور ساتھ ہی کن انکھیوں سے زیبا کی طرف دیکھا، جو اُس کی بات پر ساری شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر مارے غصے کے اُسے گھور رہی تھی۔

کافی دیر تک فوٹو گرافی کا سلسلہ چلتا رہا۔ خاصی رات گئے جواہر کی رخصتی عمل میں آئی۔

"خدا کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے تمہارے فرض سے سبکدوش کیا۔ خدا تمہیں سدا آباد رکھے۔" سید صاحب نے بہت محبت سے جواہر کو سینے سے لگایا اور اُس کے ماتھے پر بوسا دیا۔

قریب کھڑے شیراز نے بھی بہن کو گلے سے لگایا۔ خمار اور زیبا، جواہر کو سہارا دے کر اسٹیج سے اتارنے لگیں۔

اچانک نہال تیزی سے اُن کی جانب بڑھا۔

"جواہر! دیور بن کر ساتھ چلوں یا بھائی بن کر یہیں سے رخصت کر دوں؟"

جواہر نے ایک دم پلکیں اُٹھا کر اُس کی سمت دیکھا۔ اُس کی بات سید صاحب کے کانوں سے بھی جا ٹکرائی تھی۔ نہال کے چہرے پر گڑی نگاہ بہت عجیب سی تھی۔

"جیسا تمہیں مناسب لگے۔" شہیر نے اُس کا شانہ تھپتھپایا۔

نہال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جاذب! گاڑی تم لے جاؤ۔" اُس نے گلاب کے پھولوں سے ڈھکی سیاہ مرسیڈیز کی چابی جاذب کے ہاتھ میں دی۔

نہال نے جواہر کو گاڑی میں بیٹھنے میں مدد دی۔ خمار پیچھے جواہر کے ساتھ بیٹھ گئی۔ زیبا فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کچھ ہی دیر میں سب لوگ ایک ساتھ روانہ ہو گئے۔

○ ● ◆

نہال نے دروازے کے ہینڈل کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ کھل گیا۔ دوسری طرف سید صاحب کھڑے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر سید صاحب اُس کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

نہال نے پلٹ کر اُن کی پشت کی طرف دیکھا۔

"السلام علیکم نانا جان!"

"وعلیکم السلام۔" اُنہوں نے رُخ موڑے بغیر جواب دیا اور سیدھے نکلتے ہی چلے گئے۔

طویل سفر کی وجہ سے وہ پہلے ہی تھکا ہوا تھا۔ سید صاحب نے اُسے جس طرح نظر انداز کیا تھا، اُن کے اس رویے نے اُس کے ذہن و اعصاب دونوں کو بُری طرح بوجھل کر دیا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

بے رُخی اور بے اعتنائی کی چھری بڑی کند ہوتی ہے۔ انسان لمحہ لمحہ کر کے مرتا ہے۔

"یار میں سوچ رہا ہوں کہ مستقلاً اپنے فلیٹ پر ہی منتقل ہو جاؤں۔" وہ سب ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ نہال اچانک بولا۔

"ہیں۔" وہ سب چونک گئے۔

"کیا مطلب؟" خمار نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مطلب یہ ہے کہ راستہ بھی کافی طویل ہے۔ روز آتے جاتے دیر بھی ہو جاتی ہے۔" اس نے بات کو سرسری رنگ دینے کی کوشش کی۔

"تمہارا جی بھر گیا ہے ہم سے؟" شیراز کا ٹھنڈا لہجہ اور بھی برفیلا ہو گیا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" وہ جھلا گیا۔

"اور جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ صحیح اور مناسب ہے؟" ذیشان نے برا مان کر کہا۔

"اچھا بابا! معاف کر دو، یوں ہی ایک بات زبان سے پھسل گئی تھی۔" نہال نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"نہال! کیا بات ہے؟" شیراز نے اسے ایسے دیکھا کہ وہ نظریں چرا گیا۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"کوئی بات ہے ضرور، ورنہ تم اتنی بڑی بات یوں ہی نہیں کہہ سکتے۔" جاذب نے اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

نہال نے کہنا تو بہت کچھ چاہا، مگر لفظوں نے ساتھ نہ دیا۔ حلق میں گولہ سا اٹک گیا۔ وہ صرف نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"یہ بتاؤ کہ شہیر کا فون آیا تھا؟" نہال نے بات بدل دی۔

"جی ہاں، آج کل موصوف فرانس میں ہیں، تم سے بات ہوئی؟" جاذب نے پوچھا۔

"نہیں، میری تو اب تک اس سے بات ہی نہیں ہو سکی۔ البتہ کافی دن پہلے اس کا ایک کارڈ ملا تھا، جو اس نے لندن سے پوسٹ کیا تھا۔"

"یہ شہیر بھائی بمعہ اہلیہ گئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بمعہ اہل و عیال ہی واپس آئیں گے۔" ذیشان نے حسبِ عادت شُرچھوڑ دیا۔ وہ سب ہنس پڑے۔

نہال بظاہر تو ان سب میں بیٹھا ہنس بول رہا تھا، مگر اس کے اندر جو گرداب بن رہے تھے، وہ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

○ ● ◆

"انابی! آپ کہاں چلی گئی تھیں۔ میں کافی دیر سے تلاش کر رہا تھا؟" نہال، انابی کے کمرے میں داخل ہوا۔

"میں نماز پڑھ رہی تھی بیٹے!"

"آپ میرے لیے دعا کیوں نہیں کرتیں؟" وہ ان کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گیا۔

"اولاد کے لیے دعائیں تو ہر وقت ماں کے لبوں پر رہتی ہیں۔ میں اپنے بیٹے کے لیے دعا نہیں کروں گی؟

اللہ تجھے تندرستی دے، لمبی عمر عطا کرے۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"مجھے لمبی عمر نہیں چاہیے۔" وہ جھنجلا گیا۔ "مجھے محبت چاہیے، سکون چاہیے۔"

"ناشکرے لڑکے! تیری زندگی میں کس چیز کی کمی ہے۔ آسودگی ہے، اطمینان ہے، اتنے بہت سے لوگوں کی محبت حاصل ہے۔"

"اتنے بہت سے لوگوں کی محبت حاصل ہے، مگر سب لوگوں کی تو نہیں ہے ناں۔" وہ برجستہ بولا۔

انابی چپ سی ہو گئیں۔ ان کے پاس نہال کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"انابی! یہ قسمت کا لکھا ہمارے بس میں کیوں نہیں ہوتا؟" اس کا بے تکا سوال اس کی بڑھتی ہوئی فرسٹریشن کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

"میرے بچے قسمت اگر ہمارے اختیار میں ہوتی، تو خدا کے وجود کا کون اقرار کرتا؟"

"بے شک آپ ٹھیک کہتی ہیں، مگر انابی! ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم جس سے چاہیں، اس سے محبت کر سکتے ہیں، مگر جس کی چاہیں، اس کی محبت حاصل نہیں کر سکتے، ہم اتنے بے اختیار کیوں ہیں؟"

"نہال! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" وہ اس کے بے ربط سوالوں سے پریشان ہو گئیں۔

"انابی! میں سوچتا ہوں کہ اگر انسان کے سینے میں دل نہ ہوتا، تو کتنا اچھا ہوتا۔ یہ دل بڑی فضول سی شے ہے، کیا یہ آپ کو فساد کی جڑ نہیں لگتا؟"

"نہال! اگر دل نہ دھڑکے تو انسان زندہ کیسے رہے؟" وہ حیران پریشان تھیں۔

"چلو اچھا مان لیا کہ زندہ رہنے کے لیے دل کا دھڑکنا بے حد ضروری ہے، مگر اللہ نے جب دل دیا ہی تھا، تو اس میں احساس کیوں ہے؟ ہم لوگ بے حس کیوں نہیں ہیں؟ میں بے حس کیوں نہیں ہوں؟" نہال کا ذہنی انتشار بے معنی اور بے ربط جملوں کی صورت میں نکل رہا تھا۔

انابی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"انابی! یہ آنسوؤں کا وجود کیوں ہے؟ دُکھ کا وجود کیوں ہے؟ درد بے معنی کیوں نہیں ہوتے؟ اس قدر معنی خیز کیوں ہوتے ہیں؟ اور درد کے بعض مفہوم تو انابی ایسے ہوتے ہیں کہ زندگی سے دور لے جانے لگتے ہیں۔" وہ کھڑکی سے باہر خلا میں گھورتے ہوئے بولے ہی جا رہا تھا۔

"نہال! یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" ان کی پریشانی انتہا کو پہنچ گئی۔

"انابی!" اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "آپ کو یاد ہے آپ بچپن میں ہم سے کہا کرتی تھیں کہ سب انسان محبت کے قابل ہوتے ہیں، سب سے محبت کرنی چاہیے؟"

"ہاں بالکل! ہر انسان پیار کے قابل ہوتا ہے۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرا تھام لیا۔

"تو یہ بات آپ نے نانا جان سے کیوں نہیں کہی۔ آپ ان سے کہیں کہ میں بھی انسان ہوں، میں بھی محبت کے قابل ہوں۔" اس کے الفاظ سُلگ رہے تھے۔

اور شیراز جو کمرے کے اندر داخل ہو رہا تھا، باہر ہی رُک گیا۔

"نہال! تو نے کیوں امیدیں لگا رکھی ہیں؟ بیٹے آس کے یہ چراغ بجھا کیوں نہیں دیتا؟ اس طرف کے دروازے بند کیوں نہیں کر دیتا؟" وہ بے بسی سے بولیں۔

"بعض اوقات روشنی کا احساس بند دروازوں میں بھی تو ہوتا ہے۔ امید بھی تو روشنی ہے۔" انابی کے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کا دباؤ بڑھ گیا۔

"نہال! تم سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہو۔ تم ان کی طرف بڑھو جو تمہاری طرف بڑھتے ہیں۔ قریب آنے کے لیے ایک دوسرے کی سمت میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ مخالف سمتوں میں چلنے والے کیسے ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔ تم سید صاحب کا خیال دل سے نکال دو۔ تم ان کے لیے شجرِ ممنوعہ ہو، جسے وہ پسند نہیں کرتے، جس کے قریب وہ جانا نہیں چاہتے، مگر کچھ کر بھی نہیں سکتے، اس لیے کہ وہ درخت تو ان کے اپنے گھر میں لگا ہوا ہے۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

نہال کچھ دیر خاموش رہا، پھر بے چینی سے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"اچھا انابی! میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، ایک کپ چائے بھجوا دیجیے، سر میں درد سا محسوس ہو رہا ہے۔" وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ انابی تفکر بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہیں۔

نہال کمرے سے باہر نکلا تو شیراز سے اس کا سامنا ہو گیا۔

"کیا بات ہے نہال؟ مضمحل سے لگ رہے ہو؟" اس نے بغور دیکھا۔

"کچھ نہیں، یوں ہی سر بھاری بھاری محسوس ہو رہا ہے۔" وہ کنپٹیاں ملتے ہوئے بولا۔

اور شیراز نے اس کے ذہن کی گرہیں کھولنے کا ارادہ پھر کسی وقت کے لیے ملتوی کر دیا۔ ورنہ وہ اس وقت

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس سے تفصیلی بات چیت کرنا چاہتا تھا۔

"او۔کے، تم جاؤ آرام کرو۔"

نہال اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

شیراز اُس کی پشت پر نگاہ جمائے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

○ ● ◆

"پھر آپ نے کیا سوچا؟" کھانا کھاتے ہوئے جویریہ ایک دم ہی بولی۔

"کس بارے میں؟" معاذ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"فریال سے شادی کے بارے میں۔" اُس نے یوں کہا، جیسے کوئی بہت عام سی بات کہی ہو۔

معاذ کے چہرے پر ایک دم تناؤ کی کیفیت نمودار ہوگئی۔

"تمہاری بات اتنی فضول اور احمقانہ ہے کہ میں ہاں چھوڑ نہ میں بھی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

اُس نے بے حد خشک لہجے میں جواب دیا۔

"آپ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں، سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"پہلے میں تمہیں تو سمجھ لوں کہ آخر تم کیا چیز ہو؟" اُس نے تیز نظروں سے گھورا۔

"معمہ بن گئی ہے میرے لیے۔"

"معاذ پلیز! آپ اپنے رویّے میں لچک پیدا کریں، اس مسئلے کو سلجھانے میں میری مدد کریں۔"

"اوّل تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اگر مسئلہ ہے بھی تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ سختی سے بولا۔

"کیسے نہیں ہے آپ کا تعلق؟ آپ ہی تو اس کا بنیادی کردار ہیں۔" اُس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ختم کرو اس موضوع کو۔" معاذ نے دو ٹوک کہا۔

"بات ابھی ختم کہاں ہوئی ہے، ابھی تو آغاز ہوا ہے؟"

"جانتی ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟" وہ چبھتے ہوئے انداز میں بولا۔

"تین زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔"

اُس نے جیسے اُسے ڈرانا چاہا۔

"نہیں، اگر آپ میری بات مانیں گے تو کوئی زندگی بھی برباد نہیں ہوگی۔ کوئی بھی بے مراد نہیں رہے گا۔" وہ پُر اُمید لہجے میں بولی۔

"جویریہ! تم چاہتی کیا ہو؟" وہ زِچ ہوگیا۔

"کیا سوچا ہے تم نے آخر؟"

"بڑی سیدھی سی بات ہے، آپ فریال سے شادی کر لیں۔ آپ کو اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ آپ سے کتنی شدید محبت کرتی ہے۔ آپ اُس کے جذبوں کا مان رکھ لیں۔ اُس کی چاہتوں کے صلے میں کم از کم اپنی محبت دے دیں کہ اسے اپنے جذبات کے رائگاں جانے کا احساس نہ ہو۔ وہ ٹوٹ رہی ہے۔ آپ جوڑ نہیں سکتے، مگر کرچیاں تو سمیٹ لیں۔"

"یہ مت بھولو جویریہ! کہ یہ سب کچھ تم جس شخص سے کہہ رہی ہو، وہ تمہارا اپنا شوہر ہے۔"

"جانتی ہوں، مگر یہ عمر بھر کا سودا نہیں ہوگا۔ یہ تو صرف لمحوں کی بات ہوگی۔ آپ اور میں دونوں جانتے ہیں کہ وہ تیزی سے موت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ زندگی کے چند گنے چُنے لمحوں میں اگر آپ کی رفاقت سے اس کی محرومیاں مِٹ جائیں، تو یہ بہت مہنگا سودا نہیں ہوگا۔"

"ان چند لمحوں کی رفاقت کے لیے میری زندگی، میرا گھر، میری محبت، میری خوشیاں، میرا سکون سب کچھ داؤ پر لگے گا اور تم کہتی ہو کہ یہ مہنگا سودا نہیں ہے؟"

(ہونہہ نہیں معاذ احمد! داؤ پر تو صرف جویریہ کی ذات لگے گی)

"اُف خدایا! مجھے تو یہ سوچ سوچ کر وحشت ہونے لگی ہے کہ جب اور لوگوں کو یہ بات پتا چلے گی تو کیا ہوگا۔ کیسی کیسی باتیں بنیں گی، کیا جواب دوں گا میں ان سب کی باتوں کا، کس طرح ان کی زبان بند کروں گا۔ تمہارے اور اپنے والدین کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ ابھی تو میری شادی کو سال بھی نہیں ہوا ہے اور میں دوسری شادی کے چکر میں لگا ہوں۔ تم صرف خود کو یا مجھے ہی نہیں ہم سے وابستہ نہ جانے کتنے لوگوں کو اذیت میں مبتلا کر دو گی۔"

"ایسا نہیں ہوگا اور نہ ہی آپ کو کسی کے آگے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ میں سب کا سامنا کروں گی۔ میں ان سب کو سمجھا دوں گی، میں آپ کی ڈھال بن جاؤں گی، آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟"

"یا اللہ! میں کیا کروں؟" اُس کا دل چاہا اپنے بال نوچ لے، اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے، وہ دوبارہ سمجھانے کے انداز میں گویا ہوا۔

"ذرا عقل سے سوچو جویریہ! اس شادی کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ اُلٹا ہم تینوں پر ظلم ہے، یہ فریال کے ساتھ کیا زیادتی نہ ہوگی؟ کیا ہے میرے پاس اُسے دینے کے لیے؟ کیا دے سکتا ہوں میں اس کو؟ صرف جسمانی قربت؟ اور اس میں بھی خلوص نہ ہوگا، صرف دکھاوا، صرف بہلاوا، کیا یہ اس کے ساتھ خیانت نہ ہوگی کہ جسمانی طور پر تو میں اُس کے ساتھ رہوں اور سوچوں میں تم بسی ہوئی ہو۔ بات اُس سے کروں اور مخاطب تم ہو۔ دیکھوں اُس کو اور تصوّر تمہارا ہو۔ قدم قدم پر اُس سے جھوٹ بولوں جھوٹی محبّت کا ڈھونگ رچاؤں۔ پُرفریب چاہت کے سہارے اُس کے جذبات، اس کی انا سے کھیلوں اُس کو فریب دینے کا عمل میرے دل کا بوجھ بن جائے گا۔ دوسری طرف اس کا شوہر ہونے کے ناتے، مجھ پر عائد اس کے حقوق نباہنے کی شرعی ذمّہ داری میں کوتاہی کا خوف، خدا کے عذاب کی صورت میں میرے سر پر ننگی تلوار کی طرح لٹکا رہے گا۔ آخر کس قصور کی سزا بھگتوں میں؟ میں اپنی مرضی کے خلاف شادی کیوں کروں؟ میں ایک خوش و خرم زندگی بسر کر رہا ہوں، مجھے کس چیز کی کمی ہے؟ مجھے تم سے کیا کچھ حاصل نہیں؟ ایک مرد اپنی بیوی سے جو توقعات رکھتا ہے، جو خواہشات رکھتا ہے، وہ سب تم نے پوری کی ہیں۔ تم نے مجھے ہر خوشی دی ہے، ہر طرح مطمئن رکھا ہے۔ جواب میں، میں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا ہے، تم سے محبت نہیں عشق کیا ہے۔ ذرا یاد کرو میری چاہتوں کو، اُن لمحوں کو جب تمہارے عشق میں، میں نے دیوانگی کی حدوں کو چھوا ہوگا اور پھر موازنہ کرو ان لمحات سے، جب وہی میں ہوں گا، وہی محبّت، وہی لمحے، مگر اس محبّت میں میری شریک تم نہیں فریال ہوگی۔"

وہ اُسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ قدرے توقف کے بعد وہ پھر شروع ہوگیا۔

"کیا یہ تم پر ظلم نہ ہوگا کہ میں تم کو اپنی محبّت، اپنی قربت سے محروم کر دوں، تم پر سوکن لا بٹھاؤں، کیوں تم اپنی دُشمن بن گئی ہو۔ یہ میرا اور تمہارا گھر ہے۔ اس کی فضا میں رچی خوشگواری تمہاری اور میری باہمی محبّت کا نتیجہ ہے۔ اس گھر میں طمانیت کا احساس، اس آسودگی کا مرہونِ منّت ہے، جو ہمیں ایک دوسرے سے حاصل ہے۔ قدر کرو تم اُس محبّت کی، جو تمہیں نصیب ہے۔ شکر کرو پروردگار کا کہ اُس نے تمہیں اس نعمت سے نوازا ہے۔ کیوں تم جلتے ہوئے چراغ سے کھیل رہی ہو، کیوں اپنے گھر کو آگ لگانے پر تلی ہوئی ہو۔" مارے غصّے کے معاذ کا چہرا سُرخ ہو رہا تھا۔

"ضروری تو نہیں ہے کہ چراغوں سے آگ لگ جائے، یہ روشنی بھی تو دیتے ہیں۔" وہ بے حد دھیمے لہجے میں بولی۔

"بے وقوف! یہ روشنی نہیں ہے، یہ فریب ہے، جو تم اپنے آپ کو دے رہی ہو۔ اس لڑکی کو خوشی دینے کے چکر میں تم اپنے حصّے کی خوشی سے بھی محروم ہو جاؤ گی۔ جویریہ تم نہیں جانتیں، تم خودکشی کر رہی ہو، تم عورت ہو عورت ہی رہو، میں تمہارا شوہر ہوں، مجھے اپنے آپ سے دور مت کرو۔ نفس کی مہار اپنے ہاتھ میں رکھنا اور بات ہے، مگر فطرت کو بدلنے کی کوشش مت کرو۔ کوئی بھی عورت شوہر کی تقسیم پر راضی، خوش اور مطمئن نہیں رہ سکتی۔ جو کچھ عورت کو اپنے شوہر سے میسّر ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس کی محبّت، قُربت، خلوت اس میں دوسری عورت بالکل اسی انداز میں برابر کی حصّہ دار بن جائے۔ یہ کوئی عورت برداشت نہیں کر سکتی۔ میں سوچ سوچ کر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تھک چکا ہوں کہ آخر فریال کی طرف داری میں وہ کون سا جذبہ ہے، جس نے تم کو اپنی فطرت سے لڑنے پر آمادہ کر لیا ہے۔ تم مجھے آخر کس طرح دوسری شادی کے مشورے دے رہی ہو؟

ہونہہ!" وہ طنزیہ ہنسا۔ "آج کہاں ہیں تمہارے وہ خوف، تمہارے وہ وہم، تمہارے خدشات۔ یاد ہے تم ایک دن کتنا روئی تھیں کہ مجھے ڈر ہے آپ کہیں کھو نہ جائیں، آپ مجھ سے دور نہ ہو جائیں۔ مجھے ڈر ہے آپ مجھ سے چھن نہ جائیں، آپ مجھ سے دور ہوئے تو میں مر جاؤں گی۔"

معاذ نے جویریہ کا ہاتھ تھام کر اُس کے چانٹا جڑ دیا تھا۔ اور پھر اُس کے چہرے پر اپنی بات کا ردِعمل تلاش کرنے لگا۔

جویریہ بالکل خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُس کی خاموشی سے وہ اور سُلگ گیا۔

"جویریہ بیگم! تمہارا اگر مرنے کا دل چاہ رہا ہے تو زہر میرے جسم میں داخل مت کرو"۔ اس کی زبان شعلے اُگل رہی تھی۔

"یہ آج آخری بار میرے اور تمہارے درمیان اس موضوع پہ بات ہوئی ہے۔ آیندہ کبھی بھی اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہ ہوگی، اس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔ میں انتہا پسند ہوں، شدت سے محبت کرنا جانتا ہوں تو شدت سے ــــ!" اُس نے جان بُوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا۔

"جان دینا جانتا ہوں، تو جان لے بھی سکتا ہوں۔ مجھے سخت رویہ اختیار کرنے پر مجبور مت کرنا، ورنہ یہ تمہارے حق میں بہت بُرا ہوگا۔"

جویریہ کچھ دیر نظریں اُٹھا کر خاموش دیکھتی رہی، پھر بے حد پُرسکون اور ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

"معاذ! آپ نے جو کچھ کہا ہے، میں نے تحمل سے سُن لیا ہے۔ شاید جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، وہ سب صحیح ہو، مگر پھر بھی آپ کی یہ باتیں میرے ارادے کو مشکل تو بنا سکتی ہیں، میرا ارادہ ختم نہیں کر سکتیں۔ میں اب بھی پُراُمید ہوں کہ میں آپ کو رضامند کر لوں گی۔"

اُس کی اس بات نے جیسے بارود کو آگ دکھا دی۔

"جویریہ! تم اسی وقت کمرے سے باہر چلی جاؤ، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" غصے سے بے قابو معاذ نے بمشکل خود کو "گیٹ لاسٹ" کہنے سے روکا۔

○ ● ◆

گھر میں مستقل بے اطمینانی اور بے سکونی کی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ معاذ اس موضوع پر قطعی بات چیت نہیں کرنا چاہتا تھا اور جویریہ کو جب موقع ملتا، وہ یہی موضوع لے بیٹھتی۔ معاذ بات کو ختم کرنے کی کوشش کرتا۔ جویریہ ہر بار نئے سرے سے آغاز کرتی۔ نتیجہ ہمیشہ دونوں کے درمیان جھڑپ اور تلخ کلامی کی صورت میں نکلتا تھا۔ معاذ ناراض ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتا تھا۔ وہ بھی الگ منہ پھُلا کر بیٹھ جاتی، پھر خود ہی منہ کا سائز نارمل کر کے معاذ کو جا کر منا لیتی۔ وہ ہر بار پگھل جاتا اور اس کے سدھر جانے کی توقع کی بنا پر اس سے دل صاف کر لیتا۔ جویریہ ہر بار معاذ کی اس کمزوری کا فائدہ اُٹھا لیتی، مگر آخر کب تک؟

رفتہ رفتہ معاذ کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ فریال کی شادی کا خیال، جویریہ کے دل و دماغ کی تہوں میں اُتر گیا ہے۔ بُری طرح جم گیا ہے۔ وہ کسی بھی طرح اُسے کھرچ نہیں پا رہا ہے۔ اس نے ہر ممکن کوشش کر لی تھی کہ اس کے دل سے یہ خیال نکال دے۔ سو طرح کی دلیلوں سے سمجھایا تھا۔ نفسیاتی اور جذباتی حربے استعمال کیے تھے۔ نرمی، پیار، منت سماجت سے کام لیا تھا، مگر جویریہ کسی طور اپنے خیال کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ بدل کی طرح اپنے ارادے پر قائم تھی۔ اس صورتِ حال نے معاذ کو شدید ذہنی کشمکش میں مُبتلا کر دیا تھا۔ وہ بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو گیا تھا کہ آخر کس طرح جویریہ کو راہِ راست پر لائے۔ اُس نے معاذ کو بُری طرح زچ کر دیا تھا۔ وہ سخت عاجز ہو چکا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالے، کس سے مشورہ کرے۔ وہ اس بات کا کسی سے تذکرہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس سے مزید مسائل پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، ورنہ شاید وہ اپنے یا جویریہ کے والدین سے ذکر کر ہی دیتا، وہ اس پر دباؤ

اسے سمجھانے کی کوشش کرتے اور وہ اپنی زندگی کو شعلوں کی نذر کرنے سے باز آ جاتی۔

بہرحال اُس نے سوچ لیا تھا کہ اگر حالات کچھ زیادہ ہی اس کے قابو سے باہر ہو گئے تو پھر وہ ضرور کسی کو اعتماد میں لے گا، مگر فی الحال وہ اپنے طور پر اس کا دماغ درست کرنے کی سعی میں مصروف تھا، مگر جویریہ پر جنون طاری ہو چکا تھا۔ وہ اس کی ہر کوشش کو کامیابی کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیتی۔

دوسری جانب جویریہ بڑی مستقل مزاجی سے اپنے ارادوں پر عمل پیرا تھی۔ اس کا موقف تھا کہ انسان زندگی میں ہمیشہ اپنے لیے ہی سب کچھ نہیں کرتا۔ کبھی کبھی اپنی ذات سے ہٹ کر بھی سوچنا چاہیے۔ اگر اپنی زندگی کا کچھ حصہ دوسرے کے نام کر کے اُس کی خوشیوں کی ضمانت بن رہا ہو اور بہرحال مجموعی زندگی پر اس کا بہت زیادہ اثر بھی نہ پڑ رہا ہو، تو یہ کوئی بہت بڑی قربانی نہیں ہے۔

اس کا خیال تھا کہ معاذ کو انسانیت کے نام پر اور ہمدردی و خلوص کے جذبات کو سہارا بنا کر اپنی ذات کے دائرے سے باہر نکال کر سوچنا چاہیے، مگر معاذ تھا کہ اپنی ذات سے باہر نکلنے پر ہرگز تیار نہ تھا۔ بالفرض وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آ بھی جاتا، تو اس کے اردگرد جویریہ کی ذات کا دائرہ موجود تھا اور اتنا وسیع تھا کہ وہ کبھی بھی اس کی حدود پار نہیں کر سکتا تھا، مگر جویریہ یہ کب کہتی تھی کہ مجھے یا میری ذات کو پسِ پشت ڈال دو۔ وہ تو بڑی وسیع القلبی، وسیع النظری اور بڑے خلوص سے (بقول خود اس کے) اپنی ذات کے دریچے وا کر کے معاذ کے لیے فریال کی گنجائش پیدا کر رہی ہے۔

معاذ اور فریال بے شک دو کناروں کی طرح تھے، جو بے شک ساری عمر ساتھ چلتے رہتے مگر کبھی نہ ملتے، مگر دو کناروں کو کسی پُل کے ذریعے تو ملایا جا سکتا ہے اور جویریہ "پُل" بننے کو تیار تھی۔ کسی انجانے لمحے میں معاذ اور فریال کسی اَن دیکھی ڈور کے دو سروں سے بندھ گئے تھے اور جویریہ ان دونوں کے درمیان اس ڈور پر چل پڑی تھی۔ اب وہ رُک نہیں سکتی تھی کیونکہ رُکنے کی صورت میں تو وہ گر جاتی۔

○ ● ◆

گھر کی فضا سخت مکدر اور کشیدہ تھی۔ ماحول حد درجہ تناؤ کا شکار تھا۔ جویریہ بے حد پریشان تھی۔ پورے دو ہفتے ہو گئے تھے۔ معاذ سے اس کی بات چیت قطعی بند تھی۔ وجہ وہی پُرانی تھی۔ اُس نے اسے کئی بار اسے منانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ جیسے بالکل بے حس ہو چکا تھا۔ اُس نے ایک دم ہی بڑی سے لاتعلقی اختیار کر لی تھی۔ گزرتا ہوا ہر دن اُس کی بیگانگی اور بے اعتنائی میں اضافہ ہی کر رہا تھا۔ تنہائی اور اچانک صورتِ حال پر جویریہ کا ذہن بُری طرح چکرا گیا تھا۔

معاذ پہلے بھی اس سے کئی بار سخت خفا ہوا تھا، مگر ہر بار اس کے منانے پر بالآخر مان جایا کرتا تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی میں کوئی شب ایسی نہیں گزری تھی کہ معاذ اس سے ناراض ہو کر سویا ہو، مگر اب تو پورے پندرہ دن گزر گئے تھے۔ معاذ تو جیسے بالکل اجنبی بن گیا تھا۔ وہ صلح کے لیے ہر جتن کر چکی تھی، مگر بے سود۔ وہ تو اس کی بات کا جواب تک دینے کا روادار نہیں تھا اور اگر دیتا بھی تو اس بے رُخی سے کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے سارے کام خود کرنے لگا تھا۔

اُس دن وہ کچن میں کھڑی کھانا پکا رہی تھی۔ کسی کام سے باہر آئی تو دیکھا کہ معاذ اسٹینڈ کے پاس کھڑا اپنی شرٹ پریس کر رہا ہے۔

"ارے! آپ کیوں کپڑے استری کر رہے ہیں، میں کر دوں گی۔" وہ اُس کی جانب بڑھی۔

معاذ نے جیسے سُنا ہی نہیں۔

وہ جز بز سی ہو گئی۔ پھر بھی آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"لائیے چھوڑیے، مجھے دیں، میں کر دیتی ہوں۔"

معاذ نے اپنے ہاتھ پر جما اُس کا ہاتھ نہایت بے دردی سے جھٹک دیا۔

جویریہ ہکا بکا اُس کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

معاذ اطمینان سے کھڑا شرٹ استری کرتا رہا۔ سوئچ آف کر کے قمیص کو بازو پر ڈالے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اگلے دن جویریہ کی آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھ کے بیٹھ گئی۔ دراصل فجر کی نماز کے بعد وہ عموماً نہیں سوتی تھی، مگر آج اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو نو بج رہے تھے۔

"اوہ خدا! آج تو معاذ کو آفس کے لیے بہت دیر ہو گئی۔" وہ جلدی جلدی پاؤں میں چپل ڈال کر کمرے سے باہر نکلی۔ گھر میں چھائی خاموشی اور سناٹے سے اسے یوں لگا، جیسے معاذ گھر میں موجود نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے ادھر اُدھر جا کر دیکھا، معاذ واقعی نہیں تھا۔ وہ کچن میں آئی تو اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ کچن میں رکھی ہوئی سی ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے برتن بکھرے پڑے تھے۔ گویا اُس نے خود ہی ناشتا بنا لیا تھا۔ جویریہ کو جگانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ تنہا بیٹھ کر ناشتا کر کے وہ جا چکا تھا۔

جویریہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے "معاذ! یہ آپ کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟"

اُس نے کسی خیال کے تحت معاذ کے دفتر فون کیا۔ اس کی ٹیلی فون آپریٹر نے اُسے ہولڈ کرا دیا کہ وہ ابھی معاذ سے اس کا رابطہ کراتی ہے، مگر کچھ لمحوں بعد اُسے دوبارہ آپریٹر کی آواز سنائی دی۔

"سر، اس وقت بہت مصروف ہیں، وہ ابھی تھوڑی ہی دیر میں آپ کو کال بیک کرتے ہیں۔"

پھر وہ انتظار ہی کرتی رہی۔ معاذ کا فون نہ آنا تھا نہ آیا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ سارا دن اُس نے یوں ہی گزار دیا، نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ بس اٹوائی کھٹوائی لیے بستر پر پڑی رہی۔

شام کو معاذ دفتر سے آیا تو وہ وہیں لاؤنج میں صوفے پر سکڑی سمٹی سی بیٹھی تھی۔ ملگجے کپڑوں، بکھرے بالوں میں وہ بے حد کملائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر معاذ لمحے بھر کو ٹھٹک گیا۔ اس کی متورم سرخ آنکھوں کو غور سے دیکھا اور پھر بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔

جویریہ کے دل کو جیسے کسی نے مسل ڈالا۔ جانے کیوں وہ توقع کر رہی تھی کہ معاذ ضرور اسے مخاطب کرے گا، مگر وہ تو سنگ دلی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔

○ ● ◆

وہ ایک ایک دراز کھول کر نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ جویریہ چپ چاپ بیٹھی اُسے دیکھ رہی تھی۔ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ اس سے پوچھ سکے کہ اسے کیا چاہیے، اس لیے کہ آج کل معاذ "ہوں" کا جواب بھی "پتھر" سے دے رہا تھا۔ معاذ کو شاید اپنی مطلوبہ شے نہیں ملی تھی۔ سو وہ مایوس ہو کر اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔

"کیا چاہیے آپ کو؟" وہ بالآخر پوچھ ہی بیٹھی۔

"یہ اتنی ساری دوائیاں رکھی تھیں، کہاں چلی گئیں؟" اس نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

"وہ یہاں نہیں ہیں، اُدھر دراز میں رکھی ہیں۔" اُس نے ایک سمت اشارا کیا۔

معاذ نے دراز کھینچ کر دو گولیاں نکالیں۔ پانی کے ذریعے انہیں حلق سے نیچے اُتارا اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

جویریہ تشویش بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر رہ نہ سکی، اُٹھ کر اس کے پیچھے کمرے میں چلی گئی۔

وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ایک ہاتھ سے اپنی کنپٹیاں دبا رہا تھا۔

وہ اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

معاذ کو اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔ سو وہ اس کی آواز سن کر چونک گیا تھا، مگر منہ سے کچھ بھی نہ بولا۔

"میں آپ کا سر دبا دوں؟" اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"آپ میرا گلا دبا دیجیے، بڑی مہربانی ہو گی۔" اس نے حد درجے تلخی سے کہا۔

اُس کے دل کی جذبات بری طرح مجروح ہوئے پھر بھی اس نے زبردستی اُس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ معاذ نے سختی سے جھٹک دیا، مگر اتنی دیر میں جویریہ کو اندازہ ہو گیا کہ اسے ہلکا سا بخار بھی ہے۔

"آپ کو تو بخار ہو رہا ہے۔" وہ بے حد فکر مندی سے بولی۔

"بے فکر رہیے، مر نہیں جاؤں گا میں۔" اُس نے تکیے میں منہ گھسا لیا۔ گویا وہ مزید گفتگو کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

جویریہ چپ چاپ اُس کی پشت دیکھتی رہی، پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچن میں جا کر اُس نے چائے بنائی اور لے کر واپس کمرے میں آئی۔ وہ اسی طرح لیٹا ہوا تھا۔ جویریہ نے آہستگی سے کپ اُس کے سرہانے رکھ دیا اور دھیمے سے بولی۔

"چائے پی لیں۔"

جواباً خاموشی کے علاوہ کچھ سنائی نہ دیا۔ جویریہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر باہر آ گئی۔ ساتھ ہی اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور کی ہول سے جھانک کر دیکھنے لگی۔

معاذ ہنوز اسی حالت میں تھا۔ کافی دیر میں اس نے کروٹ بدلی۔ پاس ہی چائے کی پیالی پڑی تھی۔ وہ اس میں سے نکلتی گرم بھاپ دیکھتا رہا۔ پھر تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گیا اور پیالی اُٹھا کر لبوں سے لگا لی۔ کمرے کے سوراخ سے جھانکتی جویریہ نے اطمینان بھرا سانس لیا اور وہاں سے ہٹ گئی۔

صوفے پر بیٹھ کر وہ ساری صورت حال پر غور کرنے لگی۔ خود کو حالات کے ترازو میں تولنے لگی کہ خطا کا پلڑا بھاری ہے یا بے قصوری کا۔ سوچنے کی کیا بات ہے۔ قصور میرا ہی تو ہے، معاذ بھی سب کچھ کب تک برداشت کرتے، اُس کے دل میں اب ڈر بیٹھنے لگا تھا۔ معاذ کی بے گانگی اور بے اعتنائی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس سے حد درجے غیریت برت رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سا طریقہ اپنائے کہ معاذ کا دل اس کی طرف سے صاف ہو جائے۔ وہ اب اس کی بے رخی سہتے سہتے تھک گئی تھی۔

جانے کتنی دیر اپنی جگہ مضمحل اور نڈھال سی پڑی رہی۔ پھر اُٹھ کر دوبارہ بیڈ روم میں آئی۔ معاذ سو گیا تھا۔ اس کے سینے پر کتاب اُلٹ کر رکھی ہوئی تھی۔ جویریہ نے دبے پاؤں قریب جا کر کتاب اُٹھائی۔ معاذ کے اوپر چادر ڈال کر اور خالی کپ لے کر وہ باہر آ گئی۔ اُس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ وہ بے مقصد اِدھر سے اُدھر پھرتی رہی پھر تھک ہار کر اُس نے بک شیلف میں سے "نسخہ ہائے وفا" نکالی اور قالین پر دراز ہو گئی۔ کتاب میں پنسل رکھی تھی۔ غالباً معاذ نے نشانی کے طور پر رکھی تھی۔ اُس نے وہی صفحہ کھول لیا۔ چند اشعار کو معاذ نے سرخ پنسل سے انڈر لائن کیا ہوا تھا۔

وہ پھر پڑھنے لگی۔

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اُداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں
محبت کی دُنیا پہ شام آ چکی ہے
سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں
مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں
تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں
تغافل کی آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے ستم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دُعائیں

جویریہ کے دل میں ہوک سی اُٹھی۔ ایک نامعلوم سے درد نے اُس کے وجود کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ سست قدموں سے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔ معاذ گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر ٹک گئی اور اُسے دیکھنے لگی۔

اُس کے وجود میں طوفان اُٹھنے لگے۔

بے اختیار اس کا جی چاہنے لگا کہ اُسے جگا دے۔ اُسے جھنجوڑ کر رکھ دے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اُس سے کہیے کہ آؤ ہم دونوں میں جو یہ فاصلے پیدا ہو گئے ہیں، انہیں محبت بھری نگاہ کے کسی لطیف سے اشارے سے ختم کر دیں۔

ہمارے درمیان جو یہ دیواریں کھڑی ہیں، انہیں بغیر کچھ کہے سنے گرا دیں۔

تم میرے قصور معاف کر دو، میں تمہاری خطائیں بھول جاؤں۔

آؤ ہم دونوں شادی کے اوّلین دنوں کی سی زندگی گزاریں۔

زندگی بڑی خوبصورت ہے۔ اس کے حسن کا عکس ہم ایک دوسرے کی ذات کے آئینے میں دیکھیں۔

میں سنگریزوں پر چل رہی ہوں، تم بھی کانٹوں پر جی رہے ہو۔ آؤ ہم دونوں ایک دوسرے کے مہربان سائے میں پناہ لے لیں۔

آجاؤ — آجاؤ۔

اُس کا دل بلائے چلا گیا۔

مگر وہ بے حس تو سو رہا تھا۔

جویریہ گھٹنوں میں منہ دے کر سسک پڑی۔ اس کی آنکھوں سے چشمہ چھوٹ پڑا۔ جانے کتنی دیر تک وہ اسی طرح روتی، سسکتی رہی۔ جب خوب رو لینے کے بعد اُس کے دل کا غبار نکل گیا تو اُس نے گھٹنوں سے سر اٹھا لیا۔ اُس کا دل جیسے ایک دم ہی بند ہو گیا۔

معاذ ایک ٹک اُسے گھور رہا تھا۔

○ ● ◆

اُس شب اُس کا دل ہمیشہ سے کہیں زیادہ اداس تھا۔ کسی کام میں اُس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اُس نے کھانا بھی ڈھنگ سے نہیں کھایا۔ بس معاذ کی وجہ سے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی، جو نہایت آرام و سکون سے کھانے کے ساتھ انصاف کر رہا تھا۔ اُس نے جویریہ کو یوں نظر انداز کر رکھا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔

جویریہ نے بے دلی سے دو چار نوالے کھا کر چھوڑ دیا تھا اور اب اس — انتظار میں بیٹھی تھی کہ کب معاذ کھانے اور وہ برتن سمیٹ لے۔

وہ خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کبھی کبھار نگاہ بھٹک کر معاذ کا چہرا چھو آتی۔ اس وقت اُسے شدت سے معاذ کی عشق کی وارداتیں، اُس کا والہانہ پن یاد آ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ، نگاہ کے معنی خیز اشارے اُس کی محبت بھری باتیں۔

اب تو سب کچھ خواب بن گیا تھا۔ اب تو جویریہ کو اُس سے بات کرنے میں بھی عجیب سی جھجک محسوس ہوتی۔ اس کے اور جویریہ کے درمیان تکلف بھری فضا قائم ہو گئی تھی۔

اُس نے بہت غور سے معاذ کو دیکھا۔

یہ اُس کا معاذ تو نہیں ہے۔ وہ تو بے حد نرم دل اور مہربان سا تھا۔ یہ سامنے بیٹھا شخص تو کوئی اور ہی ہے۔

دل سوچ کر بے حد دکھی ہو گیا۔ دو آنسو چپکے سے رخساروں پر لڑھک آئے۔ اسی لمحے معاذ کی نگاہ بے ارادہ اس پر اٹھ گئی۔ دونوں کی نظریں جیسے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں۔ جویریہ نے آنسو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ معاذ کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔

معاذ ٹیبل سے اٹھ گیا تو جویریہ نے جلدی جلدی برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے۔ لائٹ آف کر کے وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اور بستر پر دراز ہو کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ باہر سے اُسے مستقل ٹی وی چلنے کی آواز آتی رہی۔ غالباً معاذ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کوشش کے باوجود اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ یونہی کروٹیں بدلتی رہی اور گھڑی کی سوئیوں کو آگے سرکتے دیکھتی رہی۔

آج معاذ نے بھی سونے میں دیر کر دی تھی۔ ابھی تک کمرے میں نہیں آیا تھا، ورنہ عموماً وہ ساڑھے گیارہ بجے سو جایا کرتا تھا۔

اُسے لاشعوری طور پر اس کا انتظار بھی تھا۔ وہ کمرے میں نہ ہوتا تو اس کے انتظار کا کرب سستی اور جب وہ میں آجاتا تو کمرے میں چھائی اجنبیت کی فضا میں اُس کا دم گھٹنے لگتا۔ معاذ دوسری طرف منہ کر کے آرام سے جاتا اور وہ اُس سے تصور میں ہی شکوہ کرنے لگتی۔

کیا تمہیں میری یہ اداس صورت دیکھ کر رحم نہیں آتا؟

کیا میرے آنسو تمہارا دل نہیں پگھلاتے؟

میں ساری رات کروٹیں بدل بدل کر گزار دیتی ہوں۔ تم اتنی پُرسکون نیند کیسے سو جاتے ہو؟

تم اتنے سنگدل، اتنے کٹھور تو نہیں تھے، کہاں سے سیکھ لیں یہ ادائیں۔ تمہاری محبت، مجھے اذیت دینے پر ملامت نہیں کرتی۔ وہ اُس سے شکوہ کر کے تھک جاتی، تو اُس کے اور اپنے درمیان گزرے خوبصورت لمحوں کو یاد کر کے اپنے پاس بلاتی، دل کو بہلانے کی کوشش کرتی۔

کیا ستم ظریفی تھی۔ معاذ اُس کے پاس تھا۔ اُس کے سامنے اور وہ بیتے دنوں کی خوبصورت یادوں کے سہارے دن گزار رہی تھی۔

معاً دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ شاید معاذ سونے کے لیے اندر آیا تھا۔ اُس نے فوراً آنکھیں موند لیں جیسے سو چکی ہو۔ کافی لمحے گزر گئے۔ اُسے معاذ کے بستر پر بیٹھنے کا احساس نہ ہوا تو اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ معاذ تکیہ بغل میں دبائے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔

وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ پل بھر میں اُس نے جان لیا کہ اُس کی آنے والی زندگی کتنی ویران اور دکھوں سے بھرنے والی ہے۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" اُسے اپنی آواز اجنبی لگی۔

"یہ گھر کافی بڑا ہے، یہاں دو اجنبی نہایت آرام سے رہ سکتے ہیں۔" وہ رُکے بغیر بولا تھا۔

"معاذ یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" وہ تیر کی طرح اُٹھ کر اُس کے راستے میں آئی۔

"خدا کے لیے سزا اتنی ہی دیں جتنا میرا جرم ہو۔ کتنا بڑا گناہ کر دیا ہے میں نے آخر؟ یہی تو کہا تھا کہ فریال سے شادی کر لیں۔"

"فریال مجھے کبھی حاصل نہیں کر سکتی۔" وہ غرا کر بولا۔ "ہاں البتہ اب تم مجھے کھو دو گی اور سمجھ لو کہ اس کا آغاز ہو چکا ہے۔" وہ بندوق کی گولی کی مانند کمرے سے نکل گیا۔

وہ دروازہ تھام کر وہیں بیٹھ گئی۔

زندگی کا ہر لطیف احساس اُس کی زندگی سے مٹتا جا رہا تھا۔

اُسے یوں لگا جیسے آج اگر اُس نے یہ بھڑکتے شعلے نہ بجھائے ——— سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے گا۔

"نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں یہ بازی آج اپنے حق میں کر کے رہوں گی۔"

اُس نے تیزی سے اُٹھ کر اپنی الماری کھولی۔ آف وہائٹ کلر کا سوٹ نکالا اور باتھ روم میں گھس گئی۔ کپڑے بدل کر باہر نکلی۔ بال کھول کر جلدی جلدی برش سے اُنہیں سلجھا کر پشت پر کھلا چھوڑ دیا اور جیسے کسی شیرنی کی مانند کمرے سے نکلی تھی۔

اُس کے انداز فیصلہ کن تھے۔ اس کے ارادے چہرے سے عیاں تھے۔ چال میں جیت لینے کا اعتماد تھا۔

دراصل عورت طاقت ور نہیں ہوتی کہ مرد کو اپنی طاقت کے بل پر شکست دے سکے۔

ہاں البتہ ذرا سی عقل مند ہو اور جیتنے کے فن سے واقف بھی ہو تو مرد کی کمزوری کو ہتھیار بنا کر اسے زیر کر سکتی ہے۔ حسن مائل بہ کرم ہو اور زیرِ استحقاق بھی تو دامن بچانا مشکل ہوتا ہے۔

معاذ بیڈ پہ چت لیٹا چھت کو دیکھ رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ وہ چونک اٹھا۔

جویریہ دروازے میں ایستادہ تھی۔ "شینل" کی مہک نے بڑی تیزی سے اُس کے وجود سے معاذ کی سانسوں تک کا سفر طے کر لیا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ آئی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

معاذ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، اُس نے اُلجھی اُلجھی نگاہوں سے اُس کی سمت دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بے حد واضح تھے۔

وہ عشق بن کر اُس کی پذیرائی کو تیار کھڑی تھی۔

محبوب کے درجے سے محب کے درجے پر آنا پستی کا سفر نہیں ہے۔

اپنے شوہر کے قدموں میں جھک جانا، اَنا کی شکست نہیں ہوتی، اس سے عزتِ نفس کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ زندگی کے لطیف احساسات کی بلندیوں تک پہنچنے کا راستہ شوہر کے قدموں سے ہو کر بھی جاتا ہے اور درجہ سُرخروئی کا ملتا ہے۔

جویریہ اپنے فسوں خیز حسن سمیت، اُس کے قدموں میں جُھک رہی تھی۔

قدموں میں جھکا ہوا سر کوئی کم ظرف ہی ٹھکراتا ہے۔

اور معاذ کم ظرف نہیں تھا۔

اُس نے بازو وا کر دیے تھے۔

○ ● ◆

ڈور بیل کی آواز پر نہال نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔

"یہ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" اُس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھی اور جا کر دروازہ کھولا۔

سامنے عمر کھڑا تھا اور اُس کے ساتھ سجی سنوری تانیہ تھی۔

"یہ کون سا وقت ہے شریف لوگوں کے گھروں کی گھنٹیاں بجانے کا؟" اُس نے تیز نظروں سے عمر کو گھورا۔

"اُف! خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں مل گئے، اگر پناہ گاہ گئے ہوتے تو بڑی مشکل ہو جاتی۔" وہ سکون کا سانس لیتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟" نہال نے دونوں کے لیے راستہ چھوڑا۔

"یہاں سے کافی دور میری گاڑی خراب ہو گئی تھی، کسی طرح اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی رکشہ، کوئی ٹیکسی نہیں تھی۔ سردی کے دن ویسے ہی ہیں، جلدی ہی سناٹا چھا جاتا ہے۔ تمہارا خیال آیا کہ فلیٹ زیادہ دور نہیں ہے، پھر سوچا کہ تم تو پناہ گاہ میں ہو گے، پھر دل نے کہا دیکھ ہی لوں شاید اپنے فلیٹ پر ہی مل جاؤ، تو تمہاری گاڑی لے جاؤں۔" اُس نے خاصا تفصیل سے جواب دیا۔

نہال نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا۔ "اچھا کھڑے کیوں ہو، تشریف تو رکھو۔"

"یار میرے پاس تشریف رکھنے کا ٹائم نہیں ہے۔ تانیہ کو اس کے گھر ڈراپ کرنا ہے۔ خالہ جان پریشان ہو رہی ہوں گی۔" اُس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اس طرح کھڑے کھڑے نہیں جانے دوں گا، تانیہ کو پہلی بار لائے ہو۔"

"نہال گھر والے اب تک میری تلاش میں نکل چکے ہوں گے۔ والد صاحب تو ویسے ہی مجھے ناسمجھ بچہ سمجھتے ہیں۔"

"اوہو تو بے وقوف آدمی تم فون کر دو۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ پہلے دماغ میں نہیں آیا۔" وہ فون کرنے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

نہال، تانیہ سے باتیں کرنے لگا۔ آپس کی کئی ملاقاتوں نے اُنہیں ایک دوسرے سے خاصا بے تکلف کر دیا تھا۔

"تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟"

"ان کے قریبی دوست کی شادی تھی اور جس سے ہوئی ہے، وہ میری سہیلی کی بہن ہے۔ ہمارا ڈرائیو تو چھٹی پر ہے، امّی مجھے جانے کی اجازت نہ دیتیں، مگر انہوں نے کہا کہ یہ مجھے ساتھ لے جائیں گے۔ اب واپس آ رہے تھے کہ یہ مشکل پیش آ گئی۔"

اُسی وقت عمر کمرے میں داخل ہوا۔ "شکر ہے مصیبت سے نجات ملی۔"

"آپ نے امّی کے ہاں فون کر دیا؟" تانیہ نے پوچھا۔

"جی ہاں کر دیا ہے۔ آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کو اختلاج قلب کے دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ اپنے دوروں کو کسی اور مناسب وقت کے لیے ملتوی کر دو۔ فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری بہن بقید حیات ہے اور فی الحال جن لوگوں کے قبضے میں ہے، وہ بے حد شریف لوگ ہیں۔"

"رانیہ کیسی ہیں؟" رانیہ کا ذکر آیا تو نہال پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"ٹھیک ہیں بالکل! امّاں جی کے ساتھ صبح آئی تھیں۔ امّی نے روک لیا کہ رات کو رہ جاؤ۔ یوں بھی کل چھٹی ہے۔" وہ مُنہ بنا کر آئے بال کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

"تم لوگ بیٹھو میں کافی بنا کر لاتا ہوں۔"

"ہاں فوراً سے پیشتر بنا لاؤ۔" عمر ڈھٹائی سے کہتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

نہال اس کو گھورتے ہوئے باہر نکل گیا۔ وہ کچن کی طرف جا ہی رہا تھا کہ اچانک کوئی چیز اس کے پیروں کے نیچے آئی۔ پاؤں میں چبھن کے شدید احساس سے اس کی سسکی نکل گئی۔

اُس نے جھک کر اُسے اُٹھایا، وہ نازک سا کنگن تھا۔

"ارے! یہ زیبا کا کنگن یہاں پڑا ہے!" اُس نے بغور دیکھا۔

وہ ہیروں سے جڑا انتہائی بیش قیمت کنگن تھا، جو سیّد صاحب کے خاندانی زیورات میں شامل تھا اور زیبا کی ملکیت تھا۔

یک لخت اُسے زیبا پر سخت غصہ آیا۔

"لاپروائی کی حد ہوتی ہے۔ اس قدر قیمتی چیز زیبا کو احتیاط سے سنبھال کر رکھنی چاہیے اور وہ یہاں میرے گھر میں اس طرح قالین پر پڑی ہوئی ہے۔ زیبا سے اس درجے لاپروائی اور غیر ذمہ داری کی اُمید تو نہیں تھی۔ ناناجان کو علم ہو جائے تو اس پر سخت خفا ہوں۔

مگر زیبا تو یہاں بہت دنوں سے نہیں آئی، پھر یہ کیسے آ گیا؟" وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اسے تانیہ کی سراسیمہ اور بے حد پریشان کن آواز آئی۔

"عمر! میرا کنگن گُم ہو گیا، اوہ! میرے خدا اب کیا ہو گا؟

کہاں چلا گیا؟"

"عمر کچھ کریں پلیز! تلاش کریں۔ وہ بے حد قیمتی تھا۔ امّی تو مجھے جان سے مار ڈالیں گی۔ ہائے اللہ میں کیا کروں۔" وہ تو حواس ہی کھو بیٹھی۔

باہر کھڑا نہال چکرا کر رہ گیا۔ اُس نے پھر غور سے کنگن دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ زیبا ہی کا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

"نہال بھائی! میرا کنگن کہیں گر گیا ہے، ہیروں کا تھا۔ نہ جانے کہاں گر گیا۔ اُف خدا! اب کیا ہو گا۔ میں کہاں تلاش کرنے جاؤں۔" اس کا چہرا ایک دم سفید ہو گیا تھا۔ وہ بالکل ٹھنڈی برف ہو رہی تھی۔

"یہ تو نہیں ہے؟" نہال بغیر سوچے سمجھے کہہ گیا۔ ساتھ ہی اپنا ہاتھ اُس کے آگے کیا، جس پر کنگن دھرا تھا۔

"اوہ میرے خدا!" وہ بے جان سی ہو کر صوفے پر گر گئی اور بے اختیار رونے لگی۔

"اگر یہ نہ ملتا تو میں تو مر ہی جاتی۔ امّی کو جا کر کیا جواب دیتی۔ اُن کی تو اس سے جذباتی یادیں وابستہ ہیں۔ وہ اسے جان سے لگا کر رکھتی ہیں۔ یہ گم ہو جاتا تو مجھے تو کچھ ہو ہی جاتا۔ میرے اللہ تیرا احسان ہے کہ یہ مل گیا۔ جتنا بھی تیرا شکر ادا کروں کم ہے۔" اس کا دل بُری طرح سہم گیا تھا۔ وہ روئے چلی گئی۔

"اچھا رونا تو بند کرو، اب تو مل گیا ہے۔" عمر اُس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

دوسری طرف نہال سخت تعجب سے اپنے ہاتھ پر رکھے کنگن اور تانیہ کو باری باری دیکھ رہا تھا۔

اُسے سو فیصد یقین تھا کہ وہ زیبا کا ہے۔ ان کے خاندانی زیورات میں شامل ہے۔ زیبا نے میٹرک میں پوزیشن حاصل کی تھی۔ سیّد صاحب بے حد خوش ہوئے تھے۔ اُنہوں نے پوچھا تھا کہ وہ کیا انعام لے گی۔ اس نے بے دھڑک اس کنگن کی فرمائش کر دی تھی۔ سیّد صاحب نے اس کی فرمائش رد نہیں کی تھی۔ اور اسے دیتے ہوئے کہا تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

”یہ میری زیبا کی خوشی ہے زیادہ قیمتی نہیں ہے، مگر تم اسے احتیاط سے رکھنا۔ بہت نایاب ہیرے اس میں لگے ہیں۔“ زیبا نے انہی کے سیف میں واپس رکھوا دیا تھا۔ حالانکہ چھوٹا موٹا زیور وہ اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ شہیر کی شادی کے موقع پر بھی زیبا نے وہ کنگن پہنا تھا۔ اطہر جب اسے منگنی کی انگوٹھی پہنا رہا تھا، تو وہ اس کی کلائی میں لشکارے مار رہا تھا۔

اور ادھر تانیہ کہہ رہی ہے، کہ یہ اس کا ہے، بھلا یہ کیا چکر ہے؟

اُس کا ذہن بُری طرح اُلجھ گیا۔ عجیب ہی صورتِ حال تھی، سمجھ سے باہر۔

”لو بکڑو اپنا کنگن، پرس میں احتیاط سے رکھ لو۔“ عمر نے نہال کے ہاتھ سے لے کر تانیہ کو تھمایا۔

”حد ہو گئی، اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔“ اس نے سر کو جھٹکا دیا، پھر نہال سے مخاطب ہوا۔

”تمہاری کافی کب تک بنے گی؟“

”نہیں پھر کبھی سہی۔“ تانیہ نے بات کاٹ دی۔

”بس اب گھر چلتے ہیں، بہت دیر ہو گئی۔“

اُسے اب تک یہ سوچ سوچ کر پسینے آ رہے تھے کہ اگر کنگن نہ ملتا تو کیا ہوتا۔ اس نے سختی سے اپنا پرس تھام رکھا تھا، کہ کہیں پھر نہ گر جائے۔

”چلو کوئی بات نہیں۔“ عمر یہ کہہ کر نہال کی طرف مڑا۔

”یار نہال! کافی اُدھار رہی، تم گاڑی کی چابی دے دو۔“

نہال نے اُسے چابی لا کر دی، تو دونوں رخصت ہو گئے۔

نہال دروازہ بند کر کے بستر پر آ کر لیٹ گیا اور ساری بات پر از سرِ نو مختلف پہلوؤں سے غور کرنے لگا۔ وہ کنگن بُری طرح اُس کے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

◯ ● ◆

نہال جلدی ہی اپنے کمرے میں جا کر سونا چاہ رہا تھا، مگر ان لوگوں کی باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس پر شہیر نے اُٹھ کر وی سی آر پر فلم لگا دی تھی۔ ناچار اسے بھی دیکھنی پڑی۔ خدا، خدا کر کے وہ لوگ سونے کے لیے اُٹھے تو وہ بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ فجر کے وقت سے کچھ پہلے کا الارم سیٹ کیا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

صبح اس کی آنکھ الارم بجنے سے پہلے ہی کھل گئی۔ اُس نے لیمپ جلا کر ٹائم دیکھا اور جلدی سے الارم بند کر دیا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی آنکھ پہلے ہی کھل گئی۔

اُس کے برابر والا کمرا جاذب کا تھا۔ اُس کی نیند یہی تھی کہ ایک کے قریب کھڑے ہو کر زور سے سانس بھی لو تو اُٹھ کر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ سناٹے میں الارم کی آواز دور تک جاتی۔ ممکن تھا کہ جاذب جاگ جاتا۔

اُسی وقت فجر کی اذان ہونے لگی۔ اُس نے وضو کر کے نماز پڑھی اور کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں اُسے سیّد صاحب پناہ گاہ کے مین گیٹ سے باہر جاتے دکھائی دیے۔ اُسے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ وہ کچھ دیر ان کو باہر جاتے دیکھتا رہا۔ پھر اپنے کمرے سے باہر نکلا اور دبے پاؤں اُن کے کمرے میں پہنچ گیا۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھینچ کر اس میں سے چابیاں نکالیں۔ دائیں طرف دیوار پر لگی پینٹنگ ہٹائی تو سیف نظر آیا۔ اُس نے سیف کا ڈائل سیٹ کیا اور اس میں چابی گھمائی۔ ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔ اس نے سیف کھول کر ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر ماری۔ کونے میں اُسے بہت بڑا بکس دکھائی دیا۔ اُس نے احتیاط سے بکس نکال کر قالین پر رکھا۔ نمبروں والے تالے کو سیٹ کر کے بکس کو کھولا اور تیزی سے نظریں دوڑائیں۔ بکس میں بے شمار نادر قسم کے زیورات موجود تھے۔ اچانک ہی اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اُس نے جلدی سے وہ چیز نکال کر جیب میں رکھی اور بکس بند کر کے دوبارہ سیف میں رکھ دیا۔ پھر اسی طرح سیف لاک کر کے پینٹنگ کو دوبارہ آویزاں کر دیا۔ چابیاں میز کی دراز میں رکھیں اور بے آواز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اُس نے دروازہ لاک کیا۔ اُس کے دل کی دھڑکن معمول سے تیز تھی۔ ریفریجریٹر سے پانی نکال کر پینے کے بعد وہ اطمینان سے بیڈ پر بیٹھ گیا اور سائیڈ پر رکھا ہوا لیمپ آن کیا۔ جیب سے وہ چیز نکال کر لیمپ کے قریب لا کر اُس نے اپنا ہاتھ سیدھا کیا۔

اُس کی ہتھیلی پر بالکل ویسا ہی کنگن جگمگا رہا تھا، جیسا اس نے گزشتہ شب تانیہ کے پاس دیکھا تھا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

”ہاں بالکل ویسا ہی ہے، کوئی فرق نہیں ہے۔“ اُس نے بغور دیکھا۔

وہ ہرگز اس خاموشی سے کنگن نہ نکالتا۔ وہ چاہتا تو زیبا سے کہہ کر نکلوا سکتا تھا، مگر فی الحال اس کے پاس اس کی توجیہہ نہیں تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔

اُس نے تکیے کے سہارے ٹیک لگالی۔ اُس کا ذہن پیچھے کی جانب سفر کرنے لگا۔

اس زمانے میں وہ شاید سیکنڈ ایر کا طالب علم تھا۔ وہ اپنے فارم پر سائن کرانے کے لیے سیّد صاحب کے کمرے میں آیا۔ اس نے اندر جھانکا۔

آٹھ سالہ زیبا، سیّد صاحب کے بستر پر چڑھی اُن سے کہہ رہی تھی۔

”ہائے دادا جان! میں آپ کو کیا بتاؤں مجھے چوڑیاں، انگوٹھیاں، ٹاپس، لاکٹ کتنے پسند ہیں سب مجھے یہ سب پہننا کتنا اچھا لگتا ہے۔“

”اچھا! ہماری بیٹی کو بہت اچھا لگتا ہے؟“ سیّد صاحب مسکرائے۔

”بو... ہو... ت... !“ اُس نے لمبا کھینچا، ”مگر مجھے کوئی پہننے ہی نہیں دیتا۔“ اس نے منہ بسور لیا۔

”ابھی تو تم بچی ہو ناں بھئی۔“

”میں کوئی بچی وچی نہیں ہوں، دیکھیے ناں میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں۔“ وہ چھلانگ مار کر بستر سے اُتری اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔

سیّد صاحب پوتی کی اس ادا پر نثار ہو گئے۔

”دادا جان!“ وہ پھر اُن پر چڑھ بیٹھی۔ ”آپ کے پاس زیورات ہیں؟“

”ہاں بہت سارے ہیں۔“

”ہائے اللہ! مجھے دکھائیے ناں پلیز!“ اُس نے ایسے بے چینی بھرے انداز میں کہا کہ سیّد صاحب کو اُس پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔

وہ اُس کی بات رد نہ کر سکے۔ انہوں نے تجوری کھول کر ایک لکڑی کا بڑا سا بکس نکالا اور کھول کر اُس کے آگے رکھ دیا۔

”اوئی اللہ!“ زیبا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ”اتنے سارے؟“

”دادا جان!“ وہ اُن کے کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی میں بولی۔ ”کیا آپ نے چرائے ہیں؟“

سیّد صاحب بے ساختہ ہنس دیے۔

”میں چور ہوں؟“ انہوں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

”اللہ نہ کرے۔“ اس نے اپنے دونوں بازو ان کی گردن میں حمائل کر دیے۔ ”ویسے دادا جان! یہ سب کس کے ہیں؟“

”بیٹے! یہ سب تمہاری دادی کے ہیں۔ یہ ہمارے خاندانی زیورات ہیں۔“

”آپ یہ سب کس کو دیں گے؟“ اُسے نئی فکر لاحق ہوئی۔

”تمہیں دوں گا۔ جواہر اور خمار کو بھی دوں گا۔ تمہارے بھائیوں کی شادیاں ہوں گی، اُن کی دلہنوں کو دوں گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے دینے کی۔“ وہ تنک کر بولی۔

”یہ سب آپ مجھے دے دیجیے گا اور اُن لوگوں کے لیے بازار سے خرید لیجیے گا۔“

”اچھا! یہ سب تم ہی لے لینا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”تم سے زیادہ اچھے نہیں ہیں یہ۔“

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"نانا جان! میرے فارم پر سائن کر دیں۔" نہال اندر آ گیا۔

"لاؤ۔" اُنہوں نے اُس کے ہاتھ سے فارم لے لیا اور دستخط کرنے لگے۔

نہال وہیں کھڑے کھڑے زیورات دیکھنے لگا۔

"یہ تو بہت ہی خوبصورت ہے۔" زیبا ایک نازک سے کنگن کو ہاتھ میں لے کر بولی۔

"دکھاؤ مجھے۔" نہال نے اُس کے ہاتھ سے کنگن لے لیا۔

انتہائی نفیس اور نازک سا کنگن تھا۔ جس میں چھوٹے چھوٹے بے شمار ہیرے جڑے تھے۔

"نانا جان! کیا یہ بھی نانی جان کا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں، اس کو غور سے دیکھو تو تم کو اپنی نانی کا نام لکھا نظر آئے گا۔"

"اچھا!" وہ خوشگوار حیرت سے بولا۔ "کہاں لکھا ہے؟"

زیبا نے بھی مارے اشتیاق کے اپنا سر دادا کے سینے میں گھسیڑ دیا۔ اُن سے چپک گئی۔

سید صاحب نے اپنے پین کے اشارے سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ڈیزائن کی بناوٹ اور ہیروں کی ترتیب ایسی ہے کہ اگر تم غور کرو تو تم کو نظر آ جائے گا۔ یہ دیکھو، یہ اس طرح لکھا ہے، سیّدہ زہرا وجاہت۔"

"حیرت انگیز! یہ تو کسی بہت ماہر جوہری نے بنایا ہو گا۔ ویسے نانا جان! یہ نام والا آئیڈیا کس کا تھا؟"

سید صاحب اُس کی بات پر خفیف سا مسکرائے اور دھیمے لہجے میں بولے۔ "میرا ہی تھا۔"

"دادا جان!" زیبا کچھ سوچ کر بولی۔ "دیکھیے ز سے زہرہ، ز سے زیبا، لہٰذا یہ کنگن میرا۔"

سید صاحب نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ نہال بھی مسکراتے ہوئے اُسے دیکھنے لگا کہ کس قدر چالاک ہے۔ یہ لڑکی

"بے فکر رہو، یہ میں اب تمہیں ہی دوں گا۔"

اب وہی کنگن نہال کی ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا اور بالکل ویسا ہی وہ تانیہ کے پاس دیکھ چکا تھا۔ دونوں میں سر مو فرق نہ تھا۔

اُس نے تانیہ کے کنگن کو بھی غور سے دیکھا تھا۔ اُس کے ڈیزائن کی بناوٹ اور ہیروں کے جڑاؤ کی ترتیب میں "سیّدہ زہرہ وجاہت" نظر آ گیا تھا۔

اگر وہ کنگن بھی نانی جان کا ہے تو تانیہ کے پاس کیسے چلا گیا؟

کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے کس سے پوچھی جائے۔ وہ سخت تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔

نانا جان سے پوچھوں ــــ اوہ نہیں۔ اُس کے ذہن میں فوراً ہی دوسرا خیال آیا۔ فی الحال یہ زیادہ مناسب رہے گا۔ اس نے پُر خیال انداز میں سر ہلایا اور مطمئن سا ہو گیا۔ اپنا وارڈروب کھول کر ایک کوٹ کی جیب میں وہ کنگن احتیاط سے ڈال دیا۔ خود بستر میں گھس گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

○ ● ◆

"السلام علیکم بابا جان!" اُس نے دُور ہی سے سکندر رضا کو سلام جھاڑا۔

اُنہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ لان میں پائپ کے ذریعے پانی لگا رہے تھے۔ پائپ چھوڑ کر تیزی سے اُس کی طرف بڑھے اور بے حد گرمجوشی سے اُسے گلے سے لگا لیا۔

ایک سکون سا نہال کے وجود میں اُتر گیا۔ وہ بے حد متاثر ہوا۔

"اپنی شکل تم مجھے مہینوں میں دکھاتے ہو۔" اُنہوں نے محبت بھرا شکوہ کیا۔

"بس بابا جان! کچھ مصروفیت رہتی ہے اور کچھ میری کاہلی بھی اس کی وجہ ہے۔ بہر حال مجھے اپنی کوتاہی کا احساس ہے۔" وہ سرشاری سے بولا۔

سکندر رضا ہنسنے لگے۔ "تمہارے انداز تمہاری ماں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ وہ بھی جب آتی تھی تو اسی طرح دور سے آواز دیتی تھی۔ میں جب کبھی اس سے خفگی کا اظہار کرتا تھا تو بالکل اسی طرح شرمندہ ہو جایا کرتی

"آپ کو تو میری امی بہت اچھی طرح یاد ہوں گی؟" نہال کو اپنی ماں کا تذکرہ اچھا لگا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ اطہر کی ماں سے اُس کی بہت دوستی تھی۔ دونوں گھنٹوں بیٹھی باتیں کیے جاتیں۔ نہ جانے کون سے قصے ہوتے تھے جو ختم ہونے کا نام نہ لیتے تھے۔ ناجیہ کو بارش میں درخت پر جھولا ڈال کر جھولنا بہت پسند تھا، مگر تمہاری نانی جان منع کرتی تھیں۔ جب بھی بارش کے آثار نمودار ہوتے وہ اکثر یہیں آ جایا کرتی تھی۔ بارش میں بھیگتی جاتی اور جھولا جھولتی جاتی۔ اُس کے ہنسنے کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔" وہ پُرانے دنوں کی یاد تازہ کر رہے تھے۔

"اچھا چلو چھوڑو اس ذکر کو۔" وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ "یہ بتاؤ کہ تم کیسے آئے؟"

"بس یونہی آپ سے ملنے کو دل چاہا، سو چلا آیا۔"

دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ پھر نہال اصل بات پر آ گیا۔ اُس نے جیب سے کنگن نکالا۔

"دیکھیے بابا! یہ کتنا خوبصورت ہے۔"

"ہاں، اور یہ ہیرے اتنے قیمتی ہیں شاید تم ان کی قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ تمہارے نانا جان نے، تمہاری نانی کو شادی میں رونمائی کے طور پر دیے تھے۔"

"یہ ایک ہی ہے؟" نہال نے چابکدستی سے سوال کیا۔

"نہیں دو تھے۔" وہ روانی میں کہہ گئے۔ "ہاں ایک ہی ہے۔" وہ بُری طرح گڑبڑا گئے۔

نہال بے حد معنی خیزی سے مسکرایا۔ گویا اُسے ایک سوال کا جواب مل گیا تھا۔

"بابا جان! دوسرا کنگن کہاں ہے؟"

"بیٹے! یہ ایک ہی تھا، اگر دو ہوتے تو دوسرا بھی تمہارے نانا ہی کے پاس ہوتا۔"

"میں جانتا ہوں کہ دوسرا کہاں ہے؟" وہ پُرسکون لہجے میں اُن کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"کس کے پاس ہے دوسرا؟" وہ ایک دم چونک گئے۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بات آپ بھی جانتے ہوں گے۔" اُس نے بغور اُن کی طرف دیکھا۔

اُنہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا پھر ایک دم چُپ سے ہو گئے۔

"بھلا مجھے کیا معلوم؟" اُنہوں نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

"بابا جان! پناہ گاہ کی ایسی کون سی بات ہے، جو آپ سے چھپی ہوئی ہے۔ آپ تو اُن ہواؤں تک سے واقف ہیں جو پناہ گاہ سے ہو کر گزرتی ہیں۔ میں یہ جان گیا ہوں کہ یہ دو تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دوسرا کس کے پاس ہے۔ بس جو بات میرے دماغ میں کھٹک رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اتنی بیش قیمت چیز نانا جان کے پاس موجود نہیں ہے۔ کیا ان کو اس کے غائب ہونے کا علم نہیں؟ اگر ان کو معلوم ہے تو اُنہوں نے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟ یا پھر خود اُنہوں نے ہی کسی کو دیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اپنی خاندانی چیز جس سے ان کی جذباتی وابستگی ہو، وہ اپنی اولاد کے علاوہ کسی اور کو کیسے دے سکتے ہیں؟"

"تم اس قصے کو مت چھیڑو نہال، کیوں دبی ہوئی راکھ کرید رہے ہو۔ کوئی چنگاری اگر نکل آئی تو پتا نہیں کیا کچھ جل جائے۔"

"بابا جان! آپ کی بات سے میرا تجسس حد سے بڑھ گیا ہے۔ اب ہر قیمت پر جان کر رہوں گا، اگر آپ نہیں بتائیں گے تو معلوم تو مجھے ہر صورت ہو ہی جائے گا۔"

"کس سے؟" اُنہوں نے جلدی سے پوچھا۔

نہال ہنسنے لگا۔ "پہلے آپ مجھے ساری بات بتائیں، پھر میں بتاؤں گا۔"

"بیٹے! تم ضد نہ کرو، اس بات کو یہیں ختم کر دو۔" وہ حد درجہ گریزاں تھے۔

"ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں، آپ نہ بتائیں مجھے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"اوہو تم ناراض کیوں ہوتے ہو۔" اُنہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا۔ دوسری جانب دل ہی دل میں وہ خود بھی اس تجسس میں مبتلا ہو چکے تھے، کہ آخر نہال کے ہاتھ میں اتنی پُرانی بات کا سرا کیسے آ گیا؟

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"بیٹے وہ ۔۔۔!" وہ قدرے ہچکچائے۔ "دو سر الکنگن تمہارے نانا کی دوسری بیوی کے پاس ہے۔"

"جی!" نہال کے تو جیسے زمین آسمان گھوم گئے۔

"کیا کہا آپ نے؟" اس کو اپنی آواز اجنبی لگی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ اس بات کو یہیں رہنے دو، مگر تم بے حد ضدی ہو۔ یہ ادھوری سی کہانی ہے۔ آغاز تو مجھے معلوم ہے، انجام کی خبر نہیں۔"

"بابا جان! مجھے تو نانا جان کی دوسری شادی کا علم نہیں تھا۔" وہ ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔

"تمہیں کیا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔"

"آپ مجھے شروع سے بتائیں۔" اس کی آواز جیسے اندھے کنوئیں سے آ رہی تھی۔

○ ● ◆

"سید صاحب! اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ میری رائے مانیں تو کچھ عرصے کے لیے کسی پُر فضا مقام پر چلے جایئے، آب و ہوا کی تبدیلی صحت پر خوشگوار اثر ڈالے گی۔" ڈاکٹر صاحب نے بلڈ پریشر اپریٹس لپیٹتے ہوئے کہا۔

سید صاحب مسکرانے لگے، مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔

"ڈاکٹر صاحب! انتہائی مناسب مشورہ دیا ہے آپ نے۔ وجاہت! میرا خیال ہے، پروگرام بنا ہی ڈالو، میں بھی آج کل بہت بوریت محسوس کر رہا ہوں۔" سکندر رضا کی سیر و تفریح کے نام سے ہی رگیں پھڑکنا شروع ہو جاتی تھیں۔

"سکندر! تم گھومنے پھرنے کے بہت شوقین ہو۔"

"اس پر تم جیسے دوستوں کی عنایتیں ہیں۔" سکندر رضا برجستہ بولے۔

"اچھا سید صاحب! مجھے اجازت دیجیے اور میرے مشورے پر غور ضرور کیجیے گا۔" ڈاکٹر صاحب اُن سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

○ ● ◆

شمالی علاقے کا وہ پُر فضا مقام گویا نظاروں کی جنت تھا۔ بہت دور اُفق سے گلے ملتے برف پوش پہاڑ، حدِ نظر تک پھیلا ہوا سرسبز جنگل، صبح کے سورج کو خوش آمدید کہتے رنگ برنگے پھول، چاند کی کرنوں سے کھِلتی کلیاں، کسی الھڑ دوشیزہ کی مست چال کی طرح بہتے چشمے، غرض کہ ہر سُو قدرت کا حسن بکھرا ہوا تھا۔

مقامی لوگ خلوص کی ریشمی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ تن کے بھی اُجلے تھے اور من میں بھی روشنی تھی۔

ذرا سی اونچائی پر انگریزوں کا بنایا ہوا خوبصورت سا ریسٹ ہاؤس تھا۔ جس کی گیلری میں کھڑے سید صاحب دوربین آنکھوں سے لگائے حسین نظاروں کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ رہے تھے۔

سکندر رضا نے ٹیرس پر ہی ٹیبل اور دو کرسیاں لا کر رکھیں۔ پھر بھنے ہوئے ہرن کے گوشت کی ٹرے اُٹھا لائے۔

"وجاہت! آجاؤ، میں نے کھانا لگا دیا ہے۔"

"میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ ایک دو ملازم لیے چلتے ہیں۔" سید صاحب دوربین آنکھوں سے لگائے لگائے بولے۔

"جی میں جانتا ہوں، آپ ملازموں کی فوج لا سکتے تھے۔" اُنہوں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا پھر لمحہ بھر کو رُک کر دوبارہ گویا ہوئے۔

"لطف تو اسی میں ہے کہ انسان خود شکار کرے، خود ہی پکائے، خود ہی کھائے اور پھر بھرپور لطف اُٹھائے۔"

"قدرتی حسن کی بہتات ہے یہاں پر۔" سید صاحب نے گوشت کا چھوٹا سا پیس کاٹتے ہوئے کہا۔

سکندر رضا کھاتے کھاتے رُک گئے، نگاہیں اُٹھا کر اُنہیں دیکھا جیسے پوچھنا چاہ رہے ہوں کہ کس حسن کی بات کر رہے ہو، جیتے جاگتے حسن کی یا وہ جو اپنی جگہ ساکت کھڑے بہار دکھا رہے ہیں۔

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔" اُن سے رہا نہ گیا، بول ہی پڑے۔

سید صاحب نے عجیب معنی خیز نگاہوں سے اُن کی سمت دیکھا۔ سکندر رضا کو ان کی آنکھوں کی چمک

سے وحشت سی ہوئی۔

"حسن کے معنی پہلی دفعہ میری سمجھ میں آئے ہیں۔" سید صاحب اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولے۔

"چھوڑو اس بات کو، مجھے کھانا کھانے دو۔" وہ کوفت زدہ انداز میں بولے اور اپنی پلیٹ پر جھک گئے۔

"یار سکندر! میرا قہوہ پینے کو دل چاہ رہا ہے۔" کھانا کھانے کے بعد سید صاحب آرام سے کرسی پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ گئے۔

"گل بابا سے کہتا ہوں، وہ بنا دے گا۔" سکندر رضا نے ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار کو بلوایا۔

"گل بابا! ذرا ہمیں قہوہ بنا دو۔"

"کیوں نہیں صاحب ابھی لیجیے، میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ کھانے پینے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ یہاں جتنے لوگ بھی آ کر ٹھہرتے ہیں یا تو اپنے ساتھ باورچی لاتے ہیں یا پھر ان کے لیے انتظام ہم خود کرتے ہیں۔ میری بیٹی کھانا اچھا بناتی ہے۔"

"نہیں بابا! اس میں لطف نہیں آتا۔" سکندر رضا ستانے کی غرض سے بستر پر لیٹ گئے۔

"انہیں کھانا پکانے کے سلسلے میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا بہت شوق ہے۔" سید صاحب جلے کٹے لہجے میں بولے۔

انہیں ملازم ساتھ نہ لانے کا سخت افسوس تھا۔ اُنہوں نے بہت کوشش کی تھی مگر سکندر رضا نے ان کی ایک نہ چلنے دی تھی۔

سکندر رضا ان کی بات پر یوں مسکرائے جیسے خاصا محظوظ ہوئے ہوں۔ "جایئے آپ قہوہ بنا لایئے۔" اُنہوں نے گل بابا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جی بہتر۔" وہ باہر نکل گیا۔

○ ● ◆

"وجاہت! میں ذرا نیچے بستی تک جا رہا ہوں۔ تم چل رہے ہو میرے ساتھ؟" سکندر رضا سوئیٹر پہنتے ہوئے بولے۔

"نہیں تم جاؤ، میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔" وہ بیزاری سے بولے۔

"ٹھیک ہے، میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔" وہ باہر نکل گئے۔

سید صاحب کچھ دیر تک کتاب پڑھتے رہے پھر بور ہو کر اسے ایک طرف رکھ دیا۔ دوربین اُٹھا کر ریسٹ ہاؤس سے باہر آ گئے۔

"او بابو صاحب! آپ نے ریشم کو دیکھا ہے؟"

سید صاحب چونک کر پلٹے اور دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

"پروردگار! جب تیرے بندے اتنے حسین ہیں تو، تُو خود کیسا ہو گا۔" اُن کے لب پھڑپھڑائے۔

اُجلی شفاف رنگت پر کوٹ لینے کی حد تک حسین آنکھیں، ہونٹ اتنے پیارے پیارے کہ بے ساختہ انسان ان کا موازنہ پھولوں سے کرنے لگے۔ دو چوٹیاں باندھے، بڑی سی چادر سر پر ڈالے وہ ان کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

سید صاحب بھلا کیا بولتے۔

حواسوں میں ہوتے تو بولتے بھی۔

"خدا جانے کہاں چلی گئی۔ یہ تو بہت ہی آوارہ ہو گئی ہے۔ ذرا مجھے مل جائے، خوب اچھی طرح خبر لوں گی۔" اُس نے آنکھیں سکیڑ کر چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔

"بہت تنگ آ گئی ہوں اس سے۔ روز بروز اس کی حرکتیں ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔" وہ اپنے آپ سے گفتگو میں مصروف تھی۔

"اوہ! وہ رہی۔۔۔ ٹھہر جا، مجھ سے بچ کر بھلا کہاں جائے گی۔ ابھی بتاتی ہوں اسے۔" وہ مست ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی غائب ہو گئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

سیّد صاحب اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پائے۔

کیا تھی وہ؟

خواب تھی یا حقیقت تھی۔

انسان تھی یا حُور تھی۔

وہ کھوئے کھوئے انداز میں واپس ریسٹ ہاؤس کے اندر آ گئے۔ گیلری میں کھڑے ہو کر وادی میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ وہ حسن کی پری انہیں کہیں نظر نہ آئی۔

اگر وہ حقیقت تھی تو کہاں چلی گئی؟

اور اگر سپنا تھی تو اتنی جلدی کیوں ٹوٹ گیا؟

ان ہی سوچوں میں مگن وہ اپنے بستر پر جا لیٹے۔ کچھ ہی دیر میں اُنہیں نیند نے آ گھیرا۔

سکندر رضا کے قدموں کی آواز سے اُن کی آنکھ کھُلی۔ انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اندھیرے نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا تھا۔

"تم نے اتنی دیر لگا دی؟" انہوں نے سستی سے کہا۔

"ہاں، بستی کے لوگوں کے آگے میرا بس نہیں چل رہا تھا۔ وہ لوگ تو مجھے آنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ ہر گھر کا مکین مجھے اپنا مہمان بنانا چاہ رہا تھا۔" سکندر رضا بہت زیادہ متاثر دکھائی دے رہے تھے۔

◆ ● ☾

سیّد صاحب ریسٹ ہاؤس کے پاس ہی بہتے چشمے کے قریب ایک بڑے سے گول پتھر پر بیٹھے چشمے کو پتھروں سے پھوٹتے اور نیچے کی جانب بہتے ہوئے محویت سے دیکھ رہے تھے۔ سکندر رضا پر بستی کے لوگوں نے نہ جانے کون سا جادو کر دیا تھا کہ وہ صبح سے جو غائب ہوئے تھے، تو اب تک شکل نہ دکھائی تھی۔ کھانے پر بھی وہ غائب تھے۔

"ارے بابو صاحب آپ؟"

سیّد صاحب اس آواز پر تیزی سے پلٹے۔ وہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ان کے پیچھے کھڑی تھی۔

"اوہ!" وہ کھڑے ہو گئے۔ "کیا آج بھی تمہاری ریشم تم کو چکمہ دے گئی؟"

"ارے نہیں بابو صاحب! اس کی مجال ہے۔" اُس کے یاقوتی ہونٹوں کے اندر سفید موتیوں کی لڑی ایک دم نمایاں ہو گئی۔

"آج تو میں نے اس کی گردن میں رسّی ڈال کر اس کا سر کھڑکی کی سلاخ سے باندھ دیا ہے۔"

"کیا؟ تم نے اپنی بہن کی گردن میں رسّی ڈال دی؟" وہ سخت تعجب میں رہ گئے۔

"ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا!" اُس کے حلق سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا۔

بے ساختہ سیّد صاحب کا دل چاہا کہ وہ یونہی ہنستی رہے اور وہ اُسے کھڑے دیکھتے رہیں۔

"ارے بابو صاحب! آپ بھی بہت بھولے معلوم ہوتے ہیں۔ ارے ریشم تو میری بکری کا نام ہے۔"

لڑکی کی اس بات پر وہ بُری طرح جھینپ گئے۔ اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے جلدی سے بولے۔

"تم یہیں رہتی ہو؟"

"ہاں جی، وہ اُدھر میرا گھر ہے۔" اُس نے نیچے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروں کی طرف اشارا کیا۔

"میرے بابا ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار ہیں، اس لیے ادھر آتی جاتی رہتی ہوں۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"دل آرا۔" وہ ہولے سے بولی۔

"بہت خوبصورت نام ہے، میں نے پہلی بار سُنا ہے۔"

"تم نے مجھے دیکھا بھی تو پہلی بار ہے۔" اس نے برجستہ کہا۔

وہ حسین ہی نہیں ذہین بھی تھی۔ سیّد صاحب دل ہی دل میں اُس کے قائل ہو گئے۔

"تم یہاں اس وقت اکیلی ہو تم کو ڈر نہیں لگ رہا ہے۔ شام کے وقت تو درندے بھی یہاں آزادانہ گھومتے ہوں گے۔" سیّد صاحب جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"ہونہہ! ہمت ہے کسی میں جو دل آرا کو چھیڑ سکے۔" وہ قدرے اکڑ کر بولی۔

"کیا بات ہے تمہاری۔" سیّد صاحب نے اُسے دلچسپی سے دیکھا۔

اُسی لمحے اس کا پاؤں پتھر سے پھسل گیا۔ وہ لڑکھڑائی پھر فوراً ہی سنبھل گئی، مگر اُس کا کندھا سیّد صاحب کے بازو سے ٹکرا گیا۔

"سوری۔" اُس نے معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھا۔

سیّد صاحب حیرت زدہ رہ گئے۔ کہاں یہ بنیادی سہولتوں سے محروم، دور افتادہ گاؤں کی لڑکی اور انگریزی کا لفظ؟

"یہ لفظ کہاں سے سیکھا؟" وہ پوچھ ہی بیٹھے۔

اُن کی بات پر وہ ہنسی کی جھنکار کے ساتھ بولی۔

"یہاں ایک انگریز بابو اپنی میم کے ساتھ آیا تھا۔ اس کی میم بیمار پڑ گئی۔ وہ لوگ کافی عرصہ یہاں رہے تھے۔ میں تو یہاں آتی جاتی ہی رہتی ہوں۔ اُس کی میم مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ اُس نے مجھے تھوڑی سی اپنی زبان سکھائی، تھوڑی سی میں نے اُس کو اپنی زبان سکھائی۔ مجھے صرف سوری نہیں اور بھی تھوڑا بہت آتا ہے۔"

"مثلاً؟" انہوں نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

"ہیلو۔۔۔ ہاؤ آر یو۔۔۔ آئی ایم فائن تھینک یو۔۔۔ سو نائس آف یو۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔" وہ بڑے فخر سے بتا رہی تھی۔

"اس نے تم کو 'آئی لو یو' بھی سکھایا ہوگا۔" سیّد صاحب کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

"ہاں، کیوں نہیں سکھایا، مجھے آئی لو یو بھی آتا ہے۔"

یا تو وہ بہت زیادہ بھولی تھی یا حد سے زیادہ خود اعتماد۔ دو ہی قسم کی لڑکیوں سے ایسی بات کی توقع کی جا سکتی تھی۔

سیّد صاحب نے اُسے بغور دیکھا۔ فرشتوں جیسی معصومیت لیے وہ انتہائی اطمینان سے سیب کھا رہی تھی۔

"آؤ ذرا نیچے وادی میں گھوم کر آئیں۔" انہوں نے اُسے پیشکش کی۔

"چلو۔" وہ جھٹ راضی ہو گئی۔

"تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگ رہا؟" وہ اونچے نیچے راستے پر قدم جما جما کر رکھ رہے تھے۔

"کیا مطلب؟ کیا تم جن ہو؟" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"دیکھو ناں مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔ تم بستی سے اتنی دور ہو۔ آس پاس سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے۔"

دل آرا نے اُن کی بات سن کر نقرئی قہقہہ لگایا۔ "میرا خدا جو میرے ساتھ ہے اور میں اپنی محافظ خود بھی ہوں۔ یہ دیکھو۔" اُس نے کمر کی پٹی کے ساتھ بندھا تیز دھار خنجر نکالا۔

"کیا خیال ہے؟" اُس نے خنجر والا ہاتھ سر سے بلند کیا۔ "یہ اتار دوں سینے میں؟"

وہ اس کے عین سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ "میں لکھ کر مروں گا کہ موت سے نہ ڈرو، موت بے حد حسین ہوتی ہے۔"

دل آرا کا اُٹھا ہوا ہاتھ گر گیا۔ وہ ایک دم چُپ سی ہو گئی۔

پھر باقی سارا وقت وہ خاموش ہی رہی۔ سیّد صاحب ہی اُس سے بولتے رہے۔ کسی کسی بات کا وہ جواب دے دیتی، ورنہ ہوں ہاں ہی کرتی رہی۔ تھوڑی دیر گھوم پھر کر وہ واپس ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ارے دل آرا! تو صاحب کے ساتھ گئی تھی؟" گل بابا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بابا! یہ راستے میں مل گئے تھے۔ ہم اُدھر نیچے وادی کا چکر لگا کر آ گئے۔" وہ عام سے لہجے میں کہتی ہوئی ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ گئی۔

"یہ میری بیٹی ہے صاحب!" گل بابا نے بیٹی کو محبت سے دیکھا۔

"سکندر آ گئے ہیں؟" انہوں نے اندر کی طرف جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جی، وہ تو سرِ شام ہی آ گئے تھے۔"

سیّد صاحب اندر چلے گئے۔

"کہاں چلے گئے تھے وجاہت؟" سکندر رضا کاؤچ پر لیٹے کتاب پڑھ رہے تھے۔

"حور کے ہمراہ جنت میں گھوم رہا تھا۔" انہوں نے پانی کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" سکندر رضا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

سیّد صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر جھانکنے لگے۔ وہ پری پیکر ابھی تک سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔

"تم، دل آرا سے ملے؟"

"گل بابا کی بیٹی سے؟ ہاں بستی میں ملا تھا۔"

"کیسی ہے؟" سیّد صاحب نے کچھ عجیب سے انداز میں کہا۔

سکندر رضا کو توقع نہ تھی کہ وہ آگے سے اس قسم کا سوال بھی کر بیٹھیں گے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر اُن کو دیکھتے رہے اور پھر ایک گہرا سانس لے کر بولے۔

"بات یہ ہے سیّد وجاہت علی خاں کہ میں اُن مردوں میں سے نہیں ہوں کہ جو کسی بھی عورت کو اس حد تک غور سے دیکھتے ہیں کہ اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ وہ کیسی ہے اور کیسی نہیں ہے۔ میری بیوی جب میری نظروں کے سامنے ہوتی ہے تو شاید کبھی کبھی مجھے بُری بھی لگنے لگتی ہے، مگر جب میں اُس سے دور ہوتا ہوں تو وہ مجھے بُری طرح یاد آنے لگتی ہے۔ اُس کا تصوّر مجھے کسی اور کی طرف اس حد تک غور سے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا، کہ میں اس قسم کے سوال کا جواب دے سکوں کہ فلاں کیسی ہے۔" نہ جانے سکندر رضا نے انہیں کیا جتانا چاہا۔

سیّد صاحب بے وقوف نہ تھے کہ سمجھ نہ پاتے۔ دل ہی دل میں وہ کھول کر رہ گئے۔ ایک تیز نگاہ اُن پر ڈال کر وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔

"بہت دیانت دار قسم کا مرد ہوں۔ کسی بھی قسم کی خیانت پسند نہیں کرتا۔" سکندر رضا بڑی معنی خیزی کے ساتھ گویا ہوئے۔

ان کا ایک ایک لفظ جیسے زہر میں بُجھا ہوا تھا، جو وہ سیّد صاحب کے کان میں ٹپکا رہے تھے۔

"میرا خیال ہے یہ کتاب بہت دلچسپ ہے، تم اسے آج ہی ختم کر ڈالو۔" انہوں نے جل کر اُس کتاب کی طرف اشارا کیا جو وہ پڑھ رہے تھے۔

سکندر رضا بے ساختہ ہنسنے لگے۔

سیّد صاحب بیزاری کے عالم میں مُڑے اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئے۔

"کھانا نہیں کھاؤ گے؟" اُن کی کیفیت پر سکندر رضا خاصے محظوظ ہوتے مُسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولے۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" انہوں نے رکھائی سے جواب دیا۔

"کھا لو میرے بھائی! آج کھانا تمہاری دل آرا نے بنایا ہے۔"

سیّد صاحب کو دل ہی دل میں بڑا افسوس ہوا۔ ناحق یہ کہہ دیا کہ بھوک نہیں ہے۔ ذرا اس زہرہ جبیں کا بنایا ہوا کھانا بھی چکھ لیتے، مگر اب تو بات مُنہ سے نکال چکے تھے اور اس کا بھرم بھی رکھنا چاہ رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے انکار کر دیا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" سکندر رضا نے بھی اصرار نہ کیا۔

اگلے دن صبح نئے انداز میں طلوع ہوئی۔ رات اگر سیّد صاحب سو نہیں پائے تھے تو نیند دل آرا کو بھی نہیں آئی تھی۔ سیّد صاحب اگر بے قرار تھے تو سکون دل آرا کو بھی نہیں تھا۔

بعض لوگ ایسے کیوں ہوتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر اپنی ہستی کے مٹ جانے کا احساس ہونے لگتا ہے۔

جن کو دیکھ کر اپنا وجود بے معنی لگتا ہے۔

ان سے مل کر یوں لگتا ہے کہ جیسے دُنیا ان پر ختم ہو گئی ہے۔ ان کے بعد ان سے آگے کچھ نہیں ہے۔ کہیں نہیں ہے۔

دل آرا بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا تو سکون ہی لُٹ گیا تھا۔ دھیان خواہ مخواہ اس ریسٹ ہاؤس والے بابو صاحب کی طرف جا رہا تھا۔

"اُفوہ!" اُس نے سر تھام لیا۔ آخر اس شخص میں ایسی کون سی بات ہے اور بھی تو کئی لوگ ریسٹ ہاؤس میں آ کر ٹھہرے تھے، مگر نہ جانے اُس شخص نے کون سا جادو کر دیا ہے۔

اُس شخص کو دیکھ کر ایسا کیوں لگتا ہے، جیسے ایک مضبوط سی چھت سر پر آ گئی ہو۔

"دل آرا! اُٹھ گئی بیٹے؟" گل بابا نے اندر آ کر کہا۔

دل آرا کو یوں لگا جیسے گل بابا نے اس کی چوری پکڑ لی ہو، اُس کی سوچ پڑھ لی ہو۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"بیٹیا! جو ریسٹ ہاؤس میں صاحب لوگ آئے ہیں تُو اُن کے لیے ناشتا تیار کر دے۔"

"بابا! اس سے پہلے تو تم نے کبھی نہیں بنوایا۔" وہ بستر کی چادر تہہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"اُن میں سے ایک صاحب خود بنا لیتے تھے، مگر آج اُن کے سر میں درد ہے۔"

(کون سے والے صاحب کے سر میں درد ہے؟)

"اچھا میں بنا دیتی ہوں۔" اُس نے جا کر مُنہ ہاتھ دھویا اور پھر پراٹھے بنانے لگی۔

ناشتا تیار کر کے اُس نے گل بابا کو دے کر ریسٹ ہاؤس روانہ کر دیا اور اپنے گھر کی دہلیز پر آ کر بیٹھی۔ آج نہ جانے کیا بات تھی، اُس کا کسی کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ (نہ جانے جی کو کیا ہو گیا تھا)

ورنہ وہ تو اتنی پھرتیلی تھی کہ فٹافٹ سارے گھر کے کام نمٹایا کرتی تھی، پھر اس کے بعد بستی کے ہر گھر کا چکر لگانا اور گھر کے ہر مکین کا حال فرداً فرداً دریافت کرنا گویا اس کے فرائض میں شامل تھا، مگر آج اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ بس خاموش بیٹھی رہے۔ نہ کوئی اس کو آواز دے اور نہ وہ کسی سے بات کرے۔

کچھ دیر وہ یونہی اَن دیکھے سے خیالوں میں کھوئی رہی۔ پھر بے دلی سے اُٹھ کر گھر کا کام کاج کرنے لگی۔ صفائی ستھرائی سے فارغ ہو کر وہ تخت پر آن بیٹھی۔ دل کی عجیب ہی کیفیت تھی۔ اُلٹی سیدھی باتوں پر اُکسا رہا تھا۔

(میں وہاں ہرگز نہیں جاؤں گی۔) اُس نے سوچا اور کچھ اور بھی جم کر تخت پر بیٹھ گئی۔

پھر نہ جانے کیا ہوا، ایک انجانی سی طاقت اُس کو کھینچنے لگی۔ وہ دروازے سے باہر آ گئی۔

باہر کا سماں بھی بدلا بدلا تھا۔ (یا شاید اس کو لگ رہا تھا) نیلا آسمان کچھ اور بھی نیلاہٹیں لیے ہوئے تھا۔ بادلوں کی آوارگی کچھ اور بھی عروج پر تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کسی رسیلے نغمے میں ڈھل چکی تھی۔ ہواؤں کی سرسراہٹ سرگوشیوں میں بدل گئی تھی۔

اس کے قدم کشاں کشاں ریسٹ ہاؤس کی طرف اُٹھنے لگے۔ ناہموار راستوں پر سہج سہج۔ قدم رکھتی وہ آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کو ایک بڑے پتھر سے ٹھوکر لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ گرتی، دو مضبوط ہاتھوں نے اسے تھام لیا۔ اس نے نگاہ اُٹھائی۔

سیّد وجاہت اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ سامنے کھڑے تھے۔

"اوہ۔ السلام علیکم بابو صاحب!" اس نے بڑے نامحسوس طریقے سے اپنا بازو چھڑایا۔

"وعلیکم السلام۔ کہاں جا رہی ہو؟"

"وہ۔ مجھے بابا سے کچھ کام تھا۔" وہ جھجک کر بولی۔

"واقعی؟" انہوں نے یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں جھوٹ بولنے کا کیا فائدہ؟

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دل آرا کو خاموشی کے علاوہ کوئی بات نہ سوجھی۔

"تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں۔ رات کو نیند نہیں آئی؟" وہ مدھم سرگوشی میں بولے۔

دل آرا کا جی چاہا کہ پوچھے کیا اپنی آنکھوں کو غور سے نہیں دیکھا؟ مگر وہ کچھ نہ بولی۔

ضروری تو نہیں کہ دو انسان آپس میں بات کریں تو لفظوں کا سہارا بھی لیں۔ خاموشی کی اپنی بھی تو زبان ہوتی ہے۔ اس "خاموش طویل گفتگو" کے بعد سید صاحب ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولے۔

"آؤ گھومنے چلتے ہیں۔"

"ٹھہرو، میں بابا سے کہہ آؤں۔" دل آرا ریسٹ ہاؤس کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

سید صاحب اس کی بات پر نہ جانے کس سوچ میں پڑ گئے۔

"کہاں کھو گئے بابو صاحب؟" ان کو پتا ہی نہ چلا کہ کب دل آرا ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"بہت دور۔" وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔

دل آرا نے نظریں چرا لیں۔

"آؤ۔" وہ آگے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے ہو لی۔

"بس بابو صاحب میں تھک گئی۔" وہ ایک چشمے کے قریب بیٹھ گئی۔

"میں تمہاری تھکن سمیٹنے کو تیار ہوں۔" سید صاحب کا دل بولا مگر زبان مصلحتاً خاموش رہی۔

ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ بات پُر تاثر بنانے کے لیے مناسب موقع اشد ضروری ہوتا ہے۔

"دل آرا تم نے مجھے اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔" وہ آسمان کو تکتے ہوئے بولے۔

"جانتے تو ہو آپ مجھے۔ میرا نام دل آرا ہے اور میں گل بابا کی بیٹی ہوں۔" اس نے پتھر اٹھا کر چشمے میں پھینک دیا۔

"تمہارے گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ میری ماں کا تین سال پہلے انتقال ہو گیا۔ بس میں ہوں اور بابا ہیں۔"

"تمہاری شادی نہیں ہوئی ابھی تک۔" انہوں نے انتہائی سرسری لہجے میں سوال کیا۔

"منگنی ہو چکی ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

سید وجاہت کو اس جواب و اطمینان کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک دم اسے دیکھتے رہ گئے۔

"کب ہوئی؟ کس سے ہوئی؟"

"کب ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب میں پیدا ہوئی اور کس سے ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شہزور سے ہوئی۔"

"کہاں ہے تمہارا منگیتر۔ میں نے تو اس کو نہیں دیکھا۔"

"بابو صاحب! تم کیا اس کو تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔" دل آرا نے ایک اور پتھر اٹھا کر چشمے میں اچھال دیا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"وہ بہت گہری نیند سو رہا ہے۔ ہمیشہ کی نیند۔ اب کبھی نہیں اٹھے گا۔"

"اوہ!" سید صاحب نے جیسے سینے میں پھنسا سانس باہر نکالا۔

دل آرا نے بڑے غور سے ان کو دیکھا۔

"کیا ہوا تھا اسے؟"

"اس پر بھیڑیے نے حملہ کر دیا تھا۔" اس نے اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بابو صاحب اس بات کو سال گزر چکے ہیں مگر مجھے لگتا ہے کہ کل ہی کی بات ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ شام کا وقت تھا۔ میں نے اپنی بکریوں کو چرنے کے لیے چھوڑ رکھا تھا۔ اچانک مجھے جنگل کی طرف سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً ہی جان لیا کہ وہ شہزور ہے۔ اس کی دردناک چیخیں پورے جنگل میں گونج رہی تھیں۔ میں بے اختیار جنگل کی طرف دوڑی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خوفناک بھیڑیے نے اس کو دبوچ رکھا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس وحشی درندے کے آگے اس کا کوئی زور نہ چل رہا تھا۔ وہ خون میں نہا چکا تھا۔ پھر جانتے ہو بابو صاحب میں نے کیا کیا؟"

اس نے لمحہ بھر کو رک کر سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا اور پھر کمر کی پٹی سے خنجر نکالا اور اس کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

"یہاں تو زہریلی جڑی بوٹیاں عام ہوتی ہیں۔ میں نے ایسی ہی ایک بوٹی اس خنجر پر گھس کر یہ اس بھیڑیے کے اندر اتار دیا۔ وہ کچھ ہی دیر میں ٹھنڈا ہو گیا۔ مگر شہزور اس سے پہلے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے ہی ہاتھوں سے اس کی لاش گھسیٹی تھی۔" اس نے اپنے سپید سپید ہاتھ ان کے آگے پھیلا دیے۔

"وہ صرف چودہ برس کا تھا اور میں تیرہ برس کی۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ بابا نے اس سے میری منگنی کر رکھی ہے۔ اسی دن پتا چلا جب وہ قبر میں جا کر سو گیا کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔"

"تمہیں دکھ تو بہت ہوا ہو گا؟" سید صاحب نے اسے کھوجتی نگاہوں سے دیکھا۔

"بہت زیادہ۔ مگر مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر تو نہیں جاتا ناں۔ صبر آ ہی جاتا ہے بندے کو۔ مجھے چھوڑو شہزور کی ماں کو دیکھو۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ بھی زندہ ہی ہے بیٹے کے بغیر۔"

"تم بہت دلیر لڑکی ہو۔" سید صاحب نے اس کے ہاتھ سے خنجر لیتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔ "کسی لڑکی کے ہاتھ میں خنجر ہو تو کیا تم شہر والے اسے دلیری کا خطاب دیتے ہو۔"

سید صاحب لاجواب ہو گئے۔

"بابو صاحب یہاں کی ہر لڑکی دلیر ہے۔ گھر سے نکلتی ہے تو خنجر ساتھ ہوتا ہے۔ وہ صرف خنجر ہی ساتھ نہیں رکھتی، وقت پڑنے پر اپنی عزت اور جان کے دشمن کے سینے میں اتار دینے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ اس کا دشمن چاہے حیوان ہو یا حیوان نما انسان، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم گاؤں کی لڑکیاں، تم شہر والوں کی لڑکیوں کی طرح نہیں ہوتیں جو ذرا ٹیڑھی نظر سے ڈر جاتی ہیں۔" دل آرا کے لہجے میں پہاڑی لڑکیوں کا فخر بول رہا تھا۔

"تم نے میرے بارے میں تو جان لیا۔ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" اس نے گھاس کا تنکا توڑتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں جیسا ہوں تمہارے سامنے ہوں۔"

"بچے کتنے ہیں تمہارے؟"

"شادی ہو گی جبھی تو بچے ہوں گے۔" انہوں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

وہ گاؤں کی بھولی لڑکی، شہر کے پروردہ سید وجاہت کی سوچوں میں نہ اتر سکی۔

"ہائے اللہ تم نے شادی نہیں کی؟ اتنی عمر ہو گئی تمہاری۔"

"کتنی عمر ہے میری؟" انہوں نے مزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"اوں۔ تیس سے پینتیس سال کے درمیان تو ضرور ہو گی۔" اس نے اندازہ لگایا۔

"تو کیا میری عمر بہت زیادہ ہو گئی ہے۔" ان کے لیے یہ سوال بہت اہم تھا۔

"بابو صاحب تم کو تو ہمارے ہاں پینتیس سال کی عمر کے دادے نانے مل جائیں گے۔ ہمارے یہاں تو سترہ اٹھارہ برس کا کوئی لڑکا ایسا ملے گا جس کی شادی نہ ہوئی ہو۔ اور لڑکیوں کی شادی تو بارہ تیرہ سال میں ہی کر دی جاتی ہے۔"

"تمہاری تو اس لحاظ سے کافی عمر ہو گئی ہے۔ گل بابا نے تمہاری شادی کیوں نہیں کی؟"

"بابا تو کرنا چاہتا ہے پر میں نہیں مانتی۔"

"کیوں؟" وہ اس کی جانب جھک کر بولے۔

"بابا کا میرے سوا کون ہے۔ میں بابا کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

"تو کیا ساری زندگی یونہی گزار دو گی؟"

"پتا نہیں۔" اس نے گول مول جواب دیا۔ "تم بتاؤ تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں آزاد رہنا پسند کرتا تھا۔ شادی میرے نزدیک زنجیر کی طرح تھی۔"
"تھی سے کیا مطلب؟ اب نہیں ہے؟"
"نہیں یہ بات نہیں۔ شادی زنجیر ہی ہے مگر بے حد خوبصورت زنجیر ہے۔ اس کا احساس تو اب ہوا ہے۔"
سیّد وجاہت تو اس میدان کے منجھے ہوئے کھلاڑی تھے۔ جانتے تھے کہ لفظوں کا جال کس طرح پھینکا جاتا ہے کہ شکار ہونے والا الٹا اپنے آپ کو شکاری سمجھے۔
"چلو بابو صاحب۔" وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔
"کیا ہوا؟"
"مجھے دیر ہو رہی ہے گھر جا کر کھانا بھی بنانا ہے۔"
سیّد صاحب کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر کندھے اچکا کر بولے "جیسے تمہاری مرضی۔"
دونوں ریسٹ ہاؤس چلے آئے۔

○ ● ◆

"سکندر! آج گل بابا نظر نہیں آیا۔ شام ہونے کو آ گئی۔" سیّد صاحب نے گیلے بالوں کو تولیے سے پونچھتے ہوئے کہا۔
"تمہیں گل بابا کی فکر ہے یا کسی اور کی؟" وہ کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر بولے۔
سیّد صاحب نے کوئی جواب نہ دیا اور بالوں میں کنگھا کرنے لگے۔
"ارے یہ کیا ہے؟" انہوں نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو کسی سخت چیز کا احساس ہوا۔
سکندر رضا بھی کتاب میں سے منہ نکال کر دیکھنے لگے۔
سیّد صاحب نے ہاتھ باہر نکالا تو ان کے ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن تھا۔
"یہ بیگم کا کنگن میرے پاس کیسے آ گیا۔" وہ حیرت سے بولے۔ "اوہ یاد آیا۔ اس کا پیچ کچھ ڈھیلا ہو گیا تھا۔ کھل نہیں پا رہا تھا۔ میں نے جوہری کے ہاں بھجوایا تھا۔ وہ اسی وقت لے کر آیا جب میں ادھر آنے کے لیے گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ میں نے بے خیالی میں بجائے بیگم کو پکڑانے کے جیب میں ڈال لیا۔ یہ میرے ساتھ ہی آ گیا۔"
"دکھانا ذرا۔" سکندر رضا نے کہا۔
"یہ لو۔ یہ میں نے بیگم کو منہ دکھائی میں دیے تھے۔ ان ہیروں کے جڑاؤ کی ترتیب ایسی رکھوائی تھی کہ بیگم کا نام لکھا دکھائی دے۔"
"ایسے انوکھے خیالات تمہارے ذہن کی پیداوار ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ لو۔ بہت خوبصورت ہے۔" انہوں نے کنگن واپس کر دیا۔
سیّد صاحب نے سوٹ کیس میں کنگن رکھ دیا اور باہر کی جانب قدم بڑھائے۔
"کہاں جا رہے ہو؟" وہ پوچھ بیٹھے۔
"ابھی آتا ہوں۔" وہ باہر نکل گئے اور کوچۂ جاناں کی طرف چل دیے۔ منزل مقصود پر پہنچ کر ان کے قدم خود بخود رک گئے۔
انہوں نے دروازے پر دستک دی۔
دل آرا نے کھولا۔ "آپ یہاں۔" وہ کبھی انہیں تم سے مخاطب کرتی تھی اور کبھی آپ سے۔
"کیوں؟ کیا میں یہاں نہیں آ سکتا؟" انہوں نے الٹا سوال کیا۔
"آئیے۔" اس نے راستہ چھوڑ دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
"سمجھ میں نہیں آ رہا ہے آپ کو کس جگہ بیٹھنے کے لیے کہوں۔"
"تم اپنا آنچل بچھا دو۔ میں اس پر بیٹھ جاتا ہوں۔" وہ مدھم آواز میں بولے پھر لہجہ بدل کر کہا۔ "آج گل بابا نہیں آئے۔ کیا بات ہے؟"
"بابا کو رات سے بخار ہے۔ وہ سو رہے ہیں۔"

"کون ہے دل آرا؟" اندر سے گل بابا کی آواز آئی۔
"بابا تم اٹھ گئے۔" وہ تیزی سے اندر کی طرف لپکی۔
سیّد صاحب بھی اس کے پیچھے اندر چلے آئے۔
"کون آیا ہے؟" گل بابا کی آواز میں نقاہت نمایاں تھی۔
"یہ ریسٹ ہاؤس والے بابو صاحب آئے ہیں۔"
"معافی چاہتا ہوں، غالباً میرے دستک دینے کی آواز سے آپ کی آنکھ کھل گئی۔"
"نہیں صاحب! آپ نے یہاں آنے کی کیوں تکلیف کی۔" وہ اٹھنے لگا۔
"تم لیٹے رہو۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔
"کوئی دوائی وغیرہ دی۔" وہ دل آرا سے پوچھنے لگے۔
"بابو صاحب! ہم تو جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں۔"
"اچھا ٹھہرو میں آتا ہوں۔" وہ باہر نکل آئے اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے واپس ریسٹ ہاؤس آئے۔ سکندر رضا غالباً نہا رہے تھے۔ غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ سیّد صاحب نے بیگ میں سے چند دوائیاں نکالیں اور واپس روانہ ہو گئے۔ دل آرا انہیں دروازے ہی میں کھڑی مل گئی۔ وہ اس کے ہمراہ اندر چلے آئے۔
"یہ گولیاں انہیں چائے کے ساتھ دے دو۔" انہوں نے دوائیاں دیتے ہوئے کہا۔ "اس سے جلد آرام آ جائے گا۔"
"بابو صاحب آپ نے ہمارے لیے کیوں تکلیف کی۔ میں آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں۔" وہ دوپٹے کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے آہستہ سے بولی۔
"کیا چاہت کے سارے الفاظ ختم ہو گئے ہیں۔"
دل آرا نے چونک کر دیکھا۔ وہ والہانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔
"اب میں چلتا ہوں۔" وہ باہر نکل گئے۔
وہ تو چلے گئے مگر دل آرا کو تہی داماں کر گئے۔ وہ وہیں دروازہ تھام کر بیٹھ گئی۔
ایک دو دن میں گل بابا کی طبیعت سنبھل گئی۔ سیّد صاحب نے اس دوران ان کے گھر کے کئی چکر لگائے۔ وہ دل آرا ہی نہیں گل بابا کو بھی متاثر کر چکے تھے۔
اس روز وہ باہر گیلری میں کھڑے تھے کہ ان کی نظر گل بابا پر پڑی۔
"کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"
"اب تو ٹھیک ہوں صاحب۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اتنا خیال کیا۔ فرشتہ ہیں آپ تو۔" وہ نیاز مندانہ لہجے میں بولا۔
سکندر رضا جو جانے اپنے سوٹ کیس میں کیا تلاش کر رہے تھے، چونک سے گئے۔ انہوں نے پہلے گل بابا کو اور پھر سیّد صاحب کو دیکھا۔
"اچھا تم ذرا چائے بنا لو۔" سیّد صاحب نے گل بابا سے کہا۔
"جی بہتر۔"
"وجاہت ہم دونوں کو یہاں آئے کئی دن ہو گئے ہیں مجھے تو اب گھر یاد آنے لگا ہے۔ واپسی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
"اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"
"اب مزید کتنا ہم یہاں ٹھہریں گے۔ جانا تو بہرحال ہے۔"
"سکندر میں تم سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔
"کیا بات ہے۔" سکندر رضا کرسی پر بیٹھ گئے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"میں دل آرا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟" سکندر رضا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کچھ لمحے کو ان کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ "وجاہت یہ کیا مذاق ہے؟"

"اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔" انہوں نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔

"تم ہوش میں تو ہو۔ تمہیں احساس ہے تم نے کیا کہا ہے؟"

"سکندر! کوئی انہونی بات تو نہیں کہہ دی میں نے۔"

"وجاہت تم شادی شدہ ہو۔ تمہارے بچے ہیں اور۔" وہ کہتے کہتے رک گئے کہ پانچوں کی آمد کی نوید تم نے مجھے یہاں آتے وقت راستے میں سنائی تھی۔

"تو کیا ہوا؟" وہ لاپروائی سے بولے۔

"تم اپنی اور اس کی عمر کا فرق دیکھو۔ اس کی عمر کا سورج تو ابھی زندگی کے آسمان کی اونچائی پر بھی نہیں پہنچا۔ اور تم۔ تمہاری عمر ڈھل رہی ہے۔ زندگی کے درخت سے جوانی کے پتے اگر جھڑے نہیں ہیں تو مرجھانے ضرور لگے ہیں۔"

"عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" سید صاحب کے بے نیاز انداز پر سکندر رضا آپے سے باہر ہو گئے۔

"تم اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کو شادی جیسا مقدس نام دے رہے ہو۔ اس کی مٹی کو اپنے بھڑکتے ہوئے جذبات کی بھینٹ چڑھانا چاہتے ہو؟ تم شادی کے نام پر اس کی زندگی کے خوبصورت لمحوں سے لطف اٹھا کر اسے ہمیشہ کے لیے دکھوں کے سمندر میں دھکیل دو گے۔ اور میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

"تمہاری بکواس ختم ہو گئی؟" سید وجاہت کا پُرسکون لہجہ، سکندر رضا کا قرار لوٹ رہا تھا۔

"وجاہت۔" سکندر رضا نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ پھر غصہ ضبط کر کے لہجہ نرم کرتے ہوئے بولے۔ "دیکھو وجاہت۔ تم جذباتی ہو گئے ہو۔ ذرا غور کرو۔ تم میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم یہ شادی کر تو سکتے ہو اس کو نبھا نہیں سکتے۔ اس کا تعلق جس طبقے سے ہے تمہارا معاشرہ اسے اتنی آسانی سے قبول نہیں کرے گا۔ اور شاید اتنی زحمت تو تم بھی نہ کرو کہ اپنے معاشرے میں اسے متعارف ہی کرا دو۔" انہوں نے طنزیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم اگر یہ سمجھ رہے ہو کہ اپنے دلائل سے مجھے قائل کر لو گے تو تم غلط فہمی کا شکار ہو۔ تمہاری کوئی بات مجھے میرے ارادوں سے نہیں روک سکتی۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں۔" وہ اطمینان سے پائپ سلگاتے ہوئے بولے۔ پائپ کے ساتھ ساتھ وہ سکندر رضا کو بھی سلگا رہے تھے۔

"یہ بتاؤ کہ کیا دل آرا کی بھی وہی حیثیت و اہمیت ہو گی جو تمہاری پہلی بیوی کی ہے۔ تمہارے ان بچوں کا کیا ہو گا جن کی دل آرا ماں بنے گی؟ کیا تم ساری دنیا کے سامنے انہیں یہ کہنے کی اجازت دو گے کہ تم ان کے باپ ہو؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"سکندر! زندگی کو تم آنکھوں سے دیکھو دوربین سے نہیں۔ ابھی ان باتوں میں بہت وقت پڑا ہے۔" وہ کھڑکی میں آ کر کھڑے ہوئے۔

"وجاہت، دل آرا شفاف پانیوں میں کھلنے والا کنول ہے اور تمہارے ہاتھ آلودہ ہیں۔ میں تمہیں اسے توڑنے نہیں دوں گا۔"

"اسٹاپ اٹ۔" سید صاحب کی دھاڑتی ہوئی آواز سے آس پاس کے درختوں پر بیٹھے پرندے ڈر کر اڑ گئے۔ "تمہارا میرے ذاتی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یو مائنڈ یور اون بزنس۔" وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئے۔

سکندر رضا اپنا سر تھام کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ ضرور اس سلسلے میں دل آرا سے بات کریں گے۔ اسے سمجھائیں گے کہ وہ سید صاحب کے راستوں پر نہ چلے۔ اس کا راستہ کانٹوں سے پُر ہے۔ وہ خود تو بے کے جوتے پہن کر چلتا ہے اس لیے وہ کانٹے اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے مگر اس کے پیچھے دیوانہ ہونے والے جب ان کانٹوں پر ننگے پاؤں دوڑتے ہیں تو وہ کانٹے پاؤں میں ہی نہیں روح تک میں زخم ڈال دیتے ہیں۔

سید وجاہت بجائے اس کے کہ ان زخموں پر ہمدردی اور خلوص کا مرہم رکھتے، اسے تو ان لوگوں کی آہیں اور سسکیاں تک نہیں سنائی دیتیں، وہ ان صورتوں کو بھول جاتا ہے جن کے نقوش میں کھو جانے کے وہ دعوے کرتا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی سوچوں کو دل آرا کے سامنے لفظوں کا پیراہن پہناتے، سید صاحب نے پُرجوش لہجے میں یہ خوشخبری سنائی کہ گل بابا ان کی شادی دل آرا کے ساتھ کرنے کو تیار ہے۔

سکندر رضا سناٹوں میں رہ گئے۔ انہیں دل آرا پر شدید غصہ آیا۔

آخر یہ محبت کرنے والے اپنی آنکھوں پر پٹی کیوں باندھ لیتے ہیں۔ پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ جس راستے پر وہ چل نکلے ہیں اس پر اندھیرا ہے یا روشنی۔

سنگریزے چبھے ہیں یا کہکشاں۔

وہ کف افسوس مل کر رہ گئے۔

سید صاحب نے سارے معاملات بالا ہی بالا طے کر لیے تھے۔ خدا جانے کون سے لالچ کی پٹی ان دونوں باپ بیٹی کی آنکھوں پر باندھ دی تھی کہ گل بابا تیسرے ہی دن دل آرا کا نکاح کر رہا تھا۔

"میرے نکاح میں کم از کم شریک تو ہو جاؤ۔" انہوں نے بہت اصرار سے سکندر رضا سے کہا۔

وہ جانے کے لیے تیار بیٹھے رہے تھے۔ انداز ایسے تھے جیسے بھلا نکاح کر رہے ہوں۔

"وجاہت اب بھی باز آ جاؤ۔" سکندر رضا ان کی تیاریاں دیکھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

"فار گاڈ سیک سکندر! میرا موڈ آف نہ کرو۔" وہ پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے بولے۔

"تم بیک وقت دو محاذوں پر جنگ کر رہے ہو۔ اگر تمہیں ذرہ بھابی کا ذرا سا بھی خیال ہے یا دل آرا کے لیے تمہارے دل میں واقعی نرم گوشہ ہے تو یہ قدم نہ اٹھاؤ۔"

"سکندر پلیز! اگر تم میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے تو نہ جاؤ۔ مگر زبان سے یہ زہر اگلنا بند کرو۔"

سکندر رضا اپنی جگہ بیٹھے انہیں خونخوار نظروں سے گھورتے رہے۔

سیڑھیوں پر پہنچ کر وہ رک گئے اور مڑ کر انہیں دیکھا۔

"سکندر آ جاؤ پلیز۔ میری خاطر۔" وہ بے حد نرمی سے بولے۔ "میں تم سے درخواست کر رہا ہوں۔"

وہ کچھ لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئے۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو۔" وہ ان کی طرف بڑھے۔

سید صاحب نے ایک نظر ان کے سراپے پر ڈالی۔ ان کے کپڑے مسلے ہوئے تھے بلکہ تھوڑے بہت میلے بھی لگ رہے تھے۔

"کپڑے تو تبدیل کر لو۔" وہ رہ نہ سکے، کہہ ہی دیا۔

"کسی کی بربادی پر تصدیق کی مہر لگانے جا رہا ہوں، کیا بن سنور کر جاؤں؟" وہ بھنا کر بولے تھے۔

سید صاحب خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

"ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" انہوں نے رکھائی سے جواب دیا اور آگے بڑھ گئے۔

سید صاحب سر جھٹک کر ان کے پیچھے چل دیے۔

بستی کے کچھ افراد سید وجاہت کی طرف ہو گئے۔ سکندر رضا لاتعلقی سے بیٹھے رہے۔ سادگی سے نکاح ہوا اور سید صاحب دل آرا کو لے کر ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔

اگلے دن صبح سکندر رضا اپنا سامان سمیٹ کر جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ سید صاحب سو کر اٹھ کے باہر آئے تو انہیں اپنا منتظر پایا۔

"وجاہت میں واپس جا رہا ہوں۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اگر اجازت دو تو تمہاری بیوی سے مل لوں۔"

انہوں نے بیوی پر بطور خاص زور دیا۔

سید صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اندر چلے آئے۔ دل آرا کرسی پر بیٹھی دوپٹے کو انگلیوں پر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پلیٹ اور کھول رہی تھی۔

سکندر رضا کی پہلی نگاہ سیدھی اس کی کلائیوں پر پڑی۔

"اوہ" ان کے ہونٹ سکڑ گئے۔

اس کی کلائی میں وہی کنگن جگمگا رہا تھا۔ جس کی جوڑی سیّد صاحب نے اپنی پہلی بیوی کو رونمائی میں دی تھی اور جو اتفاق سے ان کی پینٹ کی جیب میں آ گیا تھا۔

"یہ لو" انہوں نے جیب سے چند نوٹ نکال کر سلامی کے طور پر دل آرا کو دیے۔

دل آرا نے سوالیہ نظروں سے سیّد صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں سے اشارا کیا۔ دل آرا نے سلام کر کے لے لیے۔

"خوش رہو" ان کی آواز بھرّا گئی۔ انہیں یقین تھا کہ جو دعا وہ دل آرا کو دے رہے ہیں، وہ کبھی قبول نہیں ہو گی۔ وہ سست قدموں سے باہر آ گئے۔

"سکندر" پیچھے سے سیّد صاحب کی آواز ان کے سیڑھیاں اترتے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

"یہی کہنا چاہتے ہو ناں کہ میری زبان پر خاموشی کا تالا لگ جائے۔ بے فکر رہو۔ میں بڑا کم ہمت ہوں مگر اے کاش تم پر اس لڑکی کا اعتبار ہمیشہ قائم رہ سکتا" انہوں نے رخ موڑے بغیر کہا اور سیدھا نکلتے چلے گئے۔

"نہال" سکندر رضا نے تھکے تھکے انداز میں کرسی سے پشت لگا لی۔ "پھر میں واپس آ گیا۔ اس زمانے میں میری والدہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ انڈیا میں میرے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں۔ میں فوراً ہی اس کے بعد انڈیا چلا گیا۔ وہاں کافی عرصہ رہا۔ جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ وجاہت بھی آ گئے ہیں۔ میں فوراً پناہ گاہ گیا اور وجاہت کی صورت دیکھتے ہی پہلا سوال یہی کیا۔

"دل آرا کہاں ہے؟"

وجاہت نے کہا کہ اس سلسلے میں کوئی سوال نہ کرو۔ میں اپنی زندگی کا وہ باب ہمیشہ کے لیے بند کر آیا ہوں، مجھے یہ سن کر غصّہ آ گیا۔ میں دل آرا کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب ہوا جا رہا تھا۔ وجاہت نے اگر اس سے شادی کی تھی تو یہاں لانے کی ہمّت کیوں نہیں کی۔

وجاہت کے پاس تو صرف ایک ہی جملہ تھا۔

"جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ دل آرا سے شادی میری بہت بڑی غلطی تھی۔ جذبات میں آ کر میں نے بہت بڑا مگر غلط قدم اٹھا لیا تھا۔"

میری اس سے اس معاملے پر سخت تلخ کلامی ہو گئی۔ میں غصّے میں پناہ گاہ سے چلا آیا۔ میں نے اپنے ایک ملازم کو اس پہاڑی مقام کی طرف روانہ کیا کہ وہ ان لوگوں کا پتا کرے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ لوگ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور جا چکے ہیں۔ بہرحال اس واقعے کے بعد میں نے وجاہت سے قطع تعلق کر لیا۔ شاید دو سال گزر گئے تھے اور ہم نے ایک دوسرے کی شکل بھی نہ دیکھی۔ پھر مجھے اچانک فالج ہو گیا۔ جسم کا داہنا حصّہ تقریباً مفلوج ہو گیا۔ وجاہت میری عیادت کو آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے گلے سے لگ گیا۔ وہ ٹوٹے ہوئے تعلقات دوبارہ استوار کرنا چاہتا تھا۔ میں بھی فطری نرم دلی کے ہاتھوں مجبور ہو گیا۔

دل آرا سے تعلق وجاہت نے جوڑا تھا۔ جب اس کو پروا نہیں تھی تو میں فکر میں گھلنے والا کون تھا۔ جب اپنی دنیا میں مگن ہو چکا تھا تو میں اس غم کو پال کر کیا کرتا۔ رفتہ رفتہ میں نے بھی بھلا دیا" سکندر رضا یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اور ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگے۔

نہال اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے ساکت بیٹھا گھاس کو تکے جا رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان مکمل خاموشی طاری تھی۔

"نہال" انہوں نے ہی سکوت توڑا۔ "بیٹے تمہارے ہاتھ اس الجھی ڈور کا سرا کیسے آ گیا۔"

"عمر کو جانتے ہیں آپ؟" وہ بے حد مدھم آواز میں بولا۔

"عمر؟ وقار میاں کے صاحبزادے" انہوں نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہی۔ اس کی بیوی کے پاس بالکل ایسا ہی کنگن ہے۔ ذرا بھی تو فرق نہیں"

"بیٹے ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق دل آرا سے ہو؟ کیا تم نے اس سے پوچھا کہ وہ اس نے کہاں سے خریدا ہے؟"

"نہیں میں نے تو نہیں پوچھا"

"تم معلوم تو کرو"

"ممکن ہے کہ نانا جان کی دوسری بیوی نے وہ کنگن کہیں بیچ دیا ہو۔ اس صورت میں تو ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہو سکتا"

"یہ بھی بعید از قیاس نہیں۔ تم ٹھیک کہتے ہو"

"کیا نانا جان کے کوئی اور بچہ تھا۔ میرا مطلب ہے"

"میرے خیال سے تو نہیں تھا" وہ سمجھ گئے "اور اگر ہو بھی تو میں کیا کہہ سکتا ہوں"

"خیر میں کسی مناسب موقع پر تانیہ سے پوچھوں گا کہ وہ کنگن اس نے کہاں سے لیا ہے"

"جب معلوم ہو جائے تو مجھے ضرور بتانا" وہ جلدی سے بولے۔

"جی اچھا۔ اب اجازت دیجیے۔ چلتا ہوں۔ کافی دیر ہو رہی ہے" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس وقت اس کا سر بری طرح دکھ رہا تھا۔ بوجھل دل و دماغ لیے وہ واپس چلا آیا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

معاذ نے تو نہ جانے کتنے عرصے بعد سکھ کا سانس لیا تھا۔ کتنا بھاری بوجھ اس کے دل و دماغ سے اترا تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی جس آزمائش سے دوچار تھی، وہ بحفاظت اس آزمائش سے خود بھی نکل آیا تھا اور جویریہ کو بھی نکال لایا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ پچھلے ایک ماہ میں اس نے جویریہ کے ساتھ خاصی زیادتی کی ہے۔ اسے اپنے ناروا سلوک کا شدت سے احساس تھا۔ مگر وہ اس سلسلے میں بے بس تھا۔ خود جویریہ ہی نے اسے یہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ جویریہ اس کی محبّت کو خود اسی کی کمزوری بنا کر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ وقتی طور پر اس سے لاتعلقی اختیار کر لے۔ اس سے بے رخی برتنے لگے۔ جویریہ کو یہ تو معلوم تھا کہ معاذ کی محبّت اس کی زندگی میں اہمیّت کے کس مقام پر ہے مگر اس کی محبّت کے عدم احساس کی صورت میں وہ خود اذیّت کی کس حد تک جا سکتی ہے۔ معاذ اسے اس بات کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ اپنی ذات کی ہمہ وقت ضرورت اور محبّت کی اہمیّت کو اس کے دل میں مزید پختہ کرانا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے اسے ایک ہی راستہ دکھائی دیا تھا۔

اس کی ذات، اس کی قربت سے وقتی محرومی کا احساس، جویریہ کو آئندہ آنے والے دنوں کی جھلک دکھا کر اسے اس کے ارادوں سے باز رکھ سکتا تھا۔

اور معاذ اپنی کوششوں میں کامیاب رہا تھا۔

قیمتی چیز کی سبھی حفاظت کرتے ہیں مگر ایسی ہی کوئی چیز کھو کر دوبارہ ملے تو اس کی اہمیّت و قیمت پہلے سے کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

جویریہ نے کم از کم اتنا تو جان ہی لیا تھا کہ سوچنے اور عمل کرنے میں کتنا فرق ہے۔ جو کچھ اس نے سوچا تھا وہ اتنا آسان نہیں تھا، جتنا وہ سمجھ بیٹھی تھی۔

معاذ نے جو اتنے دنوں تک جویریہ سے سخت رویّہ اختیار کیے رکھا، اسے اس کا شدید احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے عمل سے جویریہ کو ذہنی اذیّت، دکھ پہنچا ہے۔ اس کے دل کو ٹھیس لگی ہے۔ شاید اس کی زیادتیاں حد سے بڑھ چلی تھیں۔ مگر وہ بھی کیا کرتا۔ جویریہ کے ڈھیلے اسکرو کسنے کے چکر میں وہ یہ سب کرنے پر مجبور تھا۔

اس نے اپنی محبّت بے مہری کی چادر میں لپیٹ دی تھی۔

وہ پریشان رہتی، وہ دیکھتا مگر انجان بنتا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس کے آنسو بہتے رہتے، اس کا دل دُکھتا مگر بے حس بنا رہتا۔
وہ کھانا نہ کھاتی، اسے تشویش ہوتی مگر لاپروائی کا مظاہرہ کرتا۔
اسے نیند نہ آتی، وہ بظاہر تو آنکھیں بند کیے لیٹا رہتا مگر سو وہ بھی نہ پاتا۔
مگر اب وہ اپنی تمام تر زیادتیوں کی تلافی کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ہر لمحے کے ہر حصے میں اسے یہ احساس دلاتا رہتا کہ وہ اب بھی اسے اتنی ہی شدتوں کے ساتھ چاہتا ہے جتنا پہلے چاہتا تھا۔ وہ وقت کبھی نہیں آئے گا جب اس کا ذہن جویریہ کے تصور سے خالی ہو۔ اس سے پہلے اس کا جسم روح سے خالی ہو چکا ہوگا۔

○ ● ◆

بارہا اس کے دل میں اس سوال نے جنم لیا تھا کہ اگر معاذ فریال سے شادی کر لیتا تو خود اس کے دل کے کیا احساسات ہوتے؟ کیا وہ واقعی برداشت کر لیتی؟ کیا اس کے اندر منفی جذبات پیدا نہ ہوتے؟ ایک دوسری عورت کو اپنے شوہر کی توجہ کا مرکز پا کر وہ خود پر قابو پانے کا کون سا طریقہ اختیار کرتی؟
مگر ہر بار اس نے ان سوالوں سے پہلو بچایا تھا۔ کان بند کر لیے تھے۔ "پتا نہیں" کہہ کر خود کو ٹال دیا تھا۔ "دیکھا جائے گا" کہہ کر جان چھڑائی تھی۔ بلکہ الٹا ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اس قسم کے سوالات اس کے دل میں پیدا نہ ہوں۔
مگر اب بغیر کسی سوال جواب کے یہ بات خود اس پر واضح ہو گئی تھی کہ وہ تو معاذ کی طرف سے بے توجہی برداشت نہیں کر سکتی۔ چہ جائیکہ معاذ اپنے وجود کا بٹوارا کر لے۔ کسی دوسری عورت کو جویریہ کا شریک بنا دے۔
پتا نہیں بہتری کس میں تھی؟ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔
اس میں جو میں نے چاہا یا پھر اس میں جو ہو گیا۔
ہاں شاید جو ہو گیا اسی میں خدا کی مصلحت تھی۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں کرسی سے ٹیک لگا لی۔
آہ فریال۔ ایک چمکتا مگر ڈوبتا ستارا۔
تمہیں معلوم بھی نہیں فریال کہ تمہاری خاطر میں نے اپنے لیے اس راستے کا انتخاب کر لیا تھا جس پر چلنے کا کوئی عورت تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں نے تمہیں اپنے ہی شوہر کے سائے کی پناہ میں لانا چاہا تھا۔ تمہارے دکھ بانٹنے کے چکر میں، میں اپنے دامن میں آگ بھرنے کو تیار ہو گئی تھی۔ مگر شاید میری قربانی کا یہ انداز خدا کو بھی پسند نہیں آیا۔
اسی لیے تو میں اپنے ارادوں کو عملی شکل نہ دے سکی۔
میں تو صبر اور جبر کے سہارے پل صراط پر چلنے کو تیار تھی۔ مگر معاذ ایسا کرنے پر راضی نہ تھے۔ الٹا انہوں نے حقیقت کے آئینے میں اپنی بے رُخی اور بے گانگی کا عکس دکھا کر میرے ارادوں کو بھی توڑ دیا۔
میں ہار گئی فریال۔ مجھے ساری عمر اس بات کا دُکھ رہے گا کہ میں چاہنے کے باوجود تمہارے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔
اس لیے کہ فقط چاہنا ہی میرے بس میں تھا۔ میں نے جبراً عمل کے اختیار معاذ سے حاصل کرنا چاہے تو جواب میں انہوں نے اپنی ذات پر مجھ سے میرے اختیارات بھی چھین لیے۔
آہ۔ سو یہ کہانی بھی اب ختم ہو گئی۔ اپنے ادھورے انجام کے ساتھ میرے اور معاذ کے دلوں میں دفن ہو جائے گی۔ اور وقت کے غبار میں اس کی یادیں بھی دھندلا جائیں گی۔ کوئی کبھی یہ نہ جان سکے گا کہ میرے اور معاذ کے درمیان ایک تیسرا وجود بھی تھا۔
اوہ۔ وہ اچانک چونک گئی۔ اسے کچھ یاد سا آ گیا۔
اس نے تو معاذ اور فریال کی شادی کے سلسلے میں ایک تیسری ہستی کو رازدار بنا کر اس سے تعاون حاصل کرنا چاہا تھا۔ اسے الف سے یے تک ساری بات بتائی تھی مگر جواب میں اسے طویل اور گہری خاموشی کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔
اس کی سوچ کا رُخ اب اس ہستی کی طرف ہو گیا جس نے کسی بھی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ جویریہ کو اپنے عمل پر پچھتاوا ہونے لگا کہ اس نے یہ سارا تذکرہ کیا ہی کیوں تھا۔
کاش اس نے کہا ہوتا۔ کاش وہ خاموش رہی ہوتی۔

اس دن کے بعد سے وہ سخت تجسس میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ذہن ہر وقت اُلجھا اُلجھا رہتا کہ آخر یہ کیا بھید ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس معمے کو کیسے حل کرے۔ جی تو چاہتا تھا کہ بس فون گھمائے اور تانیہ سے پوچھ لے کہ وہ کنگن اس نے کہاں سے خریدا تھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو رہتا۔
دوسری طرف سکندر رضا کو بھی سخت بے چینی نے گھیر رکھا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اسے فون کھڑکا دیتے۔
"پھر تم نے معلوم کیا؟" وہ بے صبری سے پوچھتے۔
"نہیں! ابھی تو میں ان لوگوں کے گھر نہیں گیا۔" وہ بے چارگی سے جواب دیتا۔
اس دن تو نہال نے تہیہ کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جلد از جلد اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ مناسب لگے یا نامناسب وہ تانیہ سے دو ٹوک پوچھے گا۔ اسی ارادے سے وہ ایک شام تانیہ کے گھر چلا گیا۔
زرتاج اس کو دیکھ کر ایک دم کھل اُٹھیں۔
"آؤ بیٹا! آؤ۔"
وہ جب بھی آتا زرتاج اس کے آگے بچھ بچھ جاتیں۔ اور ایسا کیوں نہ کرتیں۔ عمر بھر بیٹی کی جدائی کی آگ میں جلتی رہی تھیں اور نہال نے ان کو اس سے نجات دلائی تھی۔
"کیسی ہیں خالہ جان آپ؟" وہ عمر کی طرح ان کو خالہ جان کہہ کر ہی مخاطب کرنے لگا تھا۔
"میں تو اچھی طرح ہوں۔ تم اپنی سناؤ، بہت دنوں بعد آنا ہوا۔"
"بس مصروفیت ہی کچھ ایسی رہتی ہے۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "تانیہ نظر نہیں آ رہی ہیں۔"
"رانیہ آئی ہوئی تھی۔ دونوں نہیں شاپنگ کرنے گئی ہیں۔"
"اوہ!" رانیہ کے نام پر اس کا دل خوشگوار احساس سے دوچار ہوا۔ خوامخواہ کی مسکراہٹ لبوں پر آ کر معدوم ہو گئی۔
"بیٹھو ناں، کھڑے کیوں ہو؟" انہوں نے ہاتھ سے صوفے کی جانب اشارا کیا۔
نہال ایک دم ٹھٹک گیا۔ وہی فسادی جڑ کنگن جس نے اسے سخت اُلجھن میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ان کی کلائی میں نگار رہا تھا۔ اس نے لمحے بھر کو سوچا اور انہی سے اس سلسلے میں بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے بے حد سرسری انداز میں تمہید باندھی۔ "آپ کا کنگن بے حد خوبصورت ہے۔ اس دن یہ تانیہ کے ہاتھ سے گر گیا تھا تو وہ بے حد پریشان ہو گئی تھیں۔"
"ہاں۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔ یہ بہت قیمتی ہے بیٹا!" انہوں نے کنگن کلائی میں گھماتے ہوئے کہا۔ "اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ میری ماں کا ہے۔ ماں کی واحد نشانی جو میرے پاس ہے۔"
"آپ نے کبھی اپنے گھر والوں کا تذکرہ نہیں کیا۔" اس کے اندر جو کھد بد ہو رہی تھی اس نے ایسے بے تکے اور غیر ضروری سوال داغنے پر مجبور کیا ورنہ اپنے اور ان کے درمیان تعلق کی نوعیت کے حساب سے شاید اس سوال کی گنجائش نہ تھی۔ یوں بھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ بات یہیں پر ختم ہو جائے اور موضوع تبدیل ہو جائے۔
"کیا تذکرہ کرتی بھلا۔" وہ قدرے اُداس اور ڈھیلے ڈھالے سے لہجے میں بولیں۔ "میکہ نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ وہ تو ماں اور باپ کے دم سے ہوتا ہے۔ ماں مر گئی۔ رہا باپ، تو یہ تو جانتی ہوں کہ یہ رشتہ دُنیا میں آنے کے بعد اسے معتبر قرار دینے کا ذریعہ ہوتا ہے مگر اس رشتہ سے وابستہ احساسات اور جذبات سے ہمیشہ نابلد رہی۔ میرے پاس صرف باپ کا نام تھا۔ باپ نہیں تھا۔"
نہال نے کچھ نہ سمجھنے والی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھیں کسی نامعلوم نکتے پر مرکوز تھیں اور نگاہ میں گزرے زمانے کے منظر تھے۔
"میں آج جس مقام پر کھڑی ہوں۔ یہ دولت، بنگلہ، آسائشیں یہ سب تو مجھے تقدیر سے ملا ہے۔ میں نے تو حیرت کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ عسرت کے سائے میں پرورش پائی۔ ہوش سنبھالا تو اپنے گرد ماں اور نانا کو پایا۔ وہ لوگ شمالی علاقے کے کسی پہاڑی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔"
نہال کے دل کی دھڑکن معمول سے تیز ہو گئی۔
"میں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ احساس ہی نہ تھا کہ باپ ہوتا کیا ہے۔ جب ذرا بڑی ہوئی اور

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

باپ کے معنی سمجھ میں آنے لگے تو اکثر ماں سے پوچھا کرتی تھی اور وہ مجھے جواب میں ٹال دیتی۔ ایک دن میرے اصرار پر اس نے مجھے بتایا کہ میرا باپ تو مہندی کا رنگ تھا جو کچھ عرصہ میری ماں کے ہاتھ پر رہنے کے بعد اُتر گیا۔ جانے کس ڈگر کا مسافر تھا۔ بھولے بھٹکے ماں کی زندگی میں آ گیا۔ میری ماں بے حد حسین تھی۔ شاید اس کا حسن ہی میرے باپ کے لیے زنجیر بن گیا۔ سو اس نے میری ماں سے شادی کر لی۔ مگر جس دُنیا سے وہ آیا تھا۔ شاید اس سے زیادہ دُور نہ رہ سکتا تھا۔ ماں کی زندگی میں آیا تو وہ روشن راستوں سے تھا پر ایک رات خاموشی سے لیے تاریکیوں میں چھوڑ کر چلا گیا اور دو نشانیاں دے گیا۔ ایک میں، جو پیدا بھی نہیں ہوئی تھی اور ایک یہ کنگن۔"

وہ کھوئے کھوئے انداز میں اس پر انگلی پھیرنے لگیں۔ ان کے چہرے پر بیتے دنوں کی کسک تھی۔

"جان سے لگا کر رکھا تھا ماں نے، میرے باپ کی دی ہوئی نشانیوں کو۔ غربت نے فاقوں تک پر مجبور کیا مگر اس نے یہ کنگن نہ بیچا۔ اس نے بہت تکلیفیں اُٹھائیں۔ زندگی کے ایک ایک لمحے کی بڑی بھاری قیمت ادا کی۔ خود دُکھ کی دھوپ میں جلتی رہی اور مجھے سُکھ کی چھاؤں میں بٹھائے رکھا۔ اور جب میں کسی قابل ہوئی اور اس کا سہارا بننا چاہا تو اس نے میری شادی کر دی۔ وہ تو بس میری شادی کے انتظار میں زندگی سے ناتا جوڑے بیٹھی تھی۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت اس نے میرے باپ کو بہت یاد کیا۔ مجھ سے کہا کہ اگر زندگی کے کسی موڑ پر وہ مجھے مل جائے اور مجھے گلے لگانا چاہے تو سارے گلے شکوے بھول کر باپ کے سینے سے لگ جاؤں۔ یہی اس کی آخری خواہش ہے۔"

وہ کہتے کہتے یوں چپ ہو گئیں جیسے تھک گئی ہوں۔ آنکھوں سے بہتے خاموش آنسوؤں نے سارے منظر دھندلا دیے تھے۔

نہال سختی سے لب بھینچے گہری خاموشی کے ساتھ ان کی بات سُن رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اب کوئی ابہام نہیں رہا تھا۔ ساری گرہیں کھل چکی تھیں۔ فقط ایک تصدیق کی مہر ثبت کرنی تھی۔ سو اس نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کیا نام تھا آپ کے والد کا؟"

"سیّد وجاہت۔"

نہ کوئی زلزلہ آیا نہ طوفان۔ نہ زمین پھٹی نہ آسمان۔

بس اس کے وجود پر چھایا سکوت اور بھی گہرا ہو گیا۔

کمرے کی فضا بوجھل سی ہو گئی تھی۔ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ زرتاج گزرے دنوں کے بارے میں سوچ رہی تھیں اور وہ آنے والے دنوں کے بارے میں۔

"لو بھلا، تم بھی کیا سوچتے ہو گے کہ میں نے تمہیں کن باتوں میں اُلجھا دیا۔" وہ چہرا صاف کرتے ہوئے قدرے شرمساری سے بولیں۔ اس نے غائب دماغی سے ان کی طرف دیکھا۔

"تم بیٹھو، میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"خالہ جان! آپ چائے کا تکلف نہ کریں۔ میں دفتر سے پی کر چلا تھا۔ اس وقت بالکل خواہش نہیں ہے۔" اس نے منع کر دیا۔

"اچھا چلو، پھر تم کھانا کھا کر جانا۔ اب رات ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔" انھوں نے بڑے خلوص سے کہا۔

"میں ضرور کھا لیتا مگر مجبور ہوں، رات کو ایک بزنس پارٹی اٹینڈ کرنی ہے۔ ڈنر بھی وہیں ہو گا۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب میں چلتا ہوں کافی دیر ہو گئی ہے۔"

ان سے اجازت لے کر وہ باہر آ گیا۔ پورٹیکو سے گزر رہا تھا کہ وہ اچانک گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ نہال ٹھٹک گیا۔ اس کو دیکھ کر وہ بھی جہاں کھڑی تھی وہیں رُک گئی۔

وہ جس نے اس کی سوچ کو نئی راہ دکھائی تھی۔ اس کے دل میں آرزو کے کنول کھلائے تھے۔ جس کی سوچیں اس کے پیاسے ذہن کو سیراب کرتی تھیں۔ جس کے تصور سے وہ اپنی تنہائی کو آباد کرتا تھا۔

اگرچہ کہ وہ منتشر خیالات میں گھرا، دل و دماغ پر بھاری بوجھ لیے نکلا تھا مگر اس لمحے جیسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ اسے سامنے پا کر تازگی بھرے احساس نے بوجھل اعصاب کو ہلکا کر دیا تھا۔ دل خوشگوار سے انداز میں دھڑکنے لگا۔ آنکھیں مسکرانے لگی تھیں۔ رانیہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی قریب آ رہی تھی۔

"السلام علیکم!" بڑا سرسری سا انداز تھا۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے اس کے لہجے کو محسوس تو بہت کیا مگر نظرانداز کر کے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہوں۔" عام سے لہجے میں کہتی ہوئی وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

وہ جو دوستانہ انداز میں اس سے چند اچھے جملوں کا تبادلہ کرنا چاہتا تھا چپ چاپ کھڑا رہ گیا۔ دل بجھ سا گیا۔ پلٹ کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

وہ نہال سے اسی قسم کا رویہ برتا کرتی۔ بے حد لیے دیے رہتی۔ اکھڑی اکھڑی نظر آتی۔ خفا خفا دکھائی دیتی۔ اجنبی اور بیگانی لگتی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہتی مگر آنکھیں ہمہ وقت شکوہ کناں رہتیں۔

اس کا رویہ نہال کی سمجھ سے باہر نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رانیہ اس سے اس طرح کا سلوک کیوں کرتی ہے۔ وہ ملاقات تو نہال کو بھی نہ بھولی تھی۔ جب اس نے رانیہ کو کار میں لفٹ دی تھی۔

وہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی شاید اس میں حق بجانب تھی۔

غلطی اسی کی تو تھی۔ بھلا اسے کیا حق تھا کہ وہ رانیہ سے اس انداز سے گفتگو کرتا۔ اس پر دھونس جماتا۔ اس کی انا اور اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتا۔ جو کچھ ہوا اگرچہ اس میں ارادے کا دخل نہ تھا مگر مناسب بات نامناسب طریقے سے کہہ دی تھی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ وہ اپنے رویے کی بدصورتی پر شرمندہ تھا۔ اس کا ازالہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ کسی مناسب وقت کی تلاش میں تھا۔ اور کوئی ایسا موقع اس کے ہاتھ ہی نہ لگ رہا تھا۔

دوسری جانب رانیہ جو بظاہر بے نیاز سی بنی ہوئی تھی کمرے کی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ باہر جھانکنے پر اسے نہال ابھی تک اسی جگہ تانیہ سے باتیں کرتا نظر آیا۔ تانیہ اس کی کسی بات پر قہقہہ لگا رہی تھی۔ رانیہ کی نظریں فوراً نہال پر جم گئیں۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے چہرے کی تحریر نہیں پڑھ پاتی؟ تمہاری آنکھوں کی چمک مجھ سے پوشیدہ رہتی ہے۔ تمہارے معنی خیز جملے میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

میں جانتی ہوں کہ تم میری زندگی کی راہ میں کاسۂ طلب لیے کھڑے ہو۔ میرے حصول کی خواہش کو پروان چڑھا رہے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں چھپی میری شبیہہ مجھے تمہارے دل کا حال سُناتی محسوس ہوتی ہے۔

مگر اس سے پہلے کہ میں اپنے تصورات میں تمہارے قدموں کی آہٹ پا کر اپنے دل کا دروازہ تم پر کھول دوں۔ مجھے اپنی تذلیل یاد آ جاتی ہے۔ میری عزتِ نفس کراہ اُٹھتی ہے۔ انا سسکنے لگتی ہے۔ تم نے خود پسندی کے زعم میں جس طرح میرے پندار کو زخمی کیا تھا۔ میرے احساسات و جذبات کو اپنی انانیت تلے کچلا تھا وہ میں اب تک نہیں بھولی۔

چاہتوں کے الفاظ تو دل کو شاد کرتے ہیں، روح میں پھول کھلاتے ہیں۔

کبھی کسی نے پسندیدگی کے جذبات کا اظہار انگاروں کو منہ میں رکھ کر بھی کیا ہے؟

یہ تمہاری کیسی محبت ہے جس نے میرے دل کو ناشاد کیا ہے۔ روح میں خراشیں ڈال دی ہیں۔

چاہت کا اظہار تو پھولوں اور خوشبوؤں کی زبان میں کیا جاتا ہے۔ تم نے سنگباری ہی شروع کر دی تھی۔ کیا سمجھا تھا تم نے مجھے آخر؟ میں انمول نہیں ہوں تو بے مول بھی نہیں ہوں۔ بہت بے وقعت کیا تھا تم نے مجھے۔ میں نے مانا تم میرے محسن ہو۔ تمہارے لیے احساسِ ممنونیت اور شکر گزاری کے جذبات ہر وقت میرے دل میں رہتے ہیں مگر اپنی توہین کا خیال آتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور تم سے متعلق سارے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خوش کن خیالات اسی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔

نہال آفریدی! ہر بات کے چند اصول ہوتے ہیں۔ محبت کے بھی کچھ طریقے، کچھ سلیقے ہوتے ہیں۔ جسے پسند کیا جاتا ہے، اسے دل کے سنگھاسن پر بٹھا کر کوئی معتبر نام دیا جاتا ہے۔ اپنی خود پسندی اور انا کی تسکین کے لیے انہیں جھکنے پر مجبور کر کے جذبوں کی خوبصورتی کو مسخ نہیں کیا جاتا۔

جاؤ نہال آفریدی! جاؤ جا کر محبت کرنے سے پہلے آدابِ محبت سیکھو۔"

اس نے شعلہ بار نگاہوں سے نہال کو دیکھتے ہوئے زوردار آواز کے ساتھ کھڑکی بند کر دی۔

○ ● ◆

شیراز مستقل بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند تھی کہ آ کر ہی نہ دے رہی تھی۔ اس نے سائیڈ لیمپ جلا کر ٹائم دیکھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ بستر سے اُٹھا اور کھڑکی کے پاس آ کر بند شیشوں کے اس پار دیکھا۔ بارش یوں ٹوٹ کر برس رہی تھی کہ جیسے اسے پھر کبھی موقع نہ ملے گا۔ وہ کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا پھر سردی کے احساس سے مجبور ہو کر سویٹر پہنا اور نیچے لائبریری میں آ گیا۔ بُک شیلف کے پاس کھڑے ہو کر وہ کتابوں کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اگاتھا کرسٹی کا ناول نکال کر وہ جونہی پلٹا ایک دم چونک گیا۔ شیشے والی دیوار کے پاس صوفے پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ شیراز نے قریب جا کر دیکھا تو نہال آنکھوں پر بازو رکھے سوتا نظر آیا۔

نہال یہاں سو گیا۔ اتنی سردی میں۔ وہ اسے جگانے کے خیال سے آگے بڑھا پھر کچھ سوچ کر رُک گیا۔ اس کے کمرے سے جا کر کمبل اٹھا لایا اور اس پر ڈال دیا۔

نہال نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

"بھائی جان آپ؟"

"یہاں کیوں سو رہے ہو۔ جا کر اپنے کمرے میں آرام سے سو جاؤ۔"

"میں سو تو نہیں رہا تھا۔ یونہی آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔" اس نے مضمحل سے انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی سوچا کہ کوئی کتاب ہی پڑھ لوں۔" شیراز سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

نہال اسے بغور دیکھنے لگا۔ وہ تذبذب کا شکار ہو رہا تھا کہ شیراز سے دل کی پریشانی کہے یا نہیں۔

"کیا بات ہے نہال؟" اس کو یوں چپ بیٹھا دیکھ کر شیراز بولا۔

"شیراز بھائی! میں بہت پریشان ہوں۔ میرا ذہن بھٹی کی طرح جل رہا ہے۔" اس نے کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا؟ کوئی بزنس پرابلم ہے؟"

"نہیں!" وہ کہہ کر چپ ہو گیا اور کہنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈنے لگا۔

"خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہیں ہے تمہاری؟"

"نہیں، طبیعت کو کیا ہونا ہے بھلا۔"

شیراز نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔ پریشانی کا اظہار اس کے چہرے کے ایک ایک تاثر سے ہو رہا تھا۔ شیراز فکر مند سا ہو گیا۔

"کیا کہیں چھپ کر شادی کر لی ہے؟" اس کو نہال کی پریشانی کی اور کوئی وجہ سمجھ نہ آئی تو یہی پوچھ بیٹھا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ بھائی جان آپ نے بھی حد کر دی۔" وہ جھلا گیا۔ صوفے پر سے اُٹھ کر شیشے کی دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور باہر اندھیرے کو گھورنے لگا۔

"شیراز بھائی! آپ میری بات سن کر جس طرح جلتے انگاروں پر سے گزریں گے۔ اتنا یاد رکھیے کہ اسی طرح میں گزرا ہوں۔ جو کیفیت آپ کی ہو گی میری اس سے مختلف نہ تھی۔ جو کچھ کہنے والا ہوں۔ وہ بالکل سچ ہے۔ اور اس کا ثبوت بھی موجود ہے۔"

اس نے پلٹ کر شیراز کے تاثرات دیکھے۔ وہ بے حد سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ نہال بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا پھر شیراز کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"عمر کو تو آپ جانتے ہیں؟"

"ہاں!"

"اس کا نکاح ہو چکا ہے۔"

"ہاں، تم نے بتایا تھا۔"

"اس کی مدر ان لاء نانا جان کی سگی بیٹی ہیں۔"

"ہیں۔" اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ "کیا بکواس ہے یہ؟"

"میرے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس اس بے ہودہ اور لغویات کا۔" وہ اسے غصے سے گھور رہا تھا۔

"آپ کے جاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ بابا جان، نانا جان کی دوسری شادی میں بذاتِ خود شریک تھے۔"

شیراز کو تو جیسے سکتہ ہو گیا۔

نہال نے اسے ساری بات تفصیل سے بتائی۔

"کیا دادا جان جانتے ہیں کہ ان کی ایک بیٹی کا وجود اور بھی ہے؟"

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ وہ ان کی پیدائش سے قبل ہی اپنی بیوی کو چھوڑ آئے تھے۔ مگر ان کی بیوی نے ان کو بتایا تو ہو گا۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو نہال، ان سب باتوں سے تمہارا کیا مقصد ہے؟" اس نے بے حد پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

"میں نانا جان کی بیٹی کو پناہ گاہ میں لانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ نانا جان ان کو اپنی بیٹی کی حیثیت سے تسلیم کریں۔"

"جتنی آسانی سے تم یہ بات کہہ رہے ہو، کیا تم سمجھتے ہو کہ دادا جان اتنی ہی آسانی سے تسلیم کر لیں گے؟"

"انہیں تسلیم کرنا ہو گا۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

"نہال! اگر انہوں نے تمہاری بات رد کر دی تو تمہارے اور ان کے درمیان آسمان تک دیوار کھنچ جائے گی۔"

"مجھے نتیجے کی پروا نہیں۔"

"مگر ہماری تو پروا کرو۔ ہمارا تو خیال کرو۔"

"بھائی جان!" اس نے شیراز کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں آپ کا ہوں۔ ہر لمحے آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ لوگوں کی محبت ہی تو میری طاقت ہے۔"

شیراز کچھ دیر تو قالین پر نظریں گاڑے سوچتا رہا پھر بولا۔

"تم کچھ مت کہنا دادا جان سے۔ میں اس سلسلے میں خود ہی ان سے بات کر لوں گا۔"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" وہ سختی سے بولا۔ "میں اپنی جگہ آپ کو پھانسی پر لٹکا دوں۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔"

"تو تم کو پھانسی کی امید ہے ناں!" شیراز جلدی سے بولا۔

"بھائی جان! میں تو پہلے ہی سولی پر لٹکا ہوا ہوں۔ میری گردن کے گرد اگر پھندا کچھ اور بھی کس گیا تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"نہال! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ تم آگ میں ہاتھ ڈال رہے ہو۔"

"میں نے آپ سے کہا ناں کہ مجھے جل جانے کی فکر نہیں۔ اس مسئلے پر ہر پہلو سے غور کر لیا ہے۔ کئی دنوں سے میں نانا جان سے بات کرنے کا سوچ رہا تھا۔ آج میری پریشانی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ اگر آپ سے نہ کہتا تو میرا دل پھٹ جاتا۔"

"نہال! میرے بھائی! تم ہم سے دور نہ ہو جانا۔" جانے کیا سوچ کر اس کا دل اس قدر گھبرا رہا تھا۔

نہال نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "بھائی جان! میں چاہے کہیں بھی رہوں۔ آپ جب کبھی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دل میں مجھے آوازیں دیں گے تو آپ کے اپنے ہی دل میں میری صدائیں گونجیں گی۔" جی"

"تم نے مجھے کانٹوں پر گھسیٹ لیا ہے۔" وہ فکرمندی سے اپنی پیشانی مسل رہا تھا۔

"آپ اس قدر پریشان نہ ہوں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے اس بات سے میرے اور نانا جان کے درمیان سارے فاصلے مٹ جائیں۔"

"ناممکن ہے۔" شیراز دل میں سوچ کر رہ گیا پر منہ سے کچھ نہ بولا۔

"آپ جا کر سو جائیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ شیراز کو چھوڑنے اس کے کمرے تک گیا۔

شیراز اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کو اپنے دل پر اتنا بوجھ محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے پہاڑ رکھ دیا ہو۔ اس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

اس دن وہ سب لوگ لانگ ڈرائیو پر نکل گئے تھے۔ نہال سر درد کا بہانہ کر کے گھر میں ہی رُک گیا تھا جبکہ شیراز اپنے کسی دوست کے ہمراہ باہر گیا ہوا تھا۔ نہال کئی دنوں سے کسی ایسے ہی موقعے کی تلاش میں تھا۔ ان سب کے باہر جاتے ہی اس نے سکندر رضا کے نمبر ڈائل کیے۔

"ہیلو بابا جان۔ السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔ کیسے ہو؟"

"اس وقت تک تو خیریت سے ہی ہوں۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔

"فون کیسے کیا تم نے؟"

"آپ کا دل دہلانے کے لیے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں نانا جان سے بات کرنے جا رہا ہوں۔"

"کون سی بات؟" وہ سمجھ تو گئے پھر بھی تصدیق چاہی۔

"انہیں خوشخبری سنانے جا رہا ہوں کہ ایک بیٹی کا وجود اور بھی ہے۔"

سکندر رضا ایک دم چپ ہو گئے۔

"کیا ہوا بابا جان؟ خاموش کیوں ہو گئے۔ کیا خدانخواستہ بے ہوش ہونے کے قریب ہیں؟" اس نے شوخی سے پوچھا

"صاحبزادے! اس وقت میں فوت ہونے کے قریب ہوں۔" ان کی آواز سے تفکر ظاہر ہو رہا تھا۔

"بابا جان پلیز! اس وقت میرے پیچھے سب سے مضبوط دیوار آپ ہیں۔ اگر آپ ڈھے گئے تو میں کہاں جاؤں گا۔"

سکندر رضا نے ایک گہرا سانس لیا پھر قدرے توقف کے بعد بولے۔ "تم ذرا انتظار کرو۔ میں آدھے گھنٹے میں پناہ گاہ پہنچ رہا ہوں۔ جو بات بھی کرنا میرے سامنے کرنا۔"

"نہیں بابا جان!" اس نے انکار کیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ جو ملبہ مجھ پر گرے آپ اس میں میرے حصے دار بنیں۔"

"فضول کی بات مت کرو نہال!" انہوں نے سختی سے کہا۔

"پلیز بابا جان! سمجھنے کی کوشش کریں۔" اس کا لہجہ التجائیہ ہو گیا۔

"تم بے حد ضدی ہو اس میں کوئی شک نہیں۔" وہ خفگی کا اظہار کر رہے تھے۔

"میں نانا جان سے بات کر کے آپ کو دوبارہ رنگ کرتا ہوں۔" وہ رُکا پھر شرارت سے گویا ہوا۔ "آپ اتنے میں میرے لیے دعائے مغفرت کریں۔"

"بکواس نہ کرو۔" انہوں نے برہمی سے کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

وہ اس وقت ہر طرح سے تیار تھا۔ لفظوں کو ترتیب دے چکا تھا۔ برداشت کی قوت سے لیس تھا۔ کچھ دیر یونہی اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا۔ اس کی توقع کے مطابق سید صاحب اس وقت ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ٹی۔وی دیکھ رہے تھے۔ نہال اندر داخل ہوا تو انہوں نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی اور

پھر ٹی۔وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

نہال ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ بھی ٹی۔وی دیکھتا رہا پھر ساری ہمتیں مجتمع کر کے بولا۔ "مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

انہوں نے اس کی بات پر نگاہوں کا زاویہ بدلا اور اس کی سمت دیکھنے لگے۔

"نانا جان!" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ کے اور میرے درمیان ہمیشہ فاصلے رہے۔"

سید صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"اور ان فاصلوں کو ختم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ مگر ان سب باتوں سے قطع نظر میں آپ کی بہت زیادہ عزت کرتا ہوں۔" وہ آگے کو جھکتا ہوا بولا۔

سید صاحب کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ ہنوز خاموش بیٹھے اس کی بات سن رہے تھے۔ ذہن البتہ الجھ گیا تھا۔ "شہیر اور شیراز بھائی وغیرہ تو آپ کی ذمہ داری تھے۔ اس گھر پر حق بھی رکھتے تھے مگر آپ پر میرا حق نہ تھا۔ آپ نے مجھے پناہ گاہ میں رکھا۔ میری پرورش کی۔ میں آپ کا احسان مانتا ہوں۔"

ان کی وہ تن من پھونک دینے والی مسکراہٹ کچھ اور بھی گہری ہو گئی۔

"بہر حال ان سب باتوں کو چھوڑ دیجیے۔" اس نے لہجے کو خوشگوار بنا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "فی الحال میں آپ کے پاس ایک خوشخبری لے کر آیا تھا۔"

"کیسی خوشخبری؟" انہوں نے اتنے عرصے میں پہلی بار زبان کھولی۔ لہجے میں قدرے حیرت تھی۔

"یہ کہ اس دنیا میں آپ کی ایک بیٹی کا وجود اور بھی ہے۔ آپ نے جو دوسری شادی دل آرا نامی خاتون سے کی تھی وہ ان کی اولاد ہیں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں ایک دم ہی صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

سید صاحب تو جیسے سناٹوں میں رہ گئے۔

"نہال! ہوش میں رہ کر بات کرو۔" وہ دھاڑے۔ پر دل کی دھڑکن تو تھمی کی تھمی رہ گئی تھی۔

"نانا جان! میں اللہ کے فضل سے بالکل ہوش میں ہوں اور آپ کو یہ نوید سنا رہا ہوں کہ آپ کی ایک صاحبزادی بھی ہیں۔ جن کی والدہ کو آپ شادی کے کچھ عرصے کے بعد چھوڑ آئے تھے۔" وہ بے حد آرام و سکون سے کہہ رہا تھا۔

"نہال!" مارے غصے کے ان کا جسم لرزنے لگا۔ "تمہارے منہ سے ایک بھی لفظ اور نکلا تو میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔"

نہال نے ان کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اب وہ سہارے کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہے تھے مگر کوئی مضبوط چیز ہاتھ نہ لگ رہی تھی۔

"مگر نانا جان میں نے ایسی کیا بات کہہ دی کہ آپ اس قدر خفا ہو رہے ہیں۔" اس نے خود پر مصنوعی حیرت طاری کر لی ورنہ ان کا ردِ عمل اس کی توقع کے خلاف نہ تھا۔ "کیا آپ نے دوسری شادی نہیں کی تھی؟"

"نہیں۔" پناہ گاہ کے در و دیوار ہل گئے۔

نہال ان کے صاف انکار پر متحیر رہ گیا۔

"کیا آپ دل آرا نام کی کسی خاتون کو نہیں جانتے؟" اس کی آواز تیز اور اونچی ہو گئی۔

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔" پناہ گاہ مسلسل جھٹکوں کی زد میں تھا۔

"نانا جان! آپ میری بات جھٹلا نہیں سکتے۔ آپ کی شادی کا ثبوت بابا جان ہیں جو بذاتِ خود اس شادی میں شریک تھے۔"

زمین آسمان ایک دوسرے کے اتنے نزدیک آ گئے کہ سید صاحب ان کے درمیان پس کر رہ گئے۔

مدِ مقابل شہ زور تھا۔ انہیں اندازہ ہو گیا۔ پسپائی اختیار کرنا ان کی سرشت میں نہیں تھا۔ جھکنا انہیں منظور نہ تھا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"تم ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ اور آئندہ کبھی پناہ گاہ کا رُخ نہیں کرنا۔" وہ غیض و غضب کے عالم میں پھنکارے۔

نہال بھونچکا رہ گیا۔ اسے شدید قسم کے ردِّعمل کی توقع تھی مگر اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ صورتِ حال یک لخت اس قدر سنگین ہو جائے گی کہ —

"سُنا نہیں تم نے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اب اس گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہیں۔" مارے طیش کے وہ بے قابو ہو رہے تھے۔ تیزی سے پلٹے اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگے۔ اسی وقت اپنے پیچھے نہال کی آواز آئی۔

"نانا جان! اس وقت تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا مگر میں آپ سے منوا کر رہوں گا کہ آپ نے دوسری شادی کی تھی۔ آپ کو مسز محمود کو اپنی بیٹی کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہوگا۔" ضبط کی طنابیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھیں اس کا غصہ بھی اُبل پڑا تھا۔

"شٹ اَپ!" وہ چنگھاڑے اور ساتھ ہی اپنے کمرے میں گھس گئے۔

نہال بے دم سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کی کنپٹیوں میں دھماکے ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے درد کی شدت سے اس کا سر پھٹ جائے گا۔ اعصاب جواب دے گئے تھے۔ جسم سے آگ نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ ذہن میں فقط ایک ہی جملے کی بازگشت تھی۔

"ابھی اور اسی وقت گھر سے نکل جاؤ۔"

کچھ دیر کو وہ شعور سے بیگانہ، ہوش و حواس کی دُنیا سے دُور ہو گیا۔ جانے کتنی دیر تک وہ یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر بمشکل اُٹھا اور اپنے بے جان وجود کو گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے تک لایا۔ دھندلائی نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ کمرے کی فضا سے اُداسی ٹپکنے لگی تھی۔ ہر شے اجنبی اور دُور لگنے لگی تھی۔

"اوہ خدا! یہ کیا ہو گیا۔" کھڑے کھڑے اس کا سر چکرانے لگا تو وہ بستر پر ڈھے گیا۔ دل سے درد کی شدید لہر اُٹھی تھی۔

باہر سے اسے شور و غل کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ سب لوگ آ چکے تھے۔ کوئی اسے پکار بھی رہا تھا۔ پھر دروازہ کھلا اور وہ سب اندر داخل ہو گئے۔

نہال نے بہت چاہا کہ خود پر قابو پالے مگر چوٹ سخت تھی۔ درد شدید تھا۔ اسے سنبھلنے کے لیے وقت درکار تھا۔

"کیا بات ہے نہال؟" اسے بستر پر یوں پڑا دیکھ کر جاذب اس کی طرف بڑھا۔

تاریک وحشت زدہ چہرا، بے ترتیب سانسیں۔ اس نے ویران نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!" اس نے نہال کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھے پانی پلا دو۔" حلق میں اُگے کانٹوں نے اسے بولنے بھی نہ دیا۔

"فوراً پانی لاؤ۔" جاذب نے ذیشان سے کہا۔

"اور ساتھ ہی ڈاکٹر کو بھی فون کر دو۔" شہیر بولا۔

"نہیں۔" نہال نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

ذیشان پانی لے آیا تو اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

وہ سب اس کے گرد جمع تھے۔ ان کے چہروں سے تفکر جھلک رہا تھا۔ وہ باری باری سب کو دیکھنے لگا۔

(ہاں میں ابھی تہی داماں نہیں ہوا۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں میرے دُکھ پر پریشان ہونے والے، میری خوشی میں خوش ہونے والے، میرا درد بانٹنے والے، میری آسودگی میں اضافہ کرنے والے، ابھی میری زندگی میں بہت سی محبتیں باقی ہیں۔ میرے جینے کے جواز باقی ہیں)

اس کے شکستہ دل کو ان کی موجودگی سے تقویت ملنے لگی۔ اس کی توانائیاں لوٹنے لگیں۔

"تم چپ کیوں ہو؟ کیا بات ہو گئی؟ بولتے کیوں نہیں ہو؟" شہیر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔

"کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔ تم پریشان مت ہو۔" وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔

"صورت دیکھیں جا کر اپنی۔ نادر شاہ جب دلّی اُجاڑ کر گیا تھا تو دلّی کا جو حشر ہوا تھا اس کی پوری داستان آپ کے چہرے پر لکھی ہے۔" ذیشان بُرا سا مُنہ بنا کر بولا۔

(یہ میرے اپنے اُجڑنے کی داستان ہے جو میرے چہرے پر لکھی ہے)

"سچ سچ بتائیے، کیا بات ہوئی۔ ہم تو آپ کو اچھا بھلا چھوڑ کر گئے تھے۔" خمار تردّد سے کہہ رہی تھی۔

"پہلے تم سب اپنے حوصلے مضبوط کرو۔ میری بات سُن کر صبر و تحمل سے کام لینا۔ اس لیے کہ جو کچھ ہوا وہ ایک دن ہونا ہی تھا۔ حالات کبھی بھی میرے حق میں نہیں رہے۔ اب میں اس گھر میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے حوصلے ایک بار پھر ٹوٹتے محسوس کیے۔

"کیا مطلب؟" بیک وقت کئی آوازیں اُبھریں۔

"مطلب یہ ہے کہ نانا جان نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔"

"کیا؟" ان کے مُنہ سے چیخیں نکل گئیں۔

"کیوں؟" شہیر غضبناک ہو گیا۔ "اب تم نے کیا بگاڑ دیا؟"

"جو کچھ کہوں گا۔ سچ ہے مگر جانتا ہوں تم لوگوں کو یقین نہیں آئے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ساری بات ان کو بتا دی۔ ان کی تو وہ حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دم بخود بیٹھے اس کی شکل دیکھ رہے تھے۔

"کیا یہ سچ ہے؟" ہکا بکا سی جواہر بے یقینی سے بولی۔

ایک مجروح سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ گئی۔ "رفتہ رفتہ یقین آ جائے گا۔"

"نہال! تم سے کس نے کہا تھا کہ اس معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاؤ۔" جاذب نے اُلٹا اسی کو کہا۔

"بالکل۔ ہم کسی ایسی عورت کو قبول نہیں کریں گے جو آپ کے اور ہمارے درمیان دُوری کا باعث بن گئی۔"

"فضول بات مت کرو ذیشان!" اس نے برہم ہوتے ہوئے بات کاٹ دی۔ "جب تم اس عورت سے ملو گے تو تمہیں اس میں اپنی ماں نظر آئے گی۔ میں بہت جلد انہیں یہاں بھیجوں گا۔ تم لوگوں کو میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔"

"بھائی جان! آپ مت جائیں۔ ہم جا کر دادا جان سے آپ کی سفارش کرتے ہیں۔ وہ مان جائیں گے۔" زیبا رونے لگی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے سختی سے اس کی بات رَد کر دی۔ "اور پلیز تم اس طرح مت روؤ ورنہ مجھے یہاں سے جاتے وقت اور بھی دُکھ ہوگا۔"

اس کے آنسو اور تیزی سے گرنے لگے۔

"زیبا!" اس نے بے بس سا ہو کر لب کاٹے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "میرے یہاں آنے پر پابندی لگی ہے۔ تم لوگوں کے تو میرے گھر آنے پر پابندی نہیں ہے۔"

اس نے ایک طائرانہ نظر سب پر ڈالی۔ ان کو تو جیسے سانپ ہی سونگھ گیا تھا۔ پتھر کا بت بن گئے تھے۔

"مجھے پتا تھا کہ ایک دن مجھے پناہ گاہ کو چھوڑنا ہی ہوگا۔ مگر تم سب کی محبت ہمیشہ میرے پیر کی زنجیر بنی رہی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ یہ زنجیر توڑ دیتا۔ بہرحال ہم سب کا وجود ایک ہے۔ اٹوٹ ہے۔ مجھے تم لوگوں سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔"

یہ کہہ کر اس نے رُخ موڑ لیا۔ وہ اپنے تاثرات ان لوگوں سے چھپا لینا چاہتا تھا۔ ان کے سامنے بکھرنا نہیں چاہتا تھا۔

"چلو۔ تم لوگ نیچے چلو، میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے الماری کھولی اور ہینگر میں لٹکے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ مت ہاتھ لگائیں کسی چیز کو۔" ذیشان ایک دم جنونی ہو کر آگے بڑھا۔ "کچھ بھی مت لے کر جائیں۔ خود تو جا رہے ہیں اپنی چیزیں تو یہاں چھوڑ جائیں۔ اپنے وجود کا احساس تو چھوڑ جائیں۔ یہاں بیٹھ کر کم از کم ایسا تو لگے گا کہ آپ ابھی ابھی اُٹھ کر کہیں گئے ہیں اور تھوڑی دیر میں لوٹ آئیں گے۔"

نہال کا دل بُری طرح دُکھ گیا۔ اس نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا جیسے حوصلہ دے رہا ہو۔

"او کے۔ میں کچھ لے کر نہیں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ریک پر رکھی اپنی آفس فائل اُٹھائی جو وہ اسٹڈی کے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

لیے لایا تھا۔

"آؤ باہر چلو۔" اس نے ایک بھرپور الوداعی نگاہ کمرے پر ڈالی اور دروازہ بند کر دیا۔

وہ لوگ لاؤنج میں پہنچے ہی تھے کہ بیرونی دروازہ کھلا اور شیراز اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

"شیراز بھائی!" خمار اس کو دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھی۔ "دادا جان نے نہال بھائی کو گھر سے نکال دیا۔"

شیراز کا دل دھک سے رہ گیا۔ معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں اسے فقط ایک لمحہ لگا۔ اس نے مڑ کر نہال کو دیکھا۔ اس نے بے چارگی کے عالم میں کندھے اُچکا دیے۔

وہ تیزی سے مڑا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

"شیراز بھائی!" نہال اس کا ارادہ بھانپ کر اس کے پیچھے دوڑا۔ "رک جائیے۔"

پر شیراز نے تو سنا نہیں۔

"بھائی جان!" نہال سیڑھیوں کے بیچ پہنچ کر دھاڑا۔ "آپ کو قسم ہے، رک جائیے۔ اگر آپ نے نانا جان سے میرے لیے رحم کی بھیک مانگی تو ساری عمر میری صورت کو ترسیں گے۔ میرا سراغ بھی نہ ملے گا۔"

شیراز کے قدم رک گئے۔ اس نے آگ اُگلتی نظروں سے اسے دیکھا اور پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ سب لوگ اس کے ساتھ پناہ گاہ کے مین گیٹ تک آئے۔ چہرے ستے ہوئے تھے اور زبان سلب، جسموں میں جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔

نہال پناہ گاہ سے جا رہا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی کئی دن تک پناہ گاہ سے دور رہا تھا مگر جہاں بھی گیا پلٹ کر تو آیا تھا۔ مگر اب۔

"اچھا بھئی خدا حافظ!" اس نے خوشدلی سے کہا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ ریورس کرنے سے قبل اس نے دیکھا خیرا دھیرے دھیرے چلتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے اسے دیکھ کر وہیں سے ہاتھ ہلا دیا اور تیزی سے گاڑی بیک کرنے لگا۔

جونہی وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوئے۔ ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ اس نے اپنے اوپر جو خول چڑھا لیا تھا۔ وہ چٹخ گیا اور نہال بری طرح بکھر گیا۔ اس نے مین روڈ پر لا کر گاڑی روک دی۔ اسے اپنے کزنز ہیولا کی صورت میں گیلری میں کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ایک حسرت ناک نگاہ پناہ گاہ پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ سید وجاہت علی خان بھی اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

پتا نہیں وہ سارا راستہ کیسے کٹا۔ اس نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ کس کا فون ہو گا۔ لمحہ بھر کو دل چاہا کہ فون نہ اٹھائے پھر سر جھٹک کر اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔"

"نہال! تم اتنا یاد رکھنا کہ تم پناہ گاہ سے نکلے ہو ہماری زندگی سے نہیں۔ تمہاری زندگی پر تمہارے بعد ہمارا حق ہے اور ہم اپنے حق سے آسانی سے دستبردار ہونے والوں میں نہیں ہیں۔" شہیر کی بھاری آواز ایئر پیس میں ابھری۔

"بے فکر رہو زندہ ہوں اور زندہ رہوں گا۔" اس نے ریسیور کو گھورتے ہوئے واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ تھکے تھکے انداز میں اندر چلا آیا اور بستر پر بیٹھ گیا اور طائرانہ نظروں سے کمرے کو دیکھنے لگا۔

اسے سب کچھ بڑا اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔ یہ اس کا گھر تو نہیں تھا۔

میں فلیٹ سے بول رہا ہوں۔

میں فلیٹ پر چلا آیا تھا۔

تم میرے فلیٹ پر آ جاؤ۔

اس نے بھلا یہ کب کہا تھا کہ

میں گھر سے بول رہا ہوں۔

میں گھر چلا آیا تھا۔

تم میرے گھر پر آ جاؤ۔

گھر تو اس کا پناہ گاہ تھا جہاں وہ محبتوں اور نفرتوں کی طویل داستان چھوڑ آیا تھا۔ فیکٹری سے پناہ گاہ اور پناہ گاہ،

فیکٹری وہ روز آتا جاتا تھا۔ اس فلیٹ میں تو کبھی کبھی آتا تھا۔ جب فیکٹری میں کام بڑھ جاتا یا پھر جب وہ بہت تھک جاتا اور اس کا ڈرائیو کرنے کو دل نہ چاہتا۔

یہاں کیا تھا بھلا؟

کچھ بھی تو نہیں۔ اس کا سب کچھ تو پناہ گاہ میں تھا۔

اس نے ایک نظر بیڈ روم کی دیواروں پر ڈالی۔ وہ اسے گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

کتنی بار وہ اس کمرے میں سویا تھا مگر ذرا بھی تو اُنسیت نہ ہوئی تھی۔

خواب گاہ تو اس کی وہ تھی جسے وہ چھوڑ آیا تھا۔

جو اس کی تنہائیوں کی ساتھی تھی۔

جس میں اس کے قہقہے محفوظ تھے۔

جو اس کی سسکیوں کی رازدار تھی۔

اس کا نرم بستر، ایزی چیئر، اس کا ریک، اس کی کتابیں، اس کا ڈیک۔ ہر شے اسے یاد آ رہی تھی، ہر چیز پر اس کے ہاتھوں کا لمس موجود تھا۔

پناہ گاہ میں ہر کمرے میں اس کے بیٹھنے کی مخصوص جگہیں تھیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کی مخصوص کرسی، ٹی وی لاؤنج میں اس کا مخصوص صوفہ، اور وہ کس طرح سے باورچی خانے میں چھوٹی کھانے کی میز پر کارنر والی کرسی پر بیٹھ کر انا بی سے باتیں کیا کرتا تھا۔

وہ تاج محل، جس کے ستون سے ٹیک لگا کر بارش کو برستے دیکھتا۔

وہ حوض۔ جس کے کنارے بیٹھ کر گھنٹوں پانی میں ہاتھ ڈالے رکھتا۔

درختوں کے وہ جھنڈ جس کے پار سے وہ چاند کو تکا کرتا۔

اور سب سے بڑھ کر اس کے بھائی بہن، جن کی محبت اس کی زندگی تھی۔

سب کچھ چھوڑ آیا تھا وہ وہاں پر۔

کیا ساتھ لایا وہ؟

ایک چھوٹا سا دل اور اس میں ڈھیر سارا درد۔

گھر میں تو بے جان چیزیں بھی دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

یہاں اس فلیٹ میں تو ہر چیز بے جان تھی۔ شاید اس کی اپنی سانسیں بھی۔

گھر تو اس کا پناہ گاہ تھا۔

صرف چار سال کا ہی تو تھا جب وہ پناہ گاہ آیا تھا۔ آج وہ اٹھائیس برس کا ہو چلا تھا۔ چوبیس سال کا طویل عرصہ گزار آیا تھا وہ اس گھر میں۔ اسے پیار ہو گیا تھا اس گھر سے۔ کہیں چلا جاتا مگر جانتا تھا کہ لوٹ کر تو پناہ گاہ ہی جانا ہے مگر اب!

وہ بستر سے اٹھ گیا۔

سوچوں کا بڑا تکلیف دہ سلسلہ تھا جو کسی طرح ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اسے بری طرح اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔

دھیمے دھیمے قدموں سے چلتا ہوا وہ ریک کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اور اوپر کے خانے میں رکھی فریم میں جڑی اپنے والدین کی تصویر اٹھا لی۔

"ابو! آپ نے میرے لیے جس کتاب کا پہلا ورق کھولا تھا، آج میں اس کتاب کا آخری صفحہ بھی پڑھ آیا ہوں۔

بہت سی کہانیاں بے عنوان رہ گئیں۔ ادھوری رہ گئیں۔

جو راستہ آپ نے میرے لیے منتخب کیا تھا وہ راستہ کہیں کھو گیا ہے اور میں اکیلا رہ گیا ہوں۔"

نڈھال ہو کر وہ وہیں صوفے پر ہی بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ گھوم رہا تھا۔

سوچیں تھیں کہ انگارہ، اس کا پورا وجود سلگ رہا تھا اور نہ جانے کب تک سلگتا رہا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو صوفے پر ہی پڑا پایا۔ اس کی سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

خالی نظروں سے چھت کو گھورتا رہا۔ سویا ہوا ذہن آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا۔ یک لخت اسے احساس ہوا کہ گھر میں وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ وہ جھٹکے سے اُٹھا اور دروازہ کھول کر باہر سٹنگ روم میں آیا۔

"اوہ" وہ ٹھٹک گیا۔

سب ہی موجود تھے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا تھا۔ کوئی ادھر اُدھر آجا رہا تھا۔ خمار باورچی خانے میں کھٹ پٹ کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کے زور زور سے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی "ذرا چمچہ دینا، یہ چینی آخر کہاں رکھ دی، ہٹو یہاں سے" وغیرہ وغیرہ۔

"صبح بخیر!" جاذب نے مسکرا کر کہا۔

"صبح بخیر یار!" وہ سستی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"نہال! بہت دیر سے سو کر اُٹھے؟" فیراز کا لہجہ نرمی لیے ہوئے تھا۔

"رات کو نیند نہیں آئی تھی" اس نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

"تو ہم بھی کون سا سو گئے تھے" شہیر نے جو اخبار میں گم تھا، دل میں سوچا۔

"ویسے تم لوگ آئے کب؟ مجھے پتا ہی نہ چلا۔ شاید میری آنکھ لگ گئی تھی"

"بس سورج کے ساتھ ہی طلوع ہوئے تھے" ذیشان نے فرج کھول کر اندرونی جائزہ لیتے ہوئے کہا "بھئی آپا! کیا سو گئیں باورچی خانے میں؟ جلدی سے ناشتا لے کر آؤ"

"کیا تم لوگوں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا؟" وہ حیرت سے بولا ساتھ ہی وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔

"جی نہیں۔ معدہ بد دعائیں دے رہا ہے" ذیشان نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"تم لوگ شروع کرو، میں ہاتھ منہ دھو کر ابھی آیا" وہ باتھ روم میں گھس گیا۔

آئینے پر نگاہ پڑی تو اپنی اُجڑی ہوئی صورت نظر آئی۔

"ہونہہ! مجھے بہلانے کے لیے آئے ہیں۔ احمق کہیں کے۔ سب کے سب بے وقوف ہیں"

اس نے سر کو جھٹکا دیا اور منہ دھونے لگا۔

○ ● ◆

"میں پوچھ رہی ہوں کیا آپ کی کھال گینڈے کی ہے؟" وہ اپنی جھلاہٹ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟" معاذ نے خفیف سا مسکراتے ہوئے پوچھا۔ نظریں بدستور ہاتھ میں پکڑی کتاب پر جمی تھیں۔

"سخت سردی پڑ رہی ہے اور آپ کس قدر اطمینان سے کرسی پر بیٹھے جھول رہے ہیں۔ چھوڑ دیں اس کتاب کا پیچھا اور کمبل اوڑھ لیں ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی" وہ خالص بیویوں کے انداز میں بولی۔

"بھئی، ہیٹر جل تو رہا ہے" اس نے صفحہ پلٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو لگ رہا ہے، یہ ہیٹر بھی ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے۔ ذرا اس کو اور تیز کر دیں۔ خدایا توبہ ایک تو اس قدر تیز بارش اس پر یہ برفانی ہوائیں۔ جان نکلی جا رہی ہے میری" اس نے اپنے بجتے دانتوں کو سختی سے بھینچ لیا۔

"لندن میں سردی ایسی ہی ہوتی ہے۔ تم پہلی بار یہاں کی سردیاں دیکھ رہی ہو۔ میری تو عمر یہیں گزر گئی۔ میں تو عادی ہوں" یہ کہہ کر وہ پھر کتاب کے صفحوں میں گم ہو گیا۔

جویریہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر بڑبڑاتے ہوئے سر تک کمبل تان لیا۔ اسے ہلکے ہلکے نیند کے جھونکے آنے لگے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے اس کے ذہن کو جھنجوڑ کر نیند کو بھگا دیا۔ اس نے سخت کوفت کے عالم میں کمبل منہ پر سے ہٹایا۔ معاذ فون سننے کے لیے بیڈ کے نزدیک آ رہا تھا۔

"ہیلو!"

"ہیلو معاذ! میں خرم بول رہا ہوں" اس کی سخت پریشان اور گھبرائی ہوئی آواز اسے سنائی دی۔

"کیا بات ہے؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو"

"میں اس وقت لندن سے چالیس میل دُور ایک چھوٹے سے قصبے سے بول رہا ہوں۔ ایک دوست کی عیادت کو

آیا تھا۔ واپسی کے وقت طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ ایسے میں گاڑی لے کر نکلنا بے حد خطرناک ہے۔ میں نے فریال کو یہ کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ مجھے اگر دیر ہو جائے تو وہ پریشان نہ ہو۔ پہلی بار گھنٹی بجائی تو کسی نے اُٹھا تو لیا مگر بغیر کچھ کہے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے بعد سے مسلسل گھنٹیاں بجا رہا ہوں کوئی ریسیو نہیں کر رہا ہے۔ فریال اس وقت کہاں جا سکتی ہے۔ اور پھر وہ کون ہے جس نے فون اُٹھا کر دوبارہ رکھ دیا۔ یا پھر فریال ہی کو نہ کچھ ہو گیا ہو۔ تم تو جانتے ہو کہ—" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ دل ہلا دینے والے اندیشوں نے اس کی زبان بند کر دی۔

دوسری جانب معاذ کی پیشانی پر فکرمندی کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ جو کچھ خرم کہتے کہتے رُک گیا، وہ خارج از امکان نہیں تھا۔

"معاذ! میرا ایک کام کر دو۔ میں ساری عمر تمہارا ممنون رہوں گا۔ میرے بھائی ذرا گھر جا کر دیکھ لو کہ فریال خیریت سے ہے یا نہیں۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ کہیں وہ" اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر دے دو۔ میں تمہیں رنگ کر دوں گا۔ پریشان نہ ہو۔ انشاء اللہ وہ خیریت سے ہوں گی" اس نے تسلی دینے کے انداز میں کہا مگر درحقیقت وہ اندر سے خود بھی خاصا فکرمند ہو گیا تھا۔

وہ فون رکھ کر مڑا تو جویریہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ معاذ نے مختصر الفاظ میں اسے ساری بات بتا دی۔ سن کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"معاذ! کہیں ایسا تو نہیں کہ فریال—" اس کے چہرے پر دحشت چھا گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے" معاذ نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

"اللہ نہ کرے" وہ تڑپ کر رہ گئی "ایسا مت کہیں"

"تم دعا کرو کہ وہ خیریت سے ہو۔ میں اسے دیکھ کر آتا ہوں" وہ اوور کوٹ پہنتے ہوئے بولا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی" وہ بضد ہو گئی۔

"نہیں۔ باہر سردی بہت ہے۔ تم بیمار ہو جاؤ گی" وہ سخت لہجے میں بولا۔ وہ کسی قیمت پر اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اگر اس کے اندیشے سچ ثابت ہو جاتے تو جویریہ تو اپنے حواس ہی کھو دیتی۔

"تم دروازہ بند کر لو" اس نے گاڑی کی چابی اُٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

خاموش آنسو اس کے رخسار بھگو رہے تھے۔

"حد ہو گئی جویریہ۔ ہمت سے کام لو۔ اس طرح حوصلہ نہیں ہارتے" اس نے پیار بھرے انداز میں کہتے ہوئے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے کوئی بُری خبر نہ سنائیے گا۔ میں سہہ نہ سکوں گی"

معاذ نے ایک گہرا سانس لیا اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

اس وقت وہ اُڑ کر فریال کے گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر اتنی تیز بارش میں اس کے لیے گاڑی چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا دل بھی بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ ذہن میں خیالات بگولوں کی طرح اُڑ رہے تھے۔ اس کی ہر سوچ کی تان ایک ہی جگہ آ کر ٹوٹ رہی تھی۔

کہیں خدانخواستہ وہ واقعی—

"اوہ خدا!" وہ سر جھٹک کر رفتار بڑھانے کی کوشش کرتا۔ خرم کے گھر پہنچ کر وہ سرعت سے باہر نکلا۔ ڈور بیل کے بٹن کو جلدی جلدی تین چار بار پُش کرنے کے بعد اس کے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ شاید اندر سے بند نہیں تھا۔

معاذ کو اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ دوڑنے کے سے انداز میں اندر داخل ہوا۔ چھوٹا سا لان پار کر کے اندرونی دروازے کی جانب آیا۔ ہاتھ سے دھکا مارا تو وہ بھی پٹ سے کھل گیا۔

اور اس کے ساتھ ہی سارے اندیشوں نے یقین کا روپ دھار لیا۔ مارے بوکھلاہٹ کے اس نے فریال کو

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تین چار بار آواز دی۔ اسی لمحے فریال کے کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور وہ اسے دروازے کے بیچ کھڑی نظر آئی۔

"اوہ میرے رب تیرا شکر ہے۔" اس کا تو رواں رواں سجدہ ریز ہو گیا۔ وجود میں اُٹھنے والا طوفان ایک دم ہی تھم گیا۔ پُرسکون سے احساس تلے ہر شے پر سکوت چھا گیا۔

"کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟" اسے فریال کی چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔

اس کے لہجے پر معاذ ششدر رہ گیا۔ سخت تعجب سے اس نے فریال کو دیکھا۔

وہ خون آشام نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی۔

"میں نے پوچھا ہے کہ کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟ میری عزتِ نفس، میری انا کے پرخچے اُڑا کر اب کیا میرا اکڑی تماشا بھی دیکھنے آئے ہیں؟" وہ سخت مشتعل، بپھرے ہوئے انداز میں اس کی جانب بڑھی۔

"فریال! یہ سب آپ کیا کہہ رہی ہیں!" فریال کا انداز، اس کا لہجہ، اس کے الفاظ، معاذ کے تو ہوش ہی اُڑ گئے۔

"ہونہہ! اتنے انجان اور بھولے نہیں ہیں آپ کہ جتنا پوز کر رہے ہیں۔" وہ دھاڑی۔ "مجھے بتائیے کہ کیا حق تھا آپ کو میری تذلیل کا۔ کیوں مجھے اتنی پستی میں اُتار دیا کہ آئینہ دیکھنے کے قابل بھی نہ چھوڑا؟"

وہ بھونچکا رہ گیا۔ پھر تحمّل سے کام لیتے ہوئے بولا۔ "مجھے کچھ بتائیے تو سہی کہ آخر بات کیا ہے۔ یقین کریں میں آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

مگر اس نے تو جیسے سُنا ہی نہیں۔

"کیا جُرم تھا میرا؟" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔ "یہی ناں کہ میں آپ سے محبّت کرتی تھی۔"

معاذ کے وجود پر ایک دم سنّاٹا چھا گیا۔

"ہاں ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں آپ سے محبّت کرتی تھی۔ محبّت کرتی ہوں۔" وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ "مگر اس کے بدلے آپ سے کچھ مانگا تو نہیں تھا۔ اپنی چاہت کا صلہ تو نہیں چاہا تھا۔ جویریہ سے اس کا شوہر تو نہیں چھینا تھا۔ پھر کیوں جویریہ نے میرے پاکیزہ جذبات کو داغدار کر کے مجھے ان کی بدصورتی کا احساس دلانے کی کوشش کی؟ کیوں کیا اس نے ایسا؟ کتنا ارزاں سمجھ لیا تھا اس نے مجھے؟ محبّت کو خیرات بنا کر میرے دامن میں ڈالنا چاہا۔ اپنے شوہر کی بھیک دینی چاہی۔ کیوں اس نے خرم بھائی سے کہا کہ وہ میری شادی آپ سے کر دیں۔"

معاذ کا دماغ بالکل ہی ماؤف ہو گیا۔ اس کا ذہن بالکل ہی جواب دے گیا۔ وہ پتھر کا بنا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

(اوہ جویریہ! یہ تم نے کیا کر دیا)

اس نے پتھرائی نگاہوں سے فریال کو دیکھا۔

آنکھوں سے آنسو بہاتی، منہ سے شعلے اُگلتی، غیظ و غضب کے عالم میں وہ خود اپنے بس میں نہ رہی تھی۔

"ہاں میں نے چاہا تھا کہ زندگی کا سفر آپ کے ساتھ طے کروں مگر اپنی عزتِ نفس کو آپ کے اور اپنے راستے کے درمیان نہیں بچھا دیا تھا کہ آپ اس کو روندتے ہوئے مجھ تک پہنچیں۔ محبّت کا عوض اگر اپنی انا، وقار، مان، غرور اور عزتِ نفس ہوتے تو کوئی بشر کسی سے محبّت نہ کرتا۔ یہ جذبہ اتنا اعلا و ارفع نہ ہوتا۔ محبّت تو انسان کو نکھار دیتی ہے۔ یہ تو زندگی کی آسائش و زیبائش ہوتی ہے۔ اس کے آئینے میں تو کائنات کی ہر شے کا عکس حسین نظر آتا ہے۔ تو پھر اسی آئینے میں جویریہ نے میرے ہی عکس کو کیوں اتنا کریہہ بنا دیا کہ خود سے چھٹکارا پانے کے علاوہ میرے پاس کوئی راستہ نہ چھوڑا۔"

وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اس نے دیوانگی میں معاذ کا کالر پکڑ کر اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"بہت بُرا کیا ہے جویریہ نے میرے ساتھ۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ جائیں جا کر اس سے کہہ دیں کہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں، شدید نفرت۔"

معاذ خاموش کھڑا اس چوٹ کھائی ناگن کو بل کھاتے دیکھ رہا تھا۔

اب جبکہ ہر بات سے پردہ اُٹھ چکا تھا تو کھل کر بات کر لینا ہی مناسب تھا۔

"فریال! آپ جویریہ کو غلط سمجھ رہی ہیں۔" اس نے کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ قالین پر بیٹھی، گھٹنوں میں منہ دیے سسکتی فریال نے جھٹکے سے سر اُٹھا کر تیزی سے اس کی بات کاٹ دی اور زہرخند ہنسی کے ساتھ بولی۔

"ہاں بھلا آپ کیوں نہ اس کی حمایت کریں گے۔ آخر وہ آپ کی بیوی ہے۔ دلنواز شریکِ حیات۔"

"نہیں۔" وہ قطعی انداز میں گویا ہوا۔ "میں اپنی بیوی کی نہیں اس عورت کی بات کر رہا ہوں جو آپ کی محبّت میں اتنا آگے بڑھ گئی کہ اس نے اپنی ذات کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اپنی زندگی کی خوشیوں اور اپنے جذبات کو نظرانداز کر دیا۔ عورت کی فطرت کو شکست دینا چاہی۔ اس نے محبّت کو بھیک بنا کر مجھے آپ کے کشکول میں نہیں ڈالا بلکہ آپ کو آپ کی خاموش بے لوث و بے غرض محبّت کا صلہ دینا چاہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آپ خواہشوں اور جذبوں کی ناآسودگی کا احساس لے کر اس دُنیا سے ناکام لوٹ جائیں۔ سو اس نے آپ کی خوشیوں کے لیے اپنے شوہر کی محبّت میں آپ کو حصّہ دار بنانا چاہا۔ آپ کی ذات کی تکمیل کے لیے اپنے وجود کا حصّہ کاٹنا چاہا۔ آپ کی زندگی کی تلخیوں اور محرومیوں کا سودا اپنی زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں سے کرنا چاہا۔ وہ چاہتی تھی کہ آپ اپنے وجود کی تکمیل اپنے من چاہے ساتھی سے کریں خواہ آپ کا من چاہا ساتھی اس کا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ کہتے کہتے رُک گیا۔ خاصی دیر بعد پست لہجے میں بولا۔

"آخر ان سب باتوں کی کیا بنیاد تھی۔ یہی ناں کہ وہ آپ سے محبّت کرتی ہے۔ اس کی محبتوں کی شدّتوں کا اندازہ آپ اس بات سے کیوں نہیں کرتیں کہ صرف آپ کی خاطر، آپ کی خوشی کی خاطر اس نے اپنے آپ کو شوہر کی تقسیم کے لیے راضی کر لیا۔ فریال عورت کا دل بے حد وسیع ہوتا ہے۔ مگر مجھے بتائیں کہ کس عورت کا دل اتنا بڑا ہے کہ اس میں ایک سوکن سما جائے۔ جویریہ کے ارادوں میں اس کا اپنا تو کوئی مفاد پوشیدہ نہ تھا۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی آپ ہی کے لیے تو کر رہی تھی۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی آزردگی سے بولا۔ "میں تو خود آج تک نہیں جان پایا کہ آخر کون سے جذبے نے اس کو اتنا حوصلہ، اتنی قوّت دے دی کہ وہ اپنے منہ سے مجھ سے کہتی تھی کہ میں آپ سے شادی کر لوں۔ آپ کی محبّت کا جواب محبّت سے دوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اتنی مضبوط ہے نہیں جتنا خود کو ثابت کر رہی ہے۔"

فریال نے سختی سے لب بھینچ رکھے تھے۔ وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ معاذ کا ایک ایک لفظ ہتھوڑا بن کر سماعتوں پر ضرب لگا رہا تھا۔ اس کا دل معاذ کی باتوں کو تسلیم کرنے لگا۔ شاید اس لیے کہ سوچ کا رُخ اب صحیح سمت ہو گیا تھا۔ ذہن پر پڑا غلط فہمی کا پردہ اُٹھا تو چہرے پر ندامت کا رنگ چھا گیا۔ شرمندگی کے شدید ترین احساس نے اس کا سر جھکا دیا۔

"فریال!" وہ قالین پر اس کے سامنے قدرے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ "آپ کی سوچ جویریہ کے بارے میں بڑی منفی ہے۔ وہ بے قصور ہے۔ اس کے بارے میں اپنی سوچوں کا موازنہ، اپنے بارے میں اس کی سوچوں سے کیجیے۔ آپ نے اس کے بارے میں بڑا غلط تاثر قائم کیا ہے۔ وہ آپ کے لیے بے حد مخلص ہے۔ آپ کے تصوّر سے کہیں زیادہ!"

پھر اس نے اپنا لہجہ بے حد نرم کر لیا۔ "فریال ان سب باتوں سے میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ بلکہ میں آپ کو حقائق بتانا چاہتا تھا۔ تصویر کا صحیح رُخ دکھانا چاہتا تھا۔"

فریال بالکل گم صم بیٹھی تھی۔ جویریہ کی طرف سے جو اس کے دل میں گرہ لگی تھی وہ چُپ چاپ کھل گئی تھی۔ فریال کی خاموشی اس کے احساسِ جُرم کا پتا دے رہی تھی۔

معاذ نے دھیرے سے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ حسین چہرا، جو نگاہوں کو خود پر منجمد کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ متورّم ہو رہا تھا۔ چاندنی کا ڈھلا وجود اب تک سسکیاں بھر رہا تھا۔

معاذ کی نگاہ اس پر تھم کر رہ گئی۔

یہ وجود جو اس کی محبّت کی دھیمی دھیمی آنچ میں جانے کب سے سُلگ رہا تھا۔

یہ نگاہیں کس بے قراری سے اس کا چہرا چھوتی ہوں گی۔

یہ اس کے خواب دیکھتی آنکھیں۔

یہ بے لوث محبّت کا اعتراف کرتے ہونٹ۔

یہ اس کے حق میں دعا کے لیے اُٹھتے ہاتھ۔

یہ دل جس میں اس کی چاہت خزانوں کی طرح محفوظ تھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

(کیا دیکھا تھا تم نے مجھ میں؟ میں تو بہت عام سا مرد تھا فریال۔ خود کو کیوں روگ لگا لیا۔ محبت کی بازی تو جیت لینے کے یقین کے ساتھ کھیلی جاتی ہے اور تم ہو کہ شکست خوردہ ہونے کے باوجود بساط بچھائے بیٹھی ہو)

وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تمام تر سوچوں کا رُخ فریال کی طرف تھا۔ اس کے خیالات کا عنوان بدلنے لگا۔ مفہوم بدلنے لگا۔ اور پھر اپنی قوتِ فیصلہ کو مضبوط کر کے، پوری دیانت داری و بےباکی، دل کی رضامندی و آمادگی کے ساتھ اس نے لمحہ بھر میں وہ فیصلہ کر لیا جس کا اس نے اس لمحے سے قبل تصوّر بھی نہ کرنا چاہا تھا۔

اس نے جیب سے رومال نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ "آنسو پونچھ لیجیے۔"

فریال نے رومال تھامنے کے بجائے ہاتھ کی پشت سے رخساروں پر لڑھکتے آنسو صاف کر لیے۔ اس کا ذہن پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا۔ اپنی سوچ کی بدصورتی کا احساس کر کے اسے اپنا وجود بے حد چھوٹا اور کمتر لگ رہا تھا۔

"فریال!" معاذ نے ہولے سے آواز دی۔

بے اختیار اس نے نظریں اُٹھا کر معاذ کو دیکھا۔

وہ بڑی ملائمت سے کہہ رہا تھا۔ "جو کچھ بھی ہوا ہے میں اس کا ذمہ دار کسی کو بھی نہیں ٹھہراتا۔ ہم میں سے کوئی بھی قصوروار نہیں ہے۔ یہ دل بڑی بے اختیار چیز ہوتی ہے اور محبت بھی کسی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ یہ جذبے بہت خاموشی سے دل میں اُترتے ہیں اور انسان کو اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب یہ پورے وجود میں سرایت کر چکے ہوتے ہیں۔"

اس نے رُک کر فریال کے چہرے کے تاثرات دیکھے پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔

"جویریہ چاہتی تھی کہ میں آپ سے شادی کر لوں۔ مگر میں نے اس کی بات رد کر دی تھی اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ وہ میری بیوی ہے۔ اور میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں اور اس کا مقام کسی اور کو نہیں دے سکتا۔ بلکہ انکار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اپنے آپ کو آپ کے لیے مخلص نہیں پا رہا تھا۔ میں اپنے دل میں آپ کے لیے کوئی ایسا جذبہ محسوس نہیں کر رہا تھا جسے میں سمجھتا کہ یہ آگے جا کر محبت کی شکل اختیار کرے گا۔ ایسی صورت میں آپ سے شادی کرنا آپ کی، آپ کے جذبوں کی توہین تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کے انمول جذبات کے صلے میں آپ کو دھوکا اور فریب دوں۔"

وہ چپ ہو گیا اور دیوار پر لگی پینٹنگ کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بڑے نرم اور اپنائیت بھرے لہجے میں بولا۔

"آپ نے مجھے اپنی زندگی میں بڑا اعلا مقام دیا ہے۔ اپنے انمول جذبات میرے نام کر کے مجھے بہت معتبر کر دیا ہے۔ میں آپ کی بہت قدر کرتا ہوں۔ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں، میں آپ کی محبت قبول کرتا ہوں۔ انشاء اللہ کل صبح سے پہلے پہلے آپ میری ہو جائیں گی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

فریال سُن کر سکتے کے عالم میں رہ گئی۔ معاذ کے چہرے پر ٹکی نظریں پتھرا گئیں۔

اس کی آنکھوں میں بے یقینی کو پڑھ کر وہ بڑی دلآویزی سے مسکرایا۔ "یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ "ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں جویریہ پر یہ ظلم نہیں کروں گی اور نہ آپ کو کرنے دوں گی۔"

"یہ جویریہ پر ظلم نہیں ہوگا۔" وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "اس وقت میں نے آپ سے جو بات کہی ہے وہ جویریہ کی آرزو کو پورا کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی خواہش اور اپنے ارادوں کو پورا کرنے کے لیے کہی ہے۔ آج اس لمحے سے قبل میرے اور آپ کے درمیان جویریہ موجود تھی۔ مگر اب اور اس لمحے کے بعد وہ کبھی بھی میرے اور آپ کے درمیان نہیں آئے گی۔" وہ تھکی تھکی سے کہہ رہا تھا۔

فریال وحشت زدہ سی اسے تکے چلی جا رہی تھی۔ آج اس نے وہ سب کچھ سُنا تھا جسے سُننے کے لیے وہ ساری عمر ترسی تھی۔

اس کے اور معاذ کے درمیان کے رستے کے سارے کانٹے دُور ہو گئے تھے۔ مگر یہ کیا۔ وہ تو اس سے قبل ہی اپنا راستہ بدل چکی تھی۔ اندھیروں میں گم ہو جانے والے راستے پر قدم رکھ چکی تھی۔

آہ۔ اب تو دیر ہو گئی۔ بہت دیر ہو گئی۔

اسے تقدیر کی ستم ظریفی پر بجائے رونے کے ہنسی آ گئی۔ اور پھر جو وہ ہنسی ہے تو ہنستی ہی چلی گئی۔

معاذ اس کے اس طرح دیوانوں کی مانند ہنسنے پر متعجب رہ گیا۔ اس نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو رہا ہو۔

وہ اچانک اپنی ہنسی روک کر بولی۔ "واہ معاذ آپ ملے بھی تو کب ملے۔ زندگی میں ملتے تو بات تھی۔"

"کیا مطلب؟" وہ اس وقت معاذ کی سمجھ سے بالکل باہر ہو رہی تھی۔

"میں وقت اور زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرگوشی میں بولی۔

"فریال میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" اس کا ضبط جواب دے گیا۔

"کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ "بس زہر کھا لیا ہے میں نے۔"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

"کیا؟" معاذ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی آواز پورے گھر میں گونج کر رہ گئی۔

"کیا کھایا ہے آپ نے؟ جلدی بتائیے۔"

"نیند کی گولیاں، پوری شیشی۔" اس نے بڑے مزے سے لہک کر کہا۔ ساتھ ہی مٹھی میں دبی خالی شیشی اس کی جانب اچھال دی۔

"مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" وہ سخت حواس باختہ ہو رہا تھا۔ سخت سردی کے باوجود اس کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔

"سچ بتائیے کھائی بھی ہیں یا نہیں کھائیں؟" اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اب مرتے وقت بھی کیا جھوٹ بولوں گی۔" اچانک ہی اسے چکر آیا اور وہ دھم سے صوفے پر گر پڑی۔ غالباً گولیوں نے اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔

"کیوں کھائی تھیں آخر کس لیے؟" وہ چلّا کر بولا۔

"زندگی کا بوجھ اب سہنا مشکل ہو گیا تھا۔" اس کا سر گھومنے لگا۔ گردن ایک طرف کو ڈھلکی جا رہی تھی۔ اس کی بدلتی حالت نے معاذ کے اوسان بالکل ہی خطا کر دیے۔

"جلدی چلیے میرے ساتھ۔" اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کہا۔ اس کا بازو تھام کر اپنی جانب کھینچا۔

"کہاں لے جانا چاہتے ہیں مجھے آپ؟" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"میں کہہ رہا ہوں تاخیر نہ کیجیے، فوراً اسپتال چلیے۔ اوہ میرے خدا!" اس کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔

دوسری جانب فریال کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر پسینہ آ رہا تھا۔ اسے اپنے اندر آگ لگتی محسوس ہو رہی تھی۔ حلق خشک ہو گیا تھا۔ نگاہوں کے آگے اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

"اس زندگی نے مجھے کچھ نہیں دیا، میں اب پلٹ کر اس کی طرف نہیں جاؤں گی، ہرگز نہیں جاؤں گی۔" وہ رو پڑی۔

اس کا جسم نڈھال ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں بے دم ہو رہے تھے۔

"فریال! میں آپ کو مرنے نہیں دوں گا۔" اس نے فریال کو دروازے کی طرف گھسیٹنا چاہا۔

"آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے؟" وہ پھر اُٹھی۔

"چھوڑیں میرا ہاتھ اور چلے جائیں یہاں سے۔"

وہ معاذ کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے زور لگا رہی تھی، مگر اس کی جسمانی قوتیں تیزی سے زائل ہو رہی تھیں۔ اس کی مدافعت کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔

اور پھر اچانک ہی اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اس کا جسم بے جان ہو کر معاذ کے بازو پر جھول گیا اور پھر زمین پر گر گیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

معاذ تو جیسے پتھر کے بت میں بدل گیا۔ اس نے پتھرائی آنکھوں سے زمین بوس وجود کو دیکھا۔ اُس نے تیزی سے جھک کر اُس کی نبض ٹٹولی اور اس بات کا احساس ہوتے ہی کہ اس کی ڈوبتی نبض میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہے۔ اُس نے فریال کو بازوؤں میں اُٹھایا اور تیزی سے نکل کر گاڑی میں ڈالا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی اُڑائے لیے جا رہا تھا۔

اس سے قبل کہ وہ بارش کے قطرے آسمان کے آنسو بنتے، وہ اسپتال پہنچ جانا چاہتا تھا۔

○ ● ◆

جویریہ سخت پریشانی کے عالم میں کمرے میں اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہی تھی۔ دل تھا کہ بیٹھا ہی چلا جا رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور لبوں پر دُعائیں تھیں۔ وہ خدا سے فریال کی خیریت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ ذہن سخت اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ وہ ٹہل ٹہل کر تھک جاتی تو صوفے پر بیٹھ جاتی پھر بے قرار ہو کر چکر لگانا شروع کر دیتی۔ کبھی گھڑی کی سمت دیکھتی، جس کی ٹک ٹک اسے پُراسرار لگ رہی تھی، تو کبھی ٹیلی فون کو گھورنے لگتی، جو بالکل خاموش پڑا تھا۔

دفعتاً فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ جویریہ کی جیسے جان ہی نکل گئی۔ اُس نے خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

ایک دھڑکن کہتی کہ جلدی سے اُٹھا لے۔

تو دوسری دھڑکن کہتی اور جو کوئی ——!

گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ فون تھک کر چُپ ہو جاتا۔ اُس نے ریسیور اُٹھا لیا۔

"جویریہ کہاں چلی گئی تھیں؟" معاذ کی آواز ایئر پیس میں اُبھری۔

"فریال زندہ تو ہے ناں؟" وہ بہت سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں ٹھیک ہے وہ۔"

"اوہ خدایا!" اس نے جیسے نڈھال ہو کر دیوار سے ٹیک لگا لی اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"کیا ہوا جویریہ؟" معاذ بری طرح گھبرا گیا۔

"معاذ! میں سہم سہم کر تھک گئی۔ خوف اور اندیشوں نے میرا خون خشک کر دیا۔ میں نے کس قدر پریشانی میں یہ وقت کاٹا ہے، آپ کو بتا نہیں سکتی۔"

"تم تسلی رکھو، سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"آپ بول کہاں سے رہے ہیں؟ فریال کو کیا ہو گیا تھا، وہ فون کیوں ریسیو نہیں کر رہی تھی؟"

معاذ اُس کی بات پر شش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ اسے بتائے یا نہ بتائے۔

"چُپ کیوں ہو گئے آپ؟"

"میں اسپتال سے بول رہا ہوں۔ دراصل جویریہ ——!" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"فریال نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"کیا؟" اُس کی سماعتوں میں کسی نے پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا تھا۔

"لیکن تم فکر نہ کرو، اب وہ بالکل ٹھیک ہے، ابھی اسے ہوش تو نہیں آیا ہے، مگر ڈاکٹروں نے اُس کی حالت خطرے سے باہر بتائی ہے۔ اس کا کیس تو تم جانتی ہو کہ پہلے ہی کس قدر پیچیدہ ہے۔ موت اس کے آس پاس ہی بھٹکتی رہتی ہے اور اس پر اس کا خودکشی کی کوشش کرنا۔ اس وقت اُس کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ خدا نے اس پر بڑا رحم کیا ہے۔"

"کیوں کیا اُس نے ایسا؟" وہ ابھی تک خلا میں ہی معلق تھی۔

"میں سب کچھ تمہیں گھر آ کر بتاؤں گا۔ فی الحال تم خرم کو فون کر کے فریال کی خیریت بتا دو۔ کہہ دینا کہ طبیعت خراب ہو گئی تھی، اس لیے معاذ اسپتال لے گئے۔ یہ نہ کہنا کہ اُس نے خودکشی کرنا چاہی تھی۔ اسپتال

سمنام نوٹ کر لو، اگر وہ چاہے گا تو سیدھا یہیں چلا آئے گا۔

اور پلیز جویریہ! تم حوصلہ رکھو، اگر اس طرح روئے جاؤ گی تو میں یہاں پریشان ہو جاؤں گا۔ فی الحال میں فوری طور پر تمہارے پاس آ بھی نہیں سکتا، جب تک فریال کو ہوش نہیں آ جاتا، مجھے یہاں رُکنا ہوگا۔ خود بھی تسلی رکھو اور میری ہمت بھی بڑھاؤ —— مجھے اس لمحے تمہاری ہمدردی اور سہارے کی اشد ضرورت ہے۔" خود معاذ اس وقت بڑے حوصلے اور ضبط سے کام لے رہا تھا۔ اُسے اپنے دل میں دراڑیں پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ جویریہ کی آواز سنتے ہی اُسے اپنا وہ وعدہ یاد آ گیا تھا، جو وہ فریال سے کر چکا تھا

○ ● ◆

وہ اسپتال کے برآمدے میں بنچ پر بیٹھا جویریہ اور فریال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

جویریہ —— اس کی محبوب شریکِ حیات، جس کو اس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا، جس کی ہنسی میں اس نے زندگی کا مفہوم پایا۔

اور دوسری طرف فریال —— جس نے خود اس سے بغیر کسی صلے، بغیر کسی طلب کے بے غرض محبت کی اور اب وہ اس کو اپنی ہنسی میں زندگی کے مفہوم سے آشنا کرانا چاہ رہا تھا۔

کیا وہ اس کے ساتھ اس طرح ہنس سکے گا کہ وہ اس کے وجود میں زندگی کی خوشی تلاش کرے؟

ہاں کیوں نہیں، میں نے فیصلہ سوچ سمجھ کر، دل کی رضامندی اور آمادگی سے کیا ہے۔

تو پھر یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھ رہا ہے؟ کیا اس دل سے جو جویریہ کی محبت میں دیوانہ ہے؟

جواب میں صرف خاموشی تھی۔

کیا خاموشی پچھتاوے کا مظہر ہے؟

نہیں، مجھے ہرگز کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ اٹل ہے اور میں اس پر قائم رہوں گا۔

جویریہ کو جب بتاؤ گے کہ تم نے اپنے وجود کو تقسیم کر دیا ہے تو جانتے ہو اس پر کیا گزرے گی؟

ہاں مجھے اندازہ ہے، مگر بہرحال یہ جویریہ کی اپنی خواہش بھی تھی۔

مگر تم اس کی خواہش کو انتہائی سختی سے رَد کر چکے تھے، اب کیا کہو گے کہ تمہارے اندر اچانک وہ کون سا احساس پیدا ہو گیا، جو تم نے فریال کو بھی وہی مقام دینے کا فیصلہ کر لیا، جو جویریہ کا ہے۔ جویریہ کی خواہش پر عمل کرنا اور بات تھی اور اسی سلسلے میں اپنی خواہش کے تحت فیصلہ کرنا ایک مختلف بات ہے۔ پہلی صورت میں جویریہ کا احساس ضرور زخمی ہوتا، مگر وہ یہ کہہ کر خود کو تسلی دے سکتی تھی کہ یہ تحریک تو خود اس نے شروع کی تھی، لیکن موجودہ صورت میں وہ شاید ٹوٹ پھوٹ جائے۔ یہ خوف اُسے زندگی سے دور لے جا سکتا ہے کہ تمہارے دل میں فریال کے لیے پیدا ہونے والا جذبہ کہیں اس کی محبتوں پر غالب نہ آ جائے۔

نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں چاہے فریال کے ساتھ آخری سانس تک بھی رہ لوں، مگر وہ اس مقام کو نہ چھو سکے گی، جو میری زندگی میں جویریہ کو حاصل ہے۔ اس دل پر تو اختیار جویریہ کو ہی ہے۔ ہاں مگر میں فریال کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ رہا جویریہ کو دکھ پہنچنے کا سوال تو یقیناً اُسے صدمہ ہوگا بہرحال وہ عورت ہے، مگر پھر بھی مجھے یقین ہے کہ وہ خود کو اس قربانی کے لیے تیار کرے گی، اور میں بھی اپنے دل میں اس کے لیے ہر لمحہ بڑھتی محبت سے اس کے حوصلوں کو زندہ رکھوں گا۔

"سر! آپ کی عزیزہ کو ہوش آ گیا ہے۔"

اُس کے دل و دماغ میں جنگ جاری تھی کہ نرس نے آ کر کہا۔

وہ چونک گیا۔ سارے خیالات ایک طرف جھٹک کر تیزی سے فریال کے کمرے کی طرف بڑھا۔ پھر دروازے پر پہنچ کر ایک دم ٹھٹک گیا اور اپنے دل کو ٹٹولا۔ اپنے ارادے اور فیصلے کی مضبوطی پر غور کیا پھر مطمئن ہو کر اندر داخل ہو گیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وہ کندھوں تک سفید چادر اوڑھے چپ چاپ بیٹی خالی خالی نگاہوں سے دیوار کی سمت دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرا زرد اور برسوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں ویرانی کا ڈیرا تھا۔

"کہیئے محترمہ! کیا حال ہیں آپ کے؟" معاذ اُس کے سامنے کی طرف آتا ہوا ہشاش بشاش لہجے میں بولا۔

اُس نے ویران نگاہیں معاذ پر ٹکائیں۔ پھر نہ جانے اُسے کیا کچھ یاد آ گیا۔ اُس کا دل بھر آیا اور بے اختیار آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

"بہت بے قدری کرتی ہیں آپ اپنے آنسوؤں کی، شاید آپ کو اندازہ نہیں کہ یہ کتنے قیمتی ہیں۔"

"جو خود بہت بے وقعت ہو، اُس کے آنسوؤں کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔" وہ بڑی مایوسی سے بولی۔

"اپنی اہمیت، اپنی وقعت اور قیمت کا اندازہ ہر اُس دل سے پوچھیے جو آپ کے لیے مخلص ہو۔" وہ ذومعنی انداز میں بولا۔

فریال کے دل کی دھڑکن لمحے بھر کو تیز ہوئی اور پھر ہلکی ہوئی۔

"بہت بہادر ہیں آپ فریال! پھر آخر آپ نے کیوں اتنی بزدلی کا ثبوت دیا؟" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

"جب اپنا پیارا زخمی ہو جائے، مان ٹوٹ کر بکھر جائے، عزت سربازار نیلام ہو جائے۔ پیروں تلے کی زمین بوجھ سہارنے سے انکار کر دے تو پھر یہی بزدلی نجات کا راستہ نظر آتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کی ہر قسم کی غلط فہمی دور کر دی ہے۔" معاذ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اُس کی خاموشی شاید اس بات کا اعتراف تھی کہ وہ واقعی شدید نوعیت کی غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ منفی راستے پر جانے والی اُس کی سوچ تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟" معاذ نے بات بدل دی۔

"بہتر ہوں۔" اُس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا اور چھت کو گھورنے لگی۔

"کیوں مرنے نہیں دیا آپ نے مجھے؟ کیا مل گیا آپ کو میری زندگی بچا کر؟"

"آپ۔" وہ برجستہ کہہ بیٹھا۔

فریال نے ذرا کی ذرا چہرا موڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھا۔

وہ پھر چھت کی طرف دیکھنے لگی۔

"جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں، وہ ناممکن ہے۔ چلتی پھرتی لاش کو اپنا کر آپ خود پر ظلم ہی کریں گے۔ بھلا کب تک مجھے موت سے بچائیں گے، وہ میرا سایہ بن چکی ہے۔" اُس کی آواز بھرا گئی۔

اُس کے لہجے پر جانے کیوں معاذ کا دل بے حد دکھی ہو گیا۔

وہ اُٹھ کر اُس کے بیڈ کے قریب آ گیا۔ "فریال اپنی سوچوں کو مثبت راستے پر ڈالیں۔ ذہن سے یہ منفی خیالات نکال دیں۔"

"یہ منفی خیالات نہیں، میری زندگی کی سچائی ہے۔" وہ حد درجے تلخی سے گویا ہوئی۔

"نہیں، سچائی صرف یہ ہے کہ اب میرے اور آپ کے درمیان فاصلوں کو مٹنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" اُس کا لہجہ اٹل اور پُرعزم تھا۔

"فریال! زندگی کی جانب آئیے۔ اس کے خوشگوار پہلوؤں کے بارے میں سوچیے۔ میں زندگی کے اس موڑ پر آپ کا منتظر ہوں جس کے بعد میری اور آپ کی راہیں ایک ہو جائیں گی۔"

فریال بالکل خاموش تھی، مگر اس کے چہرے پر ایک عزم واضح سا انکار تھا۔

معاذ کچھ دیر اس کے چہرے کی تحریر پڑھتا رہا پھر آہستگی سے بولا۔

"باقی باتیں پھر کبھی ہوں گی، کسی خوشگوار لمحے میں۔" اُس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "اس وقت مجھے اجازت دیں۔ جویریہ گھر میں اکیلی بہت پریشان ہو رہی ہو گی۔"

وہ اس وقت جویریہ کا نام اس کے سامنے لینا تو نہیں چاہتا تھا، مگر نادانستہ منہ سے نکل گیا۔ اُس نے سٹپٹا کر فریال کی طرف دیکھا۔

اُس کے چہرے پر کسی منفی تاثر کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ پُرسکون انداز میں اثبات میں سر ہلا رہی تھی، گویا کہہ رہی ہو "ہاں ضرور جائیے۔"

معاذ اُس کو خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ ابھی وہ کوریڈور طے کر کے دائیں ہاتھ مڑا ہی تھا، کہ اُس کو سامنے سے خرم آتا دکھائی دیا۔

"معاذ! فریال کیسی ہے، کیا ہو گیا تھا اُس کو؟" وہ اُس کے قریب آ کر سخت بے قراری سے بولا۔ پریشانی اُس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ آنکھوں میں نمی اُتری ہوئی تھی۔

"اب ٹھیک ہیں، تم ذرا میری بات سنو۔" معاذ نے پہلے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"نہیں، پہلے میں فریال سے مل لوں۔" وہ بہن کے لیے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"میں نے کہا ناں خرم اب وہ بالکل خیریت سے ہیں۔ تم یہاں آؤ ادھر بیٹھو۔" اُس نے دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں کی طرف اشارا کیا۔

خرم ناچار وہیں بیٹھ گیا۔

معاذ نے دھیرے دھیرے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔ وہ سانس روکے سنتا رہا۔

"خرم!" معاذ نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میری بات پر تمہارا کیا ردِعمل ہو گا، مگر بہرحال میں اُمید کرتا ہوں کہ تم انکار نہیں کرو گے۔"

خرم کا ذہن تو پہلے ہی معاذ کی باتیں سن کر ہچکولے کھا رہا تھا۔ اُس نے اُلجھی اُلجھی نگاہوں سے دیکھا۔

"میں تمہاری بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"معاذ!" اُس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اُس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

بہت سے لمحے دونوں کے درمیان خاموش گزر گئے۔

"مگر معاذ!" اُس نے کہنا چاہا۔

"یہی کہنا چاہتے ہو ناں کہ میں شادی شدہ ہوں،" معاذ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تو پھر اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"مگر جویریہ بھابی ــــ!"

"جویریہ کی تم فکر نہ کرو، جو کچھ ہو گا جویریہ کی اس میں رضا شامل ہو گی۔ دیکھو خرم! میں یہ بات کہنے میں قطعی عار محسوس نہیں کرتا کہ مجھے اپنی بیوی سے شدید محبت ہے اور پھر اس سلسلے میں وہ جو قربانی دے گی، وہ میری نگاہ میں کسی انتہائی بلندی تک لے جائے گی، مگر یہ بھی سچ ہے کہ فریال سے شادی میں اپنی رضا اور خوشی سے کرنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ میں فریال کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ خرم! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، تمہاری بہن کو کوئی دکھ نہیں دوں گا۔"

"معاذ!" وہ اُس سے لپٹ کر رونے لگا۔ "تم نے تو مجھے خرید لیا ہے۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔ فریال میری بہن ہے ہر لمحہ مجھ سے دور ہو رہی ہے۔ حالات نے مجھے بہن کے معاملے میں خود غرض بنا دیا ہے۔ میں اُسے خوش رکھنے کے لیے کوئی بھی ایسا قدم اُٹھا سکتا ہوں جس کا میں عام حالات میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے تمہاری پیش کش منظور ہے۔ تم ــــ بہت عظیم ہو معاذ اور جویریہ بھابی انسانیت کی معراج پر ہیں۔"

"حوصلہ رکھو خرم! انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" معاذ نے اُس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "خدا کرے جو کچھ بھی ہو وہ سب کے حق میں بہتر ہو۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

معاذ کا دل مطمئن، ذہن پرسکون تھا۔ اُسے کسی قسم کا کوئی پچھتاوا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔
پھر بھی نہ جانے کیوں اسی مطمئن دل کے کسی نامعلوم گوشے میں کوئی خلش اُبھر رہی تھی۔ کرب کا احساس بیدار ہو رہا تھا، جو روح کے خالی پن کا احساس دلا رہا تھا۔
اُسے اس خلش کا مفہوم سمجھ میں آ رہا تھا۔
اس کرب کا عنوان جویریہ کی ذات تھی، جو ساری بات سے قطعی بے خبر تھی۔

***

وہ شام کا وقت تھا۔ سب لوگ لان میں بیٹھے تھے۔ سیّد صاحب بھی وہیں موجود تھے۔
نہال کو پناہ گاہ سے نکلے چار دن ہو چکے تھے۔ اس کے بعد سے وہ اپنے دادا سے سخت خفا تھے۔ کھلّم کھلّا تو احتجاج نہیں کر سکتے تھے کہ اُن کے سامنے سر اُٹھانے کی کسی کو جرأت نہ تھی، مگر ڈھکے چھپے انداز میں گریز اظہار کر رہے تھے۔ سیّد صاحب کوئی بات کرتے تو جواب دے دیتے، ورنہ خود سے کلام نہیں کر رہے تھے۔
ان لوگوں کے درمیان عجیب تناؤ کی فضا قائم ہو گئی تھی، جسے سیّد صاحب بخوبی سمجھ رہے تھے۔
اس شام بھی وہ بظاہر اطمینان سے بیٹھے چائے پی رہے تھے، مگر دلوں کو ایک مستقل دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اب کچھ ہی دیر میں نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔
کوئی ایک گھنٹہ قبل نہال کا فون آیا تھا کہ ناناجان کی بیٹی اپنے والد سے ملنے آ رہی ہیں — عمر اُن کے ساتھ ہوگا۔
شہیر نے اُسے بہت سمجھایا کہ ابھی فی الحال اتنی جلدی یہ قدم نہیں اُٹھانا چاہیے۔ گھر کی فضا پہلے ہی سخت کشیدہ ہے۔ نہ جانے دادا جان کا کیا ردِّعمل ہو۔ کہیں قیامت سے پہلے نہ قیامت کھڑی کر دیں، مگر نہال نے اس کی بات سنی اَن سنی کر دی اور اُسے بتایا کہ وہ لوگ پناہ گاہ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔
شہیر کے پاس سر پیٹ لینے کے علاوہ اور کوئی چارا نہ تھا۔ اُس نے جھلّا کر فون بند کر دیا۔
اب وہ سب لوگ منتظر تھے۔ بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ دل میں دوسرے اندیشوں کے علاوہ یہ اشتیاق بھی موجود تھا کہ پتا نہیں دادا جان کی بیٹی کیسی ہوں گی۔ نہال نے بتایا تھا کہ ان کی دو بیٹیاں بھی ہیں۔
”ہیں!“ زیبا نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے رجحان کا اظہار کیا تھا۔
”کیسی ہیں، پیاری پیاری ہیں؟“ خمار کو اُنہیں دیکھنے کا شوق ہُوا۔
”خود دیکھ لینا۔“ نہال نے بُرا سا منہ بنا کر جواب دیا تھا۔
”مجھ سے عمر میں بڑی تو نہیں ہیں؟“ جانے کیا سوچ کر ذیشان نے تشویش سے پوچھا۔
”شٹ اَپ!“ نہال نے اُسے گھورا۔ ”تم سے تو وہ یقیناً بڑی ہی — ہوں گی۔ یوں بھی اُن میں سے ایک عمر کی بیوی ہے۔“
”اچھا!“ سخت مایوس ہو کر اس نے گردن ایک طرف ڈال دی تھی۔
شہیر اس وقت زیادہ پریشان تھا۔ وہ ان عوامل پر غور کر رہا تھا کہ اس غیر معمولی صورتِ حال کو کیسے کنٹرول کرے۔
شیراز بھی نہیں تھا۔ وہ پہر سے جو غائب ہوا تھا تو اب تک نہیں لوٹا تھا۔ وہ ہوتا تو مجھے کچھ ڈھارس تو ہوتی، خیر جاذب تو ہے۔ اُس نے ایک اچٹتی نگاہ جاذب پر ڈالی جو اخبار میں منہ دیے ہوئے تھا۔
اُسی وقت چوکیدار نے مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی۔ ان سب کے دل لمحے بھر کو واقعی رُک گئے۔
ایک سہمی ہوئی نگاہ سیّد صاحب پر ڈالی۔ وہ پوچھ رہے تھے۔

”کون آیا ہے؟“
”تم یہیں لے آؤ۔“ شہیر نے اُسے اشارا کیا۔

وہ سب لوگ پُرتجسس نظروں سے اُس سمت دیکھنے لگے۔ ذرا سی دیر میں ایک باوقار خاتون آتی دکھائی دیں۔ ان کے پیچھے دو لڑکیاں اور ساتھ میں عمر تھا۔
سیّد صاحب ایک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ اُن کے ماتھے پر لکیریں نمودار ہو گئیں۔ وہ خاتون لمحہ بہ لمحہ اُن کے نزدیک آ رہی تھیں۔
سیّد صاحب کو یوں لگا جیسے دل آرا ان کے قریب آ رہی ہو۔
”او بابو صاحب! آپ نے ریشم کو دیکھا ہے؟“
”ارے بابو صاحب! آپ بھی بہت بھولے معلوم ہوتے ہو۔ ارے ریشم تو میری بکری کا نام ہے۔“
”کسی لڑکی کے ہاتھ میں خنجر ہو تو کیا تم شہر والے اسے دلیری کا خطاب دے دیتے ہو؟“
یہ کیسی آندھیاں چل رہی تھیں کہ ہر طرف یادوں کے پتّے اُڑ رہے تھے۔
اس بھولی اور معصوم لڑکی کی تصویر ان کے ذہن کے پردے پر ایک دم ہی نمایاں ہو گئی تھی۔
جس نے ان کی محبت میں آنکھیں بند کر کے کھائی میں چھلانگ لگائی تھی۔
جس نے اس یقین کے ساتھ آگ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ اس کا ہاتھ نہیں جلے گا۔
جو سیّد وجاہت کو پا کر سمجھ بیٹھی تھی کہ اُس نے آسمان چھو لیا ہے۔
چاند، سورج، ستاروں کو پیروں تلے روند ڈالا ہے۔
شب و روز خوشیوں کا جھولا جھولتے بسر ہو رہے تھے اور پھر وہ دن جب دل آرا نے جھجکتے ہوئے انہیں ایک نوید سنائی تھی۔
”کتنا خوبصورت اور انوکھا احساس ہے یہ۔“ اُس نے شرماتے ہوئے کہا۔
وہ ایک بڑے سے گول پتھر پر بیٹھی تھی۔ سیّد صاحب اُس کے قریب ہی کھڑے تھے۔ اُس کی بات پر گم صُم رہ گئے۔
”آپ چپ کیوں ہو گئے؟ کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی، کوئی آپ کو بھی ’بابا‘ کہے گا۔“ اُسے سیّد صاحب کی طرف سے حسبِ توقع ردِّعمل نہ پا کر مایوسی سی ہوئی۔
مجھے ’ڈیڈی‘ کہنے والی چار آوازیں پہلے ہی دنیا میں موجود ہیں۔ وہ دیکھ تو اُسی کی طرف رہے تھے، مگر جانے کس خیال میں گم تھے۔
”کیا بات ہے؟“ اُسے اب سیّد صاحب کی اس گہری خاموشی سے سخت اُلجھن ہوئی۔
”ہاں!“ وہ چونک سے گئے۔ ”کچھ نہیں، تم نے بات ہی ایسی کی ہے کہ مجھے ایک لمحے کو یقین ہی نہیں آیا۔“ اُنہوں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اس کے ساتھ ہی پتھر پر بیٹھ گئے۔
”کیوں یقین نہ آنے والی کیا بات ہے، یہ سب کوئی انوکھا تو نہیں۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔“ وہ نظریں جھکا کر شرمیلے انداز میں بولی۔
”مگر ہمارے لیے تو یہ احساس بالکل نیا ہے۔“ اُنہوں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بظاہر تو اُس سے گفتگو کر رہے تھے، مگر سخت اُلجھن میں گرفتار ذہن تیزی سے گردش کر رہا تھا۔
”آپ کو بیٹے اچھے لگتے ہیں یا بیٹیاں؟“ وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔
”بیٹیاں۔“
”مجھے بھی، اللہ ہمیں پہلے بیٹی ہی دے دے۔ میں اس کا نام زرتاج رکھوں گی۔ مجھے زرتاج نام بہت پسند ہے۔“ وہ خوش کُن خیالات کے سہارے خوشیوں کے جال بُن رہی تھی۔
”اچھا رکھ لینا۔“ وہ بات ختم کرنے کی غرض سے کہہ کر اس کے پاس سے اُٹھ گئے۔
وہ ہرگز ہرگز دل آرا سے بچّہ نہیں چاہتے تھے۔ اپنے مسائل میں اضافہ نہیں چاہتے تھے۔ اس بچّے کے پیدا ہونے کے بعد ان کے لیے ہزار اُلجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ مگر نہ جانے کیوں اُنہیں دل آرا سے یہ بات کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اس بچّے کو دنیا میں آنے سے پہلے روک دے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پھر اس کے بعد انہوں نے وہ قدم اٹھا لیا جو انہیں اس مسئلے کا حل نظر آیا۔ اگرچہ کہ وہ یہ سب کچھ کر کے دل سے خوش تو نہ تھے کہ شاید دل آرا سے انہیں واقعی محبت ہو گئی تھی، مگر حالات اس بات کے متقاضی ہو گئے کہ وہ چپ چاپ دل آرا کی زندگی سے نکل جائیں۔

وہ واپس پناہ گاہ چلے آئے۔ دل آرا کی محبت کو دل کے ایک کونے میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ وقت گزرتا ہی رہا اور تمام پچھلی باتوں پر گرد پڑتی رہی۔ یہاں تک کہ دل آرا کی یاد بھی دھندلا گئیں۔

پھر جب ان کے ہاں ثاقب پیدا ہوا تو لمحے بھر کو ان کے ذہن میں دل آرا کا تصور یوں آیا جیسے بجلی کوندی ہو۔

نہ جانے اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہو گا یا بیٹی۔ انہوں نے پل بھر کو سوچا تھا۔

اور آج اس وجود کو جس کے دنیا میں آنے کی صرف خبر ہی سنی تھی، ایک ادھیڑ عمر کی عورت کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ اس کا ایک ایک نقش بتا رہا تھا کہ وہ ان کی اپنی بیٹی ہے۔

کیسے باپ تھے وہ جو اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اس کو چھوڑ آئے تھے۔

زندہ ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے مر گئے۔ اس کو باپ کی محبت نہ دی۔ اپنی شفقت سے اسے محروم رکھا۔ کبھی اس کو گود میں نہ لیا۔ اس کی معصوم ہنسی کے جواب میں اسے پیار نہ کیا۔ کبھی اس کو کھلونے لا کر نہیں دیے۔ اس سے اپنے لیے "بابا" نہ کہلوایا۔ کبھی اس کے تعلیمی فارم، اسناد پر باپ کے خانے نہیں کیے۔

اس کی شادی پر اسے دعا نہ دی۔

کیسے باپ تھے وہ آخر؟

انہیں اس کی ضرورت نہ تھی، مگر اسے تو باپ چاہیے تھا۔

اور پھر خود انہوں نے کون سا اولاد کا سکھ دیکھ لیا تھا۔ اولاد کی جوان موت روح کا شگاف ہی تھی۔ وہ تو قدرت نے پوتوں پوتیوں کے لیے زندہ رکھا تھا، ورنہ ایسے جان لیوا دکھ کے بعد زندگی کا کوئی تصور نہیں تھا۔

وہ ان کی یادوں کے سہارے تو جی رہے تھے، مگر اس کے باوجود کبھی اس ننھے وجود کا خیال نہیں آیا، جسے آنکھ کھول کر ایک باعزت اور معاشرے میں اعلا مقام رکھنے والے باپ کی گود نہیں دنیا کی ٹھوکریں ملی تھیں۔

انہوں نے تو پلٹ کر سوچا بھی نہ تھا کہ وہ ان کے وجود کا حصہ، جو شفاف پانیوں کا کنول ہے، کھلا بھی ہے یا مرجھا چکا ہے۔

آج ان کے وجود کا وہی حصہ ان کے منہ سے لفظ "بیٹی" سننے کے لیے ان کے پاس آیا تھا۔ اب جب کہ خود اس کی بھی جوان بیٹیاں تھیں۔

ان کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ دل پر لرزہ طاری تھا۔ جسم و جان میں ابال اٹھ رہے تھے۔ وہ چھڑی کے سہارے بمشکل اپنے پیروں پر کھڑے تھے۔

انہیں شہیر کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"دادا جان! یہ مسز زرتاج نمود ہیں اور یہ ——!" وہ نہ جانے اور کیا کیا کہہ رہا تھا، مگر ان کے ذہن میں ایک ہی لفظ بازگشت کر رہا تھا۔

"زرتاج ——!"

سید صاحب نے دھندلائی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ بے قرار نگاہوں سے انہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"بیٹھو!" ان کی آواز میں لرزش تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے کرسی کی طرف بھی اشارا کیا۔ وہ خود پر قابو پانے میں ناکام ہو رہے تھے۔

کچھ ہچکچاہٹ تھی، کچھ تذبذب —— قدم بڑھنا بھی چاہ رہے تھے اور رک بھی رہے تھے۔ جانے کیسی جھجک تھی جو دیوار بن رہی تھی۔ اور وہ کون سا جذبہ تھا جو بے اختیار آگے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"بابا!" زرتاج دو قدم آگے بڑھیں۔ "کیا اب بھی سینے سے نہیں لگائیں گے؟ باپ کی گود میں بیٹھ کر باپ کے ہاتھ سے کھانا کھانے والے دن تو اب دور چلے گئے۔ وہ آرزو تو حسرت بن گئی مگر سینے سے لگ کر سارے دکھ آنسوؤں میں بہا دینے کی خواہش تو موجود ہے۔ کیا یہ بھی حسرت بن جائے گی؟" وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر بے تابی کی کیفیت موجود تھی۔

یہ رشتے فطری ہوتے ہیں۔ یہ زنجیریں تو قدرتی ہوتی ہیں۔ انسان نہ ان رشتوں کو نظر انداز کر سکتا ہے اور نہ یہ زنجیریں کاٹ سکتا ہے۔ ان کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال نہیں سکتا۔ اپنی ضرورت، وقت اور حالات کے تابع نہیں کر سکتا کہ انسان ردوبدل کا مجاز نہیں ہے۔

ان رشتوں کی بنیاد قدرت نے رکھی ہے۔ ان میں محبت کا جذبہ قدرتی طور پر موجود ہوتا ہے۔ ان رشتوں کا عنوان فطرت ہے اور فطرت سے لڑا نہیں جا سکتا، اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

"بیٹی!" وہ ضبط نہ کر سکے۔ اپنا ہاتھ ان کے سر پر رکھ دیا۔

زرتاج بے اختیار آگے بڑھیں اور ان کے سینے سے لگ گئیں۔

"بابا —— بابا! میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو مجھے خود سے محروم کر دیا۔ کیا قصور تھا جو مجھے اور میری ماں کو چھوڑ دیا؟ مجھے کیا دیا آپ نے، صرف اپنا نام؟ اپنی پہچان کیوں نہیں دی۔ بہت دکھ اٹھائے ہیں میں نے زندگی میں۔ ایک دن جیتی تھی اور ایک دن مرتی تھی۔ بابا! بہت شکوے ہیں آپ سے، اب تو تلافی کا وقت بھی گزر چکا۔ مجھے وہ گزرا وقت چاہیے، مجھے وہ وقت لوٹا دیں، میرا بچپن کہیں سے لے آئیں، مجھے میرا باپ لا دیں"

وہ رو رو کر نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ ایک مجرمانہ سی چپ سید صاحب کے ہونٹوں پر تھی۔ انہیں اپنے سینے سے لگائے دھیرے دھیرے ان کا شانہ تھپک رہے تھے۔ وہ آنکھیں جن سے زیادہ تر شعلے نکلتے تھے ان میں نمی اتر آئی تھی۔

وہ سب بالکل خاموش بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ دل اس وقت دو مختلف کیفیات سے دوچار تھا۔ ایک طرف سید صاحب کی زیادتیوں کے سبب شکوے شکایت، ناراضگی تھی تو دوسری طرف اس وقت ان کی حالت دیکھ کر کچھ ہمدردی کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔

رو رو کر زرتاج کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ یہ دیکھ کر جواہر اپنی جگہ سے اٹھی۔ دھیرے سے انہیں سید صاحب سے علیحدہ کر کے بہت محبت سے خود سے لگا لیا۔ رخسار پر پیار کر کے جیسے انہیں تسلی دی۔

"آنٹی پلیز! آپ آرام سے یہاں تشریف رکھیں۔" اس نے انہیں آہستگی سے کرسی پر بٹھا دیا اور پانی کا گلاس ان کے ہاتھ میں دیا۔

مڑ کر ایک نظر سید صاحب پر ڈالی۔ ان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر تیزی سے ان کے پاس آئی۔

"دادا جان! خود کو سنبھالیں پلیز!" اس نے ان کی کرسی گھسیٹ کر زرتاج کی کرسی کے برابر رکھ دی اور دونوں بازوؤں سے انہیں تھام کر کرسی پر بٹھا دیا۔

اس وقت سید صاحب اپنے پوتے پوتیوں سے نظر نہیں ملا رہے تھے۔ ان کا بھرم کھل گیا تھا کوئی مجرمانہ احساس تھا جو چہرے پر شرمندگی بن کر چھا گیا تھا، جسے وہ چاہنے کے باوجود چھپا نہیں پا رہے تھے۔

نہال جس جرم کی پاداش میں "پناہ گاہ" سے نکالا گیا تھا، وہ جرم، جرم نہیں رہا تھا۔ بیٹی کو سامنے دیکھ کر باپ کی محبت جوش مار گئی تھی، بے اختیار ہو گئی تھی۔ سید صاحب یوں پگھل گئے تھے، گویا کبھی پتھر تھے ہی نہیں، ہمیشہ کے موم تھے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

مگر نہال تو معتوب ٹھہرایا ہی جا چکا تھا اور سزا بھی بھگت رہا تھا۔ وہ سب لوگ اس بات کو بُری طرح محسوس کر رہے تھے، مگر موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی احتجاج یا منفی ردِعمل ظاہر کرتے۔

"دادا جان! آپ ہمارا تعارف نہیں کرائیں گے؟" خمار ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے خوشگوار سے لہجے میں بولی۔

اُس کے لہجے اور اُس کے انداز پر سید صاحب نے اپنا وجود اور بھی جھکتا محسوس کیا۔

دھیمے لہجے میں اُنہوں نے زرتاج سے ان سب کا فرداً فرداً تعارف کرایا۔ زرتاج نے بھی اپنی بیٹیوں سے اُنہیں ملوایا۔

سید صاحب نے دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔

"بابا! آپ بچوں کو یہ بھی تو بتائیے کہ میں ان کی کون ہوں؟"

"آپ ہماری پھوپی جان ہیں۔" جواہر جلدی سے خوشدلی سے بولی۔ جانے کیوں وہ اس وقت سید صاحب کی ڈھال بنی ہوئی تھی۔

سید صاحب کو یوں لگا جیسے جواہر ان کے پیچھے مضبوط دیوار کی مانند ہے۔ دوسری جانب جواہر کا رویہ شہیر، جاذب وغیرہ کی سمجھ سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ سب لوگ اس وقت جواہر کا ذہن پڑھنے میں ناکام ہو رہے تھے۔

"نہال کہاں ہے، وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ اُس نے تو فون پر کہا تھا کہ میں یہیں ملوں گا۔"

کچھ دیر قبل صورتِ حال اس نوعیت کی تھی کہ نہال، زرتاج کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ انہیں خاصی دیر میں اس کا خیال آیا۔

"نہال کو کچھ ضروری کام پڑ گیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ دیر سے پہنچے گا۔ شاید آنے ہی والا ہو گا۔" جاذب نے مین گیٹ کی طرف جاتے راستے کو یوں دیکھا جیسے واقعی نہال آنے ہی والا ہو۔

"بابا!" زرتاج نے سید صاحب کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "میرے تو رویں رویں سے نہال کے لیے دُعا نکلتی ہے۔ آپ کے گھر میں تو اللہ نے رحمت کا فرشتہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ نہ ہوتا تو آپ مجھے کیسے ملتے۔"

اُن کے لہجے میں نہال کے لیے بڑی شکرگزاری اور احسان مندی تھی۔

سید صاحب ان کی بات کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گئے۔ انہیں اپنے پوتے پوتیوں کی نگاہیں آر پار گھستی محسوس ہو رہی تھیں۔

وہ بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ زرتاج، جواہر وغیرہ سب ان کے متعلق گفتگو کر رہی تھیں۔ ان سب کا رویہ زرتاج کے ساتھ تقریباً مثبت ہی تھا۔ اپنے کسی عمل سے وہ لوگ اپنے اندرونی جذبات کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔

جواہر بڑے مناسب انداز میں زرتاج کی باتوں کے جواب دے رہی تھی۔ خمار اور زیبا کا خوش اخلاقی سے گھل مل کر بات کرنے کا انداز رانیہ اور تانیہ کے لیے بے تکلفی کے راستے ہموار کر رہا تھا۔

سید صاحب کو یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے پوتے، پوتیاں، زرتاج سے اپنائیت اور خلوص کا اظہار نہیں کر رہے تھے، بلکہ خود ان کے اوپر سنگباری کر رہے تھے، ان کی طرف ملامت کے تیر چلا رہے تھے۔ اپنی طنزیہ نگاہوں سے ان کے دل کو چھید رہے تھے۔

اُن کے لیے وہاں بیٹھنا سخت دوبھر ہو رہا تھا۔ عجیب سی بے بسی تھی۔ وہ خود کو پاتال میں اترتا محسوس کر رہے تھے۔

"بھئی تم لوگ آنٹی سے باتیں کرو، میں رات کے کھانے کا انتظام کرواتی ہوں۔" جواہر کی آواز پر انہوں نے نظر اُٹھا کر اُسے دیکھا جو یہ کہہ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"دادا جان! اگر آپ طبیعت بہتر محسوس نہیں کر رہے تو آپ اپنے کمرے میں چل کر آرام کر لیجیے۔ ہم آنٹی کا خیال رکھیں گے۔" وہ تو جیسے سید صاحب کے ذہن کا ایک ایک لفظ پڑھ رہی تھی۔ ان کے دل

ایک ایک کیفیت نوٹ کر رہی تھی۔

انہوں نے سر کے اشارے سے جیسے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ چھڑی پر زور ڈالتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھے ہی تھے کہ زرتاج بول پڑیں۔

"بابا! میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" وہ بھی اُٹھ کر ان کے پیچھے اندر چلی گئیں۔

بظاہر تو وہ لوگ عمر، رانیہ اور تانیہ سے باتیں کر رہے تھے، لیکن ان کے ذہن سخت اُلجھے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ ذہنی طور پر چکرایا ہوا تھا۔ اس انہونی سی صورتِ حال کو ان کا دل قبول نہیں کر رہا تھا۔ ایک طرف تو اپنے دادا کی بیٹی کا ایک دم وجود میں اچانک ہی آ جانا انہیں ہضم نہیں ہو رہا تھا، دوسری طرف نہال کے ساتھ سید صاحب کا انتہائی رویہ اختیار کرنے کے بعد سید صاحب کا یلٹی کے مانے یوں پانی بن جانا بھی ان کی سمجھ سے باہر ہو گیا تھا۔ نہال کے ساتھ جو انہوں نے طرزِ عمل اختیار کیا تھا، اس لحاظ سے تو وہ کسی اور ہی صورتِ حال کی توقع کر رہے تھے مگر یہ!

بہرحال وہ اس وقت اپنے اُلجھے ذہنوں اور منتشر خیالات کو قابو کر کے فرائض میزبانی احسن طریقے سے نبھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اپنے کسی انداز سے وہ اپنے مہمانوں کو ایسا کوئی تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ جس سے اندازہ ہو کہ ان کے بظاہر پُرسکون چہرے درحقیقت کتنے طوفان چھپائے بیٹھے ہیں۔

"تانیہ آئیے، میں آپ کو اپنا گھر دکھاؤں۔" زیبا نے تانیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی رانیہ کی طرف دیکھ کر نگاہ کے اشارے سے اسے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

وہ مسکراتی ہوئی تانیہ کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ ذیشان تم بھی آ جاؤ۔" وہ ذیشان کی طرف مڑی۔

ذیشان نے جو گھاس پر نظریں جمائے بالکل خاموش بیٹھا جانے کس سوچ میں مگن تھا کہ چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ منتظر نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"چلو۔" وہ ایک گہرا سانس لے کر اُٹھا۔ اور اُن کے پیچھے چل دیا۔

زیبا اُن کو اپنا گھر دکھا کر ٹیرس پر لے آئی۔ ریلنگ سے ٹیک لگائے۔ وہ چاروں ایک دوسرے کا تاریخ و جغرافیائی حالات معلوم کرنے لگے۔ ان کے درمیان جھجک کا پردہ چاک ہونے لگا تھا۔ قدرے بے تکلفی سی فضا میں وہ لوگ ہلکی پھلکی باتیں کر رہے تھے۔

"زیبا بی بی!" ریشماں نے پیچھے سے آواز دی تو وہ پلٹی۔

"کیا ہے؟"

"آپ سب کو خمار بی بی بلا رہی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کھانے والے کمرے میں آ جائیں۔" وہ خمار کا پیغام پہنچا ہی رہی تھی کہ خمار بھی پیچھے سے چلی آئی۔

"آؤ بھئی کھانا میز پر تم سب کا انتظار کر رہا ہے۔"

"شیراز بھائی نہیں آئے ابھی تک؟" ذیشان نے پوچھا۔

"آ گئے ہیں، میں نے اُن کی گاڑی ڈرائیوے پر آتے دیکھی ہے۔"

وہ سب لوگ ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے تو سید صاحب اور زرتاج کو پہلے سے وہاں بیٹھا پایا۔ میز پر پُرتکلف کھانا موجود تھا، جس سے اشتہا انگیز خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں۔

"تم نے شیراز سے کہہ دیا کہ وہ یہیں آ جائے۔" خمار نے خمار سے کہا۔

"ہاں، میں نے ریشماں کو اُن کے کمرے میں بھیجا ہے۔"

"شیراز آ گیا ہے کیا؟" سید صاحب کو شیراز کا سامنا کرنا اپنا ایک اور کڑا امتحان نظر آیا۔

"جی ہاں۔" خمار نے ایک نظر انہیں دیکھا پھر کمرے کے اندر داخل ہوتی ریشماں کو اشارہ کیا کہ وہ زرتاج کے پاس جا کر انہیں کھانا پیش کرے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اسی لمحے ہر بات سے بے خبر شیراز اپنی آستینیں فولڈ کرتا ہوا اندر داخل ہوا پھر ایک دم ہی ٹھٹک گیا۔ اپنے دادا کے برابر میں ایک اجنبی خاتون کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں لمحے بھر کو حیرت در آئی۔

"آؤ شیراز۔" شہیر نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"یہ شیراز ہے، جواہر کا بھائی۔" سید صاحب نے زرتاج سے کہا۔

"اور شیراز بھائی! یہ ہماری پھوپی ہیں۔" جواہر تو جیسے سید صاحب کی مکمل حفاظت کر رہی تھی۔

ان سب کی وہاں ایک ساتھ موجودگی، جواہر کا پرسکون چہرا و لہجہ، قدرے بے تکلف سا ماحول، میز پر چنے ہوئے انواع و اقسام کے کھانے۔

شیراز کی تو عقل حیران پریشان رہ گئی۔

یسی پیچیدہ، گمبھیر اور پریشان کن صورتِ حال جس نے ان کی چولوں سمیت پناہ گاہ کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور جس کے سبب نہال کو گھر چھوڑنا پڑ گیا تھا، اتنی جلدی اس خوشگوار نہج تک پہنچنے کے لیے کن کن مراحل سے گزری۔ وہ فوراً سے پیشتر جان لینا چاہتا تھا۔ اس نے دائیں طرف بیٹھے شہیر کو دیکھا۔

اسی وقت اسے اپنے بازو پر جواہر کے ہاتھ کا قدرے سخت سا دباؤ محسوس ہوا۔ اس کا خاموش پیغام سمجھ کر وہ تیزی سے زرتاج کی طرف بڑھا۔

"آداب!" وہ مؤدب سے انداز میں ان کے آگے جھکا۔

"جیتے رہو۔" انہوں نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ایک نظر سید صاحب کے چہرے پر ڈالتا ہوا وہ زیبا کے برابر خالی کرسی پر جا بیٹھا۔

کھانے سے فراغت کے بعد زرتاج نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔

"بیٹی! یہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے۔" پوتے، پوتیوں کی موجودگی میں سید صاحب نے اپنی آواز بلند نہ ہونے دی۔

"نہیں بابا! یہ تو آپ کا گھر ہے۔ بیٹیاں اپنے ہی گھروں میں اچھی لگتی ہیں۔ آپ جب مجھے بلائیں گے، میں ضرور آیا کروں گی۔" پھر قدرے توقف کے بعد دوبارہ بولیں۔

"آپ بیٹی کے ہاں کب آئیں گے؟"

"جب تم بلاؤ گی۔" وہ بڑی محبت سے مسکرائے۔ زرتاج کو دیکھ کر انہیں اپنے جسم و جاں میں ایک سکون سا اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

"بچیوں کو رہنے کے واسطے بھیج دیا کرنا۔" انہوں نے رانیہ و عزیزہ کی طرف دیکھ کر اشارا کیا۔

"جی ضرور۔ عمر کے ساتھ بھیج دیا کروں گی یا نہال سے کہوں گی، وہ تو آتا جاتا ہی رہتا ہے میرے ہاں۔"

نہال کے نام پر سب نے غیر ارادی طور پر سید صاحب کو دیکھا۔ ان کا چہرا لمحہ بھر کو تاریک ہو گیا تھا۔

"میں ڈرائیور کو بھیج دیا کروں گا۔"

زرتاج انہیں خدا حافظ کہہ کر اٹھ گئیں۔ سید صاحب بیٹی کو چھوڑنے گیٹ تک گئے۔ گاڑی کو دور تک جاتے دیکھتے رہے پھر پلٹ کر آئے تو سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ان کے پوتے پوتیوں کے چہرے پر ان گنت سوال لکھے تھے۔ اور وہ ان کے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتے تھے یا شاید ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

رات صبح میں ڈھل جانے کے لیے لمحہ لمحہ کر کے گزر رہی تھی۔ کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ دونوں اپنی سوچوں میں گم تھے۔

"جویریہ!" معاذ کی آواز نے سکوت توڑا۔

"جی!" وہ چونک پڑی۔

"کوئی بات کرو ناں، اتنی خاموش کیوں ہو؟ کیا سوچ رہی تھیں؟" اسے اپنی سوچوں اور اس کی خاموشی سے

شت ہونے لگی۔

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے معاذ کی جانب کروٹ بدل لی۔

"جویریہ!" وہ کافی دیر چپ رہنے کے بعد بولا۔ "میں کچھ دنوں سے تم سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا۔" معاذ کا لہجہ تذبذب کا شکار لگ رہا تھا۔

"ایسی کیا بات ہے جو آپ مجھ سے کہنے میں جھجک محسوس کر رہے ہیں۔" وہ قدرے حیرانی سے بولی۔

معاذ نے ہاتھ بڑھا کر جویریہ کو خود سے قریب کر لیا۔

"میں تم سے جو بھی کہوں گا مگر تم صرف ایک بات یاد رکھنا۔ میں تم سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی پہلے کرتا تھا۔ تمہاری محبت میں میں اتنا آگے بڑھ چکا ہوں کہ عشق کی حدوں کو چھونے لگا ہوں۔ میں تم کو ہمیشہ ایسے ہی چاہوں گا۔ اور آج کے بعد تو تم میری نگاہ میں اور بھی بلند تر ہو جاؤ گی۔ میں تمہارا مقروض ہو جاؤں گا۔"

جویریہ کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔

(یہ کس بات کی تمہید باندھی جا رہی ہے۔)

معاذ نے جویریہ کے گرد بازو کے حلقے کو اور بھی تنگ کر دیا۔ اور بڑا بوجھل سا سانس فضا کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"میری بات سن کر خواہ تم کچھ بھی کہو مگر میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ مگر یاد رکھنا تم اگر ٹوٹ گئیں تو تمہارا معاذ تم سے پہلے بکھر جائے گا۔ کیونکہ تم ہی میرا سہارا ہو۔ میرا حوصلہ، میری مضبوطی ہو۔ میرا سب کچھ تم ہو۔"

جویریہ نے بے حد غور سے اسے دیکھا۔ وہ انتہائی سخت بے چین و مضطرب، ذہنی طور پر بے حد منتشر لگ رہا تھا۔ تفکر اس کے ایک ایک انداز سے عیاں تھا۔

"کیا بات ہے معاذ!" اگرچہ خود اس کے دل نے اضطرابی کروٹیں لینا شروع کر دی تھیں۔ اس کے باوجود اس نے اپنا لہجہ پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے محبت بھرے انداز میں کہا۔

ساتھ ہی اپنا نازک سا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔ نہ جانے خود کو سہارا دیا یا اسے حوصلہ دیا۔

"میں فریال سے شادی کر رہا ہوں۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم چپ کی چپ رہ گئی۔ جیسے قوتِ گویائی ہی سلب ہو گئی ہو۔

لمحہ بھر کو اسے یوں لگا جیسے معاذ کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ تعلق کی جس ڈور سے وہ دونوں بندھے ہوئے تھے اس کی گرہ کھل گئی ہو۔

اس کی نگاہیں معاذ کے چہرے پر منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔

"جویریہ!" اسے معاذ کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ شاید۔ افق کے اس پار سے۔

اس پر تو جیسے نزع کا عالم طاری تھا۔ زندگی وہم بن گئی تھی اور موت کا گمان تھا۔ کیسی جان لیوا گھڑی تھی۔

مگر نہیں۔

یہی تو لمحہ تھا کہ اسے اپنے حوصلوں کی مضبوطی ثابت کرنا تھی۔ پل صراط پر سے گزرنا تھا۔

"یہ تو خوشی کی بات ہے معاذ!" اس نے اپنی ساری قوت حوصلوں کو مجتمع کرنے میں صرف کر دی۔

"جویریہ!" معاذ کے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس نے بے یقین نگاہوں سے اس موم کی گڑیا کو دیکھا جو خود کو چٹان ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"میں خود بھی تو یہی چاہتی تھی۔" اسے اپنی آواز کی لرزش اور لہجے کے کھوکھلے پن کا احساس ہو رہا تھا۔

(یہ میری آواز کیوں لرز رہی ہے۔ میرا لہجہ کیوں کھوکھلا ہو رہا ہے۔ اے اللہ! اس وقت میرا بھرم رکھ لے مجھے اس لمحے ٹوٹنے سے بچا لے۔)

معاذ نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں تلے دبائے بے حد آزردہ اور پریشان کن نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" وہ نہیں چاہتی تھی کہ معاذ کی نگاہیں اس کے اندر تک جھانک آئیں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اور معاذ کو اس کے وجود کے اُڑتے پرخچے نظر آ جائیں۔

"معاذ!" اس نے پیار بھرے لہجے میں اسے پکارا، دوسرے معنوں میں اپنے اندر کی چیخیں دبانے کی کوشش کی۔

"خدا کے واسطے جویریہ۔ بس کرو۔ اتنا ضبط مت کرو کہ میرا ضبط جواب دے جائے۔" وہ بُری طرح چیخ گیا۔

"کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"جو کچھ تمہارے دل میں ہے وہ کہہ دو۔ جو دکھ تمہیں پہنچا ہے اس کا بوجھ مجھے دے دو۔ مت خود پر جبر کرو۔ رونا آئے تو رو لو۔ مجھے تمہاری اس استقامت اور حوصلے سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟ میں کیوں روؤں گی بھلا؟ آپ کے ارادے میں تو میری رضا پہلے سے شامل تھی۔ پھر مجھے بھلا کیوں دکھ پہنچے گا؟"

"نہیں جویریہ، تم کچھ بھی کہو۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اس عمل کی قیمت تمہارے جذبات، تمہارے ارمان تمہاری خوشیاں ہیں۔ یہ احساس میرے دل کو چیر رہا ہے کہ میرے اس عمل سے تمہیں کتنا ناقابلِ بیان صدمہ پہنچے گا۔ تمہاری اذیت کا سوچ کر میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ میری ایک ایک دھڑکن مجھے ملامت کر رہی ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ تمہیں زندگی کے ہر لمحے میں ایک نئی خوشی دوں۔ تمہیں اتنا چاہوں کہ تم مغرور ہو جاؤ۔ میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ تم کو چاہت کی انتہا پر لے جا کر ایک عظیم صدمے سے دوچار کروں گا۔" درحقیقت وہ خود بُری طرح ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ جویریہ کو ذہنی اور روحانی اذیت پہنچنے کے خیال نے اس کے اندر شدید احساسِ جرم پیدا کر دیا تھا۔

دوسری طرف جویریہ بغیر پلک جھپکے اسے تکے جا رہی تھی۔

(معاذ! میں اپنے گرد حوصلوں کی دیوار مضبوط کر رہی ہوں۔ آپ کیوں اسے مسمار کرنے پر تلے ہوئے ہیں)

معاذ نے تھکے تھکے سے انداز میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔ اور بے حد ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم بھی کیا سوچو گی کہ میں نے کتنی قطعیت اور شدت سے فریال سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا اور اب خود ہی یہ فیصلہ کر لیا۔"

"میں کچھ نہیں سوچ رہی ہوں اور نہ ہی اس سلسلے میں آپ سے کوئی سوال کروں گی۔ اگر آپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے تو خوشی کی بات ہے۔ بے شک یہ میرے اور آپ کے لیے کڑا امتحان ہے مگر مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں اس میں کامیاب اور سرخرو ہوں گے۔ پروردگار سے دعا ہے کہ وہ آپ کو ثابت قدم رکھے اور عدل قائم کرنے اور خوش اسلوبی سے اپنا فرض نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ میرے دل کو بھی مزید وسعت دے اور حسد و رقابت و شک سے پاک رکھے۔" وہ اپنے بکھرتے وجود کو سمیٹنے میں جیسے تیسے کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ملائمت سے کہہ رہی تھی۔

اس کے لفظوں نے جیسے معاذ کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ اس کے دل میں جویریہ کے لیے بے پناہ عقیدت بھر گئی۔ اس نے جویریہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نرم سا دباؤ ڈال کر بولا۔

"جویریہ! میں تمہارے دل کی وسعت اور گہرائی ناپنے نکلوں تو ساری عمر سفر کرتا رہوں گا۔ کبھی گہرائی تک نہ پہنچ سکوں گا۔ ہمیشہ خود کو سطح پر ہی پاؤں گا۔ تم بہت عظیم ہو۔ عظیم تر ہو۔"

اس کے بجھے بجھے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

معاذ نے بے اختیار اسے اپنے وجود میں چھپا لیا۔ "میں تم سے بے انتہا پیار کرتا ہوں۔ فریال کے میری زندگی میں آ جانے سے اس محبت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ میرے اور تمہارے درمیان کوئی نہیں آئے گا۔ مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ تم میرے روم روم میں بسی ہو۔ خون بن کر میری رگوں میں دوڑ رہی ہو۔ میں تمہارا ہوں ہمیشہ تمہارا ہی رہوں گا۔ یہ وجود چاہے کسی کے اختیار میں چلا جائے مگر یہ دل بہرحال تمہارے ہی اختیار میں رہے گا۔ میری چاہتوں کا ہمیشہ اعتبار رکھنا۔ میں تم پر مرتا ہوں یہی میری زندگی ہے۔ جب تک تم پر مرتا ہوں گا، زندہ رہوں گا۔" وہ اسے اپنی محبتوں کے قائم رہنے کا یقین دلا رہا تھا۔ اسے تسلیاں اور دلاسے دے رہا تھا۔

جویریہ اس کی پناہ میں چھپی اپنے وجود میں دراڑیں پڑتے دیکھ رہی تھی۔

اس کے دل کا سارا درد، اس کی روح کی سسکیاں آہیں فقط دو آنسوؤں میں ڈھل گئیں جنہیں اس نے چپکے سے پونچھ ڈالا۔

○ ● ◆

وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں گھوم رہی تھی۔ اس کے وجود میں الاؤ دہک رہا تھا جسے وہ دلاسوں اور تسلیوں سے سرد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خود کو بار بار سمجھا رہی تھی۔ جو دلائل اب تک وہ معاذ کو دیتی آئی تھی۔ اب خود کو دے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں مگر وہ ہرگز رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ خود سے ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر ضبط کرتے کرتے تھکنے لگی تھی۔

"اوہ خدا!" وہ بے جان سی ہو کر صوفے پر ڈھے گئی۔

اے رب العالمین جب یہ سب کچھ میری مرضی سے ہوا ہے تو پھر یہ دل کیوں ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔

اے اللہ! جب یہ میری اپنی خواہش تھی تو پھر یہ روح کیوں بین کر رہی ہے۔

وہ حوصلے، عزم، ارادے بھاپ بن کر کیوں اُڑنے لگے ہیں۔ میں ہمت کیوں ہار رہی ہوں۔

اب جبکہ عمل کا وقت ہے تو۔ میں اتنی کمزور کیوں ثابت ہو رہی ہوں۔

یہ کیسی آگ ہے جو میرے اندر بھڑک رہی ہے۔ یہ کیا چیز جل رہی ہے۔

میں جانتی ہوں معاذ میرے ہیں۔ وہ ہمیشہ میرے ہی رہیں گے۔ پھر یہ دل کیوں بے قرار ہو رہا ہے۔

کیا میری ریاضتیں خاک میں مل جائیں گی۔

کیا میری قربانی رائیگاں چلی جائے گی۔

نہیں پروردگار۔ میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں نے تو سچے دل سے چاہا کہ معاذ، فریال کو اپنا لیں۔ میرے رب تو گواہ ہے۔ کہ میرے دل میں فریال کے لیے رقابت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ میں اس کے لیے کسی ماں کی دعاؤں کی طرح مخلص ہوں۔ اور معاذ کے بھی تو کھو جانے کا ڈر نہیں ہے۔ وہ مجھ سے بے پناہ پیار کرتے ہیں جب تک میرا دل اس بات کی گواہی دیتا رہے گا مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ فریال تھوڑی ہی دور تک تو ان کے ساتھ جائے گی۔ معاذ کوئی مجھ سے لاتعلق تو نہیں ہو جائیں گے۔ وہ تو میرا اور بھی خیال رکھنے لگیں گے۔ کچھ اور بھی چاہنے لگیں گے۔ بالآخر انہوں نے پلٹ کر میرے پاس ہی آ جانا ہے۔

میں جانتی ہوں کہ اس بازی میں مجھے شکست نہیں ہوگی تو پھر یہ بے سکونی کیسی ہے۔

رب العزت مجھے حوصلہ دے، مجھے سکون دے۔ میرے دل کو اپنی پناہ میں لے لے۔ وہ خدا کے حضور سربسجود ہو کر دعائیں کرنے لگی۔ آنسو بے قراری سے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ جانے کب تک وہ اسی طرح سجدے میں پڑی رہی۔ اپنا دکھ خدا سے کہہ دینے کے بعد دل کچھ ٹھہر سا گیا۔ اس نے جا کر وضو کیا۔ پھر قرآن شریف لے کر صوفے پر آ بیٹھی اور بلند آواز سے تلاوت کرنے لگی۔

وہ لفظ لفظ پڑھتی گئی اور اس کے دل سے روشنیوں کا گزر ہوتا گیا۔ ابدی سکون کا احساس رگ و پے میں اُترنے لگا۔ اس کے اعصاب پُرسکون ہونے لگے۔ ذہن کے سارے بوجھ اُترنے لگے۔ وہ تلاوت کرتے کرتے اتنی محو ہو گئی کہ ہر بات اس کے ذہن سے نکل گئی۔ وہ پڑھتی رہی یہاں تک کہ اس کی روح طمانیت کے بھرپور احساس سے مغلوب ہو کر ہلکی پھلکی ہو گئی۔

بے شک دلوں کو اطمینان خدا کے ذکر ہی سے ہوتا ہے۔ اے رب تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تو مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ اس نے اپنے دل کی پُرسکون کیفیت پر غور کرتے ہوئے تشکر بھرا سانس لیا۔

قرآن شریف کو بے حد عقیدت و احترام سے بوسہ دینے کے بعد واپس سرخ مخملیں جزدان میں لپیٹ کر الماری میں رکھ دیا۔ گھڑی دیکھی تو مغرب کا وقت ہوا ہی چاہتا تھا۔ وہ جائے نماز بچھا کر بیٹھ گئی اور سیپ کے دانوں کی تسبیح نکال کر درود شریف پڑھنے لگی۔ پھر بے حد اطمینان سے اس نے مغرب کی نماز ادا کی۔ فارغ ہو کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ چہرہ بے رونق سا ہو رہا تھا۔ کپڑے بھی ملگجے ہو رہے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے الماری کھول کر ایک شوخ گلابی رنگ کا سوٹ نکالا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ ڈریسنگ اسٹول پر آکر بیٹھ گئی۔ اور ہلکا ہلکا سا میک اپ کرنے لگی۔

میں ہی تو معاذ کی طاقت ہوں۔ معاذ نے یہ قدم میرے مضبوط سہارے کے بل پر ہی تو اٹھایا ہے۔ میری استقامت اور ثابت قدمی ہی تو ان کا حوصلہ ہے۔ مجھے خود کو مضبوط رکھنا چاہیے۔ اپنے لیے اور اپنے سے زیادہ معاذ کے لیے۔ وہ بالوں کو سلجھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

چوٹی باندھ کر اس نے "ڈیلون" اٹھا کر خود پر ہلکا سا اسپرے کیا۔ دراز کھول کر ڈبے میں سے سونے کے چھوٹے چھوٹے بندے نکال کر کانوں میں اٹکائے۔ پھر آئینے میں خود کو دیکھا۔ اب وہ پہلے سے مختلف لگ رہی تھی۔ چہرے پر تازگی آگئی تھی۔ وہ دوبارہ لاؤنج میں چلی آئی۔ رسالہ اٹھا کر صوفے پر نیم دراز ہو گئی اور بے مقصد اس کے ورق الٹنے لگی۔ درحقیقت وہ اس وقت معاذ کا انتظار کر رہی تھی۔ معاذ جو نکاح کے دو بولوں کے سہارے فریال کو اپنی زندگی میں شامل کرنے گیا ہوا تھا۔

○ ○ ○

معاذ نے اپنے نکاح کے بارے میں کسی سے بھی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اگرچہ کہ جویریہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ فون پر اپنے والدین کو تو مطلع کر ہی دے یا اور کچھ نہیں تو لندن سے کچھ فاصلے پر اس کی پھوپھی رہتی ہیں انہیں تو ضرور بتا دے۔ مگر معاذ نے کافی سوچ بچار کے بعد اس کی بات مسترد کر دی تھی۔ وہ فی الحال فوری طور پر اپنے لیے کوئی نئی پریشانی نہیں کھڑی کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس بات سے خاندان میں جو دھما کا ہو گا وہ کسی ایٹمی دھماکے سے کم نہ ہو گا۔ سوال و جواب اور لعن طعن کا سلسلہ الگ شروع ہو جائے گا۔ خاص طور پر اسے اپنی والدہ کی طرف سے انتہائی سخت ردِعمل کی امید تھی۔ عین ممکن تھا کہ مختلف حربوں سے اس پر دباؤ ڈال کر اسے اس امر سے باز رکھنے کی کوشش کی جاتی۔ اس نے بہتر یہی جانا کہ خاموشی سے نکاح کرے۔ اس کے بعد اطلاع دے۔ پھر جو کچھ ہو گا وہ بھگت لے گا۔ اسی وجہ سے اس کا فریال کی فوری طور پر رخصتی کرانے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔

پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ چند دوستوں کے ہمراہ خرم کے گھر چلا گیا۔ نکاح کی رسم سادگی سے انجام پائی۔ چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد اس نے خرم سے کہا کہ وہ فریال سے ملنا چاہتا ہے۔

"ہاں کیوں نہیں۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں ہے۔"

معاذ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگیا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اگرچہ کہ وہ اب اس کی منکوحہ تھی مگر نہ جانے کیوں وہ اپنے اندر جھجک سی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ دروازے پر دستک دے بیٹھا۔ پھر وہ فوراً ہی جواب کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔

ہلکے نیلے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس وہ اپنے بستر پر بیٹھی تھی۔ اس کا چہرا ہر قسم کے میک اپ سے عاری تھا۔ ابھی تک اس کے چہرے پر اس کے کارنامے کے نشان کمزوری کی صورت میں واضح تھے۔ اس نے آہستگی سے چہرا اٹھا کر دیکھا۔ معاذ اس کے شریکِ حیات کے روپ میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"السّلام علیکم" معاذ نے ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

"وعلیکم السلام" اس نے تقریباً دل میں جواب دیا۔

مگر معاذ اب اس رشتے میں منسلک ہو چکا تھا کہ جہاں دل کی آواز بھی بخوبی فریقِ ثانی تک پہنچ جاتی ہے۔

"کیسی ہو؟" وہ بے حد بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا۔

"بس ٹھیک ہی ہوں" اس نے عجیب خفگی بھرے انداز میں کہا۔

"خوش ہو؟" وہ بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"نہیں" اس نے صاف دو ٹوک کہا۔

"کیوں؟" اس کے انداز پر معاذ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"آپ نے جو کچھ کیا، اچھا نہیں کیا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے ایسا ہرگز نہیں چاہا تھا۔"

"تم نے بے شک نہ چاہا ہو۔ مگر میں نے تو چاہا تھا" وہ اطمینان سے کہتے ہوئے اس کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"جھوٹ" وہ بڑبڑائی۔

"یہ سچ ہے" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔ "نکاح اتنی معمولی بات نہیں ہے کہ اس کی بنیاد جھوٹ، مذاق یا فریب پر رکھ دی جائے۔ میرا دل، میرا ذہن، میرا ضمیر سب اس بات پر رضا مند تھے۔ یہ نکاح میرے دل کی عین خواہش کے تحت ہوا ہے۔"

وہ چپ ہو رہی۔

"تمہیں اپنے جذبوں کی صداقت، ان کی طاقت کا یقین آیا؟" وہ مدھم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"مجھے اپنے خودغرض ہونے کا یقین آیا" وہ خود سے بھی سخت خفا تھی، جل کر بولی۔

معاذ اس کے لب و لہجے پر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"کیوں اتنی خفا ہو؟" وہ بے حد اپنائیت سے گفتگو کر رہا تھا۔

"جی چاہ رہا ہے اپنے وجود کو نذرِ آتش کر دوں"

"خدارا ایسا نہ کرنا ورنہ ہم بھی ستی ہو جائیں گے" وہ برجستہ بولا۔

فریال نے بے ساختہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خلوص اور اپنائیت کے رنگ تھے۔ لبوں پر دوستانہ سی مسکراہٹ تھی۔ فریال کی نگاہ خود بخود جھک گئی۔

بہت سے لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

اچانک معاذ اٹھا اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

"اچھا آؤ مجھ سے دوستی تو کر لو"

"دشمنی تو ہمارے درمیان پہلے بھی نہ تھی" وہ تھوڑا پرے سرک گئی۔

"ہمارے درمیان جو کچھ ہے وہ وقت بتلائے گا" وہ ذومعنی لہجے میں بولا۔

فریال کا دل عجیب انداز سے دھڑکا۔ اسے معاذ کی قربت سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

"کب آؤ گی میرے گھر کو رونق بخشنے؟" وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

فریال خاموش رہی۔

"کچھ پوچھا ہے میں نے"

"نہیں۔ میں آپ کے گھر کبھی نہیں آؤں گی" وہ اداس مگر مصمم لہجے میں بولی۔

"فریال!" وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"آپ نے مجھے جو کچھ دیا، میرے لیے وہی بہت ہے۔ آپ نے میرے جذبوں کا مان رکھا۔ میری چاہتوں کے صلے میں مجھے اپنا نام دیا۔ اپنی پہچان دی۔ زندگی پر اختیار دیا۔ میں نے آپ کو پالیا ہے۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ اس احساس کے سہارے کہ آپ میرے ہیں۔ میں زندگی کے باقی دن آسانی سے کاٹ لوں گی۔ میں آپ سے اور کچھ نہیں چاہتی۔ آپ اپنی دنیا میں واپس لوٹ جائیں۔ مجھے بھول جائیں۔ سمجھ لیں کوئی خواب دیکھا تھا۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ تم اب معاذ کی ذات کا حصہ ہو۔ اس طرح کی بات کر کے معاذ کو ادھورے پن کا احساس مت دلاؤ۔"

اس کی بات پر فریال نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے، بیڈ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

"میں بھلا کتنی دور تک آپ کے ساتھ جا سکوں گی۔ میرے قدم اندھیرے راستوں پر پڑ چکے ہیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

جلد یا بدیر۔"

"اس طرح مت کہو۔" معاذ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "دعاؤں میں بڑی طاقت ہے۔ میں خدا سے دعاؤں میں تمہیں مانگ لوں گا۔"

"فریال پلیز تم اپنے ذہن سے یہ مایوس کن سوچیں نکال دو۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم خود کو خوش رکھو گی۔ میرے لیے۔"

فریال نے اس کی بات پر سر کو مثبت انداز میں معمولی سی جنبش دی۔

معاذ کچھ دیر تک اس ملکوتی حسن والے چہرے کو دیکھتا رہا۔ جانے کیسے اچانک ہی جویریہ کا حسن کی آگ میں دہکتا چہرا اس کی نگاہوں میں آ گیا۔

اس کا دل پہلے ڈوبا پھر ابھرا۔

سر کو جھٹکا دے کر وہ جلدی سے شعوری طور پر فریال کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں کل آؤں گا۔ شام کو میرے ساتھ باہر کھانا کھانے چلو گی؟"

اس کی مہربان پیشکش نے فریال کی آنکھوں میں بہت سارے آنسو بھر دیے۔ جو ضبط کرنے کے باوجود رخساروں پر پھیل گئے۔

"فریال پلیز۔" اس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اٹھا کر اس کے کندھے پر رکھنا چاہا مگر کچھ عجیب سی جھجک آڑے آ گئی۔ ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا۔ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں۔

"رویا نہ کرو۔ جن آنکھوں میں، میں خود کو دیکھنا پسند کروں، ان آنکھوں میں مجھے آنسو پسند نہیں۔"

فریال نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھیں اس کے لفظوں کا ساتھ دے رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر جھوٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔

معاذ نے انگلی کی پور سے اس کا چہرا صاف کیا۔ اس کے ذرا سے لمس نے فریال کے اندر کرنٹ سا دوڑا دیا۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

اس کے انداز پر ایک اداس سی مسکراہٹ معاذ کے چہرے پر آ کر معدوم ہو گئی۔

"میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔" اس نے ایک نظر کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالی۔ "اجازت ہے، جاؤں؟"

"خدا حافظ۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"خدا حافظ۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی دروازے سے باہر نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ فریال بول اٹھی۔

"ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟"

"ہاں ضرور۔" وہ رک گیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا جویریہ بہت روئی تھی؟" اس کا انداز مجرمانہ احساس لیے ہوئے تھا۔

معاذ کو اس کے سوال پر ایسا لگا جیسے اس کے دل کا کوئی حصہ بوجھل سا ہو رہا تھا اور اب ہلکا ہو گیا ہے۔ فریال کے دل میں جویریہ کے لیے ہمدردی کے جذبات موجود تھے۔ اس احساس نے اس کے اندر ڈھیر ساری طمانیت بھر دی۔

"نہیں بالکل بھی نہیں۔"

"کیا وہ مجھے معاف کر دے گی؟"

"تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔" اس نے تیزی سے بات کاٹ دی۔ "اس بات کو تم اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔" رک کر اس نے ایک لمحے کو اس کے تاثرات دیکھے اور پھر باہر نکل گیا۔

باہر آ کر اس نے خرم سے جانے کی اجازت لی۔ اس نے بے حد گرم جوشی سے اسے گلے لگایا اور گیٹ

تک چھوڑنے آیا۔ معاذ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور واپس گھر کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دی۔ ڈرائیو کرتے ہوئے بھی اس کا ذہن مسلسل سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔

اے پروردگار! تو اس نازک لڑکی کو صحت دے دے۔ اس کی عمر کے دن طویل کر دے۔ میرے معبود! میں بڑی نیک نیتی کے ساتھ اس کے سارے دکھ سمیٹنا چاہتا ہوں۔ مجھے توفیق دے کہ میں اس اچھی لڑکی کو خوش رکھ سکوں۔ مجھ سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔ مجھے دونوں کے درمیان عدل قائم رکھنے کی توفیق عطا فرما۔ وہ خدا سے دعائیں کر رہا تھا۔

پھر اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ اس کے دل میں فریال کے لیے خلوص تھا، ہمدردی تھی، اچھے دوستانہ جذبات تھے مگر۔ محبت؟

اس نے یہاں آ کر خود کو بے بس محسوس کیا۔ اس کا دل جیسے خود اس سے معذوری ظاہر کر رہا تھا۔

دل پر تو میرا کوئی اختیار نہیں۔ میں کیا کروں کہ دل کے ہر گوشے میں جویریہ موجود ہے۔

جویریہ کا خیال آتے ہی اس نے گاڑی کی اسپیڈ اور تیز کر دی۔ وہ اڑ کر گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس وقت اس کے دل کی ایک ایک دھڑکن جویریہ کی طلب گار تھی۔

اگرچہ کہ اپنے دادا کی بیٹی کو انہوں نے کھلے دل سے قبول کر لیا تھا مگر دادا سے ان کی ناراضگی ہنوز برقرار تھی۔ وہ سید صاحب سے نہال کو پناہ گاہ میں بلانے کا مطالبہ کرنا چاہتے تھے مگر دوسری طرف نہال نے یہ کہہ کر ان کے منہ بند کر رکھے تھے کہ اس کے لیے سید صاحب کی عدالت میں رحم کی اپیل دائر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہرگز ہرگز ان میں سے کسی کی سفارش پر پناہ گاہ نہیں جائے گا۔ جب تک سید صاحب خود دل سے اس کو وہاں بلانے پر آمادہ نہ ہوں۔

سید صاحب بیٹی کے لیے فرش راہ بن گئے تھے۔ مگر نہال کو پناہ گاہ بلانے کے لیے اشارتاً بھی نہیں کہا۔ ان سب کو دل ہی دل میں اس بات پر سخت غصہ تھا۔ ان کے اور سید صاحب کے درمیان سرد مہری کی فضا بدستور قائم تھی۔ وہ ان سے برائے نام ہی بات چیت کرتے۔

اور وہ ساری رات انہیں اپنے دل لے اس سوال کا جواب سوا ہو گئے ... سب کے سب نہال صبح کا سورج بڑی آب و تاب سے نکلا تھا مگر اس کا دل ریشمی زلفوں کے نرم اور سلجھے کے پاس کی پناہوں سے نکلنے کو تیار نہ تھا۔

نہ تو خود کبھی اسے احساس ہوا اور نہ ہی اس نے کبھی سوچنے یا جاننے کی زحمت کی کہ محبت کہتے کس جذبے کو ہیں؟

ہوا یا رگیں محصور کر... شب بھر اسے بہت سی باتوں کا ادراک ہوا۔

اس دن بھی وہ دونوں پناہ گاہ آئی ہوئی تھیں۔ جواہر نے خمار کے برابر والا کمرا ان دونوں کے لیے درست کروا دیا تھا۔ لیکن اس وقت تانیہ ازیبل کے کمرے میں جا کر سو گئی تھی۔ رانیہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بستر پر کروٹیں بدل بدل کر وہ تھک گئی تھی۔ بالآخر اٹھ بیٹھی۔ کچھ دیر بستر پر یونہی پاؤں لٹکائے بیٹھی رہی پھر کچھ سوچ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ ہر طرف مدھم سی روشنی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی لائبریری تک آئی۔ اس کا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ اندر سے تیز روشنی کی لکیر باہر آ رہی تھی۔ ہر طرف مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسے اندر جاتے ہوئے قدرے خوف سا محسوس ہوا۔ ابھی وہ تذبذب میں ہی تھی کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ لائبریری کا دروازہ اچانک پورا کھلا اور کوئی اس کے سامنے آ گیا۔

"امی۔" مارے ڈر کے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"رانیہ۔" شیراز اس کے چیخنے پر حیران رہ گیا۔ "کیا ہوا؟"

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"اوہ گاڈ۔ آپ ہیں" اس کی آواز سن کر رانیہ نے سختی سے بھینچی آنکھیں ایک دم کھولیں۔ اس کا دل سچ مچ بند ہوتے ہوتے بچا تھا۔

"کیا ڈر گئی تھیں؟" شیراز نے خود ہی اندازہ لگایا۔

"جی" اب خوف کا احساس کم ہوا تو سخت شرمندگی طاری ہو گئی۔

"سوری مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ باہر کھڑی ہیں۔ آئیے اندر آجائیں۔"

"دراصل میں کوئی کتاب لینے آئی تھی مجھے بالکل نیند نہیں آرہی تھی۔ سوچا کتاب ہی پڑھ لوں" وہ اپنی گھبراہٹ پر پوری طرح قابو نہیں پا سکی تھی۔ شیراز کے سامنے ایسی حماقت کا مظاہرہ ہو جانے پر وہ سخت خفت کا شکار ہو رہی تھی۔ بھلا کیا ضرورت تھی گلا پھاڑ کر چیخنے کی۔ حد ہی ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی

شیراز نے نظریں اٹھا کر بے حد غور سے اسے دیکھا۔ اس کی آواز میں ہکلاہٹ، انداز میں بوکھلاہٹ، چہرے پر ندامت، صبیح چہرے پر پسینہ، سہمی ہوئی سی نگاہ، رخساروں پر الجھتے ہوئے جھولتے بال، سرخ لباس میں قیامت ڈھاتا اس کا سویا سویا سا حسن۔

جیسے کوئی پنجرہ سا کھلا اور شیراز کے دل کا پنچھی پھر سے رانیہ کی جانب اڑ گیا۔ شیراز تو بس دیکھتا کا دیکھتا سا رہ گیا۔ کچھ بھی نہ کر پایا۔ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔ رانیہ نے انجانے میں اس کے دل کے بند دروازوں کو کھول دیا۔

شیراز اپنے دل کی اس اچانک بدلتی کیفیت پر خود ششدر تھا۔

"آپ اجازت دیں تو میں کوئی کتاب لے لوں؟"

اس کی آواز پر وہ چونک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی نگاہ ابھی تک رانیہ کے چہرے پر جمی ہوئی ہے۔ لے جانے کیوں شرمندگی سی ہوئی۔

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" اس نے نظریں چرا لیں۔

رانیہ بک شیلف کے پاس کھڑے ہو کر کتابوں کا جائزہ لینے لگی۔

اپنی کیفیت پر جھنجلاتے ہوئے شیراز نے بغیر سوچے سمجھے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ پتا نہیں لائبریری سے نکلنا چاہا یا اپنے خیا[illegible]

"خدا حافظ" وہ دھیرے سے بولی۔

"خدا حافظ" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی دروازے سے باہر نکلتے بھی نہ پایا تھا کہ فریاں بول اٹھی۔

"ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟"

"ہاں ضرور" وہ رک گیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا جویریہ بہت روئی تھی؟" اس کا انداز مجرمانہ سا اپنے ہمدرد تھا۔

[illegible]

اس کا دل اس سے مشورہ طلب کر رہا تھا۔

وہ جو پہلے ہی حیران پریشان تھا، دل کے سوال پر مزید حواس باختہ ہو گیا۔

ابھی وہ ہاں اور نہیں کے درمیان چکرایا ہوا تھا کہ اسے رانیہ کی آواز آئی۔

"کتابوں کا بہترین کلیکشن ہے۔ معلوم ہوتا ہے مطالعے سے کبھی شغف رکھتے ہیں" وہ شیراز کی کیفیت سے قطعی بے خبر کتابوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

ویسے انسان بھی کس قدر خوش فہم ہوتا ہے۔ بڑے زعم سے دعوا کرتا ہے کہ ہم تو تمہیں خوب جانتے ہیں۔ رگ رگ سے واقف ہیں۔ چہرا پڑھ لیتے ہیں۔ لہجہ سمجھ جاتے ہیں۔ ذہن میں اتر جاتے ہیں۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ واقفیت کا جتنا دعوا ہوتا ہے بے خبری بھی اسی درجے کی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ کبھی کبھی فریق کے دل کی کتاب کے ایسے اوراق بھی کھل جاتے ہیں کہ ہم جو انہیں پڑھ لیں پھر یا تو منہ نوچ لینے کا جی چاہے۔

یا اس پر نثار ہو جانے کو جی چاہے۔

الجھا الجھا شیراز سارے خیالات جھٹک کر آگے بڑھا اور ہاتھ اونچا کر کے کتاب نکالنے لگا۔

"یہ لیجیے" اس نے جان بوجھ کر اس کی سمت دیکھنے سے احتراز کیا۔

"شکریہ" وہ کتاب لے کر پلٹ گئی۔

شیراز اس کے پیچھے لائبریری سے باہر آگیا۔

سیڑھیاں چڑھ کر رانیہ دائیں جانب مڑ گئی جبکہ شیراز کا کمرا بائیں طرف تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے سے قبل اس نے بے ساختہ مڑ کر رانیہ کی طرف دیکھا۔ وہ دھیمے دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔

شیراز کی نگاہیں جیسے اس کے اپنے بس میں نہ رہیں۔ وہ چاہنے کے باوجود اپنی آنکھوں کا زاویہ نہیں بدل پا رہا تھا۔ شاید دل آنکھوں کی مدد کر رہا تھا اور دماغ ہتھیار ڈال رہا تھا۔ وہ سحر زدہ سا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

رانیہ نے بالوں کا گھریلو جوڑا بنا رکھا تھا جو پنوں کی مدد کے بغیر ڈھلکا جا رہا تھا۔ اچانک ہی اس کا جوڑا کھل گیا۔ ریشم سے بال پھسل کر گرے اور بکھر گئے۔

جیسے گھنگھور گھٹا چھا گئی ہو۔

شیراز کو ایسا لگا جیسے بڑا نرم اور لطیف سا اندھیرا اس کے دل کے آس پاس چھا گیا ہے۔

دل مستی میں ایسا چور ہوا کہ بالکل ہی بے خود ہو گیا۔

رانیہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی مگر وہ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ جمائے وہیں کھڑا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر وہ دل کو ٹٹولنے لگا۔ دوسرے معنوں میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

کیا ہے اگر راہ وفا میں یہ ہمسفر بن جائے تو؟ دل ایک بار پھر سوالیہ نشان بن گیا۔

اور وہ ساری رات شیراز نے اس سوال کا جواب سوچنے میں گزار دی۔

صبح کا سورج بڑی آب و تاب سے نکلا تھا مگر اس کا دل ریشمی زلفوں کے نرم اور معطر اندھیرے کی پناہوں سے نکلنے کو تیار نہ تھا۔

○ ❁ ◈

نہ تو خود کبھی اسے احساس ہوا اور نہ ہی اس نے کبھی سوچنے یا جاننے کی زحمت کی کہ محبت کہتے کس جذبے کو ہیں؟

مگر محض ایک ہی شب میں اسے بہت سی باتوں کا ادراک ہوا۔

مثلاً یہ کہ دل و نظر کے کچھ مطالبے ہوتے ہیں۔

دل کسی کی آمد کا منتظر رہتا ہے۔ نگاہ کوئی مہربان چہرا چاہتی ہے۔

اور یہ کہ دھڑکنیں زبان بھی بننا چاہتی ہیں اور کان بھی۔

کچھ کہنا بھی چاہتی ہیں اور سننا بھی۔

اور یہ کہ کبھی کبھی اپنی صورت فقط آئینے میں ہی نہیں بلکہ کسی کی آنکھوں میں بھی دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔

اور یہ کہ درخت کی چھاؤں تلے بیٹھ کر کوئی دلچسپ کتاب پڑھنا ہی پرلطف نہیں بلکہ کسی گھنیری زلفوں کے سائے تلے دل کے اوراق پڑھنا بھی خاصا خوشگوار عمل ہے (خاص طور پر جب دل کے ہر صفحے پر آپ ہی کا نام ہو)

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اور یہ کہ جھوٹ موٹ روٹھنے اور منائے جاتے میں بڑا مزا ہے۔

مزید یہ کہ زندگی کسی خوبصورت ساتھی کے بغیر بڑی بے رنگ اور بے کیف ہوتی ہے۔

اور جو کبھی پھولوں، خوشبوؤں اور رنگوں کی زبان میں گفتگو کرنے کو جی چاہے تو بھلا انسان کس سے کرے؟

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے بیڈ روم کی فضا کسی نسوانی ہنسی اور چوڑیوں کی کھنک کے بغیر کس قدر روکھی پھیکی ہے۔

ویسے یہ کوئی خاص حیرت کی بات نہیں تھی کہ شیراز اب تک زندگی کو نکھارنے والے ان جذبات سے بے خبر تھا۔ اس کی تو فطرت ہی ایسی تھی۔ وہ تو اپنے آپ سے بھی بے خبر رہنے والا بندہ تھا۔ بے حد کم گو، بھولے سے مسکرا دینے والا۔

وہ تو اپنے ظاہر سے بھی واقف اپنے کزنز کی ستائشی نظروں اور تعریفی جملوں سے ہوا تھا۔ آئینے کے سامنے کبھی اتنی دیر تک ٹھہرا ہی نہ تھا۔ جب تک آئینہ اس کی مدح سرائی کرتا، وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ چکا ہوتا۔

ہاں مگر زیبا اکثر کہتی۔

"ہائے اللہ بھائی جان! آپ کی شادی کیسے ہوگی۔ مجھے تو سخت فکر ہے۔" مارے تشویش کے وہ خاصی ہلکان نظر آتی۔ چہرے سے پریشانی چھا جوں برسنے لگی۔

"کیوں؟" وہ مسکرا کر پوچھتا۔

"ہم آپ کے لیے حور کہاں سے لائیں گے؟" تشویش کے بعد بے چارگی اور تاسف کا مظاہرہ کیا جاتا۔ ساتھ ہی منہ بھی لٹک جاتا۔

کبھی ذیشان ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا۔

"اپنا اپنا نصیب ہے۔ آپ آگے آگے ہوتے ہیں اور لڑکیوں کے غول کے غول آپ کے پیچھے ہوتے ہیں۔ واللہ کیا آپ کی بے نیازی اور وہ ہیں کہ دل چھوڑ جان تک دینے کو راضی۔ یہاں یہ حال ہے کہ لڑکیوں کی فوج آگے آگے ہوتی ہے اور میں ارمانوں سے لبالب بھرا دل لیے ان کے پیچھے ہوتا ہوں مگر مجال ہے کہ کوئی اللہ کے نام پر ہی گھاس ڈال دے۔"

کبھی چڑ کر کہتا۔

"شیراز بھائی خدا کے لیے جلد سے جلد شادی کرلیں۔ آپ کے کنوارپن کی وجہ سے میری مارکیٹ ویلیو پر خاصے برے اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ اللہ کی قسم ریڈیو کے اسٹیشن اتنی تیزی سے نہیں بدلتے جتنا لڑکیاں آپ کو دیکھ کر میرے بارے میں اپنی رائے اور پھر ارادہ بدلتی ہیں۔ آپ کی وجہ سے پتا نہیں میری کتنی متوقع منگنیاں ٹوٹ چکی ہیں۔"

بلاشبہ وہ یوسف ثانی تھا۔ بے حد خوبرو۔ اس کے چہرے پر بلا کی جاذبیت تھی۔ اس کی قدآور شخصیت بڑی باوقار، بڑی متاثر کن تھی۔ نسوانی نگاہیں چھوڑ مردانہ نظریں تک اس کے چہرے پر آکر لمحے بھر کو ٹھٹک جاتیں اور پھر متاثر ہوکر ہی پلٹتیں۔

وہ ملکوں ملکوں پھرا تھا۔ ہر رنگ و نسل کی لڑکیاں اس نے دیکھی تھیں۔ زندگی کی راہ میں بے شمار لڑکیاں آئیں جنہوں نے اس کا ہاتھ تھامنے کی خواہش کی تھی، مگر وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ہی رہا تھا۔

مگر گزشتہ شب کیا ہوا تھا؟

کیا اس کے اندر کا شیراز کسی کا متلاشی تھا کہ اپنی تلاش کو یکایک سامنے پاکر دل بے اختیار کہہ اٹھا "یہی ہے۔"

کیا میں اپنے اندر کے انسان سے اس حد تک بے خبر تھا۔

وہ خود بھی کم حیران نہ تھا۔

دوسری جانب دل ابھی تک اس کے جواب کا منتظر تھا۔

اور پھر بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ دل کے حق میں دے دیا۔

شادی بہرحال اس نے کرنی ہی تھی۔ کیا حرج تھا کہ اگر دل و نگاہ کی پسند سے کرلی جائے۔

نہال کو پناہ گاہ چھوڑے کافی عرصہ ہوچکا تھا مگر اس کے باوجود وہ تنہا نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی ہر دوسرے تیسرے روز اس کے ہاں جا دھمکتا۔ اس وقت بھی ذیشان اس کے ہاں موجود تھا۔

"بھائی جان! کہاں جارہے ہیں آپ؟" وہ صبر و ضبط کے ساتھ کافی دیر سے نہال کو تیار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر چیں بجبیں ہوکر بولا۔

"ان سے ملنے۔" وہ ٹائی کی ناٹ کھول کر دوبارہ باندھنے لگا۔

"وہ تو آپ کی سج دھج بتا رہی ہے کہ آپ ان ہی سے ملنے جارہے ہیں۔"

"تو پھر پوچھ کیوں رہے ہو؟" اس نے اینٹر پنٹی کی شیشی اٹھائی اور خوشبو بکھیرتے ہوئے بولا۔

"یہ ان" کتنی بہنیں ہیں۔ کوئی چھوٹی بہن بھی ہے یا نہیں؟" اسے بڑی دور کی سوجھی۔

نہال نے آئینے میں سے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ کو اپنے چھوٹے بھائی کا خیال نہ ہو تو میں خود بھی اپنے مستقبل کے بارے میں نہ سوچوں؟" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

نہال بے ساختہ ہنس پڑا۔ "موصوفہ اکلوتی ہیں۔"

اس نے جواباً "ہونہہ" کہہ کر سر کو جھٹکا دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ پھر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوکر قدرے ٹھنک کر بولا۔

"مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر چلیے۔"

"تم وہاں جاکر کیا کروگے؟ کباب میں خوامخواہ کی ہڈی۔"

"بھئی "ان" اکیلی تو آئیں گی نہیں۔ ضرور کسی سہیلی کو ساتھ لائیں گی۔ آپ دونوں اپنی باتوں میں مگن ہوجائیں گے تو سہیلی تو بور ہوجائے گی۔" موصوف کو کچھ نہ سوجھا تو سہیلی کی فکر میں دبلے ہونے لگے۔

"اور آپ میرے ساتھ جاکر سہیلی صاحبہ کی بوریت دور کرنا چاہتے ہیں۔" نہال نے اپنا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل۔ آپ کو تو پتا ہے کہ میں نیکیاں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ خاص طور پر ایسی نیکیاں جو صنفِ نازک کے حوالوں سے ہوں۔"

"چپ کرکے بیٹھو۔ فیکٹری کے ایک ورکر کی شادی ہے۔ وہاں جارہا ہوں۔ بے چارے نے بے حد اصرار کرکے بلایا تھا۔"

"اچھا۔ میں سمجھا کہ خود کسی کو دل دینے جارہے ہیں۔" اسے خاصی مایوسی ہوئی۔

اس کی بات پر جانے کون تصور میں آیا کہ نہال کے لب بے ساختہ مسکرانے لگے۔ اس نے ذیشان کی طرف سے رخ پھیر لیا ورنہ وہ تو جان کو چمٹ جانے والی بلا تھا۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک کے اسباب جاننے کے درپے ہوجاتا۔ اس کے منہ سے "رانیہ" کا نام اگلوا کر ہی دم لیتا۔

"تم کھاؤ گے کیا؟" وہ ہینگر سے کوٹ نکال کر پہنتا ہوا بولا۔

"کچھ بھی کھالوں گا۔" اس کی غیر موجودگی میں جو بوریت ہوتی۔ اس کا سوچ کر وہ خاصا بیزار ہوا۔

"کہو تو برگر لے آؤں۔" نہال نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"جب تک آپ لوٹ کر آئیں گے۔ مجھے سوئے ہوئے بھی دو گھنٹے ہوچکے ہوں گے۔ فکر نہ کریں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

دودھ وغیرہ لے لوں گا۔" اس نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ٹی۔ وی آن کرتے ہوئے کہا۔
"اوکے۔ دروازہ بند کر کے اطمینان سے سو جانا۔ چابی میں ساتھ ہی لے کر جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔"
اس نے میز پر سے کار کی چابیاں اٹھائیں اور لاؤنج میں آ گیا۔ بیرونی دروازہ بند کر کے باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔
وہ واپس پلٹ کر لاؤنج میں آیا۔
دوسری طرف زرتاج تھیں۔ اس کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد بولیں۔
"نہال! میں نے تم کو اس لیے فون کیا ہے کہ کل رات کا کھانا میرے ہاں کھانا۔"
"کوئی خاص بات ہے خالہ جان؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"خاص الخاص۔ کل میرے ہاں بابا آ رہے ہیں۔"
اس کے منہ سے بے آواز "اوہ" نکلا۔
"آ رہے ہو ناں؟"
"جی ضرور۔" اس کا ذہن کچھ الجھ سا گیا تھا۔
"آٹھ بجے تک پہنچ جانا۔ بلکہ یوں کرو، آفس سے سیدھا یہیں آ جاؤ۔" وہ بڑے پرخلوص انداز میں کہہ رہی تھیں۔
"میں آٹھ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔" اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔
"ذیشان! جا رہا ہوں میں۔" اس نے اپنے بیڈ روم کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔
ڈرائیو کرتے ہوئے بھی مسلسل اس کا ذہن کل کی دعوت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
وہ جائے یا نہ جائے۔ اس کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔
چودھویں کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ فضا میں ہلکی ہلکی سی خنکی تھی، جو خوشگوار لگ رہی تھی۔ وہ سب لوگ لان میں بیٹھے تھے۔ خاصا بے تکلف اور اپنائیت بھرا ماحول تھا۔ ہلکے پھلکے لطیف سے انداز میں ایک دوسرے پر جملے کسے جا رہے تھے۔ جن سے مسکراہٹیں بکھر رہی تھیں۔ اور جوابی کارروائیاں مسکراہٹوں کو قہقہوں میں بدل رہی تھیں۔ سید صاحب کی موجودگی کی وجہ سے قہقہے البتہ پست تھے۔
زرتاج، سید صاحب کے قریب بیٹھی، ان سے باتیں کرتی بے حد مسرور اور آسودہ سی لگ رہی تھیں خوشی ان کے ایک ایک انداز سے پھوٹ رہی تھی۔ اپنے باپ کی موجودگی اور ان کی قربت کو وہ جیسے جذب کر رہی تھیں۔ بار بار ان کے بازو پر بے ساختہ ہاتھ رکھتے ہوئے وہ جیسے خود کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ واقعی ان کے پاس ہیں۔ اپنے باپ کے محبت بھرے لہجے پر بار بار ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ سید صاحب ان کی کیفیت بخوبی سمجھ رہے تھے۔ محترم شفقت بنے بیٹھے تھے۔
اس وقت سب لوگ نہال کا انتظار کر رہے تھے جو اب تک نہیں پہنچا تھا۔
"امی جان! ٹونچ گئے ہیں۔ نہال بھائی اب تک نہیں آئے۔ کتنے بجے آنے کو کہا تھا؟" تانیہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
"کہہ رہا تھا آٹھ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ پتا نہیں ابھی تک کیوں نہیں آیا۔" وہ تانیہ سے کہہ کر باپ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ "بابا! آپ کو بھوک لگ رہی ہو گی۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"
"نہال کو آنے دو۔ سب ساتھ ہی کھالیں گے۔" وہ نرمی سے گویا ہوئے۔
شہیر، جاذب وغیرہ نے انہیں چونک کر دیکھا۔ انہیں یہ یقین کرنے میں کافی دیر لگی کہ یہ جملہ انہوں نے اپنے دادا کی زبان سے سنا ہے۔ ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں خوشگوار حیرت کا اظہار

کرتے ہوئے وہ پھر اپنی باتوں میں مگن ہو گئے۔ یوں تو وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے مگر آنے والے لمحے سے کچھ خائف بھی تھے۔ جب سے نہال پناہ گاہ سے نکلا تھا۔ آج پہلی بار اس کی سید صاحب سے ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ بھی زرتاج کے گھر جو اس بات سے قطعی بے خبر تھیں کہ نہال پرپناہ گاہ میں

ان کے کان رانیہ، تانیہ کی باتوں کی طرف بھی لگے ہوئے تھے اور مین گیٹ کی طرف بھی۔ دل منتظر تھا کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ سید صاحب نہال سے کس انداز میں ملتے ہیں۔ زرتاج کے سامنے بھرم قائم رہتا ہے یا کھل جاتا ہے۔
ساڑھے نو بج گئے تو سید صاحب نے دائیں جانب بیٹھے جاذب کو مخاطب کیا۔
"جاذب! نہال کو فون تو کرو کہ وہ اب تک کیوں نہیں آیا ہے۔ اس سے کہو، ہم انتظار کر رہے ہیں۔" وہ پرسکون انداز میں بولے۔
جاذب کے تو بس کرسی سے لڑھک کر نیچے گر جانے کی کسر رہ گئی۔
"ہم انتظار کر رہے ہیں۔" اسے کسی طور ہضم نہیں ہوا۔ باہر کو ابلی ہوئی آنکھوں سے اس نے اپنے دادا کی طرف دیکھا۔
دوسری طرف شہیر نے بڑی تولتی ہوئی نگاہ سید صاحب پر ڈالی۔ وہ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ سید صاحب واقعی نہال کے لیے کمال مہربانی کا مظاہرہ کر رہے ہیں یا پھر زرتاج پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے کہ نہال کے اور ان کے درمیان تعلقات کشیدگی کے کس درجے پر ہیں۔
بہرحال جاذب کو تو سید صاحب کی بات سن کر پرلگ چکے تھے۔ وہ تقریباً پرواز کرتے ہوئے اندر گیا اور نہال کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف مسلسل بیل جا رہی تھی مگر کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔
وہ ریسیور کریڈل پر رکھ کر واپس لان میں آیا۔
"بیل جا رہی ہے۔ کوئی اٹھا نہیں رہا۔" اس نے سید صاحب سے کہا۔
"بس تو پھر وہ پہنچنے ہی والا ہو گا۔" زرتاج نے اس کی بات سے نتیجہ اخذ کیا۔ کرسی کے دونوں بازوؤں پر رکھے ہاتھوں کا بوجھ ڈال کر اٹھتے ہوئے بولیں۔
"تانیہ بیٹا! جا کر کھانا لگواؤ۔"
"جی اچھا۔" وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور اندر کی طرف بڑھ گئی۔
رانیہ بھی اس کے پیچھے جانے کے لیے اٹھی ہی تھی کہ ذیشان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"آپ کہاں چلیں چاندنی کو ماند کرنے؟" اس کا شوخ لہجہ نشیلا بھی تھا۔
"ذیشان!" وہ سب کی موجودگی میں اس کی بات پر سرخ ہو گئی۔ خفگی سے اسے گھورتے ہوئے ہاتھ چھڑا کر تیزی سے اندر چلی گئی۔
"ہائے۔" دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بڑی درد بھری ہائے نکلی۔ پھر موصوف بڑے دلگرفتہ سے انداز میں، تاسف کے اظہار کے طور پر عجیب و غریب شکل بنا کر دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔
"نہ جانے حسین لڑکیاں مجھ سے عمر میں ہمیشہ بڑی کیوں نکلتی ہیں۔ میں نے دنیا میں آنے میں چھ سات سال کی دیر کی۔ افسوس صد افسوس۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوری طور پر اس سلسلے میں ایک ماتمی مجلس کا اہتمام کر ڈالتا۔ چہرے پر تو کچھ ایسی ہی رقت طاری تھی۔
"شرم کرو۔ دادا جان بیٹھے ہیں۔" خمار نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ "کم از کم ان کے سامنے تو اپنی بکواس سے پرہیز کیا کرو۔"
"ارے آپ کو کیا معلوم۔ دادا جان نے میری عمر میں نہ جانے کتنوں سے ایسی باتیں کی ہوں گی۔" وہ ڈھٹائی کے مظاہرے کے ساتھ اس کی بے خبری پر خجالت زدہ کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔
"ڈوب مرو جا کر۔" خمار نے دانت کچکچاتے، ساتھ ہی ایک ترچھی نگاہ سید صاحب پر ڈال کر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ازہ کرنے کی کوشش کی کہ ان کی آواز سید صاحب تک تو نہیں پہنچ رہی ہے۔

"چلو بھر پانی میں؟" وہ بڑی فرمانبرداری سے اس کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار تھا۔ سنجیدگی سے مشورہ طلب کیا۔

"تم جیسوں کے لیے تو قطرہ بھی کافی ہے۔" وہ سلگ کر بولی۔

جب دس بج گئے اور نہال نہ آیا تو وہ اس کی آمد کے سلسلے میں مایوس ہو گئے۔

"نہ جانے کیوں نہیں آیا۔ اس نے تو کہا تھا کہ آٹھ بجے تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔" زرتاج خاصی بجھ سی گئی تھیں۔

"ہو سکتا ہے کہ کوئی اچانک ضروری کام پڑ گیا ہو۔" جواد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ہو سکتا ہے۔" انہوں نے اس سے اتفاق کیا۔ "آیئے بابا کھانا کھا لیجیے۔"

وہ ان سب کو لے کر ڈائننگ روم میں چلی آئیں۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے بھی خاصی دیر ہو گئی تھی لہٰذا سید صاحب کھانے کے فوراً بعد جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ زرتاج ان سب کو رخصت کرنے گیٹ تک آئیں۔

"بابا! آج میں بہت خوش ہوں۔ اب مجھے ایسی خوشیوں سے محروم نہ کیجیے گا۔" اپنے باپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں۔ ان کی آواز بھرا گئی۔

سید صاحب بڑی محبت سے مسکرائے۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

چھڑی کے سہارے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے وہ گاڑی میں جا بیٹھے۔

"دادا جان!" جاذب تیز تیز چلتا ہوا ان کے پاس آیا اور کھڑکی پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھکتا ہوا بولا۔ "میں نہال کے گھر جا رہا ہوں۔ رات کو وہیں رہوں گا۔" اس کا اطلاعی انداز اجازت طلب بھی تھا۔

"اچھا!" انہوں نے بخوشی رضامندی دی۔ "مگر وہ تو شاید اپنے گھر پر نہیں ہے۔"

"اس کے فلیٹ کی چابی میرے پاس بھی ہے۔"

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شہیر نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو خدا حافظ کہا اور سیاہ رنگ کی بڑی سی لینڈ کروزر آگے بڑھ گئی۔

نہال کے فلیٹ پر پہنچ کر جاذب نے بیل بجانے کے بجائے دروازہ چابی سے کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ٹی۔ وی کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو اسے فوری اندازہ ہو گیا کہ نہال گھر میں ہی موجود ہے۔ وہ اس کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ انگلی سے دروازہ بجا کر اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔

نہال اپنے بیڈ پر دراز ٹی۔ وی دیکھنے میں مصروف تھا۔ جاذب پر نگاہ پڑتے ہی بہت معنی خیزی سے مسکرایا۔

"آیئے حضور! تشریف لایئے۔ مجھے یقین تھا کہ آپ میں سے ضرور کوئی نہ کوئی نازل ہو گا۔ میں منتظر تھا۔"

"کیوں تمہیں کیسے الہام ہوا کہ ہم میں سے کوئی نزول فرمائے گا؟" جاذب نے بظاہر برا سا منہ بنایا۔

"میرا گزر آپ لوگوں کی سوچوں میں ہے ہوتا ہے۔" وہ بامعنی انداز میں بولا۔

"خیر۔ اب کیا بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہو گے؟ کھڑے کھڑے ٹانگیں بددعائیں دینے لگیں۔" جاذب نے بات بدلنا چاہی یا پھر شاید نہال نے جو تاثر لیا تھا اس کو زائل کرنا چاہا۔

"کیا مہمان ہو تم؟" نہال نے اسے گھورا۔ "کہیں بھی ٹک جاؤ۔"

جاذب اس کے جھاڑی بیڈ پر اس کے برابر دھم سے آ کر بیٹھ گیا۔

"کیا سیدھے خالہ جان کے ہاں سے آ رہے ہو؟" نہال نے ٹی۔ وی کی آواز آہستہ کر دی۔

"ہاں۔ تم کیوں نہیں آئے؟" وہ پوچھنا تو نہیں چاہتا تھا مگر منہ سے نکل گیا۔

جواب میں نہال نے اسے جن نظروں سے دیکھا وہ سخت جز بز ہو کر رہ گیا۔

"دراصل میں جن لوگوں کے لیے ناپسندیدہ ہوں، ان کی نظروں کا امتحان لینا نہیں چاہتا تھا۔" اس کا لہجہ جتنا پرسکون تھا مسکراہٹ اتنی ہی زہریلی تھی۔

"وہ تمہیں پوچھ رہے تھے۔" اسے نہال کی مسکراہٹ سے کوفت تو ہوئی مگر پھر بھی نظر انداز کر کے نرمی سے بولا۔

نہال خاموش رہا مگر اس کا چہرا کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہے۔

"میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گا تم سے؟" جاذب اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ کر چڑ کر بولا۔

نہال یوں ہنسا جیسے اس کے لہجے سے لطف لیا ہو۔

"انہوں نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ تم کو فون کروں۔ میں نے رنگ کیا تو کوئی ریسپونس نہیں کر رہا تھا۔"

"ہاں گھنٹی بج تو رہی تھی۔" نہال پرسکون انداز میں بولا۔

"کیا مطلب، تم گھر میں موجود تھے؟" جاذب نے چہرا موڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں، کتاب پڑھ رہا تھا۔" اس کے اطمینان میں سرمو فرق نہ آیا۔

جاذب ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ یہ سوال پوچھنا کہ تم نے فون کیوں نہیں اٹھایا۔

اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ گویا قیامت ہی کھڑی ہو گئی۔

معاذ نے دوسری شادی کر لی۔

جس نے سنا انگشت بدنداں رہ گیا۔

بس پھر کیا تھا۔ ہر سمت سے معاذ پر صلواتوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اس کو سخت تنقید کا سامنا تھا۔ ہر کوئی اپنے رشتے، رتبے اور بساط کے مطابق اس کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔

ہر دل سے معاذ کے لیے غیض و غضب کے اور جویریہ کے لیے ہمدردی اور رحم کے سوتے ابل رہے تھے۔

معاذ نے اس سلسلے میں بالکل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس وقت وہ خود بھی اپنا تماشائی تھا۔ مگر بہرحال محفوظ تھا کہ جویریہ نے اپنی ذات کے قلعے میں اسے محفوظ تر کر دیا تھا۔

اس موقع پر جویریہ کا ضبط و تحمل بھی قابل ستائش تھا۔ بے حد آرام و سکون کے ساتھ وہ سب کے ان گنت سوالوں کے جواب میں سب کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ معاذ کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے اپنے لفظوں، اپنے لہجے اور اپنے انداز سے مدد لے رہی تھی۔ اس کے پاس چند ہی جملے تھے جنہیں وہ ہر ایک کے سامنے رٹ رہی تھی۔

"اس میں اس قدر حیرت کی کیا بات ہے؟ کیا دوسری شادی کرنا جرم ہے یا ناجائز امر ہے؟"

"جی ہاں بالکل میں فریال سے ملی ہوں۔ وہ بے حد نفیس لڑکی ہے۔ جتنی خوبصورت ہے، اس سے زیادہ خوب سیرت ہے۔"

"جی ہاں، خدا کا شکر ہے۔ معاذ سے میرے تعلقات بے حد خوشگوار ہیں۔ میں اپنی زندگی سے بہت خوش ہوں۔"

"لو بھلا مجھے کیوں دکھ ہوتا؟ اور پھر معاذ نے شادی میری مرضی سے کی ہے۔ عین میری خواہش کے مطابق، میری خوشی کے احترام میں۔ میرے دل میں اور میرے گھر میں فریال کے لیے بے حد گنجائش ہے۔"

"مارے صدمے کے بچی کے حواس ٹھکانے نہیں رہے جبھی تو ایسی باتیں کر رہی ہے۔" پھوپی جان نے سر پیٹ کر دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بڑے دکھ سے کہا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کچھ سوچ کر جویریہ نے ایک طویل خط اپنی ساس کو تحریر کیا اور اس میں ہر بات کا بڑی تفصیل سے تذکرہ کیا۔

پھر ایک دم ہی طوفان تھم گیا ہر سمت خاموشی چھا گئی۔

اس دن وہ کچن میں کھڑی کھانا پکا رہی تھی کہ معاذ کی امی کا فون آگیا۔

"ہیلو جویریہ۔ میں بول رہی ہوں۔"

"اوہ۔ آداب امی جان۔" وہ ایک دم ایکسائیٹڈ ہو گئی۔

"جیتی رہو۔" ان کی آواز بھرا سی گئی۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہی ہوں۔" ان کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔ قدرے توقف کے بعد بولیں: "تمہارا خط مجھے مل گیا تھا۔"

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

"یہ تم نے کیا کیا جویریہ؟"

ان کی شفقت بھری آواز سن کر اس کے دل کے آس پاس وہ درد جاگنے لگے جنہیں وہ روز تھپکیاں دے دے کر سلاتی تھی۔

"میں نے تو نیکی کی ہے امی!" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔

"نیکی کریں مگر خودکشی تو نہ کریں۔" وہ خاصی دکھی لگ رہی تھیں۔

"آپ میری فکر نہ کریں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے حلق میں پھنسا آنسوؤں کا گولہ نگلا۔

"جویریہ مجھے ڈر ہے کہ تو کہیں ٹوٹ نہ جائے۔"

"اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے۔"

"بیٹی تجھے رحم نہ آیا؟"

"آیا تھا۔ خود پر نہیں اس پر۔"

"ایسا کیا ہے اس میں کہ وہ سوکن بن کر بھی تیرے دل میں سمائی ہوئی ہے۔"

"امی! وہ سوکن نہیں ہے۔ وہ صرف فریال ہے۔"

(جس دن اسے سوکن سمجھا، شاید اسی دن میرے اندر کی عورت جاگ جائے گی)

"ہے کیسی وہ؟"

"کون وہ؟ آپ کی بہو؟" اس کی شوخی میں بھی آنسوؤں کی نمی نمایاں تھی۔

جواب میں ان کے خاموش آنسوؤں کی روانی میں تیزی آگئی۔

"بہت اچھی ہے۔ صورت میں بھی اپنی مثال آپ ہے اور سیرت میں بھی۔"

"چاند کا ٹکڑا تو تو بھی ہے میری بچی۔"

"وہ پورا چاند ہے۔" وہ برجستہ بولی۔

"کس دل سے کہہ رہی ہو؟ کیسے دل کو اتنا فراخ کر لیا۔" ان کے آنسو خاموش نہ رہ سکے۔ ان کی سسکیاں بلند ہونے لگیں۔

سینے میں دل تھا جو پگھل گیا۔ اللہ جانتا ہے کہ اگر پتھر بھی ہوتا تو موم ہو جاتا۔

"بس کر جویریہ۔ انسان رہ، فرشتہ نہ بن۔"

"امی! میں فرشتہ کیوں بننے لگی۔ میرا رتبہ تو فرشتوں سے بڑھ کر ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے۔ میں اپنے مرتبے کو کیوں کم کرنے لگی۔" وہ کہتے کہتے ضبط کی انتہا پر جا پہنچی۔

"امی! مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ آپ میری مضبوطی بن جائیے۔ میری پناہ بن جائیے۔" اسے ضبط کا یارا نہ رہا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اس کے آنسوؤں نے معاذ کی امی کے دل کو چیر کر رکھ دیا۔ وہ اس سے زیادہ زور و شور سے رونے لگیں۔

"کیا کہہ کر تسلی دوں میں تجھے، کیا کہوں میں تجھ سے؟"

"کچھ نہ کہیں۔ بس اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے اس آزمائش سے سرخروئی کے ساتھ نکال دے۔"

اس نے دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

معاذ کی امی کچھ اور بھی بے قراری سے رونے لگیں۔

"امی! مت روئیے پلیز۔ میرے دل کو دکھ ہو رہا ہے۔ جو ہونا تھا، وہ تو اب ہو ہی چکا ہے۔ رونے کی ضرورت ہے اور نہ فائدہ۔ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیسے ٹھیک ہوگا۔" وہ یاس بھرے لہجے میں بولیں۔

"ہاں امی! ایک بات اور کہنا تھی۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"کہو، کیا بات ہے؟"

"پھوپی جان معاذ کے اس اقدام کی وجہ سے سخت ناراض ہیں۔ آپ انہیں سمجھا دیں کہ جو کچھ ہوا اس میں میرا یا معاذ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو نوشتہ تقدیر تھا۔ ایک گزارش ان سے یہ بھی کر دیں کہ جس وقت معاذ، فریال کو رخصت کرانے جائیں تو وہ بھی معاذ کے ساتھ چلی جائیں۔" وہ قدرے رک کر دوبارہ مدھم لہجے میں بولی۔

"لڑکی کو پہلی بار اپنے گھر لانے کے لیے اگر صرف شوہر ہی جائے تو اس کے دل میں یہ احساس اتر سکتا ہے کہ اسے بہو کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا۔ وہ اس گھر میں صرف بیوی بن کر آئی ہے۔ بہو بن کر نہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں میری بات؟"

معاذ کی والدہ اس کی بات کے جواب میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔

"آپ کہہ دیں گی ان سے؟" وہ دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

"کہہ دوں گی۔" وہ بجھے بجھے دل سے بولیں اور فون بند کر دیا۔

جویریہ نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔

"میں آگ کے اس دریا کو عبور بھی کر سکوں گی یا نہیں۔ دل و جان کو سوختہ ہونے سے بچا پاؤں گی بھی یا نہیں؟"

وہ خود سے سوال کر رہی تھی۔

○ ● ◆

اسے خود پر بھی بڑی حیرت تھی۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوئی جاتی۔

کیا میں اتنی مضبوط عورت ہوں؟

کیا میرے اندر سہنے کی اتنی طاقت ہے کہ وقت نے اذیتوں کا خنجر میرے اندر اتار دیا جو میری ہر آتی جاتی سانس کو کاٹ رہا ہے مگر میں پھر بھی سہے جا رہی ہوں۔ جیسے جا رہی ہوں۔

کیا یہ واقعی میں ہی ہوں؟ وہ آئینے میں کھڑی نازک سراپے والی جویریہ کو دیکھے چلی جاتی۔

لیکن پچھلے کچھ دنوں سے وہ سخت خوفزدہ تھی، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر کی عورت اس کے تعاقب میں ہے۔

وہ عورت جو بیوی ہے اور کبھی اونچے لمبے شاندار مرد کی شدت بھری چاہتوں کی تنہا مالک تھی۔

وہ عورت اسے بہت بپھری ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔ جیسے وہ خود پر کیے گئے ظلم کا بدلہ لینا چاہتی ہو۔

اسے رقابت کے شعلوں کی نذر کر کے حسد کی آگ میں جھونک دینا چاہتی ہو۔

جویریہ بہت ہراساں تھی۔ وہ اس عورت سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ خاموشی کا کفن پہنا

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کرایے دفنا دینا چاہتی تھی۔ مگر کبھی کبھی اسے یوں لگتا کہ وہ اس عورت کو شکست دینے میں ناکام ہو جائے گی۔ وہ اسے اپنے سے زیادہ طاقتور لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ حقوق کے ہتھیار سے لیس تھی۔ جویریہ کو ہر وقت اس عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی تھیں۔

تو میری خوشیوں میرے سکھ چین کی قاتل ہے۔

تیرے ہاتھ میرے ارمانوں کے خون سے رنگے ہیں۔

تو نے میرے جذبات کو بے حسی کے پتھروں سے کچلا ہے۔

تو نے میری سیج پر کسی اور عورت کو سلایا ہے۔

تو نے کسی اور کے خوابوں کو تعبیر دے کر میری آنکھوں کو بے خواب کیا ہے۔

تو نے میرا معاذ مجھ سے چھینا ہے۔

تو نے میرے معاذ کو تقسیم کر دیا۔

مجھے میرا معاذ چاہیے۔ پورا۔ بلا شرکت غیرے۔

جویریہ تنگ آ کر اپنے کان بند کر لیتی مگر پھر بھی اسے یہ شور سنائی دیتا رہتا۔

وہ اس عورت کے شکنجے سے نکل جانا چاہتی تھی۔

مگر کیا کوئی اپنی ذات سے بھی فرار حاصل کر سکا ہے۔

مگر پھر بھی وہ لڑ رہی تھی اپنے آپ سے۔

وہ حوصلے اور ضبط کی آخری حد تک لڑنا چاہتی تھی۔

دل بڑا بے کل بے کل سا رہنے لگا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

حالات کو قابو میں کرے یا وقت کو۔

دل کو سنبھالے یا خود کو۔

کیا کرے آخر؟

آنکھوں کو اندھا کر دے، کانوں کو بہرہ کر دے، زبان کو گونگا کر دے، جذبات کے در پر تالا ڈالے، احساس کے دریچوں کو بند کر دے۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ اٹھ کر زندگی کے دروازے ہی کی کنڈیاں چڑھا دے کہ آنے والے لمحے باہر ہی رہ جائیں۔

اور جن دنوں وہ شدید اندرونی کشمکش کا شکار تھی۔ زندگی نے اچانک ایک نیا موڑ لیا۔ اس وقت حالات جس نہج پہ تھے زندگی کا یہ رخ اس کا متقاضی نہیں تھا۔

جانے ہنسنے کا مقام تھا کہ رونے کا۔

وہ بالکل ہی چکرا کر رہ گئی۔ اس صورت حال نے اسے دو مختلف کیفیتوں میں مبتلا کر دیا تھا۔

دل میں انگارے بھی دہک رہے تھے اور پھول بھی مہک رہے تھے۔

بیک وقت آنکھ میں آنسو بھی جھلملاتے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلکھلاتی۔

رحمت خداوندی کے ایک اشارے کے باعث اذیت کے صحرا اور دکھ کے بیاباں میں بھٹکتی اس کی مجبور روح بے قرار دفعتاً اختیار روح کو آب حیات میسر آ گیا تھا۔

اس کی کوکھ کے سیپ میں موتی اتر گیا تھا۔

دل اگرچہ اداسیوں کی تہوں میں ڈوبا ہوا تھا مگر پھر بھی خوشی کے آنسو رو دیا تھا۔

مگر زندگی کا یہ رخ حالات کی الجھی ہوئی ڈور کو مزید الجھا سکتا تھا۔

اپنے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر اور احساسات کو پس پشت ڈال کر اپنے آپ سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد بہت سوچ بچار اور غور و خوض کے بعد اس نے فیصلہ کیا اور مصلحت کی چادر سر پر ڈال کر سمجھوتوں کی قبر میں دفن ہونے کے لیے ایک بار پھر قربان گاہ کی طرف چل پڑی۔

کہ اب اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اسے حالات کا ہی نہیں، خود اپنا مقابلہ بھی کرنا تھا۔

○ ● ◆

"سنیے، میں آپ سے ایک بات کہوں، آپ مانیں گے؟" وہ ہاتھوں کو دوپٹے سے پونچھتی کچن سے برآمد ہوتے ہوئے بڑے ناز و ادا سے بولی۔

معاذ نے چہرا موڑ کر اسے دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

"اس انداز سے کہہ کر اگر تم جان بھی مانگو گی تو آخری ہچکی بھی نہ لوں گا۔"

"اللہ نہ کرے۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "آپ کی سانس تو ہماری سانس کی شرط ہے اور میں ابھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔" وہ ایک دم روہانسی سی ہو گئی تھی۔

معاذ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ جانے کیا سوچ کر اس کا دل بے حد دکھی ہو گیا۔

"یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔" اس نے سر کو جھٹکا دے کر اپنے تکلیف دہ خیالات سے پیچھا چھڑایا اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔ وہ اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔

"اب تو آپ ہمارے پہلو کو بھی کبھی کبھی رونق بخشتی ہیں۔" وہ شکایتی لہجے میں معنی خیزی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ ویسی کی ویسی ہی تھی۔ نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی۔ دھڑکنوں کو تھما دینے والی۔

معاذ نظروں ہی نظروں میں اس پر نثار ہونے لگا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" وہ نظریں جھکا کر حیا آلود لہجے میں بولی۔

وہ کچھ دیر اس کو نرم گرم نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر اس کے بالوں کی اٹھی لٹوں کو مزید الجھاتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو کون سی بات منوانا چاہ رہی تھیں آپ؟"

"اوہ!" وہ پھولوں پر سے پھسلی اور کانٹوں بھری جھاڑی سے جا الجھی۔

"میرا دل چاہ رہا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے پاکستان چلی جاؤں۔" اس نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے بظاہر بڑے سرسری لہجے میں کہا۔

"کیوں؟" معاذ چونک گیا۔

"کیوں کا کیا مطلب ہے۔ جب سے آئی ہوں ایک مرتبہ بھی نہیں گئی۔ سب مجھے یاد آ رہے ہیں۔" وہ منہ بسور کر بولی۔

"ہوں۔" معاذ نے ہنکارا بھرا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "اس ماہ تو نہیں البتہ اگلے ماہ ہم پروگرام بنا لیں گے۔"

"ہم سے کیا مراد؟ آپ بھی ساتھ چلیں گے؟" اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ تمہارے بغیر مجھ سے اکیلے تو رہا نہیں جائے گا۔ میرے ساتھ چلنا اور میرے ساتھ ہی آ جانا۔"

"اچھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اکیلی ہی چلی جاتی۔" وہ مدھم آواز میں خود کلامی کے انداز میں بولی۔

معاذ نے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر اس کا چہرا اپنی طرف کیا اور پیار بھری خفگی کے ساتھ بولا۔

"ہاں تاکہ تم وہاں جا کر اطمینان سے بیٹھ جاؤ اور میں یہاں تنہا تمہاری یاد میں سلگ سلگ کر راکھ ہوتا رہوں۔"

"مگر آپ تنہا کب ہوں گے۔ فریال جو آپ کے پاس ہو گی۔" جویریہ نے سہولت سے کہتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

معاذ کے احساس پر بڑی کاری ضرب پڑی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم تبدیل ہو گئے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس نے اپنی کھوجتی ہوئی نظریں اس کی آنکھوں میں پیوست کر دیں اور اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

جویریہ نے اپنا چہرا بھولپن کے تاثرات کی آڑ میں کر لیا۔

"دیکھو جویریہ!" وہ سنجیدہ اور قطعی لہجے میں بولا۔ "ایک بات تم ہمیشہ یاد رکھنا۔ میں تم کو کبھی خود سے علیحدہ نہیں کروں گا۔ تمہارا چہرا میری نگاہ کی پہلی ضرورت ہے۔ ہر سانس کے ساتھ میں تمہیں اپنے اندر اتارتا ہوں۔ میری نیندیں بھی اس وقت تک پرسکون رہتی ہیں جب تک مجھے یہ احساس رہے کہ تم میرے آس پاس موجود ہو۔ تم سے دُور رہنا تو درکنار، دوری کا تصور بھی میرے لیے سوہانِ روح ہے۔"

(مگر اس وقت میرا آپ سے دُور رہنا میری مجبوری اور حالات کا تقاضا ہے۔ اس کا دل کراہا)

"معاذ! مجھے جانے دیجیے۔" اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بے حد التجائیہ انداز میں بولی۔

"تم مجھ سے دُور کیوں جانا چاہتی ہو؟ کیا وجہ ہے آخر؟" اس نے شانے پر رکھا اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور سخت برہمی سے گویا ہوا۔

"میں آپ سے نہیں اپنے آپ سے دُور جانا چاہتی ہوں۔ جویریہ معاذ سے فرار حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میں جویریہ قریشی بننا چاہتی ہوں۔ میں تھک گئی ہوں۔ بہت تھک چکی ہوں۔" وہ کہتے کہتے ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کی زبان بیچ اٹک گئے چلی تھی۔

"مجھے نہ روکیں پلیز۔ مجھے جانے دیں۔" اس کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو چمکنے لگے۔

معاذ نے اپنے دل کو کرب میں ڈوبتا محسوس کیا۔ بے حد آزردہ اور شکستہ لہجے میں بولا۔

"تمہارے جانے کی بات سے ہی میرے اندر سناٹے چھانے لگے ہیں۔ بہت خالی ہو جاؤں گا میں۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔" اس نے جویریہ کا ہاتھ تھام کر سینے پر رکھ لیا۔

"یہ دل خاموش ہو جائے گا۔"

جویریہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کی شہ رگ کاٹ دی ہو۔ وہ اس کے بازو سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

شدید اذیت کے عالم میں معاذ نے اپنے لب سختی سے بھینچ لیے۔

اس نے چابی کے ذریعے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

اسے یوں لگا جیسے کسی سمت سے چہکتی ہوئی شوخ آواز آئی ہو۔

"آ گئے آپ۔ السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" اس کے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس نے آواز کی سمت دیکھنا چاہا۔

مگر یہ تو اس کا گمان تھا۔ اس آواز کو وہ ابھی ایئرپورٹ چھوڑ کر ہی تو آ رہا تھا۔

دکھ اور بے بسی کے احساس تلے اسے اپنا جسم روح سے خالی محسوس ہوا۔ بے جان قدموں سے وہ اندر چلا آیا۔

خاموشی۔ سناٹا۔ ویرانی۔

درو دیوار تک سے سوگواری ٹپک رہی تھی۔

گھر کے ساتھ، اس کی روح سمیت ہر شے اجڑی ہوئی لگ رہی تھی۔

کہ وہ جا چکی تھی۔ اس کی محبوبِ دلنواز۔ اس کے گھر میں زندگی کا بھرپور احساس۔ وہ چلی گئی تھی۔

قفل نے دل پر اداسیاں چھا رہی تھیں۔ آسمانِ محبت پر حزن و ملال کے بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔

دل کو زبردستی ہی کوئی دھڑکا رہا تھا ورنہ وہ دھڑکنے سے انکاری ہو رہا تھا۔

اس نے کچن کے دروازے کی طرف دیکھا۔ یادوں کی دھند میں لپٹی جویریہ اس کے سامنے آ گئی۔ ہنستی کھلکھلاتی وہ باہر نکلی۔ اس کے چہرے پر وہی چمک تھی جو معاذ کو دیکھنے سے آ جاتی تھی۔ اپنی شوخ ادا کے ساتھ وہ تیزی سے اس کے قریب آتی اور شعلے بھڑکا کر اتنی ہی سرعت سے دور ہو جاتی تاکہ شعلوں کو مزید ہوا دے سکے۔

کبھی وہ مخمور نگاہوں سے دیکھتا تو کبھی مصنوعی خفگی سے گھورنے لگتا۔

اس کے ہونٹوں پر کبھی شرمگیں مسکراہٹ بکھر جاتی تو کبھی وہ شرارت سے قہقہہ لگاتی۔

اس نے کچن میں چاروں طرف دیکھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جویریہ جا چکی ہے۔ مگر اس کی نظریں متلاشی تھیں۔ اس کے جانے کا یقین بار بار گمان میں بدل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی وہ کسی کونے کھدرے سے نکل آئے گی۔ اور مخصوص انداز میں جلدی جلدی بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے آنکھیں پھاڑ کر کہے گی۔

"ہیں؟ آپ کب آئے، مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔"

دل میں درد کی تیز لہر اٹھی اور وہ اپنے ٹوٹے وجود کی کرچیاں سمیٹتے ہوئے اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔

اس کی خوابگاہ، خوابوں کی ملکہ کے بغیر بے حد سونی لگ رہی تھی۔ معاذ چپ چاپ بیڈ پر جا کر لیٹ گیا۔

نگاہ غیرارادی طور پر جویریہ کے تکیے پر ٹھہر گئی۔ جویریہ پھر خیالوں میں چلی آئی۔

"آپ اُدھر منہ کر کے کیوں سو رہے ہیں۔ اِس طرف منہ کیجیے ناں۔" معاذ کو دائیں کروٹ سونے کی عادت تھی۔ اس کی پشت جویریہ کی طرف ہو جاتی۔

اسے نیند آ رہی ہوتی۔ وہ کوئی جواب نہ دیتا۔

"کیا کہہ رہی ہوں آپ سے۔ اس طرف کروٹ بدل لیں۔"

"کیوں؟" وہ کبھی کبھی جھنجلا جاتا۔

"میں آپ کو دیکھتے رہنا چاہتی ہوں۔"

"اس چہرے میں اب کچھ نہیں رکھا۔" وہ ہنوز اسی حالت میں پڑا رہتا۔

"میری تو دنیا روشن ہی اسی چہرے سے ہے۔" وہ اس کی محبت میں ڈوب کر کہتی۔

"اور جو میں لائٹ آف کر دوں تو پھر کیسے دیکھو گی مجھے؟" وہ اس کی طرف رخ پھیر کر شرارت سے کہتا۔

"پھر دل کی آنکھوں سے دیکھوں گی۔" وہ برجستہ کہتی۔

وہ اس کے لفظوں پر، لہجوں پر، اداؤں پر مر مر جاتا۔

اب کیسے دیکھو گی مجھے۔ اس نے بے حد آزردگی سے سوچا۔

اسے جویریہ بے طرح یاد آ رہی تھی۔

اس کا چہرا، اس کی آنکھیں، اس کے بال، اس کے ہاتھ۔

ناک کی لونگ، ہاتھوں کی چوڑیاں، کان کی بالیاں۔

بار بار اس کے تصور میں آ رہی تھیں۔ اور ہر تصور کے ساتھ اس کا دل درد کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا۔

دھڑکنیں اتنی معدوم ہو جاتیں کہ لگتا رک جائیں گی۔

معاذ کا ذہن بری طرح سلگ رہا تھا۔ اس نے اپنا سر تکیے میں گھسا لیا۔ جانے کہاں سے جویریہ کی خوشبو قوتِ شامہ سے ٹکرائی اور بے چین ہو کر پھر سیدھا ہو گیا۔

آئینے پر نگاہ پڑی تو جویریہ کا عکس جھانکتا نظر آیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ہائے اللہ آپ ابھی تک سو رہے ہیں۔ دیکھیے تو شام ہو گئی۔" وہ گھٹاؤں سے بال بکھرائے کھلے دروازے سے اندر چلی آئی۔

"ہاں، اس میں شک بھی کیا ہے کہ شام ہو گئی۔" وہ ذو معنی انداز میں کہتے ہوئے زلفوں کے سائے میں پناہ لے لیتا۔

معاذ نے بڑی بے دردی سے لب کچل ڈالے۔

"لوٹ آؤ جویریہ۔ لوٹ آؤ۔" دل ضدی بچے کی طرح مچل رہا تھا۔

اپنے دل کی درد بھری پکار سے گھبرا کر وہ باہر نکل آیا۔

اداسی پاؤں میں دکھ کے گھنگھرو باندھے ہر طرف رقص کر رہی تھی۔ وحشتوں کی آندھی میں اس کا وجود تنکوں کی طرح بکھر رہا تھا۔

◆ ● ○

بہت دنوں سے ان سب کا پکنک پر جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ مگر کبھی کسی کی مصروفیت آڑے آجاتی تو کبھی کسی کی۔ بات آج کل پر مسلسل ٹلتی جا رہی تھی۔ ذیشان خاص طور پر اس صورتِ حال سے تنگ آگیا تھا۔

"بھئی، اس پروگرام کو ڈراپ ہی کر دیں تو بہتر ہے۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں فون پر نہال سے بات کر رہا تھا۔

"ارے نہیں، ڈراپ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پرسوں چھٹی ہے۔ پرسوں سب پکنک پر چلتے ہیں۔" نہال نے حتمی انداز میں کہا۔

"تم سب لوگ صبح ہی صبح میرے ہاں آجانا۔"

"آپ اطہر بھائی کو بھی فون کر دیں کہ وہ بھی ساتھ چلیں۔"

"اوکے میں اطہر کو رنگ کر دیتا ہوں۔" نہال نے فون ڈسکنیکٹ کر کے اطہر کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف سے اطہر ہی کی آواز آئی۔ سلامتی کے تبادلے اور حال احوال دریافت کرنے کے بعد نہال بولا۔

"پرسوں ہم سب پکنک پر جا رہے ہیں اور تم بھی ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔"

"پہلے 'تم سب' کی وضاحت کرو کہ سب میں کون کون شامل ہے۔" وہ شریر لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"فکر نہ کرو۔ سبھی جا رہے ہیں۔ ہر خاص و عام مدعو ہے۔" وہ اس کی بات سمجھ کر ہنس دیا۔

"خاص الخاص لوگ بھی جا رہے ہیں یا نہیں۔" وہ پوری طرح اطمینان چاہتا تھا۔

"ہاں بھائی! زیبا بھی جا رہی ہے۔"

"بس پھر تو میں سر کے بل آؤں گا۔" وہ دل و جان سے راضی ہو گیا۔

اس دن وہ سب علی الصبح ہی نہال کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔ ذیشان باقی سب لوگوں کو آف لوڈ کر کے سیدھا زرتاج کے گھر چلا گیا جہاں سے اسے رانیہ اور تانیہ کو پک کرنا تھا۔

نہال آج معمول سے زیادہ خوش تھا۔ آج رانیہ پہلی بار اس کے گھر آ رہی تھی۔ یہ احساس نہ جانے اس کے کون کون سے جذبات کی تسکین کر رہا تھا۔ اس کا دل اس سمے بڑا پُرجوش سا تھا۔ خوشی اور طمانیت کے انوکھے احساس کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ جس دن سے اس نے اپنی زندگی میں "کمی" کو محسوس کرنا شروع کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے کوئی شب ایسی نہ گزری تھی کہ اس نے رانیہ کو اپنی سوچوں میں شریک نہ کیا ہو۔ اپنے مستقبل کے خوشگوار دنوں کو اس کے نام کرنے کی آرزو نہ کی ہو۔

ڈور بیل کی آواز پر خمار نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی رانیہ کھڑی تھی۔

خاصے فاصلے پر کھڑے نہال نے بے اختیار اسے دیکھا۔ اپنی نگاہ کی بے قراری اس نے خود محسوس کی۔ وہ ابھی تک دروازے سے باہر ہی کھڑی تھی۔ نہال کی نظریں اس کے قدموں سے لپٹ

گئیں۔ اور بالآخر اس نے اندر قدم رکھ دیا۔

نہال کو یوں لگا جیسے وہ اس کے گھر میں نہیں اس کی زندگی میں داخل ہوئی ہو۔ اس کے بے قرار دل کو قرار سا آگیا۔

اچانک اس کا دل چاہا کہ وہ رانیہ کی نظروں کو اپنے لیے کھوجتا ہوا دیکھے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ منہ ہاتھ دھونے کے بہانے ایک دم منظر سے ہٹ گیا۔

وہ جب باتھ روم سے باہر نکلا تو سب ٹی۔وی لاؤنج میں اپنی اپنی تیاریوں کو آخری شکل دے رہے تھے۔ اس نے جان بوجھ کر کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

رانیہ نے ایک دم پلٹ کر اسے دیکھا اور فوراً ہی سلام جھاڑ دیا۔

نہال کو رانیہ کا یوں مڑ کر خاص طور سے اسے دیکھنا بہت اچھا لگا۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی تمام تر خوبصورتیاں نہال کی بصارتوں میں اتر گئیں۔

"وعلیکم السلام۔" نہال نے کرتے کے بٹن لگاتے ہوئے جواب دیا اور حاضرین پر جو خاصی افراتفری کا شکار لگ رہے تھے۔ ایک نظر ڈالی۔

"تانیہ کہاں ہیں؟" اس نے تانیہ کو نہ پا کر پوچھا۔

"آ رہی ہیں۔" اس نے ہوا کے زور سے منہ پر آئے بال کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"آ نہیں رہی ہیں بلکہ لائی جا رہی ہیں۔" بیرونی دروازے کے باہر سے ذیشان کی آواز آئی۔ وہ تانیہ کو سہارا دیے اندر لا رہا تھا جو ہائے اللہ اور ہائے امی کے درد بھرے نعرے بلند کرتے ہوئے آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" بیک وقت کئی آوازیں ابھریں۔

"موچ آگئی پاؤں میں۔" اس نے بڑی دلسوز آواز میں اپنا دکھڑا بیان کیا۔

"اوہو۔ کیسے بھلا؟" جواہر تشویش و ہمدردی کے بیک وقت اظہار کرتے ہوئے اس کے قریب آکر بولی۔

"سیڑھیوں پر سے پاؤں پھسل گیا۔" جو صوفہ اسے قریب نظر آیا، وہ دھم سے اس پر بیٹھ گئی۔ پھر حسبِ توفیق، مختلف قسم کی درد بھری آوازیں نکالنے لگی۔

"یہ تو آ ہی نہیں رہی تھیں۔ میں زبردستی لایا ہوں۔" ذیشان نے چابی جاذب کو تھماتے ہوئے کہا۔

"ذیشان! تم اسٹیمر لائے ہو؟" نہال کو اچانک یاد آیا تو اس نے ذیشان سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چھوٹی سی اسٹیمر وہ پہیوں والے اسٹینڈ پر رکھ کر گاڑی کے پچھلے حصے سے رسّوں کی مدد سے باندھ کر لایا تھا۔

شہر کی جانب سے کوچ کے اعلان کے ساتھ ہی وہ سب کھانے پینے کے سامان سے لدے پھندے شہر کی بڑی سی لینڈ کروزر میں ٹھنس ٹھنسا اور پھنس پھنسا کر بیٹھ گئے۔

"کوئی رہ تو نہیں گیا ہے؟" جاذب نے اپنی طرف کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"اب کیا آپ سب کی حاضری بھی لیں گے؟" ذیشان نے جل کر بیک ویو مرر میں سے اسے دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

ساحل پر پہنچ کر مسحور کن ہواؤں اور لہروں کے شور نے ان کا استقبال کیا۔ حدِ نگاہ تک نیلا نیلا پانی تھا۔ جو بہت دور نیلے نیلے آسمان سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

سامان ہٹ میں پہنچا کر جہاں جس کا منہ اٹھا اس طرف کو چل دیا اور سینگوں سمیت جہاں دل چاہا سما گیا۔

"ذیشان! بات سنو۔" وہ کارڈز لینے اندر ہٹ میں آیا تو خمار اسے دیکھتے ہی بولی۔

"پانی کے دونوں کولر گاڑی ہی میں رہ گئے ہیں، ذرا لا دو۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"گاڑی کی چابی کہاں ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ نہال بھائی کے پاس ہے۔"

"اور نہال بھائی کہاں ہیں؟"

"دیکھ لو، یہیں کہیں ہوں گے۔"

ذیشان نے باہر نکل کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ نہال کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔

"کیا" تم آپ چلے گئے۔ وہ جھنجلاتے ہوئے قریبی چٹان پر چڑھنے لگا۔ چاروں طرف دیکھا پھر نگاہ ایک دم پیچھے کی تو نہال اسے چٹان کی اوٹ میں بیٹھا نظر آ گیا۔ اس کی موجودگی اور اپنے ارد گرد کے ماحول سے بالکل بے خبر و بے نیاز ایک بازو سے اپنے گھٹنوں کے گرد حلقہ بنائے، اپنا چہرا گھٹنوں پر ٹکائے، عجیب خود فراموشی کے عالم میں وہ ایک ہاتھ سے ریت پر کچھ لکھ رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر ذیشان کی نگاہ اس کے ہاتھ کی حرکت میں اُلجھ گئی۔

"اوہ!" وہ شدید ترین حیرت سے دوچار ہوا۔ اس نے بغور دیکھا۔

اس کی اُنگلیاں بار بار ایک ہی نام لکھ رہی تھیں۔

"رانیہ۔"

اور ذیشان نے بات کی تہہ تک پہنچنے میں اور اس کے بعد افسانہ بنانے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ اپنے دل کے ساتھ وہ خود بھی بلیّوں اُچھلتا ہوا پُر جوش سا جلدی جلدی چٹان سے نیچے اُترنے لگا۔ وہ نہال کو جائے واردات پر ثبوت کے ساتھ پکڑنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ نہال تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔

"ذیشان!" ہوا کے خلاف، دوپٹے کے ذریعے بالوں کے لیے حفاظتی اقدامات کرتی زیبا اس کی سمت آ رہی تھی۔

ذیشان ہی نے نہیں، رانیہ کے خیالوں میں مگن نہال نے بھی چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اور جتنی دیر میں ذیشان، نہال تک پہنچتا، ریت پر لکھے ہوئے الفاظ آڑی ترچھی لکیروں میں بدل چکے تھے۔

ذیشان نے نہال کے قریب آ کر بڑی سرسری مگر تجسس بھری نگاہ ریت پر ڈالی۔ رانیہ کا نام ٹیڑھی میڑھی لکیروں میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔

وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"ہنس کیوں رہے ہو تم؟" نہال نے ابرو چڑھا کر پوچھا اور یوں دیکھا کہ جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"بس یونہی۔" اس نے کندھے اُچکائے "کیا میرے دانتوں پر میرا اتنا بھی حق نہیں ہے" جانے کیا سوچ کر اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"تمہیں گاڑی میں سے پانی کا کولر نکال کر لانے کو کہا تھا یا آبِ حیات لینے بھیج دیا تھا۔ جہاں جاتے ہو وہیں بیٹھ جاتے ہو۔" تیز تیز قدموں سے قریب آتی زیبا نے غصّے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھی گاڑی کی چابی نہال بھائی کے پاس تھی۔ میں انہیں ڈھونڈ رہا تھا۔" یہ کہہ کر وہ نہال کی طرف مڑا اور بڑی معنی خیزی سے بولا۔ "اور آپ شاید بہت دُور نکل گئے تھے۔"

نہال نے ایک دم چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

ذیشان نے جھٹ نظریں دوسری طرف کر لیں اور خاصی اونچی آواز میں گنگنانے لگا۔

دل میں طوفاں چھپائے بیٹھا ہوں یہ نہ سمجھو کہ مجھ کو پیار نہیں
تم جو گئے ہو میری دُنیا میں اب کسی کا بھی انتظار نہیں

نہال کچھ کھٹک سا گیا۔

"لایے بھائی جان! جلدی سے چابی دیں۔" وہ اپنی گنگناہٹ کو بریک لگا کر مگر بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "بہت سے لوگ پیاسے ہیں۔ کوئی پانی کا پیاسا ہے، کوئی محبت کا پیاسا ہے۔ کوئی دید کا پیاسا ہے۔ کوئی ملن کا پیاسا ہے۔"

"اور کوئی تمہارے خون کا پیاسا ہے۔" زیبا تڑخ کر بولی۔

ذیشان اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ نہال کے ہاتھ سے چابی لی اور جہاں سے اپنے گنگنانے کا سلسلہ توڑا تھا وہیں سے جوڑتا ہوا زیبا کے ساتھ چلا گیا۔

نہال کا اُلجھا ہوا ذہن اُس کے جملوں اور انداز میں معنی تلاش کرنے لگا۔ آنکھیں سکیڑ کر اس نے دُور جاتے ذیشان کو دیکھا پھر ریت پر اپنی انگلیوں کے نشانات پر نظر ڈالی۔ پچھلی صورتِ حال پر غور کیا تو اپنے راز کے طشت از بام ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آیا کہ جس وقت اس کی نظر ذیشان پر پڑی تھی۔ وہ خاصے فاصلے پر تھا۔ بہرحال اپنی 'بداحتیاطی' پر وہ خود کو سرزنش کرتا ہوا ہاتھ جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور دور کھڑے اطہر کی جانب بڑھ گیا جو ہاتھ کے اشارے سے اسے بُلا رہا تھا۔

ذیشان کو لہ خمار کو دے کر پلٹا تو اسے رانیہ سمندر کی لہروں کو محویت سے تکتی ہوئی نظر آ گئی۔ اس کے تصوّر میں نہال کی ریت پر حرکت کرتی اُنگلیاں آ گئیں۔ اس کے بھینچے ہوئے لب آپ ہی آپ پھیل گئے۔

"کیا دیکھ رہی ہیں اتنے غور سے؟" وہ اس کے نزدیک جا کر بولا۔

"یہ دلفریب منظر۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ "موجوں کا ساحل سے ملنا اور پھر بچھڑ جانا۔ پھر ملنا اور پھر بچھڑ جانا۔ کچھ دیر کا وصل اور کچھ دیر کا فراق۔" وہ سحر زدہ سی اپنی دُھن میں مگن کہہ رہی تھی۔

"آپ کو ہجر اچھا لگتا ہے یا وصال؟" اس نے رانیہ کو نہال کی نظروں سے دیکھا۔ وہ اسے کچھ اور بھی دلکش لگی۔

"ہجر کے بعد وصال۔" وہ بے ساختہ بولی۔ پھر ایک دم جیسے ہوش میں آ گئی اور بُری طرح جھینپ گئی۔

"لاحول ولاقوۃ۔ کیا فضول سوال کر رہے ہو۔" وہ اپنی جھینپ مٹانے کو مصنوعی خفگی سے بولی۔

"مگر مجھے آپ کا جواب بہت اچھا لگا۔" وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ پھر کچھ دیر بعد دوبارہ گویا ہوا۔

"اچھا آیئے، پانی میں چلیں۔"

"نہ بابا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ ہچکچائی۔

"بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اور پھر میں جو آپ کے ساتھ ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر کھینچتے ہوئے پانی میں لے گیا۔

"بس یہیں رُک جاؤ۔ آگے کافی گہرائی ہے۔" اسے واقعی خوف محسوس ہوا۔ پانی گھٹنوں کو چھونے لگا تھا۔

"نہیں۔ آج سمندر کے دوسرے کنارے کو چھو کر آئیں گے۔" وہ رُکا نہیں، آگے بڑھتا رہا۔

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔ سمندر کا کوئی دوسرا کنارا نہیں ہوتا۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ ذیشان نے اور سختی سے پکڑ لیا۔ اسے رانیہ کو تنگ کرنے میں مزا آ رہا تھا۔

"ذیشان! کہاں جا رہے ہو؟ واپس آؤ۔" دونوں کو پیچھے سے نہال کی آواز آئی۔

ذیشان نے مڑ کر ایک نظر دیکھا اور سُنی اَن سُنی کر دی۔

"میرا بس چلے تو پانی میں اتنی دُور تک چلا جاؤں کہ پانی یہاں تک آ جائے۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"تمہارے تو یہاں تک آ جائے اور میرے سر پر سے گزر جائے۔" رانیہ جل کر بولی۔

"ذیشان! کیا بدتمیزی ہے یہ۔ میں کہہ رہا ہوں لوٹ آؤ۔" وہ رانیہ کو لیے آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ جانے کیوں نہال کے دل کو عجیب گھبراہٹ سی ہوئی۔

"اچھا بابا! آ رہا ہوں۔" ذیشان نے جھنجلاتے ہوئے کہا مگر وہ مستقل رانیہ کو اپنی جانب کھینچ کر گہرے

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

پانی میں لیے جا رہا تھا۔
"ذیشان!" نہال کی غصے میں دھاڑتی ہوئی آواز سمندر کی لہروں پر پھیل گئی۔
ذیشان رُک گیا۔
"آیئے واپس چلیں۔"
رانیہ نے پلٹ کر ساحل پر کھڑے نہال کو دیکھا۔ اتنی دُور سے بھی اسے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ کیسی خونخوار نگاہوں سے ان دونوں کو گھور رہا ہو گا۔
جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ اسے مزید جلائے، اس کے احساسات میں آگ بھڑکا دے۔ اس کے پچھلے رویوں کا تھوڑا بدلہ ہی لے لے۔ اسے خوب تپائے۔ (آخر یہ شخص اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے)
"نہیں، تھوڑی دُور اور چلیں گے۔" بڑی پُراسرار سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ گئی۔
"ایں!" اس لمحے وہ ذیشان کی سمجھ سے باہر ہو گئی۔ کہاں تو وہ اس قدر گھبرا رہی تھی اور اب کہہ رہی ہے تھوڑی دُور اور چلیں گے۔
"نہیں باجی۔ اب قدم جمانا مشکل ہو رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بپھری ہوئی موج آئے اور ہم دونوں یہیں سے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو جائیں۔ ناں۔ ابھی میرا مرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔ ذرا میں چار چھ بچوں کی بہاریں ہی دیکھ لوں۔"
"کچھ نہیں ہوتا۔ تم آؤ تو۔ اور ہو جائے گی تمہاری شادی بھی۔ مت ہلکان ہو۔"
پہلے ذیشان آگے تھا اور رانیہ پیچھے، اب رانیہ آگے تھی اور ذیشان پیچھے۔
اس منظر نے نہال کو جھلسا کر رکھ دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ رانیہ اسے جلانے کو جان بوجھ کر یہ حرکت کر رہی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ رانیہ کو جان سے مار ڈالے۔
وہ —
جو اسے نہ جینے دیتی تھی۔ نہ مرنے دیتی تھی۔
نہ پاس آنے دیتی تھی، نہ دُور جانے دیتی تھی۔
آنکھوں کا خواب بھی تھی اور جان کا عذاب بھی۔
جو اس کے دل کی سلطنت پر حکمرانی بھی کر رہی تھی اور اس کے جذبات سے کھیل کر بے ایمانی بھی کر رہی تھی۔
جو اس کے دل کی بھی چور تھی اور چین کی بھی۔
جو اس کے خیالات کو آباد بھی کر رہی تھی اور اسے برباد بھی۔
جس نے اس کا تن من پھونک ڈالا تھا۔ اور اب مزید جلانے پر تُلی ہوئی تھی۔
زہر لگ رہی تھی اس وقت مگر —
پیاری بھی تو بہت لگ رہی تھی کہ نظر کو اس کے چہرے کے علاوہ کوئی منظر نہ بھا رہا تھا۔
سفید چکن کے کُرتے اور فیروزی شلوار اور دوپٹے میں وہ بے حد سادہ مگر بے حد منفرد لگ رہی تھی۔
"ہونہہ۔ جہنم میں جائے میری طرف سے۔" اس نے دل کی آواز کو دبایا۔ جو چلو چھوڑو، جانے دو۔ محبوب کا ستم بھی کرم ہی ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ کی آوازیں بلند کر کے عام معافی کا اعلان کرنے کی استدعا کر رہا تھا۔
شدید جھلاہٹ میں وہ بغیر سوچے سمجھے ایک بڑی سی چٹان پر چڑھنے لگا۔ جس میں جگہ جگہ نوکیلے پتھر اُبھرے ہوئے تھے۔ یکایک اس کا پیر پھسلا اور وہ تیزی سے نیچے گرنے لگا۔ مگر جلد ہی اس کا پیر ایک بڑے پتھر پر مضبوطی سے جم گیا اور وہ سنبھل گیا لیکن ایک نوکیلا پتھر پھر بھی اس کے بازو میں گہری خراش ڈال گیا۔ اس کے بازو سے خون رِسنے لگا۔ نہال نے اپنا دوسرا ہاتھ بازو پر رکھا اور سہج سہج کر نیچے اُترنے لگا۔
اسے علم نہیں تھا کہ رانیہ اور ذیشان دونوں اس کو دیکھ چکے ہیں اور نہایت تیزی سے وہ نہال کے قریب آ رہے تھے۔

"کیا ہوا؟" رانیہ نے بے حد تشویش کے ساتھ بے ساختہ ہی اس کا بازو تھام لیا اور بڑی فکرمندی سے بولی۔
جانے اس تشویش کی وجہ محض انسانی ہمدردی کا جذبہ تھا یا کوئی اور جذبہ اس کے پیچھے کارفرما تھا۔
"ذیشان! ذرا رومال دینا!" نہال نے جس بے دردی سے رانیہ کا بازو جھٹکا اتنی ہی نرمی سے ذیشان کو مخاطب کیا۔
رانیہ، ذیشان کے سامنے جیسے زمین میں گڑ سی گئی۔ اس کے احساس کے نازک شیشے پر بڑی شدید ضرب پڑی تھی۔ اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے اپنا رومال نہال کی طرف بڑھایا۔
"یہ لیجیے!"
"رہنے دیں۔ خراب ہو جائے گا۔" وہ رُکھائی سے بولا۔ "جاؤ ذیشان! تم شہیر سے لے آؤ!"
ذیشان تیزی سے مُڑ گیا۔
رانیہ شرمندہ شرمندہ سی اس کے بازو کو تکے چلی جا رہی تھی۔ بے عزتی کے شدید احساس نے اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگا دی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی شبنم اس کے عارضوں کے گلابوں کو بھگوتے ہوئے وسیع بے کراں سمندر میں مل کر اپنی قیمت کھونے لگی۔
اس نے اپنا چہرا دوسری طرف کر لیا۔
نہال نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ جانے اس کے چہرے پر کیا تھا کہ نہال نے بڑی آہستگی سے اس کی انگلیوں میں اُلجھا رومال چھڑایا اور اپنے بازو پر لپیٹ لیا۔
"ویری سوری!" وہ ہولے سے بولا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

غم و غصے کے شدید احساس کے ساتھ اس کے آنسو اور بھی روانی سے بہنے لگے۔
"کہہ تو رہا ہوں سوری!" وہ قدرے بے بسی سے بولا۔ اس لمحے اسے پہلی بار احساس ہوا کہ رانیہ کے آنسو کتنے طاقتور ہیں، اور اس کا دل کتنا کمزور
رانیہ نے اپنا چہرا یوں دوسری سمت کیا کہ گویا لفظ بھیجنا بھی گوارا نہ ہو۔
"کیا مشکل ہے بھئی؟" وہ سخت جھنجھلا گیا۔ "تم تو قتل بھی کر دو تو چپ چاپ نہیں ہوتا۔ اور میری ذرا سی غلطی بھی جھنڈے پر چڑھ جاتی ہے۔"
ابھی مزید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ اسے دور سے شیراز اور ذیشان تیز تیز قدموں سے آتے دکھائی دیے۔
"اپنے آنسو پونچھ لو، شیراز بھائی آ رہے ہیں، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے آنسو دیکھ کر یہ سمجھ لیں کہ ہمارے تعلقات اس نہج تک پہنچ چکے ہیں کہ چوٹ مجھے لگتی ہے، اور درد تمہیں ہوتا ہے۔" اس کی آنکھوں، اس کے لہجے اور اس کے لفظوں میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھر گئی۔
"اُف میرے خدا!" رانیہ کا جی چاہا کہ بال ہی نوچ لے۔ مگر عجلت میں فیصلہ نہ کر پائی کہ پہلے اس کے نوچے یا اپنے۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر اس شخص کو دیکھا جو احساس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا سفر اتنی سرعت سے طے کرتا تھا کہ سمجھ سے ہی باہر ہو جاتا تھا۔
یہ شخص۔
جو اس کے دل کے شبستانوں میں چاند بن کر طلوع ہونا چاہتا تھا۔
جو اس کے دل کے ایوانوں کے بند دروازوں کو کھولنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔
جو اس کی ذات کے اِردگرد کھڑی فصیلوں کو پار تو نہیں کر پایا تھا۔ مگر ان میں دراڑیں ضرور ڈال چکا تھا۔
جو اس کے ہاتھوں پر اپنا نام لکھنا چاہتا تھا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کبھی کبھی اسے یوں لگتا جیسے وہ اس کے آگے کمزور پڑ جائے گی۔ اس سے ہار جائے گی۔ (ایسے بپھرے ہوئے جذبات کا مقابلہ نازک ساحل کب تک کر سکتا ہے)

اسے لگتا جیسے وہ بہت زور آور ہے، اس کی ہستی پر چھا جائے گا، اسے فتح کرے گا۔ اس کے دل کی سرزمین پہ اپنے نام کا جھنڈا گاڑ دے گا جس پہ بڑا بڑا لکھا ہوگا۔ "محبت زندگی ہے۔"

لیکن اس سے پہلے وہ اپنے دل کے شبستانوں میں اس کے وجود کی چاندنی کو محسوس کرتی، از خود اس کے لیے دل کے ایوان کھولتی، اپنی ذات کے گرد کھڑی فصیلوں کو پار کرنے کے لیے راستہ دیتی یا اس کے مضبوط ہاتھ تھام کر اپنی نرم و نازک ہتھیلی پر خود ہی اس کا نام لکھتی۔

ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی کہ بے ساختہ اُس کا جی چاہتا کہ سرے سے اسے پہچاننے سے ہی انکار کر دے۔ اس کے وجود سے ہی منکر ہو جائے۔

اپنے دل کے باہر کھڑے اس منتظر اور سوالی شخص سے کہہ دے۔

"جاؤ بابا معاف کرو۔"

اس وقت بھی وہ ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھی۔ نہال سے متعلق ہر منفی احساس نے اس کے دل میں آگ لگا رکھی تھی۔ جی تو اس کا یہی چاہ رہا تھا کہ نہال کو بھی اسی آگ میں جھونک دے، مگر بے بس تھی، خود ہی اپنی آگ میں جلنے پر مجبور تھی کہ سب لوگوں کی موجودگی میں تماشا بنا کر وہ خود تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔

وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔

اسی اثنا میں شیراز اور ذیشان اس کے قریب پہنچ گئے۔

"کیا ہوا؟" شیراز نے بے حد تشویش سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یوں ہی پتھر چبھ گیا تھا بازو میں۔" اس نے بازو پر بندھے رانیہ کے گلابی رومال کو کھولتے ہوئے کہا۔ زخم سے بہتے خون کی وجہ سے رومال سرخ ہو گیا تھا۔

"نہیں ضرورت کیا تھی ان پتھروں پر چڑھنے کی۔" یہ کہتے ہوئے شیراز اس کے زخم کا بغور جائزہ لینے لگا۔ "نہال! تمہیں تو خاصی چوٹ لگی ہے۔ زخم کافی گہرا محسوس ہو رہا ہے۔" وہ فکرمندی سے بولا۔

"میرا کیا ہے، مجھے تو چوٹیں لگتی ہی رہتی ہیں۔ بہت سے زخم تو اس سے بھی زیادہ گہرے ہیں۔ مندمل ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔" اس کی ہنسی طنزیہ تھی اور لہجہ خاصا کڑوا۔

ذیشان نے ایک نظر شیراز کو دیکھا اور پھر نہال پر نگاہ ڈالی۔

"چلو میرے ساتھ، زخم صاف کر کے اس پر دوبارہ پٹی باندھ دوں۔" شیراز جو اس کے لفظوں میں الجھ گیا تھا، سر جھٹک کر بولا۔

"کب تک میرے زخم صاف کر کے ان پر مرہم رکھتے رہیں گے۔ ایک وقت آئے گا آپ بھی تھک جائیں گے۔" اس کے لہجے کی آزردگی کو دونوں نے ہی بری طرح محسوس کیا۔

"وہ وقت کبھی نہیں آئے گا شیراز کی زندگی میں۔" اس نے مضبوط اور قطعی لہجے میں کہا۔

"آؤ۔ جواہر کھانے پر ہمارا انتظار بھی کر رہی ہے۔" اس نے نہال کی پشت پر ہاتھ رکھا، اور اس کو لے کر ہٹ کی طرف چل دیا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد نہال ہٹ سے باہر جانے لگا تو پیچھے سے زیبا نے پکارا۔

"بھائی جان کہاں جا رہے ہیں؟"

"کیوں؟" اس نے پلٹ کر پوچھا۔

"اس وقت کہیں نہ جائیں، ہم لوگ پارسل گیم کھیل رہے ہیں۔" وہ یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور بیگ میں سے کچھ ٹٹولنے لگی۔

زیبا کے اٹھنے سے رانیہ کے برابر والی جگہ خالی ہو گئی۔ وہ نشست دروازے کے پاس تھی۔ نہال بھی دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر اس جگہ بیٹھ گیا۔

رانیہ نے سرسری نگاہ سے اُسے دیکھا اور پھر لاتعلق سے انداز میں چہرا دوسری طرف کر لیا۔

قہقہوں کے شور میں پارسل گیم کھیلا جانے لگا۔ زیبا نے خاصی انوکھی اور دلچسپ فرمائشیں اور سزائیں لکھی تھیں۔

اطہر، شہیر، خمار اور ثانیہ کی شامت آنے کے بعد اگلی باری نہال کی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے پرچی کھولنے لگا۔ پھر ایک دم رانیہ سے مخاطب ہوا۔

"آیئے، باہر چلیں۔"

وہ اس کی یوں غیر متوقع بات پر ہونق ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب؟" سبھی نے بیک وقت پوچھا۔

"کیا لکھا ہے پرچی پر؟" خمار اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اس پر لکھا ہے کہ اپنے دائیں سمت بیٹھے شخص سے کوئی اچھی سی بات کہیں۔" اس نے رانیہ کو شوخ نگاہوں سے دیکھا، جو اس کے دائیں طرف بیٹھی تھی، اور اپنے کانوں کی لوؤں کو تپتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

"تو کہہ دیجیے ناں، اس میں باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟" ذیشان نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے قدرے حیرانی سے کہا۔

"بھئی، اس میں تو لکھا ہے کہ دائیں سمت بیٹھے شخص سے کہیے۔ اگر میں یہاں بیٹھ کر کہوں گا تو تم سب سنو گے۔" اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔

"تو اس میں حرج کیا ہے؟"

"اور اگر رانیہ شرما گئیں تو؟" اس نے کھنکتی آواز میں کہا۔

سب نے اس کی بات کو شرارت پر محمول کرتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا۔

دوسری جانب رانیہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے مارے شرم کے اس کے ہر ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے چہرے پر یہ تاثر کس طرح قائم رکھے کہ وہ بھی نہال کی شرارت سے بظاہر محظوظ ہو رہی ہے۔ (ورنہ دل تو سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا۔ کہ نہال کو کچا ہی کھا پی کر برابر کرے۔)

"چلیے ناں۔" جانے کیسے کیسے جذبات اس کے لہجے میں در آئے۔

مارے شرم کے رانیہ کی حالت بالکل ہی غیر ہونے لگی۔ وہ اس وقت ہر نگاہ کی زد میں تھی۔

"بھئی نہال بھائی! آپ کیوں تنگ کر رہے ہیں رانیہ کو۔" جواہر، نہال کے دل کا حال تو نہ جانتی تھی، مگر رانیہ کی بظاہر شرمندہ حالت پر اسے ترس آنے لگا۔

"اچھا! میں تم سب کو ایک نظم سنا دیتا ہوں۔" اس کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ ابھی رانیہ کو مزید تنگ کرے مگر سب لوگوں کی موجودگی میں وہ حد سے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔

"ضرور، ضرور۔" کئی آوازیں جو شعر و شاعری سے خاصا شغف رکھتی تھیں، ایک ساتھ ابھریں۔

نہ شکایتیں نہ گلہ کرے
کوئی ایسا شخص ہوا کرے
جو میرے لیے ہی سجا کرے
جس کی زلف مجھ پہ ہوا کرے
نہ شکایتیں نہ گلہ کرے

کبھی روئے جائے وہ بے پناہ
کبھی بے تحاشا اداس ہو
کبھی چپکے چپکے دبے قدم
میرے پیچھے آ کر ہنسا کرے
نہ شکایتیں نہ گلہ کرے

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میری قربتیں، میری چاہتیں
کوئی یاد رکھے قدم قدم
میں بڑے طویل سفر میں ہوں
میری واپسی کی دعا کرے
نہ شکایتیں نہ گلہ کرے

اس نے نظم ختم کی تو ہر سمت واہ واہ ہونے لگی۔

"نہال! تمہارا ذوق بہت اچھا ہے۔" اطہر نے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

"میں خود بھی اتنا برا نہیں ہوں۔" اس کی مدھم آواز صرف وہی سن سکی، جس کو اس نے سنانا چاہا۔

نہال کے نظم سنانے کے ساتھ ہی نشست شعر و سخن کی محفل میں بدل گئی۔ سبھی اپنی اپنی پسند کے اشعار سنانے لگے۔

"ذیشان! تم کوئی اپنی کہی ہوئی نظم سناؤ ناں۔" جواہر نے ذیشان سے کہا۔

"تم شاعری بھی کرتے ہو۔۔؟" رانیہ نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

"بس یونہی تھوڑی بہت بکواس کر ہی لیتے ہیں۔" زیبا ذیشان کو چڑانے کے لیے جھٹ بولی۔

ذیشان جواً چڑانے کا مظاہرہ کرنے ہی والا تھا، اپنے ارادے کو موقوف کر کے اس نے زیبا کو یوں دیکھا جیسے سالم ہی نگل جائے گا۔

"یوں نہ دیکھو مجھے۔ میں تمہیں ہضم نہیں ہوں گی۔" اس نے ذیشان کے عزائم بھانپتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"سناؤ ناں ذیشان! اپنے کچھ اشعار۔" رانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔

"کیوں؟"

"یہاں پر ایک سے بڑھ کر ایک بیٹھے ہیں۔ میرے اشعار کا ایسا پوسٹ مارٹم کریں گے کہ تقریباً جنازہ ہی نکال دیں گے۔ اور میں اپنے اشعار کی شان میں گستاخی قطعی برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ صاف انکاری تھا۔

"نہیں، تم سناؤ۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ جھوٹا وعدہ کرتے ہیں۔" زیبا نے معصومیت سے کہا۔

اس کی بات پر سب ہنس پڑے۔

ذیشان نے تنے تنے چہرے کے ساتھ لب بھی سختی سے بھینچ لیے۔ گویا ابھی مزید منتیں کرانے کا ارادہ تھا۔

سبھی اس سے اصرار کر رہے تھے اور وہ تھا کہ نخرے دکھائے جا رہا تھا۔

"سنا دو ناں ذیشان! اتنے لوگوں کی شور نما آوازوں پہ رانیہ کی خوبصورت مترنم آواز اور دلکش لہجہ اس طرح حاوی ہو گیا کہ سارے ماحول پہ خاموشی طاری ہو گئی۔ سبھی اس کی طرف دیکھنے لگے۔

اور نہال کا دل تو سینے میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

(کاش کبھی اس لہجے، اس انداز سے میرا بھی نام لو۔ جاؤ آج سے اپنی سماعتیں بھی تمہارے نام کر دیں)

اس نے والہانہ سی نگاہ اس پر ڈالی اور اس پہ سے نثار ہونے کا پروگرام کسی مناسب وقت کے لیے ملتوی کر دیا۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ محفل میں کوئی اور بھی موجود ہے، جس نے رانیہ کے لہجے کو اپنے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا ہے۔

شیراز کی خوبصورت جذبوں سے سجی نظروں نے بہت چپکے سے رانیہ کو چھوا اور خاموشی سے پلٹ گئیں۔

"آپ کہہ رہی ہیں تو میں سنا دیتا ہوں۔" ذیشان نے رانیہ سے کہا اور پھر پہلو بدل کر بولا۔

"عرض کیا ہے۔۔"

"اب کر بھی چکو۔" خمار نے برا سا منہ بنایا۔

ذیشان منہ سے کچھ نہ بولا، خمار کو گھورنے پر ہی اکتفا کرنے کے بعد شعر سنانے لگا۔

؎ ابھی وہ آئی ہی تھیں نظر، کہ بجلی چلی گئی

"وہ کون؟ نام تو بتاؤ، کون ہیں؟ کیسی ہیں؟" اطہر صاحب نے پوری معلومات کے بغیر مزید آگے سننے سے انکار کر دیا۔

ابھی ذیشان کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ زیبا کی بڑی اشتیاق بھری آواز آئی۔

"ذیشان آنکھیں کیسی ہیں ان کی؟"

"کس کی؟" وہ حیران و پریشان ہو کر بولا۔

"بھابی جان کی۔" اس نے نچلا ہونٹ دبا کر مسکراہٹ روکی۔

ذیشان کا تو بھیجہ ہی الٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ زیبا پہ چڑھائی کرتا، شیراز نے فوراً قیامِ امن کے سلسلے میں اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا۔

"بھئی، اس طرح تم لوگ آپس میں جھگڑتے رہو گے تو ذرا لطف نہیں آئے گا۔ خاموشی سے سنو ناں۔ ذیشان آگے سناؤ۔" اس نے ذیشان کی طرف دیکھا، جس کے جذبات مارے غصے کے ابھی تک ابل رہے تھے۔ نتھنے پھول اور پچک رہے تھے۔

بمشکل تمام اسے زیبا کے خلاف محاذ آرائی ختم کر کے مزید آگے سنانے پر راضی کیا گیا۔

"میں کوئی اپنی آپ بیتی نہیں سنا رہا ہوں، سمجھیں۔ خبردار! جو میری ذاتیات کے آس پاس بھی بھٹکیں۔" اس نے زیبا کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

زیبا ایک ڈھیٹ واقع ہوئی تھی۔ اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ ادھر سے سن کر ادھر اڑا دی، اور ذیشان کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اگلے حملے کے لیے پوری طرح تیار ہو۔

بہرحال ذیشان اپنی کہی نظم سنانے لگا۔

ابھی وہ آئی ہی تھیں نظر، کہ بجلی چلی گئی
ابھی میں نے تھاما ہی تھا جگر، کہ بجلی چلی گئی

"کم بخت ماری کیسے غلط وقت پر چلی گئی۔" زیبا کی زبان کا تالو سے لگنا ناممکنات میں سے تھا۔ اس نے فوراً سے پیشتر اپنے دلی جذبات کا تاسف کی صورت میں اظہار کرتے ہوئے بجلی کو بھی کوس ڈالا۔

"زیبا! تم چپ نہیں رہو گی۔" شہیر نے اسے ڈانٹ دیا۔

اس نے جھٹ منہ پر انگلی رکھ لی۔ اس کی اس ادا پر ذیشان بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"ذیشان! تم تواتر سے سنائے جاؤ۔ کسی کے بولنے کی پرواہ نہ کرو۔" جواہر نے بھی زیبا کو گھورا۔

خدمت میں ان کی پیش کرنے نہ پایا تھا میں
دل نکال کر رکھا ہی تھا طشت پہ، کہ بجلی چلی گئی

ایسے اندوہناک حادثے پر اکثریت مارے صدمے کے بے حال ہو گئی، اور "واہ واہ" کی جگہ "ہائے ہائے" ہونے لگی۔

یہ میری پُرشوق نگاہوں کا اعجاز تھا مگر
روپ آنے بھی نہ پایا رُخِ یار پہ، کہ بجلی چلی گئی!

"اوہو۔ چچ چچ۔ بے چارا اپنی پُرشوق نگاہوں کے آفٹر افیکٹ بھی نہ دیکھ پایا۔" نہال میاں پر بھی رقیق القلبی طاری ہو چکی تھی۔ موصوف نے بھی دکھ و ہمدردی کے اظہار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اظہارِ تمنا کو بے چین تھی، یہ زبان میری
پکارا ہی تھا دلبر، اے جانِ جگر، کہ بجلی چلی گئی!

"ہائے اللہ۔ دل کی بات دل میں ہی رہ گئی۔ ہونٹوں تک نہ آنے پائی۔" زیبا نے ایک لمبی چیخ ماری اور پچھاڑیں کھانی شروع کر دیں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کہا سُن اے حسن والی! یہ میرا دل خالی ہے ترا سوالی
چاہت کی سوغات کرنے لگا تھا ان کی نذر کہ بجلی چلی گئی

اب تو محفل میں باقاعدہ قسم کی آہیں اور سسکیاں بلند ہونی شروع ہوگئیں۔ اور کمزور دل حاضرین پر تو تقریباً غشی ہی طاری ہوگئی۔

بل کھا کے مڑیں، ہاتھ میں چپل سنبھالی، لب پہ گالی
پھٹکار کی ہی تھیں اللہ کی مار تجھ پہ، کہ بجلی چلی گئی

"ایں!" حاضرینِ محفل ایک جھٹکے سے سیدھے ہوگئے۔

"ارے اللہ کی مار ہو گی خود اس پہ"۔ زیبا پچھاڑیں کھانے کو فوری طور پر ملتوی کر کے بلبلا اُٹھی۔

کیا حسین لب تھے، کیا مغلظات کی بوچھاڑ اللہ اللہ
اس پہ بس نہ کیا، بلانے لگیں اپنا منگیتر کہ بجلی چلی گئی

"اوئی کمبخت کی منگنی ہو چکی تھی"۔ مارے حیرت کے خمار نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

بھاگ نکلا اُٹھائے عشق کے لاشے کو کندھے پہ میں
یہ کہتا ہوا خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر کہ بجلی چلی گئی!!

نظم کے اختتام پر اس پہ داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جانے لگے۔ ذیشان میاں اترا اترا کر داد وصول کرتے رہے، کچھ دیر بعد سب لوگ دو دو چار کی ٹولی میں اسٹیمر کے ذریعے سمندر کی سیر کو نکل گئے۔

شام کے سائے جب بڑھنے لگے تو شہیر نے واپسی کا فرمان جاری کر دیا۔

"کچھ دیر اور ٹھہر جائیں بھائی جان! ہم سورج غروب ہونے کا منظر تو دیکھ لیں"۔ زیبا لسبورکر بولی۔

"ہرگز نہیں، بس اب گھر چلو، کافی دیر ہوگئی ہے"۔ اس نے قطعیت سے انکار کیا۔

"ہونہہ۔ جہاں دادا جان نہ ہوں وہاں شہیر بھائی دادا جان بن جاتے ہیں"۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر بڑبڑانے لگی۔

شہیر نے موذی دیدہ نظروں سے بہن کو دیکھا، اور ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ دبالی۔

سب نے مل کر جلدی جلدی سامان سمیٹنا شروع کیا۔ جاذب گاڑی ہٹ کے نزدیک لے آیا۔ اظہر اور نہال گاڑی میں سامان رکھنے لگے۔

جاذب نے "کمی بیشی" کا اندازہ کرنے کے لیے ایک نگاہ سب پر ڈالی۔

"یہ شیراز بھائی کہاں غائب ہوگئے؟" اس نے شیراز کو نہ پا کر کہا۔

"جاؤ ذیشان انہیں بُلا کر لاؤ۔ اب گھر واپس چل رہے ہیں۔"

ذیشان، شیراز کو ڈھونڈنے نکل گیا۔ جس کا دور دور تک نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے ایک بڑی سی چٹان پر چڑھ کر دیکھا، شیراز اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ جھنجھلا کر وہیں بیٹھ گیا اور چٹان پر اُبھرے پتھروں کو دیکھنے لگا۔ وہ چٹانیں قدرتی طور پر آپس میں اس طرح ملی ہوئی تھیں کہ درمیان میں بڑا سا خلا بن گیا تھا۔ بپھری ہوئی موجیں جب ساحل سے آکر ٹکراتیں تو وہ خلا پانی سے بھر جاتا، اور اس میں پانی ٹھہر جاتا۔ پھر وہ ٹھہرا ہوا پانی چٹان میں ہی جگہ تلاش کر کے آہستہ آہستہ دوبارہ سمندر میں شامل ہونے لگتا۔ ذیشان اس خلا کو غور سے دیکھنے لگا۔ اچانک اسے سفید رنگ کی کاغذ کی کشتی اس ٹھہرے ہوئے پانی پر تیرتی نظر آگئی۔ اس نے گردن آگے کر کے جھانکنے کی کوشش کی، تو ایک نہیں۔ کئی چھوٹی چھوٹی کشتیاں پانی میں ہلکورے لے رہی تھیں۔ جانے کس نے کشتیاں بنا کر پانی میں ڈال دی تھیں۔

ذیشان کو یہ منظر اتنا بھلا لگا کہ وہ گھٹنوں پر چہرا رکھ کر انہیں پانی میں حرکت کرتے دیکھنے لگا۔ بے ساختہ اس نے ہاتھ بڑھایا اور پانی میں سے ایک کشتی نکال لی۔

اور اگلے ہی لمحے اُسے یوں لگا جیسے وہ چٹان پر نہیں ہے، بلکہ چٹان اس کے اوپر آگئی ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کشتی پر لکھے الفاظ دیکھ رہا تھا۔

"رانیہ! آپ کو دیکھنے کے بعد میں اپنی آنکھوں سے پیار کرنے لگا ہوں۔"

اور شیراز کی رائٹنگ کو تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

"بھائی جان! آپ کی رائٹنگ ایسی ہے جیسے موتی پروئے گئے ہیں، اور میری رائٹنگ ایسی ہے جیسے موتی ٹوٹے ہوئے ہیں"۔ اپنے کہے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔

اس نے پتھرائی آنکھوں سے پانی میں تیرتی کشتیوں کو دیکھا۔ اور ایک کے بعد ایک ساری کشتیاں نکال لیں۔ ہر کشتی پر ایک ہی جملہ لکھا تھا۔ جس نے اس کے وجود میں قیامت برپا کر دی تھی۔

وہ ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اس کے اندر ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ وہ آندھیوں کی زد میں تھا۔ ہر طرف ریت ہی ریت اُڑ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا مگر ہر کوشش رائیگاں جا رہی تھی۔

اس کے ذہن کی اسکرین پر دو منظر تیزی سے آجا رہے تھے۔

ریت پر حروف کو ترتیب دیتی نہال کی اُنگلیاں۔

اور پانی میں بہتی یہ سفید کشتیاں،

اور پھر آسمان کی نیلاہٹیں اور سمندر کی نیلاہٹیں ایک دوسرے میں مدغم ہوگئیں۔ ہر طرف اندھیرا بڑھ گیا، اور ذیشان اس اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

جانے کیسا عجیب سا احساس ہوا کہ اس نے ایک دم پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ نہال کا مہربان چہرا اس پر جھکا ہوا تھا، اور خود اس کا سر شیراز کی گود میں تھا۔

"ذیشان کیا ہوا؟" نہال کے لہجے سے حد درجے پریشانی جھلک رہی تھی۔

وہ کچھ دیر خالی خالی نگاہوں سے نہال کو دیکھتا رہا، پھر اپنی ویران آنکھیں شیراز پر جما دیں، جو سے پُرتشویش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ذیشان!" شیراز نے بہت محبت سے اُسے پکارا۔

وہ ایک دم تڑپ کر اُٹھا۔ اور دور ہٹ کر بیٹھ گیا۔ نہال اور شیراز نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ذیشان اپنے بازوؤں میں سر دیے ساکت بیٹھا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے چہرا اُٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔ ان کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس نے طویل گہرا سانس لیا اور مدھم لہجے میں بولا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ شاید مجھے چکر آگیا تھا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبانے لگا۔

نہال نے بے اعتباری سے اسے دیکھا۔

"میں واپس آرہا تھا تو میں نے تمہیں یہاں پڑا پایا۔" شیراز کہہ رہا تھا۔

"ہم نے اسے آپ ہی کو بُلانے بھیجا تھا۔ کافی دیر تک جب یہ نہیں آیا تو میں آپ دونوں کو ڈھونڈنے نکلا۔ اُٹھو ذیشان اُٹھو، گاڑی تک چلنے کی ہمت کرو۔" اس نے پہلے شیراز سے اور پھر ذیشان سے کہا۔

دونوں اسے سہارا دے کر گاڑی تک لائے۔

"اسے کیا ہوا؟ بخار اسے یوں آتا دیکھ کر بُری طرح گھبرا گئی۔

"سبھی" "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" پوچھ رہے تھے، اور ذیشان بالکل خاموش کھڑا ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

ذیشان نے نگاہ کا زاویہ بدل کر زیبا کو دیکھا۔

اے کاش اس کی یادداشت واقعی گم ہو جائے۔

اے کاش اسے کچھ یاد نہ رہے کہ نہال اس کا کیا لگتا ہے۔

شیراز سے اس کی کیا رشتہ داری ہے۔

رانیہ سے اس کا کیا واسطہ ہے۔

کاش وہ سب کچھ بھول جائے۔

مگر وہ کچھ بھی نہیں بھولا تھا۔ اسے سب کچھ یاد تھا۔

ریت پر لکھا نام بھی۔

اور کشتی پر لکھا پیغام بھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس نے رانیہ کو دیکھا جو آنکھوں میں تردّد لیے اسے تک رہی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ لوگ اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ جب کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔" اس نے اپنے لہجے کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ "یوں ہی چکر سا آگیا تھا تو میں وہیں گر گیا تھا۔"

"اب تو ٹھیک ہو ناں؟" جواہر فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

"بالکل۔" وہ جبراً مُسکرایا۔

"چلو گھر چلیں۔" سب لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں بات آئی گئی ہو گئی۔ ہلکی پھلکی باتیں کرتے وہ لوگ نہال کے فلیٹ پر پہنچ گئے۔

نہانے دھونے سے فراغت کے بعد خمار سب کے لیے چائے بنا لائی۔ چائے پینے کے بعد اپنے تھکے ہارے جسموں کو لے کر جس کو جہاں جگہ ملی وہیں لیٹ گیا۔ نہال بھی اپنے کمرے میں آکر صوفے پر نیم دراز ہو گیا، اور آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر میں اسے باہر والے کمرے سے آواز آئی۔ رانیہ غالباً ذیشان سے مخاطب تھی۔

"پلیز، تم مجھے گھر چھوڑ آؤ۔"

"آپ آج یہیں رُک جائیے۔"

"نہیں۔ بس اب گھر چلوں گی۔ میں خود ہی چلی جاتی مگر مغرب ہو چکی ہے۔ اب اس وقت تنہا باہر نکلنا مناسب نہیں لگتا۔" دراصل اسے خود بھی ان لوگوں سے یہ کہتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ کہ اسے گھر چھوڑ آئیں۔ سبھی تھکے ہوئے تھے مگر وہ بھی کیا کرتی مجبور تھی۔

"آج شاید ہم سب بھی یہیں رہیں گے۔ تم بھی رہ جاؤ۔ صبح چلی جانا۔ میں نے تو تانیہ کو بھی روک لیا ہے۔" جواہر بھی اس سے ٹھہر جانے پر اصرار کرنے لگی۔

"میں ضرور رُک جاتی، مگر اماں بی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، اور ایسے میں وہ تنہائی سے زیادہ گھبرا رہی ہوں گی۔" وہ خاصی وضاحت سے بات کر رہی تھی۔ "یہ اطہر بھائی کہاں رہتے ہیں۔ اگر ان کا جانے کا پروگرام ہو، اور میرا گھر راستے میں پڑتا ہو تو میں ان کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے، اگر ان کو آؤٹ آف وے بھی جانا پڑے تو کوئی بات نہیں، وہ تم کو چھوڑ ہی دیں گے۔" جواہر نے یہ کہتے ہوئے کھڑکی سے اندر جھانکا۔

قالین پر پڑا اطہر دیوار کی طرف منہ کر کے اس طرح سویا ہوا تھا جیسے ساری دنیا سے ناراض ہو کر سویا ہو۔

"یہ تو سو رہے ہیں۔" جواہر خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "رانیہ! تم رُکو۔ میں کہتی ہوں کسی سے کہ تم کو چھوڑ آئے۔"

نہال تمام آوازیں بخوبی سُن رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ رانیہ کو روک لے۔ اے کاش وہ اس کو روکنے کا حق رکھتا۔ کاش وہ اس کے پاؤں میں اپنے استحقاق کی زنجیر ڈال سکتا۔

"نہال بھائی!" جواہر کمرے میں داخل ہوئی۔

"ہوں!" وہ آنکھیں بند کیے کیے بولا۔

"کیا سو رہے ہیں۔"

"نہیں تو۔ کہو کیا کام ہے۔"

"پلیز رانیہ کو گھر چھوڑ آئیں۔"

نہال نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ "تم چلو میں آتا ہوں۔"

وہ باہر نکلا تو رانیہ بیرونی دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"چلیے۔" نہال نے میز پر سے کار کی چابی اٹھائی۔

"کیا کوئی اور نہیں ہے جو مجھے چھوڑنے کے لیے جا سکے۔" اسے تو پہلے ہی نہال پر سخت تاؤ آرہا تھا۔ اس کی طرف سے ویسے ہی بھری بیٹھی تھی۔ اس کو ساتھ چلتا دیکھ کر بُری طرح سُلگ گئی۔

"آپ کے لیے میں ہی مناسب ہوں۔" اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔

اس کا لہجہ شوخ تھا۔ نگاہوں میں مستی تھی اور چہرا ان کہے افسانے کہہ رہا تھا۔

فرج کا دروازہ کھولے کھڑے شیراز نے ایک دم چونک کر نہال کو دیکھا۔ اس کے وجود میں ایک زوردار دھماکا ہوا اور تمام آرزوؤں کے پرخچے اُڑ گئے۔

نہال کا لہجہ، اس کے الفاظ، اس کا انداز، اس کی نظریں، اس کا چہرا پُکار پُکار کر کہہ رہے تھے، کہ وہ رانیہ کے طلبگار ہیں۔

شیراز کے دل میں کھلی خواہش کی ننھی سی کلی پہ برق گر گئی، سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ پل بھر میں زمین اوپر اور آسمان نیچے آگیا۔

کچن کی کھڑکی کے قریب موجود ذیشان نے شیراز کے بدلتے رنگوں کو دیکھا۔ اس کا چہرا یوں لگ رہا تھا جیسے دھوئیں کے پیچھے چھپ گیا ہو۔ ذیشان نے بے حد تلملگتی نگاہ نہال پر ڈالی، جو ان دونوں کی موجودگی سے بے خبر رانیہ کو دیکھتے ہوئے نگاہوں سے وہ سب کچھ بیان کر رہا تھا۔ جو اس کے دل میں تھا۔

ذیشان نے پھر شیراز کی طرف دیکھا جو شاید اس وقت نہ زندوں میں تھا، نہ مُردوں میں۔ اس نے فرج کا دروازہ بند کیا اور اندر بیڈ روم میں چلا گیا۔ نہال رانیہ کو لے کر باہر نکل گیا۔ ذیشان کے قدم وہیں جمے کے جمے رہ گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے ایک بھائی کے راستے کی رکاوٹ ختم ہو جانے کی خوشی منائے یا دوسرے بھائی کے ارمانوں کے لُٹ جانے کا ماتم کرے۔

شیراز اندر کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی تھی۔

خدایا! یہ کیسے سفّاک لمحے ہوتے ہیں، جو اتنی بے دردی سے اذیت کے نیزے سینوں میں اُتار دیتے ہیں اس کے وجود سے "بھول جاؤ، بھول جاؤ" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

"کیسے بھول جاؤں۔" اس نے کروٹ بدل لی۔ دل میں عجیب درد سا اُٹھ رہا تھا۔

ہاں۔ یہ عورتیں بھی کتنی خوش نصیب ہوتی ہیں کہ جب ان کے دل پر درد کے بادل چھا جائیں تو آنکھوں کے راستے برس جاتے ہیں، پر مرد کیا کریں؟ ایسا کون سا روزن کھولیں کہ اندر کی ساری گھٹن باہر نکل جائے، اور تازہ ہوا زندگی کی علامت بن کر اندر آجائے۔

شیراز کا وجود جیسے جسم و جان کو الگ الگ کیے بستر پر پڑا تھا۔ اس کے کانوں میں ایک ہی جملے کی بازگشت تھی۔

"آپ کے لیے میں ہی مناسب ہوں۔"

وہ نارسائی کی آگ میں جُھلس رہا تھا۔ وہ خود کو اتنی اذیت دینا چاہتا تھا کہ اس کے بعد اسی آگ میں جلتے جلتے وہ بے حس ہو جانا چاہتا تھا۔

کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا ذیشان کافی دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب ضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگا تو وہ اندر چلا آیا۔

"بھائی جان!" اس نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

شیراز نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ویرانیوں کا لامتناہی سلسلہ نظر آرہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس کا لہجہ اپنائیت سے چُور تھا۔

"کچھ نہیں۔ بس یوں ہی سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے کروٹ بدل لی۔

"میں دبا دُوں۔" وہ اس پر جُھک کر بولا۔

"نہیں۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" شیراز نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

ذیشان کچھ دیر اس کے بستر کے پاس کھڑا رہا۔ اس کا جی چاہا کہ اس سے کہے۔

"میرے بھائی! میں جانتا ہوں کہ آپ کرب کی کس منزل پر کھڑے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ارمانوں کی دنیا میں کیسی آگ لگی ہے۔ آئیں میں اپنی محبت سے اُسے بجھا دوں۔ آپ کے دل میں جو بے کلی کا تیر گڑ گیا ہے۔ میں پیار سے اسے نکال لوں۔

میں آپ کے سارے دُکھ اپنے دامن میں سمیٹ لوں۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

آیئے میں آپ کو گلے سے لگالوں کہ درد کا ہر احساس آپ کے ذہن سے محو ہو جائے۔
مگر وہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ شیراز اس وقت ٹوٹ پھوٹ کی منزل سے گزر رہا تھا۔ اس کو اس وقت تنہا ہی چھوڑ دینا مناسب تھا۔ ذیشان مردہ قدموں سے باہر آگیا۔

○ ● ◆

نہال نے گاڑی کمپاؤنڈ سے باہر نکالی اور دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ رانیہ اپنے اور نہال کے درمیان واضح فاصلہ رکھ کر دروازے سے تقریباً چمٹ کر بیٹھ گئی۔
نہال نے ترچھی نظر سے اس کے بیٹھنے کے انداز کو دیکھا۔
"ویسے کسی نے غلط اطلاع دی ہے آپ کو میرے بارے میں۔" اس نے گیئر بدلتے ہوئے کہا۔
رانیہ نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اسے دیکھا۔
"کاٹتا نہیں ہوں میں۔" وہ اس کے اور اپنے درمیان فاصلے کو نظروں سے ناپتے ہوئے بولا۔ پھر بغیر توقف کے دوبارہ گویا ہوا۔
"نہ ہی میں موم کا بنا ہوا ہوں کہ شعلے کے اتنے قریب ہونے پر پگھل جاؤں۔"
رانیہ کا جی چاہا کہ اس سے کہہ دے کہ تم تو صرف زہر میں بجھے ہوئے ہو۔ پر وہ کہہ نہ سکی۔
آخر وہ کیوں اس کے سامنے اتنی بودی بن جاتی ہے۔ اسے خود پر غصہ آگیا۔ جب وہ نوکیلے لفظوں کے جوتے اسے مارتا ہے تو وہ جواباً تیکھے جملوں کے پتھر کیوں نہیں مارتی۔ کیوں اتنی کمزور ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کی زبان کیوں سل جاتی ہے۔ اس کے سامنے، وہ خود سے لڑ رہی تھی۔
نہال سڑک کے بائیں جانب بے حد آہستہ روی سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایسے جیسے وہ اس سلسلے میں بالکل اناڑی ہو، اور اس کے پاس لائسنس بھی نہ ہو۔
رانیہ کو کوفت ہونے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ بس جلد سے جلد گھر پہنچ جائے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ وہ بول ہی اٹھی۔
"آپ اتنی آہستہ کیوں چلا رہے ہیں گاڑی؟"
"لمحوں کو اپنی گرفت میں لینا اچھی طرح جانتا ہوں۔ وقت کے پیر ہیں اپنی مرضی کی زنجیر ڈالنا مجھے آتا ہے۔" اس کا لہجہ بہکا بہکا سا تھا۔
"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کو کیا آتا ہے اور کیا نہیں۔ آپ گاڑی تیز چلایئے۔" وہ دل ہی دل میں مارے غصے کے بل کھا رہی تھی۔
"منزل پہ پہنچنے کی بہت جلدی ہے تم کو؟ ویسے کبھی کبھی ہمسفر بھی تو منزل بن جایا کرتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے۔" اس نے چہرا موڑ کر اسے دیکھا پھر ونڈ اسکرین پر نظر جما دی۔
"آپ گاڑی تیز چلایئے۔" رانیہ نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔
نہال نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ اور بڑھاتا ہی چلا گیا۔ گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اسپیڈو میٹر کی سوئی سو کے ہندسے سے اوپر چلی گئی تو کار میں مخصوص قسم کا الارم بجنے لگا۔ نہال اس پر بھی بازنہ آرہا تھا۔ مستقل ایکسیلیٹر پر دباؤ ڈالتا جا رہا تھا۔
"کتنے ہزار فٹ کی بلندی پر لے جاؤں؟" اس نے شریر لہجے میں کہا۔
رانیہ نے دہشت زدہ ہو کر پہلے اسے دیکھا پھر سامنے دیکھنے لگی۔ اس کی پیشانی پر قطرے ابھر آئے
"خدا کے لیے یہ آپ کیا کر رہے ہیں، اس کی اسپیڈ کم کیجیے۔" وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔
"اپنے اشاروں پر چلانا چاہتی ہو مجھے۔؟" اس کی آواز خمار آلود تھی۔ نگاہوں کا زاویہ بدل کر اس نے رانیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اپنی گھبراہٹ پہ قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی نہال نے فوراً اپنا پاؤں ایکسیلیٹر سے ہٹا لیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ نہال اب نارمل انداز میں ڈرائیو کرنے لگا۔ ان دونوں کے درمیان مکمل خاموشی چھا گئی۔

نہال نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔ معنی کی آواز کار میں گونجنے لگی۔

باہوش و حواس میں دیوانہ یہ آج وصیت کرتا ہوں
یہ دل و جاں تم کو ملیں، ہیں تم سے محبت کرتا ہوں

جانے کیوں بڑی دلفریب سی مسکراہٹ نہال کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ رانیہ نے خاصا جز بز ہو کر چور نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ بڑے مگن سے انداز میں بیٹھا تھا۔ گانے کے بولوں سے ماحول پر طاری خاموشی معنی خیز ہو چلی تھی۔ رانیہ سخت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اس پر مستزاد اس کی زلفوں کی آوارگی عروج پر تھی۔ کبھی ایک طرف کی لٹ اس کی چادر کی قید سے آزاد ہو جاتی، تو کبھی دوسری طرف کی۔ کبھی وہ ایک طرف کے بال پکڑ کر کان کے پیچھے کرتی تو کبھی دوسری طرف کے۔ عجیب گھبراہٹ اور پریشانی کا عالم تھا۔
نہال کن انکھیوں سے سارا کھیل دیکھ رہا تھا اور محظوظ ہو رہا تھا۔
"افوہ، نہ جانے گھر کب آئے گا۔ اس نے چڑ کر سوچا۔ "راستہ نہ ہوا کسی گنہگار کے لیے پل صراط کا سفر ہو گیا۔ کمبخت ختم ہونے میں ہی نہیں آرہا ہے۔"
خدا خدا کر کے بالآخر وہ پہنچ ہی گئی۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر اتر گئی۔
"سنو۔" جانے نہال نے کس لہجے میں پکارا، وہ بے ساختہ مڑی۔
"کاش تم احساس کر سکو کہ میں تمہارے لیے کتنا مخلص ہوں۔" اس نے بڑے محتاط لفظوں میں کہا۔
رانیہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس سے پہلے کہ دھڑکن اتنی بڑھ جاتی کہ اس کی آواز نہال سن لیتا، وہ فوراً پلٹ گئی، اور بغیر خدا حافظ کیے، ہی اندر چلی گئی۔
"رانیہ! تم انجان بنتی ہو مگر ہو نہیں۔ سوچوں میں تمہاری تو میں اتر ہی چکا ہوں، دل میں بھی اتر جاؤں گا۔" اس نے رانیہ کی پشت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، اور گاڑی بیک کر کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دی۔

○ ● ◆

شیراز کمرے سے باہر نکلا تو نہال ڈائننگ ٹیبل پر عجب بے خودی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ شیراز نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ اس کا چہرا بڑا روشن تھا۔ بڑے خوبصورت اور دلفریب رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ دل کی آسودگی چہرے پر لکھی تھی، اور شیراز ہر سطر صاف صاف پڑھ رہا تھا اور بھر۔
شیراز نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے خیالات کو کوئی عنوان دینے سے پہلے۔ ان پر ناممکن کا پہرا بٹھا دیا۔ ہر وہ دروازہ بند کر دیا، جس سے گزر کر رانیہ اس کے تصور میں داخل ہو سکتی تھی۔ زندگی کا وہ باب جو ابھی شاید کھلا بھی نہیں تھا، اس نے اپنے خونِ دل میں انگلی ڈبو کر اس پر بڑا بڑا لکھ دیا۔
"کلوزڈ"
نہال! اس نے قریب جا کر کہا۔
"جی۔!" وہ چونک کر بولا۔
"رانیہ کو چھوڑ آئے؟"
"ہوں!" اس کے ہونٹوں پر بڑی دلآویز مسکراہٹ تھی۔ کچھ دیر پہلے محبوب کی قربت کا نشہ ابھی تک چھایا ہوا تھا۔
"تھک گئے ہو گے، جاؤ سو جاؤ۔" وہ اس کا کندھا تھپتھپا کر بولا۔
نہال اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ جلد ہی اسے نیند نے آگھیرا اور وہ سو گیا۔

○ ● ◆

"اچھا، میں تم کو ایک لطیفہ سناتی ہوں۔" دونوں پاؤں اوپر کیے شوخ لباس میں ملبوس جویریہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ ایک صاحب بڑے غصے میں داخل ہوئے اور بیوی سے کہا کہ اگر آئندہ تم نے مجھے کسی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بھیجا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ غضب خدا کا، نکاح ہی ساڑھے دس بجے ہوا۔
بیگم نے پوچھا۔ کیوں کیا بارات دیر سے آئی تھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وہ صاحب بولے۔ بارات تو سات بجے ہی آ گئی تھی، مگر قاضی صاحب نکلے تھے۔"

وہ لطیفہ سنا کر چپ ہو گئی۔ اور مسکراتی نظروں سے سامنے صوفے پر بیٹھے نہال کو دیکھا جو دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، لب بھینچے، تنے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"نہال بھائی! ہنس بھی چکو، لطیفہ ختم ہو گیا ہے۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" وہ دھاڑا۔

جویریہ ایک دم سہم سی گئی۔

"یہ اتنی دیر سے کس کو بے وقوف بنا رہی ہو؟" اس نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟" اس نے نگاہیں چرا لیں۔ جانے کیوں اسے نہال سے خوف سا محسوس ہوا۔ اپنے اندر چھپی دکھوں کی ماری جویریہ پر اس نے جلدی جلدی پردے ڈالنا شروع کیے۔

"مطلب یہ کہ تمہاری ہنسی میرے کانوں تک تمہاری چیخیں بن کر پہنچ رہی ہے۔ اور یہ آنسو جو تم اپنے اندر اتار رہی ہو۔ مجھے اپنے دل پر گرتے محسوس ہو رہے ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔" وہ اپنے لہجے کو مضبوط بنانے میں ناکام رہی۔

جانے نہال کون سے چور راستے سے اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ کسی بھی لمحے اس کے حوصلوں کی چادر پھاڑ سکتا تھا۔ پھر اس کا بھرم عریاں ہو جاتا۔ اس کے بعد اس کے سارے دکھ عیاں ہو جاتے۔ نہال کو پتا چل جاتا کہ وہ کتنی سوختہ جاں ہے۔

"دیکھو جویریہ! میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ کس وقت کس لمحے تم کیا سوچ رہی ہو، میں بخوبی جان سکتا ہوں، کس کیفیت تلے تمہارے کیا احساسات ہیں، اس کا اندازہ کرنا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ میں پوچھتا ہوں جب خودکشی کر ہی لی تھی تو اپنا مزار وہیں کیوں نہ بنوا لیا۔ اپنی لاش اٹھائے یہاں کیوں چلی آئیں۔"

وہ غیض و غضب کے عالم میں پوچھ رہا تھا۔

جویریہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کسی بھی طرح خود پر قابو پا لو۔ اپنے بھرم کو قائم رکھو۔ نہال تمہارے وجود کی کرچیاں نہ دیکھنے پائے، تمہارے درد کی گہرائی میں نہ اترنے پائے۔ تمہارے غم کی پیمائش نہ کر سکے۔ اگر آج تم اپنے پیروں پہ نہ کھڑی رہ سکیں تو پھر کوئی پناہ، پناہ ثابت نہ ہو سکے گی۔ تھام لو مضبوطی سے خود کو۔" جویریہ معاذ جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔

"نہیں جویریہ۔ یہ شخص تیرا ہمدرد ہے، تجھ پر مہربان ہے، اس کے خلوص کی سچائی پر تیرا دل گواہی دیتا ہے اپنے دکھوں کی گٹھڑی کسی مخلص دوست کے آگے خالی کر دینے سے انسان ہلکا ہو جاتا ہے، کھول دے آج اپنا دل اس کے آگے۔ گنوا دے اپنے زخم، دکھا دے ان کی گہرائی، اپنی جھلسی ہوئی روح پر سے پردہ ہٹا دے، اپنے آبلے دکھا دے۔ آخر کہاں تک ضبط کرے گی؟ تو انسان ہے پتھر تو نہیں۔ تو پتھر نہیں ہے۔ تو پتھر نہیں ہے۔" جویریہ قریشی چیختے چلی جا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں اس کی دلدوز چیخوں سے نہال کے فلیٹ کا ٹی وی لاؤنج گونج رہا تھا۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ آج وہ روح کے سارے بوجھ اتار دینا چاہتی تھی۔ آج وہ ہر غم سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ اپنے آنسوؤں میں سارے دکھ بہا دینا چاہتی تھی۔ اپنے دل کو درد سے خالی کر دینا چاہتی تھی۔ آج وہ ایک نیا جنم لینا چاہتی تھی۔

وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

اس کو اس قدر بے قراری سے روتا دیکھ کر نہال کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ اور جب ضبط کرنے کرتے اس کا وجود چٹخنے لگا تو وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

اس کے احساسات بڑے عجیب سے ہو رہے تھے، اسے وہ جویریہ یاد آ رہی تھی، جو بلا کی شوخ و شریر تھی، حاضر جواب برجستہ گو جس کی زبان منٹ بھر کو نہ رکتی تھی۔ جو اپنے قہقہوں سے آسمان ہلا دیا کرتی تھی۔ یہ وہ جویریہ تو نہیں تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی تھی۔ کتنی پژمردہ، کتنی آزردہ، ٹوٹی ہوئی۔ ریزہ ریزہ، جانے کتنے جتنوں سے اس نے اپنے آپ کو بکھرنے سے بچایا ہوا تھا۔

"خدا تمہاری حالت پر رحم کرے۔" اس نے بڑا بوجھل سا سانس فضا کے حوالے کرتے ہوئے سوچا۔

تھوڑی دیر بعد اندر خاموشی سی چھا گئی۔ یا تو دل کا غبار ہلکا ہو گیا تھا یا پھر شاید اس کی آنکھیں روتے روتے تھک گئی تھیں۔ نہال نے فرج سے پانی نکالا اور اندر چلا آیا۔

وہ دونوں گھٹنوں کو بازوؤں کے حلقے میں قید کیے حزن و ملال کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ آنکھیں بری طرح سوج گئی تھیں، چھوٹی سی ناک سرخ ہو گئی تھی، سختی سے بھینچے ہوئے لب سسکیوں کو آزاد ہونے سے روکنے میں ناکام ہو رہے تھے۔

"جویریہ! پانی پی لو۔" نہال نے بے حد نرمی سے کہا اور گلاس اس کی سمت بڑھایا۔

وہ جوں کی توں بیٹھی رہی۔

"لے لو۔ تم نے وہ حق ہی نہیں دیا۔ ورنہ خود اپنے ہاتھ سے پلا دیتا۔" اس نے ماحول پر چھائی اداسی کو کم کرنے کی غرض سے قدرے خوشگواری سے کہا۔

جویریہ کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اس نے گمبھیر خاموشی کے ساتھ اس کے ہاتھ سے گلاس لیا، اور خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔

"منہ ہاتھ دھو لو جا کر، پھر میں تم کو گھر چھوڑ آؤں گا۔"

"نہیں، میں گاڑی لے کر آئی تھی۔ خود ہی چلی جاؤں گی۔" وہ دوپٹے سے چہرا صاف کرتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

"کوئی بات نہیں محترمہ! زندگی کے سفر میں تو آپ نے ہمیں ساتھ نہ لیا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی ہمسفر بنا لیجیے۔" وہ اس کا موڈ بحال کرنا چاہتا تھا، شرارت سے گویا ہوا۔

جویریہ نے بھیگی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور چپ چاپ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر آئی تو اس کی حالت قدرے سنبھل چکی تھی۔ بالوں کو انگلیوں سے سنوارتی وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

نہال اس کے لیے ملک شیک بنا لایا۔

"نوش فرمایئے۔" اس نے ایک گلاس اسے تھمایا، اور دوسرا خود لے کر اس کے سامنے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

"سوری نہال بھائی! میں نے آپ کو خواہ مخواہ پریشان کیا۔" اس کے لہجے میں شرمساری تھی۔

"فضول بات نہ کرو۔" اس نے خفگی سے اسے گھورا، پھر آگے کو جھکتا ہوا بولا۔ "جب جب یہ آگ دل کو سلگانے لگے۔ روح کو جلانے لگے تو یہاں آ جایا کرنا۔ میرے سامنے بیٹھ کر رو لیا کرنا۔ کوشش کروں گا تمہارے آنسو سمیٹ سکوں۔ تمہیں ٹوٹنے سے بچا سکوں۔" وہ ہمدردی سے کہہ رہا تھا۔

"شکریہ۔" اس کی آواز پھر رندھ گئی۔ اس وقت وہ واقعتاً خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

"دیکھو جویریہ! سچ پوچھو تو میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعلق نہیں۔ اگر کوئی رشتہ ہے تو فقط احساس کا۔ محسوس کرنا چاہو تو نزدیک تر ہے، اور نہ محسوس کرو تو سرے سے اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ میں تمہارے دکھ کا مداوا نہیں کر سکتا۔ اس لیے۔ نہیں کہ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔ فیصلے کی گھڑی میں تم نے انتخاب پر قادر ہونے کے باوجود اپنے لیے اذیتیں اور دکھ خرید لیے۔ اور مول تمہارے حال کی خوشیاں اور تمہارا روشن و خوش آئند مستقبل ٹھہرا۔ تم نے خود اپنا دامن کانٹوں سے بھر لیا۔ اب کانٹے کی نوک پر تو پھولوں کی نرمی کا احساس نہ کیا جا سکتا ہے اور نہ دلایا جا سکتا ہے۔ تم جس آگ میں جل رہی ہو، اس کی آنچ مجھے محسوس ہو رہی ہے۔ مگر میری بے بسی یہ ہے کہ میں تم کو سلگتے ہوئے تو دیکھ سکتا ہوں مگر اس سے بچا نہیں سکتا۔ البتہ یہ کوشش ضرور کروں گا کہ اپنے ضبط اور حوصلے کو مزید مضبوط بنانے میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

نہال نے اس کو ترحم بھری نگاہوں سے دیکھا اور ایک گہرا سانس لے کر بولا۔

"جویریہ! میں تم کو کوئی دلاسا یا تسلی دینا نہیں چاہتا۔ یوں بھی کم از کم تم اتنی سمجھ دار تو ہو ہی کہ تسلی اور جھوٹی تسلی میں فرق جان سکو۔ ہاں مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ ہر صورت میں معاذ کی نگاہوں کے سامنے رہنا چاہیے تھا تاکہ اسے یہ احساس رہتا کہ فریال اس کی زندگی میں ایک اضافہ ہے، وہ کسی کی جگہ پر کرنے کے لیے نہیں آئی ہے۔ بے شک فریال معاذ کی بیوی ہونے کے ناتے حق رکھتی ہے مگر

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تم بھی اپنے حقوق سے دستبردار نہیں ہوگئی ہو۔ جویریہ تم نے بڑی بے وقوفی کی ہے یہاں آکر۔" وہ ملامت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"کیا تم معاذ کی مرضی سے یہاں آئی ہو؟"

"نہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں پاکستان جاؤں۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"کیا معاذ نے تمہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی؟"

"بہت روکا، بہت منع کیا تھا۔ مگر میں نہیں مانی۔"

"ہاں، تم نے کب کسی کی بات مانی ہے۔ انتہائی ضدی اور خودسر ہو۔" وہ جل کر بولا۔

"نہال بھائی! میرے حوصلے اتنے طاقتور ہیں کہ اگر زندگی کی آخری سانس تک بھی انہیں آزماتی تو میرا بھرم قائم رہتا۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی یوں لگنے لگتا جیسے میرے اندر کی عورت بغاوت کرنے لگی ہے۔ نہال بھائی وہ گھر میری جنت ہے، اس سے پہلے کہ وہ میری قبر بنتا، میں یہاں چلی آئی۔ آج معاذ میری نظروں سے دور ہیں۔ مجھے دکھ ہے کہ وہ مجھے دکھائی نہیں دیتے۔ ان کی آواز مجھے سنائی نہیں دیتی کہ درمیان میں فاصلہ ہزاروں میل ہے۔ لیکن ایک ہی چھت تلے جب کہ وہ میری نظروں کے سامنے بھی ہوتے، اور پھر بھی میں انہیں نہ دیکھ پاتی تو خود سوچو کہ میرے دل پر کیا گزرتی۔ شاید وہی میرا وقتِ آخر ہوتا۔ ایسے ہی لمحوں سے خوفزدہ ہو کر آئی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں پھر نمی اترنے لگی۔

نہال نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اس کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔

"تمہیں کیا صلہ ملے گا یہ سب کچھ کر کے؟"

جویریہ کے تاثرات بدل گئے۔ چہرے پر ان گنت چراغ جھلملانے لگے۔

"ایک روح جب اس دنیا سے دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہوگی تو اپنے جسم کا ساتھ بڑی آسودگی اور طمانیت سے چھوڑے گی۔ اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوگا۔" اس کے لہجہ میں غرور تھا۔

"فریال نامرادیوں اور حسرتوں کا کفن اوڑھ کر نہیں سوئے گی۔ اپنے آخری وقت تک اپنے محبوب کی قربت کے احساس کو جذب کرتے کرتے۔ آرزوؤں کی تکمیل کے احساس تلے آسودگی کا لبادہ اوڑھ کر سوئے گی، اس کی اس ابدی آسودگی کی وجہ میں ہوں۔ میں جویریہ معاذ۔ اس کے شوہر کی پہلی بیوی۔ وسیع دل کی مالک ایک عورت۔" وہ خود پر مغرور ہوگئی تھی۔

"کیا تم ملی ہو فریال سے؟" بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ہولے سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا وہ واقعی ایسی ہے کہ اس کو سوکن کے روپ میں بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا اب بھی اس سوال کی گنجائش باقی ہے۔" بڑی زخم خوردہ سی ہنسی تھی اس کی۔

اس پر وہ نہ جانے کیا بڑبڑایا۔

"کیا تم کو یقین ہے کہ معاذ تمہاری جانب پلٹ آئے گا۔" بڑا ہی بے رحم سوال کیا تھا نہال نے۔

"ہاں۔" اس کے چہرے پر یقین کی روشنی تھی اور لہجہ پُراعتماد۔

نہال نے اسے بغور دیکھا۔

"فون آیا تھا معاذ کا۔؟"

"ہاں۔"

"بہت اداس ہوگا تمہارے بغیر۔ کیا کہہ رہا تھا۔؟ وہ بڑی بے تکلفی سے پوچھ رہا تھا۔

"میں نے ان سے بات نہیں کی۔" وہ پُرسکون انداز میں بولی۔

"کیوں؟" وہ حیران رہ گیا۔

"انہوں نے دو مرتبہ رنگ کیا اور میں نے دونوں مرتبہ بات نہیں کی۔ اور پھر شاید ہمارے درمیان خاموش سمجھوتا ہو گیا ہے کہ نہ تو وہ مجھے فون کریں گے، اور نہ میں ان سے بات کروں گی۔"

نہال اس کو تیز نظروں سے گھورنے لگا۔ "خط بھی نہیں لکھا تم نے؟"

"لکھا تھا۔" اس کے انداز میں تھوڑی سی بے نیازی بھی تھی۔

"معاذ نے جواب دیا۔؟"

"جب میں نے پوسٹ ہی نہیں کیا تو وہ کیسے جواب دیتے۔" وہ ہنس کر بولی۔

دراصل جی بھر کر رو لینے کے بعد وہ خاصی مطمئن ہوگئی تھی۔ اپنے دل کو بوجھ سے آزاد کر کے وہ ایک بار پھر سے جی اٹھی تھی۔ توانائی کی نئی لہر اس میں دوڑنے لگی تھی۔ دل و دماغ نے ایک نئے عزم کے ساتھ اسے سہارا دیا تھا۔ اس کے مردہ حوصلوں میں جان پڑ گئی تھی۔ سو اب اس کے لہجے میں حسرت و یاس کی جگہ اعتماد نے لے لی تھی۔

"جی تو چاہ رہا ہے تمہارا گلا ہی دبا دوں۔" اس کو گھورنے کے سلسلے کو دراز کرنے کے ساتھ ساتھ نہال نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ جواباً ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔

"کیا معاذ کو معلوم ہے کہ تم۔" وہ کہتے کہتے رک گیا، پھر قدرے جھجک کر بولا۔ "کہ وہ باپ بننے والا ہے۔"

جویریہ کے چہرے پر حجاب کا رنگ چھا گیا۔ اس میں نظریں اٹھانے کی ہمت نہ ہو سکی۔ بہت دھیرے سے اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"بے وقوف! کسی راہ پر تو روشنی رکھ دو کہ وہ تمہاری طرف پلٹ کر آ سکے۔"

بڑی جھلملی سی مسکراہٹ جویریہ کے لبوں پر آگئی۔ معاذ کی بے پناہ چاہتوں کے تصور سے اس کی آنکھیں لو دے اٹھیں۔

"فکر نہ کرو۔ وہ آجائیں گے۔ ان کے اور میرے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے، ایک قدم کا بھی نہیں۔" وہ خود فراموشی کی کیفیت میں کہہ رہی تھی۔ نہ جانے یکایک کس جہان میں چلی گئی تھی۔

پھر حاضر ماحول میں آتے ہوئے ایک طویل سانس لے کر بولی۔

"نہال بھائی! جب میں پورا وجود معاذ کا فریال کو دے آئی تو دل و ذہن اپنے ساتھ لا کر کیا کرتی۔ سو اس وجہ سے ان کو لاعلم رکھا۔ یہ دوری اور لاعلمی معاذ کے حق میں بہتر ہے۔ شاید اس طرح وہ کچھ بہتر طریقے سے فریال پر توجہ دے سکیں گے۔ میں نے یہاں آکر اپنی ہی نہیں ان کے لیے بھی مشکلات آسان کی ہیں۔ ذرا سوچو کہ اگر میں ان کے سامنے ہوتی تو کیا وہ فریال کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے؟ اس میں دلچسپی لے سکتے تھے، جیسے کہ اس کا حق تھا، اس کے حصے کی رفاقت اس کی جھولی میں ڈالتے ہوئے وہ احساسِ جرم کا شکار رہتے کہ شاید وہ اس طرح میری حق تلفی کر رہے ہیں۔ میں نے یہاں آکر اپنی ذات سے فرار حاصل کیا ہے تو معاذ کو بھی تو ذہنی کشمکش سے نجات دی ہے۔ کیا میرا فیصلہ غلط تھا۔؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

نہال دل ہی دل میں اس کی بات کا قائل بھی ہو رہا تھا، اور اس کی عظمت سے بے حد متاثر بھی لگ رہا تھا۔

"نہال بھائی! ایک بات سچ سچ بتاؤں۔ کسی سے نہ کہی، آج تم سے کہہ رہی ہوں، جب یہ خیال دل میں آتا ہے کہ میرا شوہر تقسیم ہو گیا تو کوئی روح کو جیسے سلگتے کوئلوں پر ڈال دیتا ہے۔ مگر جب فریال کے بارے میں سوچتی ہوں تو وہ انگارے فوراً ہی سرد ہو جاتے ہیں، جب اس کا دل اپنے دل میں رکھتی ہوں، تو احساس ہوتا ہے کہ درحقیقت درد ہوتا کیا ہے؟ ایسے میں اپنے سارے دکھ بے معنی لگنے لگتے ہیں۔ خود پر نفرین بھیجتی ہوں، کہ ذرا سی آزمائش سے گھبرا گئی۔ نہال بھائی! معاذ کی رفاقت تو میرا یقین ہے مگر اس کے لیے گمان ہے، وہم ہے، معاذ میرے عمر بھر کے ساتھی ہیں۔ اس کے تو پل بھر کے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے اپنی راہ پر چلتے چلتے کوئی رک کر کسی کو سڑک پار کرا دے۔ اور پھر دوبارہ اپنی راہ لے۔

سڑک پار کرانے والے کی رفاقت کتنی دیر کے لیے میسر آتی ہے؟

اس کا اور معاذ کا ساتھ بس اتنا ہی ہے۔ زندگی اسے اپنے دامن سے جھٹکنے اور موت اپنی آغوش میں لینے کے لیے بالکل تیار کھڑی ہے، شاید اس کے ہاتھ سے سہاگ کی مہندی کا رنگ اترنے بھی نہ پائے کہ آسمان سے اس کا بلاوا آجائے، شاید وہ جی بھر کر معاذ کو دیکھنے بھی نہ پائے۔ شاید اس کے دل کی بات زبان تک کا سفر نہ کرنے پائے کہ وہ اس دنیا سے اُس دنیا تک کا سفر طے کر جائے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

میں معاذ کو کھونے کے باوجود محروم نہیں ہوں' اور وہ پانے کے بعد بھی تہی داماں ہے۔ بتاؤ محرماں نصیب میں ہوں یا وہ؟

جب یہ سب کچھ سوچتی ہوں تو دل کے زخم سے آہ کے بجائے دُعا نکلتی ہے کہ اے رب ان چار دنوں میں تو فریال کو اتنی بھرپور خوشیاں عطا کر، اپنی خواہشات اور آرزوؤں کو پورا کرتے کرتے وہ آسودگی اور طمانیت کی انتہاؤں کو چھوئے کہ اس کے بعد زندگی کے مختصر ہونے کا دُکھ بے معنی ہو جائے۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی، اور لبوں کو کاٹ کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

"تم بے حد عظیم ہو جویریہ۔ اتنی بلندی پر ہو کہ نظروں سے بھی تمہیں چھو نہیں پا رہا ہوں۔" وہ اسے عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"نہال بھائی! آج میں نے اپنا دل تمہارے سامنے کھول دیا تو شاید تم یہ سمجھ بیٹھے کہ میں اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہوں، کسی وقت بھی ڈھے جاؤں گی۔ مگر یقین جانو میں آج بھی اتنی ہی مضبوط ہوں، جتنا اس دن تھی، جب پہلی بار یہ خیال آیا تھا کہ معاذ ہی کیوں نہ فریال کی محرومیاں سمیٹ لیں۔ اس کا سہارا، اس کا آسرا بن جائیں۔ آخری منزل تک اپنی رفاقت میں اسے پہنچا دیں۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ دل ضبط کرتے کرتے تھکنے سا لگا تھا۔ مگر ہارا نہیں تھا۔ میرے دل کی فضا حبس زدہ سی ہو گئی تھی۔ میں یہ ساری گھٹن نکال دینا چاہتی تھی۔ کس سے کہتی جا کر؟ ماں باپ سے؟ بہن سے یا ساس سے؟ نہیں میں ان میں سے کسی سے نہیں کہنا چاہتی تھی۔ شاید دل میں کہیں یہ خوف تھا۔ کہ میرے منہ سے نکلا ہوا کوئی لفظ میری اپنی ذات کے لیے الزام نہ بن جائے۔ میں یہ سُننا نہیں چاہتی کہ تم نے خود اپنے پاؤں پہ کلہاڑی ماری ہے، اب کیوں رو رہی ہو۔ یقین کرو، میں تو کبھی تنہائی میں خود کو راز دار بنا کر بھی نہ روئی تھی، مگر آج تمہارے سامنے رو پڑی۔ پلیز نہال بھائی میرا بھرم رکھنا۔ میرے آنسوؤں کو راز میں رکھنا اور اس کا بھی یقین رکھنا کہ اب میں پھر سے تازہ دم ہو گئی ہوں، سارے عزم، سارے حوصلے نئے سرے سے زندہ ہو گئے ہیں۔ تم سے ملنے کے بعد دل کو یہ اطمینان ہو گیا ہے کہ پل صراط کا یہ سفر طے کرتے کرتے جہاں کبھی تھک کر رُکوں گی، وہاں تم مجھے ذہنی سہارا دینے کے لیے موجود ہو گے۔ اپنے حوصلوں کے ٹوٹنے کے بعد میں تمہارے حوصلوں کے بل پر جیوں گی۔"

"مائی ڈول! میں اس وقت تک تمہارے ساتھ ہوں، جب تک تم میری ضرورت محسوس کرتی رہو گی۔ لاؤ اسی بات پہ ہاتھ ملاؤ۔" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

جویریہ ہچکچا سی گئی۔

"دل سے دل تو ملایا نہیں تم نے، کم از کم ہاتھ ہی ملا لو۔ بے وفا ہو تو کیا ہوا دلربا تو ہو میری۔" وہ ذومعنی انداز میں بولا۔

"تم اللہ سے ڈرو۔" وہ اسے پُرانے انداز میں خونخوار نظروں سے گھورنے لگی۔

پھر ایک دم مُسکرا دی اور جھجکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بیٹے! تم چاہتے کیا ہو آخر؟" پھوپھی جان عجیب لاچاری سے بولیں۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔" معاذ جان کر بھی انجان بن گیا۔

"ایک کو تو پاکستان روانہ کر دیا۔ دوسری کو نکاح کر کے لٹکا دیا۔ خود اُجڑی صورت بنائے پھر رہے ہو، تم نے آخر سوچا کیا ہے؟"

"تو کیا کروں؟" وہ بے زاری سے بولا۔

"اے لو مجھ سے پوچھ رہا ہے کیا کروں؟ جب اس سے رشتہ جوڑا ہے تو اس کو نباہنے کی بھی تو فکر کرو۔ جا کر فریال کو گھر لے آؤ۔"

"لے آؤں گا کسی دن جا کر۔" وہ ان پر اپنی بے دلی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"کس دن؟ وہ دن قیامت سے پہلے آ جائے گا یا نہیں۔" انہیں معاذ کی عدم دلچسپی کھل رہی تھی۔ کچھ دیر اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتی رہیں۔ پھر حتمی انداز میں بولیں۔

"اگلے جمعے کو مظہر اور زارا کے ساتھ آ جاؤں گی۔ شام کے وقت جا کر بچی کو گھر لے آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھتی ہیں۔ ویسا ہی کر لیتے ہیں۔" اس نے بے تاثر لہجے میں جواب دیا۔

پھوپھی جان نے بے حد غور سے معاذ کی صورت دیکھی۔ خاصا مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ پہلے سے کچھ دُبلا بھی ہو گیا تھا۔ جہاندیدہ نگاہوں نے دل کی حالت کا اچھی طرح اندازہ کر لیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نرم لہجے میں سمجھانے کے انداز میں گویا ہوئیں۔

"دیکھو بیٹے! اب اس رشتے کو بحُسن و خوبی نباہنا۔ اس کا دل اپنی ہتھیلی پر رکھنا۔ تمہاری دوسری شادی ہے، مگر کسی بھی لمحے یہ بات ذہن سے محو نہ ہونے پائے کہ اس کی پہلی شادی ہے، اس کا اور تمہارا ساتھ زیادہ طویل نظر نہیں آ رہا ہے، ذرا ہمت اور سمجھ بوجھ سے کام لینا۔ جویریہ کے ساتھ گزری زندگی کی خوشگواری کا کوئی احساس اگر کانٹا بن کر دل میں اُتر جائے تو اس کی چبھن فریال کو محسوس نہ ہونے دینا۔ خود پہ جبر کرنا پڑ جائے تو کر لینا۔ مگر اس کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اپنی ذات کو اس کے لیے پناہ گاہ بنانا کہیں وقت سے پہلے اسے قبر میں نہ اُتار دینا۔ سمجھ رہے ہو ناں میری بات۔"

معاذ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"فریال کو یہاں لانے کے لیے خود کو ذہنی طور پہ تیار کر لو۔"

"جی اچھا!" وہ مدھم لہجے میں بولا اور کھڑکی سے باہر آسمان کو دیکھنے لگا۔

اس کی زندگی ایک اور دشوار مرحلے میں داخل ہونے والی تھی۔

زندگی عجیب خاموشی اور تکلّف کے پردوں میں لپٹی بسر ہو رہی تھی۔ فریال کو معاذ کے گھر آئے ایک ماہ سے زیادہ ہو چکا تھا۔ وہ گھر میں اس طرح موجود تھی جیسے موجود نہیں ہے۔ معاذ گھر پر نہ ہوتا تو خود کو سوچوں میں گُم رکھتی اور گھر پر ہوتا تو گھر کے کاموں میں گُم رکھتی۔ بے نام سی مصروفیت میں مصروف رہتی۔ ہر اس لمحے کی زد سے نکلنے کی پوری پوری کوشش کرتی، جو اس کو اور معاذ کو قریب لانے میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ معاذ کی طرف سے بے رُخی، لاپروائی یا بے نیازی برت رہی تھی۔ یوں دیکھا جائے تو وہ معاذ کی ہر لمحے کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ اس کے منع کرنے کے باوجود اس کے سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی۔

وہ صبح سو کر اُٹھتا تو اسے باتھ روم میں اپنے کپڑے استری کیے ہوئے لٹکے نظر آتے۔ نہا دھو کر آتا تو ناشتا میز پر تیار ملتا۔ دفتر جاتے وقت دروازے پر نازک ہاتھوں میں بریف کیس منتظر ہوتا۔ مدّھم لہجے میں خوبصورت لبوں سے خدا حافظ کی آواز آتی۔ شام کو وہ دریچے میں کھڑی اس کا انتظار کرتی۔ اس کے لیے خوش ذائقہ کھانے پکاتی، اس کے کپڑے اُدھڑ جاتے، فوراً سی ڈالتی، بٹن ٹوٹ جاتے جھٹ لگا دیتی۔ اس کی کوئی چیز اِدھر سے اُدھر ہو جاتی تو وہ پریشان ہو کر اس طرح تلاش کرنے لگتی کہ وہ لامحالہ نوٹس لینے پر مجبور ہو جاتا۔ گھر کے چھوٹے موٹے مسئلوں پر اس سے بات بھی کر لیتی۔

مگر اس نے اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا۔ ایک خول میں بند کر لیا تھا۔ اس خول سے باہر نکلنے پر وہ آمادہ نہ تھی۔

دوسری طرف معاذ تھا جس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک وقت اس پر ایسا آ جائے گا کہ وہ دوہری زندگی گزارنے پر مجبور ہو گا۔ ایک جہاں وہ تھا، جو اس کے اندر آباد تھا۔ ہر شب کے وہ لمحے جو اس کے بیت جاتے تھے، وہ یادوں کے سہارے ایک تصوراتی دُنیا میں چلا جاتا جہاں جویریہ اس کی محبوب شریکِ حیات اس کی منتظر ہوتی، جس کی قربت کے سائے میں بیٹھ کر وہ اپنے وجود کی تمام تھکن اُتار دیتا۔ (گو کہ سارا دن اپنے آپ کو بے نقاب ہونے سے بچاتے بچاتے وہ واقعی تھک جاتا تھا) اس کی آنکھوں کی شوخی اور ہونٹوں کی دلفریب مسکراہٹ سے جینے کا نیا حوصلہ پاتا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اور ایک جہاں وہ تھا جس میں فریال اس کی بیوی کے روپ میں موجود تھی۔ زندگی بظاہر تو بڑے نارمل سے انداز میں بسر ہو رہی تھی۔ وہ فریال کو خوشیاں دینے کا دل سے خواہاں تھا۔

(اور دل دینے کا!)

وہ اس کا خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کی اتنی پروا کرتا کہ طمانیت کے احساس تلے خود اس کا ضمیر اور روح ہلکے رہتے۔ اس کے انداز دوستانہ ہوتے۔ لہجے میں بڑی نرمی اور ملائمت ہوتی، نگاہ میں اپنائیت ہوتی۔ یقیناً وہ اسے وہ سب کچھ دینا چاہتا تھا جو بیوی کا حق ہوتا ہے بلکہ فریال کے معاملے میں وہ حد سے گزر جانا چاہتا تھا کہ اس وقت زندگی کا مقصد ہی فریال کو خوش رکھنا تھا۔

مگر تمام باتوں کے باوجود شاید زندگی کے کچھ پہلو ایسے بھی تھے جو ان کے درمیان موجود لمحوں کی گرفت میں اب تک نہ آسکے تھے۔

یہ تو معاذ نے شروع کے دنوں میں ہی محسوس کر لیا تھا کہ فریال اس سے کترائی کترائی رہتی ہے — الگ الگ رہتی ہے۔ اس نے اپنے اور معاذ کے درمیان پہلے ہی دن سے ایک نامحسوس سی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ ایک فاصلہ سا ان کے درمیان قائم ہو گیا تھا۔ وہ اس سے دور دور رہتی تھی۔ رات کو سوتے وقت وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر اس طرح سمٹ کر سوتی کہ معاذ کو خوف ہوتا کہ کہیں وہ نیچے نہ گر جائے۔

جو دیوار فریال نے کھڑی کی تھی، اسے معاذ نے اپنی پناہ گاہ بنا لیا تھا۔ ان دوریوں اور فاصلوں کو وہ اپنے لیے نجات کی راہ سمجھتا تھا کہ اس کے لاشعور کے کسی نامعلوم کونے میں کہیں یہ بات موجود تھی کہ اپنی قربتوں کے دروازے اس پر کھولنے میں اس کا دل راضی نہیں ہے۔ بے شک فریال اس کی بیوی تھی۔ وہ اس کے تمام جائز حقوق اسے دینا بھی چاہتا تھا۔ معاذ کی زندگی کی مکمل کتاب اس کے ہاتھ میں تھی، مگر پھر بھی وہ اس میں سے چند اوراق پھاڑ لینا چاہتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ فریال ہی نے ان صفحوں کو نہ پڑھنا چاہا تھا۔ یوں معاذ از خود محفوظ ہو گیا تھا۔ یہ احساس، احساسِ جرم بننے سے بچ گیا تھا کہ وہ کسی کوتاہی کا مرتکب ہو رہا ہے، حق تلفی کر رہا ہے۔

اسے شرمندگی بھرا اعتراف تھا کہ وہ خود بھی گریزاں ہے۔ لاشعوری طور پر پہلو تہی کرتا ہے۔ وہ اس معاملے میں "کیوں" کے سوال سے بھی اپنا دامن بچاتا تھا، خود سے خوفزدہ رہتا تھا۔ شاید اپنی خلوتوں میں جویریہ کے سواکسی اور کو رازدار بنانے میں اس کا دل، اس کے جذبات، اس کے احساسات اور خود اس کا وجود راضی نہیں تھے اور پھر تھوڑا بہت اسے یہ خوف بھی لاحق تھا کہ کہیں فریال اس کے اتنے قریب نہ آجائے کہ اس کے دل میں جھانک کر جویریہ کی موجودگی کا احساس کرے۔ وہ اس کے دل کو بھی اب کوئی ٹھیس دینا نہیں چاہتا تھا۔

لیکن شاید وہ بڑا مجبور تھا۔

فریال کی طرف اٹھنے والی اس کی نگاہ وہ نہیں ہوتی تھی، جو کسی بھی شوہر کی ہو سکتی ہے۔

◆ ●

"کیا بات ہے فریال؛ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اسے یوں چپ چپ دیکھ کر معاذ نے تردد سے کہا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں میری طبیعت ٹھیک ہی ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"پھر اتنی چپ چپ کیوں ہو؟"

"بس یونہی، کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔"

"تو کوئی عام وجہ ہوگی، کوئی یاد آرہا ہے؟"

"جویریہ!" ایک سنسناتا ہوا تیر معاذ کے دل میں کھب گیا۔ اسے فریال سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ خاصا جز بز سا ہو گیا۔

"کتنا عرصہ ہو گیا ہے جویریہ کو گئے ہوئے؟"

"تین ماہ سے زیادہ ہی ہو گئے ہیں۔" اس نے اپنے انداز میں لاپروائی کو نمایاں کرنے کی کوشش کی

(تین ماہ بائیس دن۔ اس کا دل کراہا)

"کب آئے گی؟"

"کافی عرصے بعد اپنے والدین سے ملنے گئی ہے۔ شاید اس کا وہاں طویل قیام کا ارادہ ہے۔"

"آپ کو یاد آتی ہے وہ؟"

معاذ اس کے سوال پر ہنس کر رہ گیا۔

"ہاں اگر کبھی تمہارا تصور ذہن سے محو ہو تو شاید یاد آنے لگے۔" وہ اس سے نظریں نہ ملا پایا۔

(جھوٹے، فریبی! یہ کہو کہ اگر اس کا تصور ذہن سے محو ہو تو شاید فریال میں بیوی کے روپ میں دکھائی دینے لگے۔ اس کا ضمیر طنزیہ بولا۔)

جرم اور ندامت کے احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"آپ جویریہ سے پہلے بار کہاں ملے تھے؟" معاذ جتنا اس ذکر سے بچنا چاہ رہا تھا۔ وہ اتنا ہی اس موضوع میں دلچسپی لے رہی تھی۔

"اپنے چچا کے گھر۔" اس نے مختصراً کہا۔

"کیسی لگی تھی وہ آپ کو؟" اس کا لہجہ اشتیاق بھرا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"جیسی اس وقت تم لگ رہی ہو۔" معاذ نے بروقت خود کو سنبھال لیا۔

فریال نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ اسے گہری گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً ڈور بیل بج اٹھی تو دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

فریال نے جا کر دیکھا تو خرم کھڑا تھا۔ جانے کیوں معاذ نے ایک تشکر بھرا سانس لیا اور اس کے استقبال کے لیے اٹھ گیا۔

پھر تو ایسا اکثر ہونے لگا۔

فریال بات کرتے کرتے گفتگو کا رخ جویریہ کی طرف موڑ دیتی۔ شروع شروع میں معاذ اس سے سخت اُلجھن محسوس کرتا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ فریال، جویریہ کا اتنا تذکرہ کیوں کرتی ہے۔ وہ اس کے انداز سے کوئی منفی تاثر بھی نہ لے پاتا تھا کہ فریال کے انداز میں دلچسپی اور سادگی بے حد نمایاں ہوتی تھی۔ شروع میں تو وہ بظاہر بے دلی اور ٹالنے والے انداز میں جواب دیتا، اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بے حد محتاط رہتا، مگر رفتہ رفتہ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ خود بھی یہی چاہتا ہے کہ کوئی اس سے جویریہ کے متعلق گفتگو کرے۔

"جویریہ نہیں ہے تو کیا ہوا اس کا تذکرہ ہی سہی۔" جانے اس کے کون کون سے ناآسودہ جذبات تسکین پاتے۔

ہاں رات کے مہیب سناٹوں میں اس کا ضمیر منصف بن کر اس کے سامنے آکھڑا ہوتا۔

"کیا دے رہے ہو تم اس معصوم عورت کو؟"

"سب کچھ تو دینے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ بے بس سا ہو کر کہتا۔

"اور اپنا آپ، اپنا دل، اپنے جذبات، وہ کس کے لیے سینت سینت کر رکھے ہوئے ہیں؟"

معاذ سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔

"دراصل تم اپنی ذات کے دائرے میں جویریہ کے سوا کسی اور کو داخل نہیں ہونے دینا چاہتے کیونکہ تم یہ سمجھتے ہو کہ فریال کی طرف متوجہ ہو کر تم جویریہ سے بے وفائی کے مرتکب ہو رہے ہو۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ ایسا کر کے تم فریال کی حق تلفی کر رہے ہو۔ فریال، جویریہ کے مساوی حقوق رکھتی ہے، اس کا اپنا الگ مقام ہے مگر تم خود اس کو جویریہ کے برابر لانے کو تیار نہیں ہو۔ فریب دے رہے ہو تم۔ فریال کو بھی اپنے آپ کو بھی۔"

"فریب — فریب — فریب!"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

معاذ کو ہر سمت سے اسی ایک لفظ کی بازگشت سنائی دینے لگتی۔ کبھی کبھی احساسِ جرم اتنا شدید ہو جاتا کہ معاذ ساری رات کروٹیں بدل بدل کر گزار دیتا۔

◆ ● ○

بارش زور و شور سے برس رہی تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جب بجلی چمکتی تو لمحے بھر کو ہر چیز روشن ہو کر نگاہوں کی دسترس میں آ جاتی اور اگلے ہی لمحے دوبارہ اندھیرے میں ڈوب جاتی۔

جویریہ کھڑکی کے شیشے سے ناک ٹکائے کھڑی تھی۔ ایک جھڑی اس کی آنکھوں سے بھی لگی تھی۔ ہر آنسو اس کی حالت پر نوحہ کناں تھا۔ آج پھر اس کے دل نے اس فاصلے کو ناپنے کی کوشش کی تھی، جو معاذ اور اس کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔

"میرے رب! میرے اور معاذ کے درمیان جذبوں کی صداقت کو قائم رکھنا۔ یہ فاصلے کہیں دلوں میں فاصلے نہ پیدا کر دیں۔" اس نے رُخ بدل لیا اور کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا دیا۔

"معاذ!" اس کا ایک ایک آنسو کراہا۔

"میں یہ تو نہیں کہتی کہ آپ مجھے یاد رکھیں مگر پلیز مجھے بھولنا نہیں۔"

اس کے خاموش آنسوؤں کی روانی میں شدت آ گئی۔ اس کی نگاہ بھٹکتی ہوئی آئینے پر جا کر ٹھہر گئی۔ اس نے پلکوں میں پھنسے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور بڑی سی چادر میں لپٹے اپنے سراپے کو غور سے دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے تخلیق کے مراحل طے کر رہی تھی۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی، آنکھوں سے آنسو نہیں لہو بہنے لگا۔

"دیکھیے معاذ! یہ چھوٹی سی فراک کتنی خوبصورت ہے۔" اسے اپنے کانوں میں اپنی ہی آواز آئی۔

"ہوں، اچھی ہے۔" وہ کسی اور طرف متوجہ تھا۔ ایک نظر ڈال کر بولا۔

"میں خرید لوں؟" اس نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"ہیں، کیا واقعی، مگر تم نے مجھے تو نہیں بتایا۔" معاذ نے چہرا موڑ کر مصنوعی حیرت سے اسے دیکھا، ساتھ ہی شرارت بھری مسکراہٹ روکنے کے لیے نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں میں دبا لیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔" اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"تمہیں مجھ سے ذکر تو کرنا چاہیے تھا۔" وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

"بات نہیں کریں آپ مجھ سے۔" وہ سرخ ہو گئی تھی۔ خفگی سے کہتے ہوئے چہرا دوسری طرف کر لیا تھا۔

اگلی شام معاذ دفتر سے گھر آیا تو اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا پیکٹ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" جویریہ نے کھول کر دیکھا تو وہی چھوٹا سا خوبصورت نیلا فراک تھا۔ اس نے اُلجھی ہوئی نظروں سے معاذ کی طرف دیکھا۔

وہ صوفے کے بازو پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھکتا ہوا سرگوشی میں بولا۔

"اللہ میاں کبھی تو ہمارے گھر ننھی پری کو بھیجے گا ناں۔"

اسے اس لمحے معاذ پر بہت لوٹ کر پیار آیا تھا۔

آنسوؤں کے گرم گرم قطرے اسے ماضی سے حال میں لے آئے۔ ایک تھکا تھکا سا سانس لے کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور الماری کھول کر وہی فراک نکال لی اور بیڈ پر پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔

اس کے لب ہولے ہولے ہلنے لگے۔

"معاذ! اسے بہت سے فراک چاہئیں۔ وہ ننھی پری آ رہی ہے۔ معاذ آپ کہاں ہیں، میں اس کے استقبال کے لیے اکیلی ہوں — بالکل اکیلی ہوں۔ آہ معاذ! آپ کو کچھ نہیں معلوم۔ آپ کو تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ وہ آ رہی ہے، ننھی پری آ رہی ہے، میں اکیلی ہوں، آپ کو کچھ نہیں معلوم، وہ آ رہی ہے۔"

اس پر ہذیان طاری ہو گیا تھا۔ وہ زار زار رو رہی تھی۔

پھر وہ ایک دم ہی چپ ہو گئی۔ وحشت زدہ نظروں سے آئینے میں اپنے عکس کو گھورنے لگی، پھر

عجب دیوانگی بھرے پُراسرار سے انداز میں بولی۔

"معاذ! آپ کو ننھی پری چاہیے یا چھوٹا سا فرشتہ؟"

○ ● ◆

سید صاحب اپنے ایک دوست کی عیادت کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ پہلے تو ان کا فوراً ہی پناہ گاہ واپس جانے کا ارادہ تھا پھر سوچا جب آئے ہیں تو بیٹی سے بھی ملتے چلیں۔

"ڈرائیور! زرتاج کے گھر چلو۔"

ڈرائیور نے سر ہلا دیا اور گاڑی موڑ کر دوسرے راستے پر ڈال دی۔

سڑک پر گاڑیوں کا ہجوم تھا۔ سید صاحب بے مقصد سا تھ چلتی ہوئی، گاڑیوں کو دیکھ رہے تھے، کہ اچانک چونک اٹھے۔

ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر نہال کی گاڑی تھی جسے وہ خود چلا رہا تھا۔

نیوی بلو سوٹ میں ملبوس باوقار سا نہال اپنے مخصوص اسٹائل میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی دائیں کہنی کھڑکی پر رکھتا تھا اور صرف بائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو حرکت دیتا تھا۔ سید صاحب نے اس کا یہ انداز کئی مرتبہ نوٹ کیا تھا۔ کتنا لاپروا مگر بے حد دلکش انداز تھا اس کا۔ اس کے چہرے پر تمکنت سی تھی۔ ایک فاتحانہ سی کیفیت ہر وقت اس کے چہرے پر رہتی تھی، یا شاید سید صاحب کو ہی ایسا محسوس ہوتا تھا۔

چار یا پانچ سال کا وہ بچہ جسے انہوں نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ آج اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ اس کے قدم بڑی مضبوطی سے اپنی زمین پر جمے ہوتے تھے۔ اس کو کاروباری امور پر پورا عبور حاصل تھا۔ اپنے مخصوص حلقے میں وہ بڑا ہر دلعزیز تھا۔ اس کی کم عمری کی ذہانت، معاملہ فہمی، کاروباری سوجھ بوجھ کے بڑے چرچے تھے۔ وہ بزنس سرکل کی ایک اہم شخصیت بن چکا تھا۔ اس کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا۔

اور سید صاحب ان تمام باتوں سے باخبر تھے۔

وہ کوئی ٹوٹا ہوا پتا نہیں تھا، جو اپنی شاخ سے جدا ہونے کے بعد ہوا کے رحم و کرم پر ہوتا ہے کہ وہ اسے جہاں چاہے اڑا لے جائے۔ نہال آفریدی کی جڑیں بڑی مضبوط تھیں۔ وہ ان سے علیحدہ ہو کر در در کی ٹھوکریں نہیں کھا رہا تھا۔ بڑی آن بان سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وہ کسی چیز کا محتاج نہ تھا۔ انہیں زیبا کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ وہ عمرہ کرنے کے لیے گیا ہوا تھا اور تین دن قبل ہی لوٹا تھا۔

برابر سے گزرنے والی گاڑی کا ہارن انہیں خیالات سے واپس کھینچ لایا۔ نہال کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ان کی نظروں نے اسے اِدھر اُدھر تلاش کرنا چاہا، مگر شاید وہ بہت دور جا چکا تھا۔

انہوں نے تھکے تھکے سے انداز میں نشست کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

"کیا تم یہ ساڑھی باندھ کر جاؤ گی؟" معاذ نے ساڑھی استری کرتی فریال پر ایک نظر ڈالی۔

"جی ہاں۔" وہ بدستور سر جھکائے آسمانی رنگ کی پلین ساڑھی استری کرتی رہی۔

"کوئی شوخ رنگ کی باندھ لو۔"

"شوخ رنگ میری زندگی سے مطابقت نہیں رکھتے۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

معاذ نے اخبار کی اوٹ سے اسے دیکھا۔

"یہاں آؤ۔" وہ اخبار رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

فریال نے استری کا بٹن آف کیا اور اندر چلی آئی۔ معاذ اس کی وارڈ روب کھولے بیٹھا تھا۔

"کتنے ڈھیر سارے کپڑے ہیں تمہارے پاس۔ تم کیوں استعمال نہیں کرتیں؟"

"دل نہیں چاہتا۔" وہ قدرے بیزاری سے بولی۔

معاذ نے پھر مصلحتاً اس کے لہجے کو نظر انداز کر دیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"مگر میرا دل تو چاہتا ہے۔" وہ اس کے خوبصورت بالوں کو دھیرے سے چھو کر بولا۔

وہ بڑے نامحسوس طریقے سے پرے سرک گئی۔

"آج تم یہ پہن لو۔" معاذ نے الماری میں سے سرخ رنگ کی ساڑھی نکالی۔

"یہ تو بہت بھاری ہے۔" اسے تامل ہوا۔

"بہرحال آج کی تقریب کے لحاظ سے مناسب ہے۔" اس نے قطعی انداز میں کہا پھر اٹھ کر باہر جانے لگا۔

"اور ہاں۔" وہ ایک دم رک گیا جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔

"زیورات کا انتخاب بھی لباس کی مناسبت سے کرنا۔" پھر قدرے توقف کے دوبارہ بولا۔

"آج میں تم کو ایک نئے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟" اس کا رواں رواں پکار اٹھا مگر زبان خاموش رہی۔

معاذ باہر جا چکا تھا اور وہ ساڑھی گود میں رکھے چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ اس نے نگاہ آئینے کی طرف کی اور اپنا بھرپور جائزہ لیا۔

وہ ہمیشہ ہلکے رنگوں کے کپڑے ہی پہنتی تھی۔ بہت عرصہ ہوا اس نے گہرے شوخ رنگ پہننا چھوڑ دیے تھے، میک اپ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ معاذ سے شادی کر لینے کے بعد بھی اس کا چلن نہیں بدلا تھا۔ اس کی الماری خوبصورت، نفیس کپڑوں سے بھری ہوئی تھی، مگر وہ چند مخصوص جوڑے ہی نکال کر پہن لیتی، ہلکے رنگ اس کے چہرے پر چھائی اداسی کو اور بھی بڑھا دیتے۔ اس کا حسن کچھ اور بھی افسردہ نظر آتا۔

وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھی اور دراز کھول کر اپنے زیورات کا ڈبا اٹھا لائی اور کپڑوں کی مناسبت سے زیور کا انتخاب کرنے لگی۔ اس وقت وہ خاصی الجھی ہوئی تھی۔ معاذ کے چند پچھلے بار بار اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہے تھے۔

"کیا چاہتے ہیں آپ؟ کون سی جوت جگانا چاہتے ہیں؟" اس کے ذہن میں بہت سے سوالات آرہے تھے۔

◯ ● ◆

دراصل آج مظہر کے چھوٹے بیٹے کی پہلی سالگرہ تھی اور خود اس کی شادی کی پانچویں سالگرہ تھی۔ مل بیٹھنے کا پروگرام تو کئی دنوں سے بن رہا تھا سو اسی بات کا بہانہ بنا لیا۔ تین دن پہلے پھوپھی جان نے ان کو انوائٹ کرنے کے لیے فون کیا تھا۔

"چھٹی کا دن ہے، صبح سے آجانا، مہمانوں کی طرح نہ آنا۔" وہ فریال سے بار بار کہہ رہی تھیں۔

صبح تو وہ لوگ نہ نکل سکے کہ معاذ کو ضروری کام کے سلسلے میں کہیں جانا تھا۔ اس نے فون کر کے پھوپھی جان سے معذرت کر لی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ پانچ بجے تک ضرور پہنچ جائے گا۔

فریال نے معاذ کے کپڑے استری کر کے اسے تھمائے اور خود تیار ہونے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔

معاذ کپڑے تبدیل کر کے ٹی۔وی لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا اور ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ فریال کا انتظار کرنے لگا۔ دفعتاً فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"حد ہو گئی، تم ابھی تک گھر سے ہی بول رہے ہو۔ کب نکلو گے اور کب یہاں پہنچو گے۔ دو گھنٹے کا تو سفر ہی ہے۔" دوسری طرف پھوپھی جان تھیں جو خاصی خفگی سے کہہ رہی تھیں۔

"بس پھوپھی جان! نکلنے ہی والے تھے۔ یہ ذرا فریال نے تیار ہونے میں دیر لگا دی۔" وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ ساتھ ہی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ واقعی ان کا پانچ بجے تک پہنچ جانا مشکل ہی تھا۔

"فریال! کیا کر رہی ہو؟ ذرا جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے۔ پھوپھی جان نے ناراضگی کے طویل پروگرام کا آغاز کر دیا ہے۔" وہ کہتے کہتے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور ایک دم ہی اس کے قدم جم گئے۔

وہ بالکل ہی سامنے کھڑی تھی۔ معاذ کو یوں لگا جیسے آج وہ لڑے بغیر ہی فاتح بن جائے گی۔

سرخ ساڑھی میں ملبوس، بے حد نفاست سے میک اپ کیے، بالوں کا دلکش اسٹائل بنائے، سونے

کے بھاری زیورات سے آراستہ اس کا وجود حشر برپا کیے دے رہا تھا۔

معاذ کی نگاہیں اس پر منجمد ہو کر رہ گئیں۔ وہ بے خود سا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ دل بھی پتا نہیں دھڑک رہا تھا یا نہیں۔ ہر سمت سے جیسے سرخ روشنیوں کی چکاچوند تھی۔ اس کے ملکوتی حسن کو دیکھ کر لمحے بھر کو معاذ کو اس کے انسان ہونے پر ہی گمان ہونے لگا۔

"ماشاء اللہ۔" اس کی زبان سے نہیں جیسے اس کی دھڑکنوں کے درمیان سے صدا نکلی۔

فریال کی پلکیں لرز کر رہ گئیں، مگر اس نے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آنے دیا۔

"چلیے۔" اس نے مخصوص دھیمے انداز میں کہا اور ساتھ ہی ساڑھی کا پلو درست کرنے لگی۔

"آج یہ دل جانبر نہ ہو سکے گا۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ اپنے جملے پر وہ خود بھی ششدر رہ گیا۔

فریال نے ایک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

معاذ کی آنکھیں اس کے چہرے پر یوں جمی تھیں، جیسے اس کے حسن کو بڑی تفصیل سے پڑھنا چاہتی ہوں۔ اس کا دل عجیب انداز سے دھڑکا۔

"چلیے ناں، دیر ہو رہی ہے۔" اس نے فوری طور پر اس معنی خیز صورت حال سے فرار چاہا۔

"ٹھہر جاؤ، میں تمہاری چند تصویریں کھینچ لوں۔" اس نے خود محسوس کیا کہ چاہنے کے باوجود وہ خود کو اس کے حسن کے فسوں سے آزاد نہیں کروا رہا ہے۔

(لیکن وہ کیوں آزاد ہونا چاہتا ہے۔ وہ فوری طور پر جن جذبات سے مغلوب ہوا تھا، وہ جھنجلا گئے)

"نہیں۔" فریال نے سختی سے انکار کیا۔

"کیوں نہیں؟" وہ دو قدم آگے بڑھ آیا اور ستائشی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"اس حسن کو آنکھوں میں۔ قید کرنے نہیں دے رہی ہو، تصویروں میں تو قید کرنے دو۔"

"کیا ضروری ہے؟ رہنے دیجیے، جلدی چلیں، پہلے ہی بہت دیر ہو رہی ہے۔" وہ ہرگز تصویریں کھنچوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے کمرے سے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

"نہیں، ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔" معاذ نے ذومعنی انداز میں کہا اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس کے نرم ہاتھ کو اپنے مضبوط ہاتھ میں لیتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس کا لمس کتنا سکون بخش ہے۔ خود بخود ہی اس کی گرفت سخت ہو گئی۔

فریال کا سانس ہی اٹک گیا۔ اسے انجانا سا خوف محسوس ہوا۔ دوسری طرف معاذ بدستور کچھ انوکھے سے جذبات سے مغلوب تھا۔ کچھ مبہم، غیر واضح سے احساسات تھے، جو کچھ کچھ سمجھ میں بھی آرہے تھے اور نہیں بھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ ایسا کیوں اور کیسے ہو رہا تھا۔ بہرحال اسے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وقت وہ اپنے اور فریال کے درمیان ان لمحات کو طویل کرنا چاہتا ہے۔

اس نے دراز کھول کر کیمرا نکالا اور پھر اس کی ایک نہ دو، ڈھیروں تصویریں کھینچ ڈالیں۔ وہ بے بسی اور جھنجلاہٹ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ تصویریں کھنچواتی رہی۔

تھوڑی دیر میں ہی دونوں گاڑی میں بیٹھے اڑے جا رہے تھے۔ دیر ہو جانے کے سبب معاذ خاصی تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ دونوں کے درمیان بے نام سی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جسے توڑنے کا کسی فریق کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ فریال کبھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی تو کبھی ہاتھ میں پکڑے رسالے کی ورق گردانی کرنے لگتی۔ معاذ اپنی جگہ سوچوں سے الجھا ہوا تھا۔ ایک آدھ نظر اس کے جگمگاتے چہرے پر بھی ڈال لیتا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بال ہوا کے زور سے اڑ کر منہ پر آرہے تھے اور اس کے رخساروں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔

عارض پہ ہوا کی جنبش سے رہ رہ کے مچلتے ہیں گیسو
یہ منظر دلکش کیا کہیے، کچھ صبح بھی ہے کچھ شام بھی ہے

بے ساختہ اسے خواہش ہوئی کہ اس کے منہ پر آتے بال ہٹا دے، مگر اگلے ہی لمحے اسے محسوس ہوا کہ

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر مزید سختی سے جم گئے ہیں۔ جانے کیوں اُس نے شدید ذہنی کوفت محسوس کی۔

"یہ کیسی جھجک ہے، وہ ایک قدم آگے بڑھ کر دو قدم پیچھے کیوں ہٹنے لگتا ہے۔ وہ کون سا جذبہ ہے جو آگے بڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور وہ کون سا احساس ہے جو اُسے روکتا ہے۔ وہ چاہ کیا رہا ہے آخر؟" اس کے ذہن میں رسّہ کشی سی ہو رہی تھی۔

وہ اپنی سوچ کو کسی ایک نکتے پر مرکوز نہیں کر پا رہا تھا۔ متضاد نوعیت کے خیالات سے لڑتے لڑتے وہ پھوپھی جان کے ہاں پہنچ گیا۔

ان کے مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی پھوپھی جان نے ان کو دیکھتے ہی دیر سے آنے پر خفگی کا اظہار کیا، مگر فریال نے کچھ اس انداز میں ان سے معذرت کی کہ وہ پگھل کر رہ گئیں۔

دعوت کے دوران بھی اس کی نگاہ بے ارادہ فریال کے تعاقب میں رہی۔ وہ اپنی نگاہ کی بیقراری پر خود بھی متعجب تھا۔ اس وقت جن احساسات کے زیرِ اثر تھا، انہیں کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔

"مسز الود! یہ سُرخ ساڑھی میں ملبوس جو لڑکی ہے یہ آپ کی کون ہے؟" اُسے اپنے پیچھے کسی خاتون کی آواز آئی۔

"میرے بھتیجے کی بیوی ہے۔" یہ پھوپھی جان تھیں۔

"ماشاء اللہ غضب کا حسن ہے۔" آواز میں رشک کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

پاس کھڑا ہوا مظہر جو ساری گفتگو سن رہا تھا، معاذ سے نگاہ ملنے پر مسکرا دیا۔

"بڑے خوش نصیب ہو۔" وہ قریب آ کر بولا۔

"ہاں مجھ جیسا قسمت والا کون ہوگا۔ میری تو دونوں ہی بیویاں بے حد خوبصورت ہیں۔ ایک کا حسن دہکتی آگ ہے تو دوسری کا چاندنی میں ڈوبا ہوا ہے۔"

دونوں ہی ہنس پڑے۔

مظہر اپنے کسی دوست کی طرف متوجہ ہو گیا تو معاذ کونے میں رکھی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

فریال سامنے والی دیوار کے ساتھ بچھے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسٹرا کو سُرخ لبوں میں دبائے بڑے انہماک سے برابر والی خاتون کی بات سن رہی تھی۔

کتنا دلکش انداز تھا اس کا کہ انسان لٹ کر رہ جائے۔

"فریال! تم نظرانداز کر دینے والی چیز نہیں ہو۔" اُس نے دل سے اعتراف کیا۔

"تم دل میں جگہ نہیں بناتیں، دل بن جاتی ہو۔"

"جب جویریہ میری زندگی میں آگئی تھی تو کاش تم نہ آئی ہوتیں۔

اور اگر تم نے آنا ہی تھا تو کاش جویریہ مجھے نہ ملی ہوتی۔

شاید وقت اب اس کے سلسلے میں میرے لیے مکمل اخلاص کے بھرم کو قائم رکھنے میں مشکل پیدا کر دے۔"

"میرے خدا!" اُس نے بوجھل سے انداز میں کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ اس وقت اس پر شدید ذہنی دباؤ تھا۔

○ ● ◆

پھر بہت سارے دن معاذ نے خود سے اس بات کا اعتراف کرنے میں صرف کر دیے کہ فریال کے لیے اس کے دل میں موجود جذبہ بڑے نامحسوس انداز میں محبت کا روپ دھار چکا ہے۔

محبت بڑا طاقتور جذبہ ہے۔ عین فطرت ہے اور فطرت کو شکست دینا معاذ کے بس میں نہیں تھا۔

محبت اگر شعوری عمل ہو تو اس پر قدغن لگائی جا سکتی ہے۔ مگر یہ بڑا فطری احساس ہے۔ اس کے لیے دل میں جگہ بنانی نہیں پڑتی، از خود بن جاتی ہے اور اس سلسلے میں "کیوں اور کیسے" کے سوال بڑے بے معنی ہوتے ہیں۔

اور پھر ایک دن معاذ نے بڑی خاموشی سے اس بات کا اپنے آپ سے اعتراف کر لیا کہ وہ واقعی فریال کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ فریال کی طرف اس کا التفات بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کی موجودگی کا احساس معاذ کے لیے ذہنی سکون کا باعث بننے لگا تھا۔ وہ بند آنکھوں سے بھی اسے دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کی ہر ادا معاذ کے ہر احساس کو زبان بننے پر مجبور کرنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں کی معصومیت، شنگرفی لبوں کی موہوم سی مسکراہٹ، نرم لہجے کی پھوار، قدموں کی آہٹ، چوڑیوں کی کھنک معاذ کو اپنا قیمتی اثاثہ لگنے لگی تھی۔ وہ اب اس ان دیکھی دیوار کو گرا دینا چاہتا تھا، جو اس کے اور فریال کے درمیان قائم ہو گئی تھی۔ وہ اب سارے فاصلے سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ اس کی نگاہیں اب بولنے لگی تھیں اور وہ چاہتا تھا کہ فریال اس کی آنکھوں کی زبان پڑھے، سمجھے۔ فریال ایک سربستہ راز تھی اور وہ رازداں بننا چاہتا تھا۔

○ ● ◆

وہ چھٹی کا دن تھا۔ فریال کچن میں کھڑی کھانا بنا رہی تھی۔ معاذ باہر ڈائننگ ٹیبل پر اس رخ پر بیٹھا تھا کہ فریال اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ بظاہر تو وہ اخبار پڑھ رہا تھا، مگر اس کی نگاہ فریال کے اردگرد ڈول رہی تھی۔ اس نے ڈارک براؤن کلر کا لباس پہنا ہوا تھا، جس کے گلے اور آستین پر کریم اور گولڈن کلر کے دھاگوں سے نفیس سی بیل بنی ہوئی تھی۔ پچھلے دنوں معاذ نے خاص طور پر اس کے لیے یہ لباس ایک پاکستانی بوتیک سے خریدا تھا۔ وہ لباس اس پر جتنا کھل رہا تھا، اس سے زیادہ معاذ کا دل اس کو دیکھ دیکھ کر کھل رہا تھا۔

یوں تو وہ بھی بظاہر اپنے کام میں مصروف تھی، مگر اسے معاذ کی نظروں کی تپش کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔

وہ بہت دنوں سے نوٹ کر رہی تھی کہ معاذ کی نگاہوں کے انداز بدل گئے ہیں۔ اسے ان نظروں کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آتا تھا، مگر وہ انجان بنی رہتی۔ اس وقت بھی وہ اس کی طرف سے تقریباً غیر متوجہ تھی۔ مگر درحقیقت دل ہی دل میں خاصی نروس ہو رہی تھی اور معاذ تھا کہ مسلسل نظروں کے ذریعے پیغام رسانی کر رہا تھا۔

فریال نے برتن سمیٹ کر سنک میں رکھے اور دھونے لگی۔ یکایک معاذ کے گنگنانے کی آواز کان میں اتری، تو اس کے سارے احساسات چونک گئے، ہاتھ جہاں تھے وہیں جم گئے۔

جب محبت جواں ہوتی ہے، ہر ادا اک زباں ہوتی ہے
تم جہاں پیار سے قدم رکھ دو، وہ زمین آسمان ہوتی ہے

اُس نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا۔ معاذ آنکھیں بند کیے، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے، ان کو سر کے پیچھے رکھے، کرسی پر جھولتا ہوا بڑے مگن سے انداز میں گا رہا تھا۔

غنچے غنچے میں ہنس رہے ہو تم، کن خیالوں میں بس رہے ہو تم!!
یوں میرے دل میں چھپ رہے ہو تم، جیسے مرلی میں تان ہوتی ہے
کچھ کہو تو کہا نہیں جاتا، دردِ دل کا سہا نہیں جاتا!
بن تمہارے رہا نہیں جاتا، ہائے مشکل میں جان ہوتی ہے!

وہ بہت ڈوب کر گا رہا تھا۔ اس کی آواز ایک سحر سا طاری کر رہی تھی۔ فریال کا دل سینے میں دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ اُسے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

ہلکا ہلکا سرور رہتا ہے، دل تو مستی میں چور رہتا ہے
بات جو بھی کہی نہیں جاتی، وہ نظر سے بیاں ہوتی ہے

اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلتی آواز اس کی روح کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ع جب محبت جواں ہوتی ہے ......

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹہلتا ٹہلتا کچن کے دروازے تک آ گیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

ہوگیا۔

وہ اب بھی وہی نغمہ سیٹی کی دھن پر گنگنا رہا تھا۔

فریال ایک دم پلٹ گئی۔ معاذ سے نظریں چار ہوتے ہی اس کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں جذبوں کی شدید لپک تھی۔

"آپ بہت اچھا گاتے ہیں۔" اسے بہرحال کچھ تو کہنا ہی تھا۔

"اور آپ انجان بننے کی اداکاری بہت اچھی کرتی ہیں۔" وہ سلگ کر بولا۔

"تھک گئی ہو؟" وہ اس کے بجھے بجھے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں تو۔" اس نے تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"فریال! میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ کوئی میڈ رکھ لو، مگر تم مانیں ہی نہیں۔ کوئی حرج تو نہیں تھا اگر تم ایسا کر لیتیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی خفگی کا تاثر تھا۔

"مجھے آپ کے کام اپنے ہاتھ سے کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"اور میں کیسا لگتا ہوں۔" وہ اچانک پوچھ بیٹھا۔

"آپ تو ہیں ہی بہت اچھے۔ اس دنیا میں آپ جیسا تو کوئی بھی نہ ہوگا۔" اس کی آنکھیں بے اختیار چھلک اٹھیں۔

اس لمحے معاذ نے اس کے اور اپنے درمیان فاصلوں کو مزید تیزی سے سمٹتے محسوس کیا۔

○ ● ◆

سید صاحب نے پناہ گاہ میں داخل ہوتے ہی گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ وہ ایک دوست کے گھر دعوت میں شرکت کی غرض سے گئے تھے۔ واپسی میں آتے ہوئے گاڑی خراب ہوگئی۔

"بچے سب سو گئے ہیں؟" انہوں نے کچن سے نکلتی آنابی سے پوچھا۔

"جی ہاں، سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے ہیں۔"

وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے اور پھر بالکل غیر ارادی طور پر ان کے قدم اپنے کمرے کے بجائے نہال کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ اس کے کمرے کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئے۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہ تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوگئے اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ ہاتھ بڑھا کر سوئچ آن کیا۔ سارا کمرا روشنی میں نہا گیا۔

انہوں نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی۔ نہال کو گئے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا، مگر کمرا دیکھ کر یوں لگ رہا تھا، جیسے ابھی ابھی اٹھ کر گیا ہو۔ اس کی تمام چیزیں بالکل اسی طرح اپنی اپنی جگہ رکھی تھیں۔

وہ دو قدم آگے بڑھے اور اس کے بیڈ پر بیٹھ گئے۔ بے خیالی میں اس کا تکیہ اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہے۔ پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھی اس کی جگمگاتی ہوئی فریم شدہ تصویر اٹھائی اور غور سے دیکھنے لگے ——— دیکھتے ہی دیکھتے وہ تصویر ایک چار پانچ سال کے بچے میں بدل گئی۔

انہیں وہ دن یاد آیا جب نہال پہلی بار پناہ گاہ آیا تھا۔ سہما سہما بچہ۔ یوں دیکھ رہا تھا، جیسے ہر طرف اجنبی چہرے ہوں اور وہ ان میں کوئی مہربان چہرا تلاش کرنا چاہتا ہو۔

اور وہ دن جب وہ فون پر اپنے باپ سے بات کر رہا تھا۔ وہ اس وقت وہیں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ نظریں اخبار پر تھیں اور کان فون پر ہونے والی گفتگو پر۔

"ابو! آپ کب آئیں گے؟ میں آپ کے بغیر بہت اداس ہوں۔ روز آپ کا انتظار کرتا ہوں، مگر آپ نہیں آتے۔"

"آپ نے مجھے منع کیا تھا ناں، اس لیے میں نہیں روتا، ورنہ میرا دل چاہتا ہے، میں خوب زور زور سے روؤں۔"

"ہاں ابو! وہ میرے بھائی بہن ہیں، وہ سب بہت اچھے ہیں، مگر وہ میرے ابو تو نہیں ہیں۔"

"ابو! آپ کہاں ہیں، مجھے اپنے پاس بلا لیں، میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں، ابو! میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ آپ کو بہت یاد کرتا ہوں۔"

وہ زور زور سے رونے لگا۔ نیکر کی جیب سے ایک چھوٹی سی تصویر نکالی اور دیوانہ وار پیار کرنے لگا۔

سید صاحب ایک ٹک یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں اوپر سے تیزی سے نغمہ شیراز سیڑھیاں اتر کر آیا۔ اس نے نہال کے ہاتھ سے ریسیور لیا اور کان سے لگایا۔

دوسری طرف سے لائن ڈسکنیکٹ ہو چکی تھی۔ اس نے آہستہ سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"نہال تمہارے ابو آجائیں گے، تم کیوں رو رہے ہو؟" اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"شیراز بھائی! میرے ابو آئیں گے ناں میرے پاس؟" اس نے بڑی آس سے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں، ضرور آئیں گے، لیکن تم رویا نہ کرو۔ دیکھو ہمارے ابو بھی تو نہیں ہیں، مگر ہم لوگ تو نہیں روتے۔ نہ یہ دیکھو تم سے کتنی چھوٹی ہے، وہ بھی نہیں روتی، ہر وقت کھیلتی رہتی ہے۔ اچھا آؤ میں تمہیں تمہاری پسند کی کینڈیز دوں، آج اسکول سے لایا ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے باہر نکل گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ کینڈیز سے وقتی طور پر بہل جانے والا بچہ ایک بھرپور مرد میں بدل گیا۔ اونچا لمبا قد، گندمی رنگت، آنکھوں میں ذہانت کی چمک، ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ ہر وقت رہتی تھی۔ اس کی ہر ادا میں ایک دل موہ لینے والا لاابالی پن تھا۔ اپنی مقناطیسی شخصیت کی بنا پر چل بھر میں اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا تھا۔ نگاہ کے ایک ہی تیر میں ساری دنیا کو پرو لینے والا آج شہر کی ایک قد آور شخصیت بن چکا تھا۔ کاروباری محفلوں میں اس کے تذکرے تھے۔

آج ہی دعوت کی بات تھی۔ میزبان نے ایک صاحب سے سید صاحب کا تعارف کرایا۔

"ان سے ملیے، نہال آفریدی کے نانا ہیں سید وجاہت۔"

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ان کا اپنا نام ان کی پہچان نہ بنا تھا بلکہ نہال آفریدی ان کا تعارف بن گیا تھا۔

وہ صاحب نہال کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور ان کے دل کے کسی کونے میں فخر کا احساس جنم لے رہا تھا۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور تصویر واپس ریک پر رکھ دی۔ اٹھ کر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ پھر اس کی وارڈ روب کا دروازہ کھولا۔ اندر سے خوشبوؤں کی پیٹیں ایک دم باہر آگئیں۔ سامنے خانے میں رکھے پرفیومز پر نگاہ ڈالی۔ خوشبوؤں کا تو وہ ہمیشہ سے دیوانہ تھا۔ ایک سے ایک عمدہ خوشبو استعمال کرتا تھا۔ پھر وہ اس کا ایک ایک لباس نکال کر دیکھنے لگے۔ اس کے ملبوسات اس کی خوش ذوقی کے مظہر تھے۔

انہوں نے کپڑے واپس رکھ کر وارڈ روب بند کر دی۔

سب کچھ تھا بالکل اسی طرح اور کچھ نہ تھا تو بس نہال آفریدی ہی نہیں تھا۔

نہ جانے اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ انہوں نے کمرے کی بتی بند کرتے ہوئے سوچا۔

شاید اپنی تنہائیوں سے نبرد آزما ہو یا شاید ان سے لڑتے لڑتے تھک ہار کر سو گیا ہو۔

سید صاحب بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں چلے آئے۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ خاصے مضمحل سے انداز سے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ اس وقت بھی ان کے ذہن پر ایک ہی شخص کا تسلط تھا۔

○ ● ◆

نہال اپنے آفس میں بیٹھا بڑے انہماک سے فائلیں دیکھ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور مارکیٹنگ منیجر ریحان صاحب اندھا دھند داخل ہوئے۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

نہال نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "کیا بات ہے، ریحان صاحب؟"

"سر! چھوٹے والے گودام میں آگ لگ گئی۔" وہ بے حد گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا؟" نہال اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی ریوالونگ چیئر ایک طرف دھکیل کر سامنے کی دیوار کی بلائنڈز کھول کر دیکھا گودام سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

"مائی گاڈ! کیسے ہو گیا یہ سب؟"

"پتا نہیں، غالباً شارٹ سرکٹ ہو گیا۔ سر! جانثار خان اندر ہی ہے۔" ریحان صاحب کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟" نہال دہاڑا۔

"سر! ماربل سے بھرا ٹرک پہنچنے ہی والا تھا۔ وہ سارا مال اسی گودام میں رکھا جانا تھا۔ اس لیے جانثار خان گودام کھولنے گیا تھا، اب وہیں پھنس گیا ہے۔"

نہال سرعت سے کمرے سے باہر نکلا اور سرپٹ دوڑتا ہوا گودام تک پہنچا۔ باہر لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر پھینک رہے تھے۔ قریشی صاحب بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے شعلوں کا رقص دیکھ رہے تھے۔

"فائر بریگیڈ کو فون کرو۔" نہال چلایا۔

"سر! کر دیا ہے۔"

"جانثار کو باہر نکالو۔" نہال نے بدحواسی کے عالم میں گودام کی طرف اشارا کیا۔

"سر! آپ دیکھ رہے ہیں کہ اطراف میں لگے درختوں کی وجہ سے آگ تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ہم اندر کس طرح جا سکتے ہیں۔ ممکن ہے گودام کے پچھلے حصے کی طرف ابھی آگ نہ پہنچی ہو اور جانثار محفوظ ہو۔"

"اس وقت فائر بریگیڈ کے آنے کے انتظار کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔" پیچھے کھڑے فیکٹری ورکر نے کہا۔

"اوہ جانثار!" نہال نے سخت بے بسی سے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ اس کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

اچانک مجمع کو چیرتی ہوئی ایک لڑکی آگے بڑھی۔ نہال نے پلٹ کر دیکھا، جانثار کی نئی نویلی کمسن سی دلہن اس کے سامنے کھڑی تھی۔ نہال نے اس کو اوپر سے نیچے تک دیکھا، صرف چار دن ہوئے تھے جانثار کی شادی کو۔

وہ صرف چار دن کی دلہن تھی۔ اگلے ہفتے جانثار چھٹی لے کر اپنے گاؤں جانے والا تھا۔

مگر اب!

"میرے شوہر کو بچا لو، خدا کے لیے اس کی مدد کرو، کچھ کرو، ورنہ وہ مر جائے گا۔" وہ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔

اچانک وہ لڑکی تیزی سے اس کے قریب آ گئی اور اپنے حنائی ہاتھوں سے اس کے کوٹ کا کالر تھام لیا اور اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا۔

"مجھ پر رحم کرو، خدا کے واسطے مجھ پر ترس کھاؤ، میرا شوہر مر جائے گا، اسے بچا لو — اسے بچا لو۔" وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

نہال نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کی نازک کلائیاں پکڑ لیں اور جھٹکا دے کر اپنا کالر چھڑا لیا۔ اس کے ہاتھ نہال کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ غور سے اس کی ہتھیلی پر حنا کا رنگ دیکھنے لگا اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ حنائی ہاتھ خون سے بھر گئے اور خون نہال کے کپڑوں پر گرنے لگا۔ نہال بری طرح خوفزدہ ہو گیا۔

اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ ایک لمحے کے لیے اس لڑکی کو بغور دیکھا اور اچانک بلا سوچے سمجھے ہی گودام کی طرف دوڑ لگا دی۔

قریشی صاحب کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

"نہال! پاگل ہو گئے ہو، یہ خودکشی ہے، مرنا چاہتے ہو؟" وہ چیخے اور ساتھ ہی اس کا کوٹ بھی پکڑ لیا۔

"چھوڑیں آپ مجھے۔" وہ آپے میں نہیں رہا تھا۔ اس نے قریشی صاحب کو دھکا دیا۔ وہ پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں پر جا گرے۔ اور جتنی دیر میں اور لوگ اسے پکڑتے، وہ چھلانگ مار کر جلتا ہوا گیٹ پار کر چکا تھا۔ اب وہ گودام کے کمپاؤنڈ میں کھڑا تھا۔ اسی وقت گیٹ کے برابر لگا درخت جس سے آگ کے بڑے بڑے شعلے بلند ہو رہے تھے عین گیٹ پر آ کر گرا۔

باہر کھڑے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ نہال کے دل کی دھڑکنیں ایک لمحے کو بالکل خاموش ہو گئیں۔ اس کی واپسی کا راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ وہ سر کو جھٹکا دے کر اندر کی طرف بڑھا۔ دھوئیں کے سبب اسے ٹھیک طرح کچھ دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا اور گھٹن کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ باہر سے دروازہ کھول کر وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، سامنے جانثار کھڑا تھا۔

اس کو دیکھ کر جانثار کا رنگ فق ہو گیا۔

"سر! آپ؟" اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

"تمہیں نکالنے کے لیے آیا ہوں۔" نہال نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آگ ابھی اس کمرے تک نہیں پہنچی تھی، مگر تپش شدید نوعیت کی تھی۔ دروازہ بند ہونے کی وجہ سے دھواں صرف نیچے دروازے سے آ رہا تھا۔ مگر جونہی نہال نے دروازہ کھولا، ہر طرف دھواں ہی دھواں بھر گیا تھا۔ کمرے میں صرف دو روشن دان تھے، جو بند تھے اور کافی اونچائی پر تھے۔

"تم اندر کس طرح رہ گئے، باہر نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کی تم نے؟" دھوئیں کے سبب سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے بدقت کہا۔

"دروازہ صرف باہر سے ہی کھلتا ہے، اس کا لاک آٹومیٹک ہے۔ پتا نہیں ہوا کے زور سے بند ہو گیا یا موت کے فرشتے نے میرے لیے زندگی کا راستہ بند کر دیا۔ میں نے سوچا کہ ماربل سے بھرا ٹرک پہنچ ہی رہا ہے، ڈرائیور کو آواز دے کر دروازہ کھلوا لوں گا۔ کافی دیر تک مجھے احساس نہیں ہوا کہ آگ لگ گئی ہے اور —!" اس سے آگے وہ بول نہ سکا۔ کھانستے کھانستے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

نہال کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ دونوں دل ہی دل میں خدا کو یاد کرنے لگے۔ معاً اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اس نے جوتا اتارا اور بھرپور قوت سے روشن دان پر دے مارا۔ اس کا جوتا — روشن دان کا شیشہ توڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ نہال نے دوسرے جوتے سے بھی دوسرا شیشہ توڑ دیا۔ دھواں بڑی تیزی سے باہر نکلنے لگا۔ گھٹن کا احساس کسی حد تک کم ہونے لگا۔

"آؤ جانثار! یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ یہ روشن دان نہیں ہے، خدا نے ہمارے لیے زندگی کی طرف جانے والا راستہ کھولا ہے۔ ہم دونوں میں سے ایک بچ سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ میرے کندھوں پر پیر رکھ کر اوپر چڑھ جائیں اور اس روشن دان تک پہنچنے کی کوشش کریں، پھر اس کے ذریعے باہر چھلانگ لگا دیجیے گا۔"

"نہیں جانثار! تم میرے کندھے پر چڑھ کر روشن دان تک پہنچنے کی کوشش کرو۔" اس نے سختی سے کہا۔

"سر! ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ موت میری طرف بڑھ رہی ہے — لیکن آپ نے تو خود اس کے منہ میں ہاتھ ڈالا ہے، میں آپ کو خودکشی کرنے نہیں دوں گا۔"

"بکواس بند کرو۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"اپنی بیوی کا خیال کرو، صرف چار دن ہوئے ہیں تمہاری شادی کو، ایک — دو — تین — چار — تم

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کیوں مرنا چاہتے ہو۔ کیوں اپنی بیوی کو جیتے جی مار دینا چاہتے ہو۔ کیا شادی کے تحفے کے طور پر اس کو جوانی کی بیوگی دو گے؟"

"مگر میں آپ کے بغیر یہاں سے نہیں نکلوں گا۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

"دیکھو جانثار! ہم دونوں اس طرح بحث کرتے رہے تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ہم میں سے ایک کی جان بچ سکتی ہے، میری مانو، تم نکل جاؤ۔"

اسی لمحے فائر بریگیڈ کی گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"دیکھو فائر بریگیڈ بھی آ گیا ہے۔ شاید وہ لوگ مجھے بھی یہاں سے نکال لیں، جانثار جلدی کرو۔"

اس نے متذبذب نگاہوں سے نہال کو دیکھا۔

"دیر نہ کرو، کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟"

جانثار نے مُردہ دلی سے اس کے کندھے پر ہیر رکھ دیے۔ نہال اوپر کی طرف اٹھنے لگا۔ جانثار کا بھاری بھرکم تھا۔

نہال کو دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ اس کے لیے جانثار کا بوجھ اٹھانا مشکل ہو گیا۔

"تم فوراً روشن دان میں لگی راڈ کو پکڑنے کی کوشش کرو۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

بالآخر جانثار روشن دان تک پہنچ گیا۔ نہال بالکل ہی بے دم ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔

جانثار کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ واپس اندر آ جائے اور اپنے محسن کے ساتھ ہی مر جائے۔

"سر!" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"نئی زندگی مبارک ہو تمہیں جانثار، اور میرے لیے دعا کرنا کہ پروردگار میری آخرت کی تمام منزلیں مجھ پر آسان کر دے۔"

اس کے حواس اب اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

جانثار نے ایک الوداعی نظر اس پر ڈالی اور دوسری سمت کود گیا۔ نہال کو اس کے باہر گرنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی اس کی دلدوز چیخ بلند ہوئی۔

اس کے گرنے کے ساتھ ہی نہال کو یوں لگا، جیسے اس کے دامن پر سے خون کے سرخ دھبے صاف ہو گئے ہوں۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی جو لحظہ بہ لحظہ اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

"میرے اللہ یہ کیسی بے کسی کی موت ہے۔ میرے معبود میرے حال پر رحم فرما۔ مجھ پر موت کی سختیاں آسان کر دے۔ مجھے گناہوں سے پاک کر دے، مجھے معاف کر دے۔ اب کچھ ہی دیر میں میرے اور تیرے درمیان سارے پردے اٹھ جائیں گے۔ میں تیرے سامنے اس طرح حاضر نہیں ہونا چاہتا کہ گناہوں کے بوجھ سے میری گردن جھکی ہوئی ہو۔ مجھے اپنی رحمت کے سائے میں لے لے۔ اے پروردگار اپنے اس بندے پر رحم کر دے۔" اس کا وجود پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔

اس کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔

آگ اس کے نزدیک آ گئی تھی، بے حد نزدیک — بالکل قریب۔

اور اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

◆

اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر تک اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا رہا۔ کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا پھر رفتہ رفتہ اسے سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگا۔ شاید وہ کسی اسپتال کے کمرے میں تھا۔

"نہال — نہال —!" اسے اپنے قریب سے شہیر کی آواز آئی۔

اس نے نظریں گھما کر دیکھا۔

"نہال میرے بھائی! یہ سب کیا ہو گیا، یہ کیوں ہو گیا؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"شہیر! میرا کھیل اب ختم ہو گیا۔ زندگی کے اسٹیج پر میرا رول ختم ہو گیا۔"

"نہیں، ہرگز نہیں، میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا، تم زندہ رہو گے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

آہ! اس کے زخموں سے درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ "موت میرے تعاقب میں ہے اور تم زندگی کی بات کرتے ہو۔ زندگی کو اب میں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔"

"نہال! خدا کے لیے ایسا مت کہو۔" اس کے آنسو نہال کے جلے ہوئے سینے پر گر رہے تھے۔

"موت پر میرا بس نہیں ہے میرے بھائی۔" اس کے حلق سے ٹوٹ ٹوٹ کر الفاظ نکل رہے تھے۔

آنے والے دنوں کے لیے کیا کیا سوچ لیا تھا، مگر دیکھو کیا ہو گیا۔ شہیر میرے پاس خواہشوں کا سمندر نہیں تھا میرے پاس آرزو کا ایک ہی گلاب تھا، وہ بھی مرجھا گیا، کیوں ٹوٹ گیا، کیوں بکھر گیا۔ شہیر میں اتنا تیرہ بخت کیوں نکلا۔ کیا پایا میں نے زندگی؟ میرے ہاتھ خالی کیوں ہیں؟"

اسی وقت زوردار انداز میں دروازہ کھلا۔ سید صاحب اور رانیہ اندر داخل ہوئے۔

"نہال میرے بچے!" سید صاحب بیقراری سے اس کی طرف بڑھے اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"نہال! یہ تمہیں کیا ہو گیا؟"

"نانا جان!" اس نے لڑکھڑاتی زبان میں پکارا۔

"نانا جان! اب میں جا رہا ہوں، یہ نافرمان آپ سے بہت دور جا رہا ہے، اب کوئی آپ کو نہیں ستائے گا، ایسا کوئی نہ ہوگا جو آپ کی بات رد کر سکے، جو —!"

"نہیں بیٹے! ایسا مت کہو، تم میری زندگی ہو، میری ناجیہ کی نشانی ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ اپنے سارے بچوں میں تم مجھے سب سے زیادہ عزیز تھے۔ نہال! مجھے تم سے محبت ہے۔ جانے کیوں یہ محبت دل میں ہی چھپی رہی، زبان تک نہ آنے پائی۔" وہ تڑپ تڑپ کر رو رہے تھے۔

نہال کی نظریں دیوار سے لگی رانیہ پر جم گئیں۔ اس کی سیاہ آنکھوں سے سفید پانی تواتر سے بہا چلا آ رہا تھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اسے زندگی کی طرف بلا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔

لوٹ آؤ، اپنے لیے، میرے لیے، زندگی کے لیے۔

کہاں جا رہے ہو تم، ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے، ابھی تم نے زندگی کے معنی بھی نہیں پائے۔

لوٹ آؤ، میں تمہیں سمجھاؤں گی زندگی کیا ہے۔

یہ پھولوں کی نرم مسکراہٹ ہے۔

یہ معصوم کلیوں کی شرمیلی ادا ہے۔

یہ بہاروں کے خوشبو بھرے پیغام میں پوشیدہ ہے۔

بہتے جھرنوں کی روانی کو زندگی کہتے ہیں۔

کسی انتظار کرتی دوشیزہ کے پریم کے قدموں کی مدھم آہٹ زندگی ہے۔

میرے لیے تمہارے قدموں کی آہٹ زندگی ہے۔

تم مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟"

نہال پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ہائے کس وقت وہ اسے بلا رہی تھی۔

اب جبکہ وہ ایک پاؤں موت کی سرحد میں رکھ چکا تھا اور دوسرا زندگی کی زمین سے اٹھانے ہی والا تھا۔ وہ اسے بلا رہی تھی، وہ اسے زندگی کے معنی سمجھا رہی تھی۔

نہال نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ جذبوں، ارمانوں اور خواہشات کے ادھورے رہ جانے کا احساس اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ نکلا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کاش — کاش! اس نے یہ سب کچھ پہلے کہا ہوتا تو وہ دل تو کیا جان بھی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔

"کہ لو میرا سب کچھ لے لو، مگر یہ آنکھیں مجھے دے دو، اپنی نگاہیں مجھے دے دو۔"

"اللہ!" وہ درد سے پھر تڑپ گیا۔

"نانا جان!" وہ بکھرتی سانسوں کے درمیان بولا۔

"آپ مجھے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتار دیں گے۔"

سیّد صاحب کے سینے میں کسی نے جیسے نیزہ اُتار دیا

"ایسا مت کہو، میرے ہاتھ تمہارے بچوں کو تو اُٹھا سکتے ہیں، لیکن تمہارا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے، اپنے نانا کو اتنی بڑی سزا مت دو، ایسا مت کہو۔"

"نانا جان! آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں ناں؟"

"بہت زیادہ — بہت زیادہ۔" انہوں نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔

"تم مایوس نہ ہو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں پناہ گاہ میں لے جاؤں گا۔"

"نہیں نانا جان! اب بہت دیر ہو چکی ہے۔" اُس نے ایک نظر رانیہ کو دیکھا۔ اس کا چہرا آنسوؤں میں چھپ گیا تھا۔

نہال کے دل کی ڈوبتی دھڑکنوں سے خدا حافظ کی صدا بلند ہونے لگی اور پھر —!

موت کی قینچی نے اس کی زندگی کی ڈور ایک ہی جھٹکے سے کاٹ دی۔

وہ جو نظر کے ایک ہی اشارے سے دلوں کو فتح کر لیا کرتا تھا، وہ چلا گیا۔

اس کے لبوں سے پھول بھی جھڑتے تھے اور انگارے بھی۔ اب پھول بھی مرجھا گئے اور انگارے بھی سرد ہو گئے۔ وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

شہیر اُس کے جسم سے لپٹا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ سیّد صاحب سکتے کے عالم میں اپنی جگہ بیٹھے رہ گئے تھے۔ اور رانیہ —!

بے یقینی کی کیفیت میں ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے نکلنے والے موتی لفظوں کی صورت میں ڈھل رہے تھے۔

میرے خوابوں کے ہمسفر
تو کیوں مجھ سے رُوٹھ گیا
کہ تیرے دامن کا تار تار
میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا
تجھے میری جستجو تھی
میں ہی تیری آرزو تھی
میں ہی تیری منزل تھی
میں ہی تیرا ساحل تھی
میری محبت تیرا قرض تھی
تیری محبت میرا فرض تھی
یہ کیسی خاموش صدا تھی
یہ کس کی بددعا تھی
کہ تو مجھ سے منہ موڑ گیا
بھیڑ میں اکیلا چھوڑ گیا

یہ تیری بے وفائی ہے
جانے کتنی لمبی جُدائی ہے
ساری عمر تنہائی کا زہر پینا ہے
اب اس ستم گر کے بغیر جینا ہے

ہاں اس ستم گر کے بغیر جینا ہے — اس کے بغیر جینا ہے — جینا ہے — جینا ہے — کیوں — کیوں اس کے بغیر کیوں —؟ زمین و آسمان گھوم رہے تھے۔

رانیہ کا وجود لڑکھڑایا اور وہ پوری کی پوری سیّد صاحب پر گر پڑی۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

ہر طرف پُرہول سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اندھیرا، گھڑی کی ٹک ٹک، دل کی دھک دھک، سانسوں کی سنسناہٹ، نامعلوم سے درد کی لہریں، پسینے سے شرابور جسم، کانپتا ہوا وجود، ماؤف ہوتا ذہن۔

سیّد صاحب نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور ڈائل کرنے لگے۔

دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔

ایک — دو — تین — چار — پانچ، کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔

بالآخر کوئی بارھویں گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو —!" نیند سے چور چور آواز اُبھری۔

"ہیلو نہال۔" وہ سخت بے قراری سے بولے۔

"کون صاحب بول رہے ہیں؟" نہال پر نیند کا شدید غلبہ تھا۔

"تم خیریت سے تو ہو ناں بیٹے؟" اُن کی آواز سے عجیب وحشت ٹپک رہی تھی۔

"آپ کون صاحب ہیں؟" اس کے حواس ذرا ذرا جاگنے لگے۔

"تم ٹھیک تو ہو، تمہیں کچھ ہوا تو نہیں؟"

"کون، نانا جان؟" اُس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔

"نہال! مجھے بتاؤ تو سہی تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟"

"ہیں، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اُس کا دماغ چکرا گیا۔ ساتھ ہی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔

"ہر طرف آگ ہی آگ تھی اور تم اُس میں پھنس گئے تھے، مگر تم فکر نہ کرنا، میں ہوں ناں تمہارے پاس۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔" اُن کی آواز شاید رندھ گئی تھی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" مارے بوکھلاہٹ کے وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"کیسی آگ، کہاں لگ گئی تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہیلو — نانا جان!"

دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی، مگر وہ پریشانی اور گھبراہٹ میں بولے چلا گیا۔

"آپ سے کس نے کہا کہ آگ لگ گئی ہے؟ یہاں تو کوئی بھی آگ نہیں لگی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، سو رہا تھا میں، یہ آپ کو اچانک کیا ہو گیا ہے، بولتے کیوں نہیں آپ؟ ہیلو — ہیلو نانا جان — یقین کیجیے میں بالکل خیریت سے ہوں، آپ کو کس نے اطلاع دی کہ — اوہ میرے خدا — نانا جان آپ نے ضرور خواب دیکھا ہوگا۔"

"خواب —!" دوسری طرف جیسے خواب میں ہی کہا گیا اور ایک دم فون رکھ دیا گیا۔

○ ● ◆

صبح شیو کرتے ہوئے اُس کا ذہن مسلسل رات — والے واقعہ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔

تعجب ہے، جب اس کا ذہن کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا تو وہ محض حیرت کے اظہار پر کندھے اُچکا کر رہ گیا۔

اسی وقت ڈور بیل بجی تھی۔ اُس نے چونک کر باتھ روم کے دروازے سے سر نکال کر بیرونی دروازے کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

طرف دیکھا اور جلدی جلدی منہ دھونے لگا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" یہ سوچتے اور تولیے سے منہ رگڑنے کا کام ایک ساتھ کرتے ہوئے اس نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظریں جمی کی جمی رہ گئیں۔

سید وجاہت علی خان اس کے دروازے پر کھڑے تھے۔

"نانا جان آپ؟" وہ اپنا تحیر چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

وہ خفیف سا مسکرائے۔ "اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟"

"اوہ!" وہ ایک دم حواسوں میں آیا۔ "آپ باہر ہی کیوں رک گئے۔ آئیے ناں پلیز آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔ اپنے گھر میں داخل ہونے کے لیے کسی کو اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"کیسے ہو تم؟" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔" اس نے ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں پر پڑے بھاری بھاری پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"آپ کیسے ہیں؟"

"بوڑھا ہو گیا ہوں۔" ان کے لہجے میں عجیب طرح کی خستگی تھی۔

نہال نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ وہ سامنے دیوار پر لگی مینیری کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز پر جانے کیوں اسے دکھ سا ہوا۔

وہ ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور خاصے ہشاش بشاش لہجے میں بولا۔

"اب بتائیے آپ کیسے آئے؟ کوئی خاص کام تھا تو مجھے بلوا لیا ہوتا، میں حاضر ہو جاتا۔"

"بہت عرصہ ہو گیا تھا تمہیں دیکھے ہوئے، یاد آ رہے تھے، سوچا تم سے مل آؤں۔" وہ بہت دھیمے سے لہجے میں بول رہے تھے۔

نہال کے احساسات میں ہلچل سی ہونے لگی۔

"تم نے گھر بہت خوبصورتی سے آراستہ کیا ہے۔" وہ کمرے میں تفصیلی نگاہ دوڑاتے ہوئے بولے۔

اچانک ان کی نگاہ کارنر ٹیبل پر ٹھہر گئی۔ خوبصورت فریم میں ان کی اپنی تصویر سجی تھی۔ انہوں نے چہرا موڑ کر نہال کی صورت دیکھی۔

وہ اپنی دھن میں مگن مجروح سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"یہ گھر کہاں ہے نانا جان! یہ تو فلیٹ ہے۔"

اس کی بات پر ان کے دل میں کسک سی جاگی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ ایک گہرا سانس لے کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"نہال! میں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا ہے۔"

"اوہ!" وہ ایک دم گھبرا ہو گیا۔ شوخ سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بولا۔

"نانا جان! صرف پانچ منٹ، ابھی ناشتا تیار کر کے لاتا ہوں۔"

"تم نے کوئی ملازم ہی نہ رکھا ہوتا۔"

"اکثر ضرورت تو محسوس ہوتی ہے، مگر پھر بھی کام چلا ہی لیتا ہوں۔ جس دن ضرورت مجبوری نظر آتی، فوراً رکھ لیتا۔" یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

سید صاحب کی نظریں کارنر ٹیبل پر رکھی اپنی تصویر پر جا کر ٹک گئیں۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ایک ساتھ ناشتا کر رہے تھے۔ نہال ان سے مستقل باتیں کر رہا تھا، وہ بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔

"آفس کتنے بجے جاتے ہو؟" وہ ناشتے سے فارغ ہو کر نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔

"عموماً آٹھ بجے تک نکل جاتا ہوں گھر سے۔"

"ہوں۔" انہوں نے گھڑی پر ایک نگاہ ڈالی۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"نانا جان! تھوڑی دیر اور رک جائیے، اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ رکا اور قدرے توقف کے بعد دوبارہ بولا۔

"مجھے یقین تو آ جائے کہ ——!"

"میں پھر آؤں گا۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"بہت تھک گیا تھا، سو تھکن اتارنے تمہارے پاس چلا آیا تھا۔ انشاء اللہ جلدی دوبارہ آؤں گا۔" انہوں نے یہ کہہ کر دروازے کی سمت قدم بڑھائے۔

"اور ہاں۔" وہ رک گئے۔

"آج رات کا کھانا میرے ساتھ پناہ گاہ میں کھانا، میں انتظار کروں گا۔"

"جی۔" کوئی ان دیکھی دیوار گرنے لگی۔

"جی میں ضرور آؤں گا۔" اسے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ اس نے اپنے لب سختی سے بھینچ لیے۔

سید صاحب دھیرے دھیرے قدموں سے چلتے باہر نکل گئے۔

○ ○ ○

وہ سب حسب معمول رات کے کھانے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر جمع تھے۔ ریشماں کھانا لگانے لگی تو سید صاحب نے منع کر دیا۔

"تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔"

پاس بیٹھے جاذب کے منہ سے بے ساختہ نکلوں دادا جان" نکل گیا۔ شاید اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔

"میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔" انہوں نے یہ کہتے کے ساتھ ہی ریشماں کو اشارا کیا کہ وہ ان کو اخبار اٹھا کر دے۔

زیبا نے اٹھ کر دیوار کے کونے میں ٹرالی پر رکھا ٹی وی آن کر دیا۔ وہ سب ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

سید صاحب اخبار پڑھنے لگے۔ جنہیں سخت بھوک لگ رہی تھی ان کے لیے وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا اور جنہیں کھانے کی کوئی خاص جلدی نہ تھی، ان کے لیے تیزی سے گزر رہا تھا، مگر سید صاحب کے لیے وقت اڑا جا رہا تھا۔ وہ اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ مسلسل گھڑی بھی دیکھتے جا رہے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے چہرے پر انتظار کی کیفیت اضطراب میں بدلنے لگی اور اس سے پہلے کہ وہ اضطراب مایوسی میں بدلتا۔ نہال لان کی طرف کھلنے والے ڈائننگ ہال کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

"ایکسٹریملی ویری سوری نانا جان! میں کیا کروں۔ کوشش تو بہت کی کہ وقت پر پہنچ جاؤں۔ آفس سے بھی جلدی ہی اٹھ گیا تھا پہلے فلیٹ پر گیا تاکہ کپڑے تبدیل کر سکوں۔ نیچے آیا تو گاڑی ہی اسٹارٹ ہو کر نہ دے۔ فوراً عمر کو فون کیا کہ گاڑی لے کر آ جائے۔ وہ بے وقوف موٹر سائیکل دوڑاتا ہوا آ گیا۔ مجبوراً اس کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اس کے گھر گیا۔ وہاں سے اس کی گاڑی لی اور تقریباً پرواز کرتا ہوا یہاں آ رہا ہوں۔"

اس نے ایک ہی سانس میں ساری داستان بیان کر دی اور اگلا — سانس لینے سے قبل ان کا حال بھی دریافت کر ڈالا۔

ان کا تو وہ حال کہ کبھی اس کو اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھیں۔ نہال کی یوں پناہ گاہ میں انتہائی غیر متوقع آمد، اس کا سید صاحب سے بات کرنے کا انداز، اس کی بے تکلفی، انہیں اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ غیر یقینی کی کیفیت میں وہ انقلاب زمانہ دیکھ رہے تھے۔

"تم فون کر دیتے میں ڈرائیور کو بھیج دیتا۔" سید صاحب نرمی سے بولے۔

"نانا جان اس طرح اور بھی دیر ہو جاتی۔" وہ غیر ارادی طور پر اپنی مخصوص نشست کی طرف بڑھا۔

"آؤ اِدھر بیٹھو" سید صاحب نے ایک سرسری سی نگاہ سے اُسے اپنی کرسی کی طرف بڑھتا دیکھ کر اپنی بائیں جانب رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

نہال ایک لمحے کو رکا پھر مسکراتے ہوئے اُن کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"ریشماں کھانا لگاؤ۔" جواہر نے کونے میں کھڑی دوپٹا مروڑتی ریشماں سے کہا۔

نہال نے ایک نظر سب پر ڈالی۔ کچھ آنکھوں میں چمک تھی اور کچھ آنکھوں میں نمی اور دونوں کا سبب ایک ہی تھا۔ اس کی آمد کی بے انتہا خوشی، جو ان کے چہروں سے روشنی بن کر بھی پھوٹ رہی تھی۔ اس کھوئی ہوئی نعمت کے دوبارہ پانے کے احساس سے اس کا دل بھر آنے لگا۔ اپنے جذبات پر قابو پا کر وہ دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ بے حد خوشگوار سے ماحول میں وہ لوگ کھانا کھانے لگے۔ کھانے سے فراغت کے بعد سید صاحب اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور وہ سب ——— ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔

اندر داخل ہوتے ہی ذیشان نے مارے خوشی کے ایک عجیب و غریب چیخ نما آواز نکالی، جو وہ کافی دیر سے بمشکل تمام اپنے حلق میں گھونٹے بیٹھا تھا۔

جاذب نے اُس کی حرکت پر اسے گھور کر دیکھا "تم بڑے کب ہو گے آخر؟"

"پہلے پیدا ہو جاؤں" اُس نے ڈھٹائی اور بے نیازی کا مظاہرہ ایک ساتھ کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے نہال بھائی، مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ اُف اس سے پہلے کہ مارے بے چینی کے فوت ہی ہو جاؤں، جلدی سے بتا دیں کہ دادا جان کا دل کیسے پگھلا؟" زیبا مارے تجسس کے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

"بھئی صبح نانا جان میرے فلیٹ پر آئے تھے" وہ مزے لے لے کر بتانے لگا۔ اُن میں سے اکثر کا مارے حیرت کے انتقال پُرملال ہوتے ہوتے بچا۔

"پھر؟" کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا گیا۔

"پھر انہوں نے میرے ساتھ ناشتا کیا۔"

"پھر؟" آنکھیں حلقوں سے وسیع و عریض رقبے پر پھیل گئیں۔

"پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں رات کا کھانا پناہ گاہ میں کھاؤں۔"

"پھر؟" اب تو آنکھیں تقریباً باہر کو ہی اُبل پڑیں۔

"کیا پھر، پھر لگا رکھی ہے۔ پھر یہ کہ اب میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔"

"اُف! فوراً میرے لیے کاغذ اور پین کا انتظام کیا جائے۔" زیبا نے پیچھے کی جانب گرتے ہوئے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" سب نے بیک وقت پوچھا۔

"میں تحریری طور پر دادا جان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔" اُس کا حواسوں میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔

"نہال بھائی آپ کو یہاں دیکھ کر جو خوشی ہو رہی ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔ ایسا لگ رہا ہے، جیسے کسی طویل تھکن کا احساس ایک دم اُتر گیا ہو۔" خمار کا چہرا بھی خوشی سے تمتما رہا تھا۔

"ہاں" اس نے آسودگی بھرا سانس لے کر صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "جیسے کوئی بھیانک خواب تھا جو بہت طویل ہو گیا تھا۔ شکر ہے ختم ہو گیا۔ شکر ہے صبح ہو گئی۔ میری زندگی کی ایک نئی صبح۔"

اس کے بعد تو باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ نہال اس وقت چونکا جب زیبا نے منہ پھاڑ کر جماہیاں لیتے ہوئے کہا۔

"ماہ دولت کو سخت نیند آ رہی ہے اور ماہ دولت اپنے کمرے میں جا رہے ہیں۔"

"یار میں بھی اب چلتا ہوں، واقعی کافی وقت ہو گیا ہے۔" اُس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" وہ حیران ہی تو رہ گئے۔

"واپس اپنے گھر" وہ میز پر سے اپنا والٹ اور کار کی چابیاں اُٹھاتے ہوئے بولا۔

"لیکن نہال تم ——!"

"لیکن کیا؟" اُس نے جاذب کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی کاٹ دی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں یہاں رات کا کھانا کھانے کے لیے ہی آیا تھا۔"

"اوہ!" اُن کے چہرے پر جلتے سارے چراغ بجھ گئے۔

"لیکن یہ میرا وعدہ ہے۔ میں یہاں اب آتا جاتا رہوں گا۔" وہ اُن کی دلی کیفیات بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ لوگ کچھ نہ بولے۔

نہال انہیں خدا حافظ کہہ کر سید صاحب کے کمرے میں آیا۔ دھیرے سے دروازے پر دستک دی۔ "اندر آ جاؤ" کی آواز پر وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

"نانا جان! آپ سو تو نہیں گئے تھے؟"

"نہیں۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب ایک طرف رکھ دی۔

"نانا جان اچھے کافی دیر ہو گئی ہے گھر پہنچتے پہنچتے بھی خاصا وقت لگ جائے گا۔ آپ سے اجازت لینے آیا تھا۔"

اُن کے چہرے کے تاثرات پل بھر کو تبدیل ہوئے پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور اُس کے قریب آ کر بولے۔

"چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

وہ نہال کو ساتھ لے کر باہر نکلے۔ اُس کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے ایک دم رک گئے۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے۔

"اچھا سو جاؤ بہت رات ہو گئی ہے۔" شفقت بھری آواز میں کہتے ہوئے وہ جس کا شانہ تھپتھپا رہے تھے۔ نہال اپنی جگہ ٹھٹکے کا ٹھٹکا رہ گیا۔ انہوں نے اس کا رُخ اپنی طرف کیا۔ نہال بے اختیار اُن کے سینے سے لگ گیا۔

"نانا جان ——" اُس نے کچھ کہنا چاہا، مگر جذبات کی شدتوں نے اس کی زبان بند کر دی۔

"کچھ مت کہو میرے پاس تو اب بہت ساری باتوں کے ازالے کے لیے بھی وقت کم ہے۔ گزری باتوں کو دہرا کر میں اس وقت کو مزید مختصر کرنا نہیں چاہتا۔ زیادتیوں کی فہرست طویل ہے۔"

وہ جھٹکے سے ان سے علیحدہ ہوا "ایسا نہ کہیے مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔"

"مگر مجھے اپنے آپ سے بہت شکایتیں ہیں۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولے۔

نہال دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔ گزشتہ زندگی کے اوراق اس کی نگاہوں کے سامنے پھڑپھڑانے لگے۔

"سو نانا جان زندگی کے اس موڑ پر آ کر میں نے آپ کو پا لیا" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔ کچھ دیر یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر آنکھیں کھول کر بڑی اپنائیت بھری نظروں سے اپنے کمرے میں رکھی ایک ایک چیز کو دیکھنے لگا۔

طمانیت کی لہریں قلب و روح سے گزرنے لگیں۔ اُس نے بے خیالی میں تکیہ اُٹھا کر گود میں رکھ لیا — یکایک اس کی نظر تکیے کے نیچے پڑے خاکی رنگ کے بڑے سے لفافے پر پڑی۔ اُس نے حیران ہو کر لفافہ کھولا تو اس میں کچھ کاغذات موجود تھے۔ وہ کاغذات نکال کر پڑھنے لگا۔ جوں جوں پڑھتا گیا اُس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ وہ تیزی سے اُٹھا اور دروازہ کھول کر تقریباً دوڑنے کے سے انداز میں سید صاحب کے کمرے تک پہنچا اور فوراً ہی اندر داخل ہو گیا۔

"نانا جان! یہ سب کیا ہے؟" اُس نے کاغذات اُن کے آگے کیے۔

"کیا تم نے پڑھے نہیں؟" وہ پُرسکون انداز میں بولے۔

"یہ پناہ گاہ کے کاغذات ہیں۔ میں نے پناہ گاہ تمہارے نام لکھ دیا ہے۔"

"مگر ——!" حلق تک آ جانے والے گولے نے اسے بولنے نہیں دیا۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھا اور اُن کی

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

گود میں سر رکھ کر چھوٹے بچّوں کی طرح رو دیا۔

بید صاحب نے اپنا دایاں ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا اور دھیرے دھیرے سہلانے لگے۔

(کاش! کوئی زندگی بھی کسی کے نام لکھ سکتا)

○ ● ◆

پتا نہیں ہر گزرتا ہوا لمحہ اسے فریال سے قریب کر رہا تھا یا ہر گزرتا ہوا پل اسے فریال سے دور لے جا رہا تھا۔ جہاں اس کی محبت کا احساس خوشبو بن کر حواسوں پر چھاتا وہیں یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگتا کہ جانے زندگی کے سفر پر کون سا موڑ آخری ہو اور فریال اس سے بچھڑ جائے۔ اس تصور سے اس کی روح تک کانپ جاتی تھی۔ ایسے جان لیوا خیالات کو وہ جتنا ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا، وہ اتنا ہی اس کے ذہن پر سوار رہتے۔

اس وقت بھی وہ کرسی پر بیٹھا فریال کو ایک ٹک دیکھتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ جانے کب یہ چہرا، یہ وجود اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ یہ سوچ کر مارے دُکھ کے اس کا دل بھر آنے لگا۔ آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔

فریال اُس کے کپڑوں کی الماری صاف کر رہی تھی۔ گاہے گاہے اُس پر بھی نگاہ ڈال لیتی تھی۔ دونوں کے درمیان مکمل خاموشی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" فریال نے ہی بالآخر خاموشی کو توڑا۔

"ہیں، کچھ نہیں۔" وہ چونک کر بولا۔

"جو کچھ آپ سوچ رہے ہیں، وہ آپ کے چہرے پر لکھا ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"کیا لکھا ہے؟" معاذ نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔

"شاید آپ میری سکڑتی سمٹتی زندگی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

"فریال! فضول باتیں مت کرو۔" اس کے لہجے میں سختی سے زیادہ پریشانی تھی۔

فریال لبوں پر شکستہ سی مسکراہٹ لیے دوبارہ الماری کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔" وہ پریشان کن سوچوں کی یلغار سے گھبرا کر بولا۔

فریال نے پلکوں کی اوٹ سے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔ سفید کرتا شلوار میں ملبوس، بکھرے ہوئے بال لیے تھکا تھکا سا معاذ یوں دل میں اترا کہ وہ اُسے روک بھی نہ سکی۔ اُس نے نظریں جھکا لیں۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، کبھی تمہارا بھی کچھ دل چاہتا ہے یا نہیں؟"

"اب تو آپ کی ہر سوچ ہی میری خواہش اور آپ کی ہر خواہش ہی میرا ارادہ ہے۔" خوبصورت لبوں سے نکلے مہکتے پھول سے لفظ معاذ کی روح تک کو سرشار کر گئے۔

اُس نے بڑی وارفتگی سے اُسے دیکھا۔

(محبت کرنے کا ہنر تم اچھی طرح جانتی ہو، خوبصورت جذبوں کو لکھنا تمہیں اچھی طرح آتا ہے۔ تو پھر تم رُک کیوں گئی ہو فریال! آگے کیوں نہیں بڑھتیں، فتح کیوں نہیں کر لیتیں)

معاذ کے یوں محویت سے دیکھنے سے فریال کو گھبراہٹ سی ہوئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔

"میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔" اُس نے معاذ کی توجہ منتشر کرنا چاہی۔

اور جانے کیا سوچ کر معاذ ایک دم ہنس پڑا۔

فریال نے کچھ اُلجھی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا۔ معاذ کی ہنسی کا مفہوم اُسے سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اُلجھا ہوا ذہن لے کر اپنا وارڈ روب کھول کر کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔

"لاؤ میں ہی تمہارے لیے کپڑے منتخب کر دوں، ورنہ تم ہمیشہ کی طرح کوئی فضول سے رنگ کا لباس پہن لو گی۔" یہ پہن لو۔" اُس نے ہینگر میں لٹکا گہرے سبز رنگ کا سوٹ نکالا۔

"نہیں، یہ نہیں پہنوں گی، یہ جویریہ کا ہے۔" فریال نے تیزی سے اُس کے ہاتھ سے سوٹ تقریباً چھینتے ہوئے کہا۔

"یہ سوٹ جویریہ کا کیسے ہو سکتا ہے، یہ تو تمہارے کپڑوں کی الماری ہے۔" معاذ اُس کے جملے اور اس کے انداز پر بھڑکنا بکا رہ گیا۔

"نہیں، یہ اُسی کا ہے۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"لیکن جویریہ کے کپڑے یہاں کیسے آ گئے؟" وہ بات سمجھ میں نہ آنے پر جھنجھلا سا گیا۔

"یہ سوٹ میں نے اور جویریہ نے ایک ساتھ جا کر خریدا تھا۔ ہم دونوں کو ہی یہ بہت پسند آیا تھا، مگر اس بوتیک میں اس اسٹائل کا یہ ایک ہی سوٹ تھا۔ میں چاہتی تھی یہ جویریہ لے لے۔ وہ چاہتی تھی میں خرید لوں۔ ہم دونوں کو ہی ضد ہو گئی، مگر شاید جویریہ زیادہ ضدی ہے، سو یہ سوٹ میں نے خرید لیا، مگر میں نے اسے استعمال نہیں کیا، میں یہ سوٹ جویریہ کو دے جاؤں گی۔"

"دے جاؤں گی ۔۔۔ دے جاؤں گی" معاذ کے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر فریال کو دیکھا۔

وہ اُس لباس کی آستین تھامے شاید کسی گزرے لمحے میں تھی۔

"نہیں، تم یہی لباس پہنو گی۔" وہ سختی سے بولا۔

اُس کی نگاہوں کے انداز معاذ کو بے بس کر گئے۔

"او کے، جو دل چاہے پہنو۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

فریال تیار ہو کر باہر آئی۔ معاذ صوفے پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں اسے لگا کہ وہ کچھ خفا سا ہے۔ اُس کا چہرا تنا ہوا تھا۔ اُسے ایک دم ہی معاذ پر بہت سا پیار آ گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔

دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اُس کے قریب آ گئی۔

"خفا ہو گئے ہیں آپ؟"

معاذ نے مڑ کر دیکھا۔

اُس نے نیوی بلیو کلر کا لباس پہن رکھا تھا۔ ہونٹوں پر شاکنگ پنک کلر کی لپ اسٹک کی ہلکی سی تہہ تھی۔

"تم سے کیسے خفا ہو سکتا ہوں۔ تم تو کبھی ناراض ہونے کا موقع بھی نہیں دیتیں۔ حالانکہ میرا دل چاہتا ہے کہ کبھی میں تم سے خفا ہو جاؤں، روٹھ جاؤں اور تم مجھے مناؤ۔ فریال کبھی تو ایسا کرو ۔۔۔ کبھی تو ایسا کرو۔" اُس کی آواز پر جذبات غالب آ گئے۔

فریال کی دھڑکنیں بکھرنے لگیں۔

"اب آپ جلدی سے تیار ہو جائیے، میں نے کپڑے نکال کر بیڈ پر رکھ دیے ہیں۔" وہ ایک دم سیدھی کھڑی ہو گئی۔

وہ ہمیشہ بروقت خود کو بچا لے جاتی تھی اور معاذ کی شکوہ کناں نگاہیں اسے دیکھتی رہ جاتی تھیں۔

○ ○ ○

وہ رات معاذ کے لیے لمحہ لمحہ قیامت بن کر گزر رہی تھی۔ وہ سخت پریشانی اور خوف کے عالم میں کمرے کے چکر کاٹ رہا تھا۔ مارے گھبراہٹ کے اُسے پسینے آ رہے تھے۔ اگلے لمحے کچھ بھی ہو جانے کے خوف سے اس کا دل بند ہوا جا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں بے جان ہو رہے تھے۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی مگر معاذ کو اپنے گھر کے دروازے کے باہر موت کے فرشتے کی آہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے موت کا فرشتہ بھی وقت دیکھ رہا ہے۔ لمحہ لمحہ گن رہا ہے اور جیسے ہی وہ لمحہ آئے گا وہ گھر کے اندر داخل ہو جائے گا، پھر اس کے کمرے تک، پھر فریال کے بیڈ کے پاس، اور پھر ۔۔۔!

وہ ہول کر تیزی سے بیڈ کے نزدیک آیا اور فریال کی ہتھیلی تھام کر اس کے وجود کی حرارت کا اندازہ کیا۔ اس کو بغور دیکھ کر سانسوں کا زیروبم محسوس کیا۔ اس کے نتھنوں کے نیچے ہاتھ رکھ کر سانسوں کی گرمی کا احساس کیا۔ پھر اس کی کلائی تھام کر نبض ٹٹولنے لگا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کبھی اسے فریال کی نبض تیز معلوم ہوتی اور کبھی ملک الموت کے قدموں کی چاپ۔

اُس نے فریال کی کلائی چھوڑ دی۔ سخت بے قراری کے عالم میں وہ پھر کمرے کے دیوانہ وار چکر لگانے لگا۔ سوچ سوچ کر اُس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اعصاب بُری طرح شل ہو گئے تھے۔ جسم و جان جیسے جلتے انگاروں پر دھرے تھے۔ وہ شدید ترین ذہنی دباؤ کا شکار تھا کہ اسے سانس بھی معمول کے مطابق نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر ضبط کرتے کرتے وہ تھک گیا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ دوسرے کمرے میں آ کر وہ بے اختیار قالین پر سجدہ ریز ہو گیا۔

معاذ ضبط کی انتہا پر پہنچ کر بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اُس نے خود کو خدا کے حوالے کر دیا۔ اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہو گئیں۔

"اے رب! میرے حال پر رحم کر۔ بے شک تیرے سوا اور کوئی نہیں جو اس کو بچا سکے۔ وہ مجھ سے دور جا رہی ہے، اسے مجھے واپس لوٹا دے، اس پر سے موت کے سائے کو ٹال دے، اس گھڑی کو ٹال دے۔ تو قادرِ مطلق ہے، تیرے بس میں سب کچھ ہے۔ میرا ایک ایک آنسو، فریال کی ایک ایک سانس، ایک ایک دھڑکن کی بھیک مانگ رہا ہے۔ فریال کو مجھے واپس دے دے۔ تیرا یہ گناہ گار بندہ تیرے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے۔"

جانے کب تک وہ اسی حال میں پڑا آنسوؤں کی زبان میں دُعا کرتا رہا کہ کندھے پر ہاتھ کے لمس کا احساس کرتے ہی مارے ڈر کر اٹھ بیٹھا۔

بیمار اور کمزور چہرا لیے فریال اسے حیرت سے تک رہی تھی۔

"فریال!" وہ اُس کا چہرا دونوں ہاتھوں میں تھام کر سخت بے قراری سے بولا۔

"کیسی ہو تم؟ اس وقت تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ تم کیا محسوس کر رہی ہو، بولتی کیوں نہیں ہو، ٹھیک تو ہو ناں تم؟"

فریال ایک ٹک اُس کے چہرے پر کرب کے سائے لہراتے دیکھ رہی تھی۔

"فریال! میرے پاس رہو، میرے ساتھ رہو، مجھے چھوڑ کر کہیں مت جانا، اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ــــ!" اس سے آگے اس سے بولا نہ گیا۔ اُس کی آواز رُندھ گئی۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" معاذ کی حالت پر وہ بُری طرح پریشان ہو گئی۔

"حوصلے سے کام لیں، آپ کو آنے والے وقت کے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے، وہ تو آنا ہی ہے۔"

"فریال!" وہ پھٹ پڑا۔

"اس طرح مت کہو، مجھے یہ احساس مت دلاؤ کہ میری دُعا کی قبولیت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مایوسی کے الفاظ منہ سے مت نکالو، مایوسی کفر ہے۔ آؤ میرے ساتھ دُعا مانگو کہ خدا ہم دونوں کو ایک دوسرے کی دائمی رفاقت نصیب کرے۔" وہ تو جیسے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس نے فریال کی دونوں ہتھیلیاں جوڑ دیں۔

"کہو آمین۔"

"آمین۔" اس نے سر جھکا لیا۔ بہت سارے آنسو خاموشی سے ٹپک گئے۔ چپکے سے آنسو صاف کر کے وہ آہستہ سے بولی۔

"چلیے، اندر کمرے میں چلیں۔" وہ اُسے لے کر بیڈ روم میں چلی آئی۔

دُکھ سے نڈھال معاذ بستر پر ڈھے گیا۔ وہ اُس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور بڑی ملائمت سے بولی۔

"آپ آرام و سکون سے سو جائیں، میں اس وقت بالکل ٹھیک ہوں۔ رات البتہ طبیعت زیادہ بگڑ گئی تھی، مگر اب سنبھل گئی ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں، اپنے ذہن کو ہر طرح کی سوچ سے خالی کر دیں اور سونے کی کوشش کریں۔"

"فریال! خدا کرے تمہیں میری عمر بھی لگ جائے۔" اُس نے فریال کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"خدا نہ کرے۔" اُس نے تڑپ کر معاذ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

معاذ سے بے ساختہ گستاخی ہو گئی۔

"فریال! اگر تم میرے لفظوں کا اعتبار کرو، میرے جذبوں کی صداقت پر تمہارا دل گواہی دے تو میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ بے شک اس کا احساس کرنے اور اس کا اعتراف کرنے میں مجھے بہت دیر لگی، مگر یہ سچ ہے کہ معاذ تمہیں چاہنے لگا ہے۔

ہاں بے شک محبت سے روشناس مجھے جویریہ نے کرایا، مگر تکمیل کا احساس تم نے مجھے دیا ہے۔ جویریہ میری اوّلین محبت ہے اور اس کا سب سے خوبصورت روپ تم ہو۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جویریہ میری پہلی بیوی ہے۔ مجھے اُس سے محبت ہے۔ اتنی شدید محبت کہ اس کی غیر موجودگی کا احساس بھی اس شدت کو کم نہیں کر سکتا۔ آج بھی دل میں جھانکتا ہوں تو اس کو موجود پاتا ہوں۔ جویریہ میرے دل میں بسی ہے، مگر تم ــــ تم تو دل بن گئی ہو میرا۔ جویریہ میرے لیے زندگی کا بھرپور احساس ہے۔ وہ میرے گھر کی رونق ہے اور تم ــــ تم میرے وجود کی رونق ہو۔ اُس کی آنکھوں سے میں دُنیا کو دیکھتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں سے میں نے خود کو دیکھا ہے اور اپنا آپ تمہاری چاہت میں ڈوبا ہوا پایا ہے۔ فریال اعتبار کرو میری چاہت کا، یقین کرو میرے لفظوں کا۔" وہ اسے جھنجوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

وہ بے اختیار جھر جھر رونے لگی۔

"خدا کے لیے مجھ سے اتنی محبت نہ کریں کہ زندگی کے مختصر ہونے کا دُکھ میرے دل میں اُتر جائے۔ اپنی چاہت سے مجھے سیراب نہ کریں۔ یہ پیاس کبھی نہیں بجھتی۔ اسے جتنا بجھاؤ یہ اتنی ہی بڑھتی ہے۔ اتنا قریب نہ آئیں معاذ کہ آپ سے ہمیشہ کے لیے دور جانا میرے لیے مشکل ہو جائے۔ ایسا کوئی دروازہ میرے لیے نہ کھولیں جس سے زندگی روشنی بن جائے۔ موت کا بڑھتا ہوا اندھیرا مجھے اور بھی خوفناک لگے گا۔"

وہ اُس کے کندھے سے لگی زار زار رو رہی تھی۔

جس خول میں اُس نے خود کو بند کر لیا تھا، وہ آہستہ آہستہ چٹخ رہا تھا۔

○ ○ ○

"کیا کر رہے ہو نہال؟" شہیر اُس کے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

"تم سوئے نہیں ابھی تک؟" نہال نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ رات کے ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔

"تم بھی تو جاگ رہے ہو!"

"تو ثابت یہ ہوا کہ ہم دونوں اُلو ہیں۔" وہ ہنسا اور بیڈ پر ایک طرف سرک گیا اور شہیر کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

"تمہیں نیند کیوں نہیں آ رہی ہے۔ تمہارا تو اب عقد بھی ہو چکا ہے۔" نہال نے انگڑائیاں لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو گویا تمہیں نیند اس لیے نہیں آ رہی ہے کہ تمہارا عقد ابھی تک نہیں ہوا ہے۔" اُس نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔

"بھئی اس میں پریشان ہونے اور نیندیں حرام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سر پہ سہرا لپیٹ کر چھپ بھی جان کے ہاں جاؤ اور رانیہ کو لے آؤ۔"

"کیا مطلب؟" نہال اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ وہ "رانیہ ہی ہے"؟" وہ واقعی حیران رہ گیا تھا۔

"اب ہم اتنے بے خبر بھی نہیں ہیں۔" وہ شانِ بے نیازی سے بولا۔

"پھر بھی میں نے کبھی تمہارے سامنے رانیہ کا نام تو نہیں لیا تھا۔ آخر تمہیں کیسے پتا چلا کہ رانیہ وہی لڑکی ہے۔"

"شاید تم بھول رہے ہو، ایک بار تم نے مجھ سے اُس کا تذکرہ کیا تھا۔ نام بھی بتایا تھا۔ بہرحال تصدیق قیامت کی نظر نے کی۔ جو ہم بخوبی رکھتے تھے۔ یہ اُس دن کی بات ہے جب ہم سیب پکنک پر جا رہے تھے۔ جب رانیہ تمہارے گھر میں داخل ہوئی تم وہیں موجود تھے۔ تم نے اُسے جن نگاہوں سے دیکھا، اُس وقت تمہاری نگاہوں کے آگے دُنیا کی ہر خوبصورت چیز ہیچ تھی۔ بس ہماری قیامت کی نظر نے تاڑ لیا کہ یہی وہ موصوفہ ہیں جو آپ کے حواسوں پر سوار ہیں۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"ہاں وہی ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں اعتراف کیا۔ اس کی آنکھیں رانیہ کے تصور سے چمکنے لگی تھیں۔ وہ عجب سوئے سوئے لہجے میں بولا۔

"یار شہیر! تم نے دیکھا، رات اس کی آنکھوں میں ڈھلتی ہے اور دن جیسے اس کے چہرے پر طلوع ہوتا ہے۔"

"دیکھو بھئی، میں بیوی والا آدمی ہوں۔ پرائی لڑکیوں کو اتنے غور سے نہیں دیکھتا کہ رات اور دن کا پتا چل سکے۔" اس نے اطمینان سے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

اس کی بات پر نہال اس کو گھور کر رہ گیا۔

"پھر اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟"

"میرے تو نیک ارادے ہیں، مگر شاید وہ یہ نیکی کرنے پر تیار نہیں۔" نہال ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

"کیا مطلب؟" شہیر نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اسے دیکھا۔

"مطلب یہ کہ وہ تو میرے سائے تک سے خار کھاتی ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"راز ہو، اب تمہیں کیا بتاؤں۔ دراصل میں نے اس سے راز الفت قبل از وقت ہی کہہ ڈالا۔ خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر قیامت کے آنے کا امکان ہوتا۔ لیکن جو میرا بیان کرنے کا انداز تھا، وہ ذرا گڑبڑ تھا۔ تم یوں سمجھو کہ بات پھولوں کی تھی اور پتھر مارنے کے انداز میں کہہ دی۔"

"تم پر کون سی افتاد پڑی تھی کہ فوراً ہی اظہار عشق فرما دیا، وہ بھی سنگ باری کی صورت میں۔ یار ہم سے مشورہ لے لیا ہوتا۔ فقط دو لفظ لکھتے۔ دل امانت ہے اور جان نذرانہ۔" شہیر نے اپنی دانست میں آسان سا نسخہ بتایا۔

"امانت کو تو وہ بھاڑ میں جھونکے گی۔ ہاں البتہ میری جان وہ ضرور لے لے گی، نذرانے کے طور پر نہیں انتقام کی صورت میں۔" وہ سلگ کر بولا۔

"چچ چچ۔" شہیر نے ایسے موقع پر تاسف کا اظہار ضروری سمجھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس کا دل میری طرف سے کیسے صاف ہوگا۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

"ایسا کرو تحفے کے طور پر اسے دو گائے سوپ بھیج دو۔" شہیر نے بڑی سنجیدہ شکل بنا کر کہا اور جھٹ تکیہ اٹھا کر اپنے لیے دفاعی مورچہ تیار کر لیا۔

نہال کا پہلا کشن تکیے پر ہی پڑا۔

"یار نہال! تم بھی کن باتوں میں الجھے ہوئے ہو، سیدھے سیدھے دادا جان سے جا کر کہہ دو کہ تم رانیہ سے شادی کرنا چاہتے ہو، بعد میں سب کچھ خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ نانا جان سے کون بات کرے؟"

"تم خود کہہ دینا کہ نانا جان میں اپنے عشق کے ہتھوڑے سے سماج کی ہر دیوار گرا دوں گا، بشرطیکہ ہتھوڑا رانیہ کے ہاتھ میں ہو، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ دینا کہ میں اپنی زندگی کی اندھیری شاہراہوں پر رانیہ کے نام کی ٹیوب لائٹس لگانا چاہتا ہوں۔" شہیر نے اسی کے کہے الفاظ اس کو لوٹا دیے۔

"تم اپنے باز نہیں آؤ گے۔" نہال نے مارے غصے کے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں کہ شاید کوئی ایسی چیز ہاتھ لگ جائے جس سے شہیر کی تواضع ہو سکے۔

"اچھا چلو خیر یہ ذمہ داری میں لے لیتا ہوں۔ میں دادا جان سے کہہ دوں گا کہ تم رانیہ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

"کوئی اس سے بھی تو پوچھے کہ وہ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے یا نہیں۔"

"تو چلو چلتے ہیں۔" شہیر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"رانیہ سے پوچھنے۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"شہیر! تم فوراً سے پیشتر یہاں سے چلے جاؤ، میں اب مزید تمہیں برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ تلملا کر رہ گیا۔

"یار نہال تم سے بھی حد ہے، بیکار وسوسوں میں الجھے ہو۔ اگر تمہاری کسی بات سے اس کو ٹھیس پہنچی ہی ہے تو تم اس سے سوری نہیں کر سکتے تھے۔"

نہال اس کی بات پر خاموش رہا۔

"خیر اب جب بھی موقع ملے اس سے معذرت کر لینا، میں دادا جان سے بات بھی کر لوں گا، لہٰذا اب آرام سے سو جاؤ، انشاء اللہ تمہارا عقد کبھی نہ کبھی ہو ہی جائے گا۔" وہ کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

○ ○ ○

جس دن سے فریال موت کی سرحدوں کو چھو کر ایک بار پھر دوبارہ پلٹی تھی، اس دن کے بعد سے معاذ بہت زیادہ بجھا بجھا رہنے لگا تھا، مگر فریال کے سامنے وہ خود کو نارمل ہی ظاہر کرتا۔ اس دن کے بعد سے وہ اس پر اور بھی زیادہ مہربان ہو گیا تھا۔ دفتر سے بھی وہ اب جلدی ہی آنے لگا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ اب وہ زیادہ سے زیادہ وقت فریال کے ساتھ گزارے۔

اس شب وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد حسب معمول ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا۔ فریال نے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے اور دروازہ بند کر کے اندر کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا سا پیکٹ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اگرچہ کہ اس کا دل اندر سے بے حد اداس تھا، پھر بھی اس نے بظاہر دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ تحفہ ہے۔"

"میرے لیے؟" اس نے بھنویں اچکا کر کہا۔

"جی ہاں، بہت خوبصورت، بہت منفرد، بظاہر تو مضبوط ہے مگر درحقیقت بہت نازک ہے، اسے حفاظت سے رکھیے گا، دل سے لگا کر رکھیے گا، بے حد قیمتی ہے، بلکہ انمول ہے۔" وہ ذومعنی انداز میں کہہ رہی تھی۔

"مگر یہ ہے کیا؟" معاذ کے لہجے میں تجسس تھا۔

"یہ آپ کے لیے ہے، آپ ہی کی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔ معاذ گھٹنوں پر رکھ کر اس کا پیپر اتارنے لگا۔ پیپر کے اترتے ہی اس کے ہاتھ ساکت رہ گئے۔

جویریہ کا انتہائی خوبصورت پورٹریٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"خوبصورت ہے۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"تصویر یا تصویر والی؟"

"تینوں۔ تصویر بھی، تصویر والی بھی اور تصویر بنانے والی بھی۔" اسے ہوش آ چکا تھا، مسکراتے ہوئے بولا۔

"بہت سوچتی تھی کہ کون سی چیز اپنی یادگار کے طور پر آپ کے لیے چھوڑ کر جاؤں۔ پھر اس سے بہتر چیز اور کوئی نہ سوجھی، آپ کو پسند آئی ناں؟"

اس کے لہجے پر معاذ نے پہلے خفگی سے اسے دیکھا پھر قدرے نرمی سے بولا۔

"تمہارا خلوص زیادہ پسند آیا، جاؤ اسے الماری میں رکھ آؤ۔"

"الماری میں کیوں رکھوں؟ آپ اسے وہاں دیوار پر لگا دیں۔" اس نے دائیں سمت دیوار کے خالی حصے کی طرف اشارہ کیا۔

"فی الحال تم الماری میں رکھ دو۔" معاذ کو جویریہ کی تصویر دیوار پر لگانے میں تامل ہوا۔

"نہیں، آپ ابھی لگائیے۔" وہ بضد ہو گئی۔

خاصے پس و پیش کے بعد مجبوراً معاذ نے اٹھ کر دیوار پر تصویر لگا دی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"کتنی خوبصورت ہے ناں جویریہ، بلا کی معصومیت ہے اور بے ساختگی ہے اس کے حسن میں"۔ وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بولی۔

معاذ اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

(یا رب! یہ کس قسم کی عورتیں تُو نے میرے نصیب میں لکھ دی ہیں۔ ایک دوسری کے حوالے کر کے چلی گئی۔ دوسری پہلی کی محبت میں مبتلا نظر آتی ہے۔ یہ عورت کی فطرت تو نہیں ہے پروردگار! ان دونوں کا خمیر کس مٹی سے اٹھا ہے۔ یہ دونوں عورتوں کی کس قسم سے تعلق رکھتی ہیں)

"معاذ!" فریال کچھ سوچ کر بڑے سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"آپ نے کبھی سوچا ہے کہ جویریہ کو آخر کس بات کی سزا ملی ہے، اس سے تو کوئی بھی خطا نہیں ہوئی۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں آپ سے محبت کرتی تھی۔ آپ کی خطا یہ ہے کہ آپ نے مجھ سے شادی کر لی، مگر جویریہ، اس نے تو کچھ نہیں کیا تھا، پھر وہ کیوں سزا جھیل رہی ہے، کس بات کا کفارا ادا کر رہی ہے؟"

معاذ کی نگاہ جویریہ کی تصویر پر ٹھہر گئی۔

(معاذ آپ مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جائیے گا، میں مر جاؤں گی۔ ہر وہ لمحہ جو آپ کے بغیر گزرتا ہے، زندگی سے خالی ہوتا ہے۔ آپ دفتر چلے جاتے ہیں تو میرے اندر سے زندگی کے احساس کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں گھڑی دیکھتی رہتی ہوں کہ آپ کب آئیں گے۔ جوں جوں آپ کے آنے کا وقت آتا جاتا ہے، زندگی قطرہ قطرہ میرے اندر داخل ہونے لگتی ہے۔ معاذ! آپ ہمیشہ مجھے اپنے پاس رکھیے گا، آپ مجھے خود سے دُور نہیں کریں گے ناں؟)

اس کے کانوں میں جویریہ کی روتی ہوئی آواز آ رہی تھی۔ وہ بُری طرح بے چین ہو گیا۔

"کیسے جی رہی ہو گی وہ میرے بغیر"۔ اس کے دل میں درد اکٹھا ہونے لگا۔

"کیا سونے کا ارادہ نہیں"۔ وہ اپنے خیالات سے گھبرا کر بولا۔

"نیند آ رہی ہے آپ کو؟"

"ہاں تھکن سی ہو رہی تھی ذرروح بوجھل محسوس ہو رہی ہے"۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

فریال نے ٹی وی آف کیا۔ کمرے کے پردے برابر کیے اور بتی بجھا کر اس کے پیچھے پیچھے بیڈ روم میں چلی آئی۔

معاذ چپ چاپ بیڈ پر جا کر لیٹ گیا۔

"کمرے کی لائٹ بھی بند کر دوں؟"

"ہاں کر دو"۔

فریال ٹیوب لائٹ آف کر کے نائٹ بلب جلا کر دوسری سمت سے آ کر اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔

"معاذ!" اس کی آواز اندھیرے میں گونجی۔

"جب آپ واپسی کا سفر شروع کریں تو کوئی ایسا راستہ اختیار کیجیے گا کہ جس پر میرے قدموں کے نشان نہ ہوں۔ جویریہ کو اس کا وہی معاذ لوٹا دیجیے گا جس کو اس نے پہلی بار پایا تھا"۔

معاذ اُس کے لفظوں پر غور ہی کرتا رہ گیا اور وہ بے خبر سو گئی۔

مگر معاذ نہ سو پایا۔ وہ مضطرب سا کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ پرانے راستوں پر دور تک سفر کرے۔ جویریہ کو تلاش کرے۔ وہ خاموشی سے اٹھا۔ ایک نظر فریال پر ڈالی۔ وہ دوسری طرف منہ کیے گہری نیند سو رہی تھی۔

معاذ آہستگی سے چلتا ہوا دروازے تک آیا اور بے آواز طریقے سے کھول کر باہر نکل گیا۔

ڈرائنگ روم میں آ کر اس نے جویریہ کی تصویر دیوار پر سے اُتاری اور بغور دیکھنے لگا۔

اس کے ذہن کے پردے پر بیتے دنوں کے بہت سے خوشگوار پل ایک دم ہی نمایاں ہو گئے۔

وہی شوخی سے چمکتی آنکھیں، وہی ستواں ناک، مسکرانے کے انداز میں ادھ کھلے لب، رخسار پر جھولتی اس کی اُلجھی ہوئی لٹ۔

کتنے عرصے کے بعد وہ جویریہ کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ وہ ظالم تو جاتے ہوئے اپنی ساری تصویریں بھی ساتھ لے گئی تھی۔

وہ بڑی بے قرار نگاہوں سے تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ بے ساختہ اس نے پیار بھرے انداز میں یوں تصویر پر ہاتھ پھیرا، جیسے رخسار پر سے اس کی لٹ ہٹانا چاہی ہو۔

"کیسی ہو تم؟" اس نے اس کی آنکھوں سے پوچھا "جی رہی ہو ناں، دن رات کیسے گزرتے ہیں تمہارے؟ مجھے پل پل یاد کرتی ہو گی۔ میں بھی تمہیں بھولا نہیں ہوں، سب کچھ یاد ہے مجھے۔ تم بھی اور تمہاری محبت بھی۔ بہت حفاظت سے رکھا ہوا ہے تمہیں۔ کانچ کی بنی ہوئی ہو ناں تم۔ اپنا خیال رکھنا، ٹوٹ نہ جانا تم"۔

اس نے نرمی سے تصویر پر لب رکھ دیئے۔

بے ساختہ اسے خواہش ہوئی کہ وہ جویریہ کی آواز سنے اور پھر وہ اپنی خواہش کو دبا نہ سکا۔ اس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور دوسری اپنے بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف۔ ریسیور اٹھا کر کراچی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف عنبرینہ تھی جس نے اسے بتایا کہ جویریہ اپنے والدین کے گھر گئی ہوئی ہے۔ اس نے ڈسکنیکٹ کر کے قریشی صاحب کا نمبر ملایا۔ زوباریہ نے اٹھا لیا۔

"زوباریہ! میں معاذ بول رہا ہوں"۔

"ہائے"۔ اس نے پُر مسرت چیخ ماری۔

"معاذ بھائی، آداب عرض ہے، کیسے ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہوں، تم سناؤ کیسی ہو؟"

"ابھی تک تو سارے حواس صحیح کام کر رہے ہیں"۔

"جویریہ کیسی ہے؟"

"باجی بالکل خیریت سے ہیں"۔

"میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں، مگر تم اس سے یہ مت کہنا کہ میرا فون ہے"۔

"جی اچھا! میں ابھی بلاتی ہوں"۔ وہ رُکی پھر قدرے جھجک کر بولی۔

"معاذ بھائی! فریال باجی تو خیریت سے ہیں ناں؟"

اور معاذ کے دل سے جویریہ کے لیے محبت کے سوتے اُبل پڑے۔ اس نے سوکن کے رشتے میں منسلک ہونے کے باوجود اپنے سے وابستہ لوگوں میں فریال کے متعلق کوئی منفی تاثر پیدا ہونے نہیں دیا تھا۔

"فریال بھی ٹھیک ہے"۔ اس نے مدھم لہجے میں کہا

"میں باجی کو ابھی بلاتی ہوں"۔

"باجی!" وہ غالباً وہیں سے دھاڑی تھی۔ معاذ کو اس کی آواز سنائی دی۔

"کس کا فون ہے؟" جویریہ ریسیور ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

اس کی آواز کان میں کیا پڑی۔ معاذ کی پیاسی سماعتیں سیراب ہو گئیں۔

"ہیلو"۔ اب اسے جویریہ کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔

وہ خاموش رہا۔

"ہیلو۔۔!"

معاذ نے سختی سے لب بھینچ لیے۔

"ہیلو"۔ اس نے دوبارہ کہا پھر زوباریہ سے مخاطب ہوئی۔

"زوباریہ! کس کا فون ہے، کوئی بول ہی نہیں رہا ہے"۔

معاذ نے ایک دم ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ڈھیلے ڈھالے انداز میں صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ کچھ دیر اسی حالت میں پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور بستر پر دراز ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اور ساری رات اس کے دل سے دھک دھک کی نہیں ہیلو ہیلو کی آوازیں آتی رہی۔

○ ○ ○

"ذیشان" زیبا نے سیڑھیاں چڑھتے ذیشان کو پکارا اور ساتھ ہی لپک کر اس کے قریب آ گئی۔

وہ ٹھہر گیا۔ "کیا بات ہے؟"

"تم کہاں چلے گئے تھے۔ مجھے تمہیں ایک بڑی زبردست خبر سنانی تھی۔ کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی کہ تم آؤ اور میں فوراً سے پیشتر اگل دوں۔" وہ بے حد ایکسائیٹڈ لگ رہی تھی۔

ذیشان بڑی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ اس کی نگاہوں کی محویت کو محسوس کر کے قدرے ٹھٹک کر بولی۔

"تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔" وہ مسکرایا۔

"اونہہ۔ فضول بات نہیں کرو۔" وہ جھینپ گئی۔

"ہاں تو وہ کون سی خبر ہے جو تم مجھے سنانے کے لیے بے چین ہو رہی ہو۔"

"بے چین نہیں، سخت بے چین۔" اس نے جھٹ تصحیح کی۔ "تمہیں پتا ہے نہال بھائی، رائنہ باجی کو پسند کرتے ہیں اور ان سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

ذیشان کے چہرے پر ایک دم ہی سناٹا چھا گیا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

دوسری طرف زیبا، ذیشان کی طرف سے حسب توقع ردعمل نہ پا کر حیران رہ گئی۔ اور الجھے ہوئے انداز میں بولی۔

"نہال بھائی نے شہیر بھائی سے کہا تھا اور اب شہیر بھائی دادا جان سے بات کرنے والے ہیں۔ کیا بات ہے ذیشان، لگتا ہے تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔" ذیشان کے ردعمل سے اس کا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

ذیشان نے فوراً خود پر قابو پایا اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"خوشی کی بات ہے۔ مجھے بھلا خوشی کیوں نہ ہو گی۔"

"پھر تمہارا منہ کیوں لٹک رہا ہے۔" وہ اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ ہائیں۔ اس کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔

"ذیشان کہیں تم بھی تو رائنہ باجی کو پسند نہیں کرتے؟" اس نے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ذیشان کا ذہن لمحے بھر کو بھٹکا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "فرض کرو ایسا ہی ہے پھر؟"

"ہیں۔" زیبا کی تو آنکھیں پھٹ گئیں۔ "کیا کہا تم نے؟"

"بھئی وہ ہیں ہی ایسی۔ جو دیکھے ہار جائے۔"

"میں کہہ رہی ہوں تم اپنے حواسوں پر سے صدقہ دو۔ تمہاری عقل گھاس کھانے تو نہیں چل دی۔ تمہیں وہی ملی تھیں لٹو ہونے کے لیے۔ تمہیں پتا ہے وہ تم سے عمر میں بڑی ہیں۔ اُف خدا یہ کیا غضب ہو گیا۔" وہ کم عقل ذیشان کی بات پر فوراً ایمان لے آئی اور ساتھ ہی اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے۔ وہ دھپ سے سیڑھیوں پر سر تھام کر بیٹھ گئی اور اسے چکرانے سے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

ذیشان نے بمشکل ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ روکی۔

"عمر میں بڑی ہیں تو کیا ہوا۔ اس سے کوئی خاص فرق تو نہیں پڑتا۔" اس نے کندھے اچکا کر بظاہر لاپروائی سے کہا۔

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔" وہ تڑخ کر بولی۔ "تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔ یا باری تعالیٰ یہ ذیشان کے سر سے محبت کا بھوت کیسے اُترے گا۔" اس کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

ذیشان دوسری طرف منہ کر کے ذرا سا مسکرایا۔

"زیبا ایک بات تو بتاؤ۔ اگر تمہارے دو بھائی بیک وقت ایک ہی لڑکی کو پسند کر بیٹھیں تو تم کیا چاہو گی کہ شادی کس سے ہو؟ جبکہ اپنے دونوں بھائیوں کے لیے تم محبت کے یکساں جذبات رکھتی ہو۔"

"میں پوچھتی ہوں تم نے رائنہ باجی پر ایسی نظر ڈالی ہی کیوں؟" وہ سچ مچ بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔

"تو کون سی قیامت آ گئی۔ بہرحال اب تو میں ان کو پسند کر بیٹھا ہوں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

زیبا اس کو سخت متفکر اور متذبذب نظروں سے دیکھنے لگی۔

"دیکھو ذیشان! تم رائنہ باجی کا خیال دل سے نکال دو۔" وہ روہانسی سی ہو گئی۔

"کیوں نکال دوں؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہاری ان سے شادی ناممکن ہے۔ وہ تم سے عمر میں بڑی ہیں۔ تمہارے اور ان کے درمیان ذہنی مطابقت ہونا مشکل ہے۔ اور ذرا رائنہ باجی کا سوچو کہ وہ بھلا تم سے شادی کیسے کر سکتی ہیں؟"

"اچھا چلو میں تمہاری بات تسلیم کر لیتا ہوں لیکن بالفرض مجھ سے ان کی شادی ممکنات میں سے ہوتی تو۔۔۔؟"

زیبا نے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تب بھی ذیشان میں تم سے یہی کہتی کہ ان کو بھول جاؤ۔"

"کیوں؟" اس نے بغور زیبا کو دیکھا۔

"نہال بھائی کے لیے۔ ذرا سوچو ذیشان کہ نہال بھائی نے اب تک اپنی زندگی کس طرح جلتے انگاروں پر گزاری ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں، چھوٹی چھوٹی محبتوں کو ترسے ہیں وہ۔ کیا تم نہیں جانتے؟ اور اس پر بھی تم چاہتے ہو کہ وہ مزید۔" اس سے آگے اس سے بولا نہ گیا، وہ رو پڑی۔

"او میرے خدا۔" اسے روتا دیکھ کر ذیشان نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "بس زیبا یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تم سے زیادہ بے وقوف لڑکی پورے کرۂ ارض پر نہیں پائی جاتی۔ نہ خشکی پر اور نہ پانی میں۔ یا با ذرا عقل سے سوچو کیا میں اس طرح رائنہ باجی کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ احمق لڑکی میں تو تمہیں تنگ کر رہا تھا۔ تم سے مذاق کر رہا تھا۔"

"مذاق۔" وہ جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔ اپنے جلد باز آنسوؤں پر لعنت بھیجتے ہوئے، فوری طور پر دل ہی دل میں اپنے احمق ہونے کی تصدیق کی اور پھر اس پر ماتم کرنے کے بعد اس نے ذیشان کو خون آشام نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے کہ میں تمہارا سچ مچ خون پی جاؤں، تم فوراً سے پیشتر دفع ہو جاؤ۔ میری نظروں کے سامنے سے اور ہفتے بھر تک مجھے اپنی شکل نہ دکھانا کہ کہیں میرا جذبۂ انتقام پھر قابو سے باہر نہ ہو جائے۔" وہ دھاڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اسے یوں بے وقوف بن جانے پر خاصی خفت اور شرمندگی ہو رہی تھی۔ اگرچہ کہ یہ اس کے ساتھ پہلی بار نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ تو اکثر ہوتا ہی رہتا تھا۔ پاؤں پٹختی ہوئی وہ اپنے کمرے میں گھس گئی اور زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر لیا۔

ذیشان جانے کب تک وہیں کھڑا اپنی سوچوں سے الجھتا رہا۔

○ ○ ○

"ذیشان۔ اے ذیشان۔" اماں بی آوازیں دیتے ہوئے آ رہی تھیں۔

تکیے میں سر گھسائے ذیشان نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"ذیشان بیٹے کھانا کھا لو۔ نیچے سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

انا بی نے اسے تردد بھری نظروں سے دیکھا اور اس کے پاس ہی بستر پر بیٹھ گئیں۔ "میں صبح سے تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ بجھے بجھے سے ہو۔ تم نے دوپہر کو بھی ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے بے چینی سے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"بیٹے۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ مجھ سے چھپا رہے ہو۔"

"انا بی! جب کوئی بات ہی نہیں ہے تو کیا بتاؤں؟"

"پھر تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟"

"پتا نہیں۔ شاید بلاوجہ۔"

"بلاوجہ تو کوئی پریشان نہیں ہوتا۔" وہ خفگی سے اسے گھورنے لگیں۔

"اچھا آئیے کھانا کھانے چلیں۔" وہ مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا

انا بی کچھ دیر اسے متفکر نظروں سے دیکھتی رہیں پھر ایک گہرا سانس لے کر اُٹھیں اور ا[illegible] کے ساتھ کمرے سے باہر آگئیں۔

کھانا کھانے کے بعد باقی سب لوگ حسب معمول ٹی۔وی لاؤنج میں چلے گئے۔ وہ اُٹھ کر دوبارہ اپنے بیڈروم میں آ کر چپ چاپ بستر پر جا کر لیٹ گیا اور سوچوں کے جال بننے لگا۔

"بھائی جان!" شیراز کو اپنے کمرے کے سامنے سے گزرتا دیکھ کر وہ بے اختیار اسے آواز دے بیٹھا۔

شیراز اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

"جی کچھ نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا۔

شیراز نے اسے غور سے دیکھا اور دو قدم آگے بڑھ کر اس کے قریب آ گیا اور سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔

"بھائی جان کیا آپ بے حس ہیں۔" اس کا ذہنی انتشار بے ربط سے جملے میں ڈھل گیا۔

شیراز نے بھنویں سکیڑ کر اسے دیکھا پھر قدرے ہنس کر بولا۔

"یہ کس بات سے اندازہ لگایا تم نے؟"

"تو پھر گھر میں نہال بھائی کی رائنہ باجی سے شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ آپ اس پر احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ رائنہ باجی آپ کے تصور کی حدوں سے بھی نکل رہی ہیں۔ آپ اس کا غم کیوں نہیں مناتے۔ کیوں نہیں آپ ان سب لوگوں سے یہ کہتے کہ آپ بھی ان کے خواہش مند ہیں۔"

دوسری طرف شیراز کو حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا۔ لمحے بھر کو وہ بالکل گم صم ہو کر رہ گیا۔

"چپ کیوں ہیں آپ؟ بولتے کیوں نہیں؟ میری بات کو رد کرنے کے لیے شاید آپ کو مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ رائنہ باجی میں انٹرسٹڈ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ نہال بھائی کی وجہ سے آپ نے ان کا خیال دل سے نکال دیا۔"

"ذیشان! تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ رائنہ بے شک اچھی لڑکی ہے مگر تم جن معنوں میں بات کر رہے ہو، میں نے اس انداز سے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔" ذیشان نے ایک دم ہی اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اس کے لیے سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا۔

"شیراز بھائی آپ میری طرف دیکھ کر بات کریں۔" اس نے شیراز کا رُخ اپنی جانب موڑا۔

"تم جو سمجھ رہے ہو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے قدرے سختی سے کہا۔

"آپ کے انکار کرنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ کیوں اتنے بزدل بن رہے ہیں آپ؟ اقرار کیوں نہیں کرتے کہ آپ رائنہ باجی میں انٹرسٹڈ ہیں۔" اسے خود پر قابو نہیں رہا۔ وہ ایک دم پھٹ پڑا۔

"ذیشان میں کہتا ہوں بکواس بند کرو اپنی۔" وہ پھنکار کر بولا۔ "اور آہستہ بولو۔ تمہاری آواز اس کمرے کی دیواروں سے باہر نہیں جانی چاہیے۔" وہ تیزی سے مڑا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر وہ اسے بے حد برہم نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

"مجھے سخت حیرت ہے کہ جو بات میرے ذہن سے محو ہو چکی ہے، وہ تمہارے دل میں کیسے اُتر گئی۔"

"ہونہہ۔" وہ طنزیہ ہنسا۔ "شکر ہے آپ نے اس بات کا اقرار تو کیا لیکن آپ یاد رکھیے کہ میں آپ کی خواہشات کے مزار پر نہال بھائی کو ارمانوں کا تاج محل کھڑا کرنے نہیں دوں گا۔ اگر رائنہ باجی آپ کی نہیں ہو سکتیں تو نہال بھائی بھی ان کو حاصل نہیں کر پائیں گے۔" وہ دھیمے مگر لوہے کی طرح سخت لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ذیشان تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیوں نہال کی زندگی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ کیا تمہیں احساس نہیں کہ نہال نے اب تک اپنی زندگی کس طرح کانٹے کی نوک پر بسر کی ہے۔ ایک ٹھکرائے ہوئے انسان کی حیثیت سے اس نے زندگی کا ایک ایک دن جیسے تپتے صحراؤں میں بھٹک کر گزارا ہے۔ آج دادا جان کے دل میں اس کے لیے جگہ پیدا ہو گئی ہے۔ کیا تم کو علم نہیں کہ دادا جان کی ایک شفقت بھری نگاہ کے لیے، ان کے منہ سے نکلے محبت کے دو لفظوں کے لیے اس نے سالوں انتظار کیا ہے۔ اس کا ایک لمحہ آس میں دوسرا ناامیدی میں گزرا ہے۔ ذیشان، نہال نے زندگی گزاری نہیں، سزا کی مانند کاٹی ہے۔ اب جبکہ اس کی حیات اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آ گئی ہے۔ خوشی کے در پر دستک دے بیٹھی ہے تو تم چاہتے ہو کہ وہ دروازہ ہی نہ کھولے۔ وہ اگر رائنہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو تم کو کیا اعتراض ہے؟"

"اعتراض مجھے یہ ہے کہ میرا ایک بھائی اپنی زندگی میں جن رنگوں کو بکھیرنا چاہتا ہے۔ وہ رنگ نہیں میرے دوسرے بھائی کے جذبات کا خون ہے۔ میرا ایک بھائی میرے دوسرے بھائی کے آنسوؤں کو آب حیات سمجھ کر پی جائے۔ میں یہ بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ براہی سے کہہ رہا تھا۔

"ذیشان۔" شیراز کا لہجہ بے حد نرم ہو گیا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ میں نے رائنہ کے بارے میں سوچا تھا۔ مگر میں اتنی دور نہیں گیا تھا کہ پلٹ کر واپس نہ آ سکوں۔ جتنی سچائی سے میں نے تمہارے سامنے رائنہ سے جذباتی وابستگی کا اعتراف کیا ہے۔ اتنی ہی سچائی سے میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ آج میری سوچیں رائنہ کی پرچھائیوں سے بھی اتنے فاصلے پر ہیں جتنا آسمان سے زمین دور ہے۔ اعتبار کرو میری بات کا۔"

ذیشان نے بے ساختہ اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی مسکراتی آنکھوں میں سچائی کا رنگ بے حد واضح تھا۔ ذیشان نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"تم نہال کو تو جانتے ہو ناں کہ وہ کتنا جذباتی ہے، شدت پسند ہے۔ اس کی خواہشات کتنی جلدی جنون بن جایا کرتی ہیں۔ اپنی من پسند چیز کو حاصل کرنے کے لیے۔ جو چیز وہ سب سے پہلے داؤ پر لگاتا ہے۔ وہ اس کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ مجھے اور تمہیں اس بات کا اندازہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی کہ رائنہ محض اس کی خواہش نہیں، گزرتے وقت کے ساتھ اس کا جنون، اس کی دیوانگی بن گئی ہوگی۔"

اس نے ایک طویل سانس لیا اور باہر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آج وقت نے اس کے کرچی کرچی وجود کو سمیٹ لیا ہے۔ ذیشان تم اس کو یوں ٹھوکر نہ لگاؤ۔ اب اگر وہ ٹوٹ گیا تو بکھرے گا نہیں، مر جائے گا۔ اور میں اور تم دونوں ساری زندگی اپنے اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم بنے کھڑے رہیں گے کہ ہم نے اپنے بھائی کو مار دیا۔"

ستے ہوئے چہرے، لبوں کو سختی سے بھینچتے ذیشان کو خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"بے وقوف۔" شیراز نے بڑی محبت سے اسے سینے سے لگا لیا۔ "یہ آنسو کس لیے ہیں؟"

"آپ کی قربانی، آپ کے ایثار کی نذر دو آنسو بھی نہ کروں۔"

"بشت۔" اس نے اس کے سر پر چپت لگائی۔ "یہ قربانی نہیں ہے۔ یہ تو تحفہ ہے جو ایک بھائی دوسرے بھائی کو انمول خوشی کی صورت میں دے رہا ہے۔ اچھا اُٹھو۔ کیا بچوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ۔"

ذیشان خاموشی سے اُٹھا اور منہ دھو کر آ گیا۔

"ذیشان مجھ سے وعدہ کرو کہ اس بات کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ گے۔" اس نے ذیشان کے دونوں

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"بھائی جان میں تو بھول جاؤں گا۔ مگر۔"
"تم بھول جاؤ گے اور میں بھول چکا ہوں۔" وہ اس کی بات سمجھ کر بولا۔
ذیشان نے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا اور ایک دم ہی اس سے لپٹ گیا۔

○ ○ ○

"سنیے آپ ذرا مجھے خرم بھائی کے ہاں ڈراپ کر دیجیے۔ کل ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں ذرا ان کو دیکھ آؤں۔" فریال ناشتے کی میز پر بیٹھی تھی۔
"ٹھیک ہے تم تیار ہو جاؤ۔ میں دفتر جاتے ہوئے تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔" وہ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ "رات کو وہیں رہنے کا ارادہ ہے؟"
"نہیں۔ میں دوپہر تک آ جاؤں گی۔"
"ایسا کرو تم شام تک وہیں رُک جانا۔ میں دفتر سے واپسی پر تمہیں لے لوں گا۔"
فریال نے اثبات میں سر ہلایا اور تیار ہونے کی غرض سے اندر چلی گئی۔ معاذ دفتر جاتے ہوئے اسے خرم کے ہاں چھوڑ گیا۔
مگر رات کو گھر واپس لوٹتے انہیں کافی دیر ہو گئی۔ کہ خرم نے انہیں کھانے پر روک لیا تھا۔
"کیا بات ہے آپ بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔ آنکھوں میں انوکھی سی چمک ہے۔ لب بھی بے وجہ مسکرا رہے ہیں؟"
معاذ دروازہ کھول رہا تھا۔ فریال اسے بغور دیکھ رہی تھی۔
"ہوں۔ کیا کہا تم نے؟" جانے وہ کس جہان میں تھا اور کس خیال کے تحت اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔
"مجھے اپنی خوشی میں شریک نہیں کریں گے؟"
"تم تو خود میرے لیے انمول خوشی ہو۔" وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔
فریال نے اپنا پرس ٹیبل پر رکھا۔ بالوں کو ربر بینڈ کی قید سے آزاد کر کے سر کو جھٹکا دیا۔ ریشمی بال کندھوں پر بکھر گئے۔ بازو پر جھولتی شال کو صوفے پر ڈال کر تھکے تھکے سے انداز میں انگلیوں کے ذریعے بالوں میں تلاش کرتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔
معاذ کی معنی خیز نگاہ نے اس کا تعاقب کیا۔
"معاذ۔" فریال کی تحیر بھری آواز آئی۔
اور وہ تو جیسے منتظر ہی تھا۔ خوشگوار احساسات سے معمور دل لیے سرمستی کے عالم میں جھومتے قدموں سے اندر چلا گیا۔
فریال دم بخود سی کھڑی کمرے کے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں اتنے پھول تھے کہ پہلے سے کمرے میں رکھی ہر شے ان میں کہیں گم ہو گئی تھی۔
"یہ سب کیا ہے؟"
"دراصل میں جاننا چاہ رہا تھا کہ کمرے میں اگر ہر طرف پھول ہی پھول ہوں اور تم بھی موجود ہو تو کیا میں تمہیں دیکھ پاؤں گا یا نہیں۔ پہچان پاؤں گا یا نہیں۔" اس کا لہجہ اور نظر بہکے بہکے تھے۔
فریال نے چہرا اُٹھا کر اسے دیکھا۔
معاذ کی نگاہیں درد دل پر دستک دیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔
اس کا دل ایک نئے انداز سے دھڑکنے لگا۔
"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" وہ بے حد نروس ہو رہی تھی۔ نظریں چراتے ہوئے بولی۔
"کیا تمہیں پھولوں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی؟" اس نے مخمور آنکھوں سے سوال کیا اور پھر پلٹ کر

کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔
صبح معاذ کی آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ کمرے کی فضا معطر معطر تھی اور معاذ کے حواسوں پر نشہ ابھی تک طاری تھا۔ اس نے گہرا تازگی بھرا سانس لیا اور بیڈ کے دوسری طرف سوئی فریال کو دیکھا۔
وہ سوتے ہوئے اتنی معصوم لگ رہی تھی کہ وہ بے اختیار اسے دیکھے گیا۔
"فریال۔" اس نے ہولے سے آواز دی۔
وہ بدستور سوتی رہی۔
"فریال۔" اس نے پھر پکارا مگر شاید اس کی نیند بہت گہری تھی۔
معاذ نے سرہانے رکھے گلدستے میں سے ایک پھول توڑا اور دھیرے سے اس کے رخسار پر مار کر کہا۔
"محترمہ! اچھی خاصی صبح ہو گئی ہے۔ کیا آپ کا سو کر اُٹھنے کا ارادہ نہیں ہے؟" اس نے پھول کو اس کے نرم ہونٹوں پر رکھ دیا۔
فریال تو شاید گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔
معاذ تکیوں کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
"فریال اُٹھو بھئی۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔" اس نے فریال کے رخسار تھپتھپا کر زور سے کہا۔
وہ ہنوز خاموش رہی۔
اچانک ایک ہولناک سا خیال اس کے ذہن کو جھنجھوڑ گیا۔ مارے خوف کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کا وجود تھرا گیا۔ وہ تیزی سے اس پر جھکا۔
"فریال، فریال اُٹھو پلیز۔ آنکھیں کھولو۔ میری طرف دیکھو۔ میں تمہیں کب سے پکار رہا ہوں۔ صبح ہو گئی ہے۔ کب اُٹھو گی۔ کیا تم سن نہیں رہی ہو۔ فریال ایسا مت کرنا۔ مجھے ایسا مذاق بالکل پسند نہیں ہے۔ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔ اُٹھو ناں۔ اُٹھتی کیوں نہیں ہو تم؟" اس کے چیخنے کی آواز پورے کمرے میں گونج کر رہ گئی۔
"نہیں فریال ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کبھی نہیں ہو گا۔ فریال یہ پھول تو میں تمہیں تحفے میں دینے کے لیے لایا تھا۔ یہ تمہاری تربت پر چڑھانے کے لیے نہیں ہیں۔ فریال یہ تربت پر چڑھانے کے لیے نہیں ہیں۔
فریال۔ فریال۔" وہ چیختے جا رہا تھا۔

○ ○ ○

معاذ کی امی تہجد کی نماز کے لیے اُٹھی تھیں۔ وضو کر کے باتھ روم سے باہر نکلی ہی تھیں کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔
"اللہ خیر۔" ان کا جی بُری طرح ہول گیا۔ ایسے وقت میں فون کی گھنٹی بجنا سو طرح کے وسوسے جگا دیتا ہے۔ باہر ٹی۔وی لاؤنج میں فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلیں اور خدا سے خیر کی دعا مانگتے ہوئے فون اُٹھا لیا۔
"ہیلو۔"
"ہیلو امی۔ میں معاذ بول رہا ہوں۔"
"معاذ خیریت تو ہے؟"
"معوذ بھائی کہاں ہیں؟"
"معوذ اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ کیا بات ہے بیٹے؟"
"امی! فریال کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں جمعہ کی صبح چار بجے پی کے سیون فور سکس سے اس کی ڈیڈ باڈی لے کر پاکستان آ رہا ہوں۔ معوذ بھائی سے کہیں کہ ایمبولینس کا اور میت کو دفنانے کا انتظام کر کے رکھیں۔"
معاذ کی امی کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر گر گیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

اس کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ وہ اس کو جانتی نہ تھیں۔ مگر پھر بھی جانے کیوں دل کا کوئی گوشہ اس کے لیے نرم سا تھا۔ اس کے نام سے انسیت تھی۔ ہر نماز میں اس کی صحت کے لیے دعا مانگتی تھی۔

وہ پتھر کے بت کی مانند اپنی جگہ کھڑی تھیں۔ احساس تک نہ تھا کہ پورا چہرا آنسوؤں میں بھیگ چکا ہے۔

"امی۔ امی ابھی گھنٹی بجی تھی۔ کس کا فون تھا۔ امی آپ رو کیوں رہی ہیں؟" جویریہ وحشت زدہ سی پھٹی پھٹی آنکھیں لیے انہیں جھنجھوڑ رہی تھی۔

نہ تو آنسوؤں کی دھند میں انہیں جویریہ کا چہرا دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی اس کی آواز آ رہی تھی کہ حواس ابھی تک معطل تھے۔

"امی آپ بولتی کیوں نہیں۔ کیا ہو گیا؟ یہ کس کا فون آیا تھا۔" اس کی آواز بے حد سہمی ہوئی تھی۔

"جویریہ۔" جانے ان کا لہجہ کیسا تھا کہ جویریہ کا دل کانپ کر رہ گیا۔

"نہیں امی آپ کہہ دیں کہ کسی کا بھی فون تھا۔ مگر معاذ کا نہیں تھا۔ امی یہ فون معاذ کا نہیں تھا۔" وہ خوفزدہ انداز میں کہتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"بیٹے! تم جس کہانی کو ادھورا چھوڑ آئی تھیں۔ آج وہ کہانی ختم ہو گئی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

جویریہ سکتے کے عالم میں ان کی صورت دیکھ رہی تھی۔ بالکل گم صم۔

"جویریہ۔ جویریہ۔" وہ گھبرا کر اس کی طرف بڑھیں اور جلدی سے اس کا بازو تھاما۔

اس کا بازو ان کے ہاتھ میں لٹکتا رہ گیا۔ وہ ہوش سے غافل ایک طرف پڑی تھی۔

جانے کتنے دن شعور سے بیگانہ، حواسوں سے دور گزر گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اندھا، گونگا، بہرہ ہو گیا ہو۔ وہ جی رہی ہے اسے احساس تک نہ تھا۔ صبح کے بعد شام اور شام کے بعد صبح ہو رہی ہے اسے معلوم نہ تھا۔ وہ اپنے آپ سے دور وقت گزار رہا تھا۔

اس دن بھی وہ اپنے کمرے میں خاموش لیٹا خلاؤں میں گھور رہا تھا کہ اس کی امی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی آئیں۔ معاذ نے چہرا موڑ کر خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں اتنی ویرانی تھی کہ ان کا دل کانپ کر رہ گیا۔ آنکھوں میں بے اختیار آنسو آنے لگے۔ جنہیں بمشکل ضبط کر کے وہ اس کے پاس بستر پر بیٹھ گئیں۔

"معاذ۔" انہوں نے بہت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"جی امی۔" لہجہ اور چہرا دونوں سپاٹ تھے۔

"بیٹا ہر وقت اندر کیوں پڑے رہتے ہو۔ باہر بھی نکل آیا کرو۔"

"جی نہیں چاہتا۔" اس نے اتنے بیزار لہجے میں کہا کہ وہ اس کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔

خاصی دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئیں۔ "بیٹے میں تمہارا درد سمجھتی ہوں۔ تمہارے دکھ پر میرا دل بھی رو رہا ہے۔ مگر میرے بچے! یہ بھی سوچو کہ خدا کی رضا اسی میں تھی۔ وہ اتنی ہی زندگی لے کر آئی تھی۔ اس نے تو چلے ہی جانا تھا۔ اس کا اور تمہارا ساتھ اتنا ہی تھا۔"

انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ "بیٹے خدا کی مرضی کے آگے سر جھکاؤ۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ اپنے آپ کو سمجھاؤ۔ زندگی اس طرح نہیں گزرے گی۔ اپنا نہیں تو جویریہ کا خیال کرو۔ اس کا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ اس نے ناکردہ جرم کی سزا بھگت لی ہے۔ اب اس کا اور امتحان نہ لو۔ بڑی اجڑی ہوئی زندگی گزار رہی ہے وہ۔ بیٹا زندگی کی طرف واپس آؤ۔ اسے خوشی خوشی گزارنے کی کوشش کرو تاکہ یہ سہل لگے۔ اسے بوجھ نہ بناؤ۔ اپنا گھر پھر سے بساؤ۔ جیسے اب تم باپ بن جاؤ گے۔ جو دکھ تمہیں ملا ہے اس پر صبر کرو۔ اور جو خوشیاں تمہیں مل رہی ہیں اس پر شکر کرو۔"

معاذ ایک ٹک اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ احساس کے دریچے ذرا وا ہو رہے تھے۔

جب سے وہ پاکستان آیا تھا صرف ایک ہی بار اس نے جویریہ کو دیکھا تھا۔ سیاہ شال میں اپنا وجود

چھپائے وہ لان میں پلر کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے بعد سے وہ اسے نظر ہی نہ آئی۔ جانے کہاں تھی۔

معاذ کی امی اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔ پھر جیسے اس کی سوچ پڑھ کر بولیں۔

"جویریہ کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ گھر کا ماحول بھی سوگوار اور بوجھل سا تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ کہیں وہ اپنے ذہن پر برا اثر نہ لے۔ اسے اس کی امی کے ہاں بھجوا دیا تھا۔ تم جا کر اسے لے آؤ۔"

اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ ہر طرح کا سکھ چین تمہارا نصیب ہو۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔

معاذ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔

○ ○ ○

چوکیدار نے اس کو دیکھتے ہی گیٹ وا کر دیا۔ لپک کر اس کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور جھٹ سلام جھاڑ دیا۔ معاذ اس کے سلام کا جواب دیتا ہوا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اندر چلا آیا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی جویریہ اس کو سامنے ہی نظر آ گئی۔

معاذ کے قدم ٹھہر گئے۔

میرون کلر کی شال اپنے گرد اچھی طرح لپیٹے صوفے پر دراز، آنکھیں بند کیے وہ اپنے آپ سے بے خبر تھی چہرے پر اداسی کے بادل بہت گہرے تھے۔

جانے کتنے لمحے گزر گئے۔ معاذ خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستگی سے اسے پکارا۔

وہ آنکھیں کھول کر یوں اٹھ بیٹھی جیسے اسی آواز کے انتظار میں جگتی رہی ہو۔ معاذ پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

نگاہیں ایک دوسرے میں جذب ہوتی رہیں۔ جویریہ بے خودی کے عالم میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ اس کی شال ڈھلک گئی ہے۔

معاذ نے سرتاپا اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں کا احساس کر کے اس نے جھک کر جلدی سے چادر درست کی۔

معاذ دو قدم آگے بڑھ کر قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ دیوار سے لگی کھڑی رہی۔ دونوں بالکل چپ تھے یوں کہ خاموشی بول رہی تھی۔

"کیسی ہو؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"زندہ ہوں۔" اس کا لہجہ زندگی سے خالی تھا۔

"آپ کیسے ہیں؟"

"زندگی کے تعاقب میں ہوں۔" اس نے بوجھل سانس لیا۔

جویریہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

اس کا معاذ تو کھلا کھلا روشن سے چہرے والا تھا۔ یہ معاذ تو کوئی اور ہی لگ رہا تھا۔ مرجھایا ہوا چہرا ویران آنکھیں، ہونٹ یوں سکڑے ہوئے جیسے برسوں سے نہ مسکرائے ہوں۔

اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ لب کاٹ کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو اس طرح؟" وہ افسردگی سے مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"اپنے معاذ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"تمہارا معاذ تمہارے پاس لوٹ آیا ہے جویریہ۔"

"پورا یا ادھورا؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

"جیسا تمہیں پہلی بار ملا تھا" وہ برجستہ بولا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"اس بات سے قطع نظر کہ میں فریال کے ساتھ کتنی دور تک گیا تھا۔ اب میں تمہارے پاس واپس آ گیا ہوں۔ میری زندگی کا وہ باب اب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔ اب نہ وہ کھلے گا اور نہ میں کبھی کھولنے کی کوشش کروں گا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا جویریہ، تم ہی میری ابتدا ہو۔ تم ہی میری انتہا ہو۔ ویسے بھی اب تو بہت مقروض ہو چکا ہوں تمہارا۔ شاید یہ ساری عمر تمہارا قرض چکانے میں ہی گزر جائے گی۔"

جویریہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ ان کے درمیان پھر سے خاموشی چھا گئی۔

معاذ بھرپور انداز میں اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے سادہ چہرے پر نور سا برس رہا تھا۔ معاذ کی نگاہوں میں بے تابیاں سمٹنے لگیں۔

"جویریہ۔" اس نے پھول سے لہجے میں پکارا۔

جویریہ کے دل میں اُبال آنے لگے۔ کتنا ترسی تھی وہ اس کے منہ سے اپنا نام سننے کو۔ اس لہجے کو۔ اس انداز کو۔ اس کا دل سینے سے نکل کر معاذ کے قدموں سے لپٹنے کو بے قرار ہو گیا۔

"اتنا دور کیوں کھڑی ہو؟ یہاں آؤ۔" وہ نظروں سے اسے بلا رہا تھا۔

اس میں جنبش نہ ہو سکی۔

معاذ خود ہی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

اس کی قربت کی مانوس آنچ سے جویریہ پگھلنے لگی۔

معاذ نے اس کو شانوں سے تھام لیا۔

"آؤ جویریہ اپنی دنیا میں واپس چلیں۔ زندگی کو نئے سرے سے شروع کریں۔ ایک نیا جہان آباد کریں۔ جس میں صرف ہم ہوں گے۔ میں اور تم۔" وہ رُکا پھر شرارت سے بولا۔ "اور تمہارا چھوٹا سا بچہ۔"

جویریہ نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نگاہ کی روشنی میں جویریہ کو اپنے اردگرد کے اندھیرے دور ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں محبت کا وہی جہان آباد تھا، جو اس کے لیے زندگی کی علامت تھا۔

"معاذ!" اس کے لب پھڑپھڑائے۔

"ہوں۔" وہ جذبوں کی ساری لطافتوں کے ساتھ اس کی طرف متوجہ تھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ آپ میرے پاس ہیں، میرے سامنے ہیں، اب تو مجھے خود سے دور نہیں کریں گے ناں؟"

وہ بڑی محبت سے ہنسا اور اس کا سر سہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں، کبھی نہیں۔"

اور اس شب معاذ کے ہمراہ واپس جاتے ہوئے اس نے زندگی کے راستوں پر دور تک نگاہ ڈالی جہاں جہاں اس کی نظر پڑ رہی تھی، روشنی وہیں وہیں سے پھوٹ رہی تھی۔

اور روشنی کی ہر کرن اسے نئی زندگی کی مبارکباد دے رہی تھی۔

◆ ◆ ◆

رانیہ آج کافی عرصے کے بعد پناہ گاہ آئی تھی۔ جب سے اس کی نہال سے شادی کے متعلق بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اس نے پناہ گاہ آنا جانا تقریباً بند کر دیا۔ آج بھی وہ مجبوراً ہی چلی آئی تھی۔ خمار کو ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ وہ اس کی عیادت کو آئی تھی۔ کوشش تو اس نے بہت کی کہ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد واپس چلی جائے، مگر جواہر اور زیبا نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور رات کو بھی زبردستی روک لیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سخت بے بس ہو کر رہ گئی۔

رات کو کھانے کے بعد وہ نیند آنے کا بہانہ کر کے جلدی ہی کمرے میں چلی آئی۔ اپنے معمول کے مشغلوں اور مصروفیات سے فارغ ہو کر وہ سب بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رات خاصی بھیگ چلی تھی۔ پناہ گاہ میں چہل پہل اور آوازیں مکمل خاموشی میں بدل گئی تھیں۔

نہال نے اپنے بیڈروم میں آ کر لباس تبدیل کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اسے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے آنے والے دنوں پر غور کر رہا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے سرکتا رہا اور وہ نیند کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہا۔ تنگ آ کر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ اس پر ابتدائی دنوں کا چاند چمک رہا تھا۔ اس کی خوبصورتی کو آنکھوں میں سمیٹنے کے بعد اس نے نیچے لان میں جھانکا تو ایک دم چونک گیا۔

حوض کے کنارے کوئی ٹہل رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے جب وہ کونے میں لگی ٹیوب لائٹ کے پاس سے گزرا تو اگرچہ کہ اس کی پشت نہال کی طرف تھی، مگر سرخ دوپٹے اور دراز چوٹی سے نہال نے پہچان لیا کہ وہ رانیہ ہے۔

"رانیہ اس وقت نیچے کیا کر رہی ہے۔" اسے خاصی حیرت ہوئی۔ مڑ کر وال کلاک پر نظر ڈالی۔ کچھ دیر کھڑا وہ اسے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر مڑا۔ صوفے پر سے اپنا ڈریسنگ گاؤن اٹھا کر پہنا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ سارے گھر میں آوازلی صورت خاموشی ہی بول رہی تھی۔ دبے قدموں سے چلتا ہوا نہال باہر لان میں چلا آیا۔

رانیہ جونہی چکر کاٹ کر مڑی، ایک دم دھک سے رہ گئی۔ سینے پر ہاتھ باندھے نہال اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے سر جھکا کر نہال کے پاس سے نکل کر اندر جانا چاہا۔

"رانیہ ایک منٹ ٹھہرو۔"

وہ رک گئی اور کچھ گھبرائی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"بے فکر رہو یہاں کوئی نہیں ہے، میں ہوں اور چاند ہے۔" نہال نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا

"چاند وہ رہا۔" اس نے جھٹ آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

رانیہ نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر چاند کی طرف دیکھا۔

"رانیہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"کہیے۔" اس نے اتنے مدھم لہجے میں کہا کہ وہ بمشکل ہی سن پایا۔

"آؤ یہاں بیٹھو۔" وہ حوض کے کنارے بیٹھ گیا۔

رانیہ چکر کاٹ کر دوسرے کنارے پر جا بیٹھی۔

نہال نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔

اپنے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ کو سمیٹتے وہ خاصے فاصلے پر تھی۔ نہال کے لیے تو جیسے قتلِ عمد کی مرتکب ہو رہی تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ جل کر کہہ دے کہ یہاں پاس آ کر بیٹھ جاؤ، میرا تمہیں کچا چبانے کا قطعی کوئی پروگرام نہیں، مگر اس نے خود پر قابو رکھا۔

"تمہیں معلوم ہوگا کہ نانا جان نے میرے بارے میں خالہ جان سے کچھ بات کی ہے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"رانیہ! اگر میں تمہارا جواب ابھی جاننا چاہوں تو—؟" اس نے اپنی نظریں اس پر جما دیں۔

جواب میں اسے خاموشی کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔

نہال عجیب بے چینی کے عالم میں کھڑا ہو گیا اور گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر مضطرب سے انداز میں ٹہلنے لگا۔

"رانیہ! تیس سال سے زندگی کی شاہراہوں پر چل رہا ہوں میں نے راستے سے ہمیشہ پتھری اٹھائے ہیں۔ کلیاں یا تو میری قسمت میں نہیں یا شاید مجھے ان کی پہچان نہیں، مگر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی اپنی قسمت کے پھول مجھے دے دے یا کم از کم مجھے ان کی پہچان ہی کرا دے۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

وہ رُک گیا اور اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگا۔

"میں جانتا ہوں مجھ میں خوبیاں کم ہیں اور خامیاں زیادہ ہیں۔ بڑا کڑوا سا مرد ہوں میں۔ بہت زہر بھرا ہوا ہے میرے اندر، مگر کیا دُنیا میں ایسا کوئی نہیں جو مجھے میری خامیوں سمیت قبول کرے؟"

رانیہ نے اُس کی جانب دیکھا۔ وہ بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔

"رانیہ! مجھ میں ہزار خامیاں سہی، مگر میں خود غرض نہیں ہوں۔ میرے نزدیک تمہاری خوشی اپنی خواہشات۔"

وہ کہتے کہتے رُکا پھر بولا۔

"اپنے جنون سے پڑھ کر ہے، اگر تمہیں میرے اندر کوئی اچھا لا نظر نہیں آتا تو میں تمہیں اندھیروں میں گم ہونے نہیں دوں گا۔" نہال نے یہ کہہ کر اپنا رُخ دوسری طرف کر لیا۔

رانیہ نے ہتھیلی پر رکھا چہرہ اُٹھایا اور اُس کی پُشت کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"آپ سے کس نے کہا کہ آپ کی ذات میں اچھائی نہیں ہیں؟" وہ یہ کہہ کر چُپ ہو گئی اور خاصی دیر کے بعد پھر بولی۔

"آپ نے ایک بار کہا تھا کہ میں بڑے طویل سفر میں ہوں، میری واپسی کی دُعا کرے، نہ شکایتیں نہ گلہ کرے۔"

اُس کی آواز خود بخود بے حد آہستہ ہو گئی۔ وہ سر جھکا کر بولی۔

"میں آپ کی واپسی کی دُعا کیا کروں گی اور مجھے آپ سے کوئی شکایت، کوئی گلہ بھی نہیں ہے۔"

نہال ایک دم اُس کی طرف گھوم گیا۔ آنکھوں میں بے یقینی لیے وہ اُسے تکنے لگا پھر ایک دم ہی کھلکھلا کر ہنس دیا۔

ایک ایک قدم اُٹھا کر اُس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے سُرخ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر حجاب کی سُرخی اُسے دو آتشہ بنا رہی تھی۔

دونوں طرف مکمل خاموشی تھی۔

رانیہ حوض کے کنارے بیٹھی اپنی انگلیاں مروڑتی رہی۔ نہال کن انکھیوں سے اُس کا روپ چُرا رہا تھا۔

جذبوں کا سمندر احساس کے ساحل سے ٹکراتا رہا۔

یکایک رانیہ اُٹھی اور تیزی سے اندر چلی گئی۔

اور جذبات کی انتہا پر کھڑا نہال آفریدی سوچتا ہی رہ گیا۔

رانیہ یہ تم ہی ہو یا خوشبو ہمسفر ہے؟